رجسٹرڈ

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد [illegible] | بابت ماہ جولائی سفر ۱۹۲۹ ع | نمبر ۱

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۱۳	بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب اول نمبر۲

[illegible] اشتراک

مارکس کی تعلیم کے نہایت ضروری مسائل تین کہے جا سکتے ہیں :- (۱) [illegible]
جسے تاریخ کی مادی تشریح کہتے، (۲) اجتماع سرمایہ کا قانون ؛ (۳) معاشی
طبقوں کی جنگ

تاریخ کی مادی تشریح : مارکس کا خیال ہے کہ جماعت انسانی [illegible]
[illegible] ہر کی اصل مادی حالات میں ہے اور یہ حالات اس کے نزدیک نظام
معاشی میں متشکل ہوتے ہیں۔ دستور سیاسی، قوانین، مذاہب، فلسفے، یہ سب
[illegible] میں اپنے موٹے موٹے خد و خال میں اس معاشی اقتدار کے مختلف
[illegible] ہیں جو انہیں پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ یہ مارکس کے ساتھ ناانصافی
ہوگی اگر کہا جائے کہ اس کے نزدیک صرف جاننے بوجھنے معاشی محرک [illegible]
حاصل ہے، بلکہ اس کا خیال یہ ہے کہ معیشت سیرت اور رائے کی تشکیل کرتی ہے اور
[illegible] طرح اکثر ان چیزوں کا سرچشمہ ہے [illegible] انسانی میں اس سے بالکل [illegible]
نظر آتی ہیں۔ یہ اپنی تعلیم کو بالخصوص دو انقلابوں پر عائد کرتا ہے، ایک گزشتہ [illegible]
[illegible]۔ گزشتہ انقلاب منصب داری کے خلاف بورژوا کا انقلاب
[illegible] کا اظہار اس کے نزدیک خصوصاً فرانسیسی انقلاب میں ہوا۔ آنے والا انقلاب
[illegible] مزدوروں یا بے مایگان کا انقلاب ہے جس سے اشتراک [illegible]
قیام عمل میں آئے [illegible] تاریخ کی سار [illegible] کے نزدیک ایک لازمی چیز ہے [illegible]

اس نتیجہ کے جو مادی اسباب وجود انسانی پر اثر ڈال کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ اشتراکی انقلاب کی تلقین اتنی نہیں کرتا جتنی اس کی پیش گوئی۔ یہ سچ ہے کہ اس کے نزدیک یہ سود بخش ہوگا لیکن اسے زیادہ تر یہ بات ثابت کرنے سے سروکار ہے کہ یہ لازماً واقع ہوگا۔ یہ جو سرمایہ داری کے نظام کی برائیاں واضح کرتا ہے اس میں بھی یہی احساس لزوم نمایاں ہے۔ یہ جن مظالم کا مجرم سرمایہ دار کو قرار دیتا ہے ان کا الزام نہیں دیتا، وہ تو صرف یہ بتاتا ہے کہ جبتک زمین اور سرمایہ پر ملکیت شخصی قایم رہے گی سرمایہ دار ایک لزوم کے ماتحت مجبور ہے کہ بے رحمی سے پیش آئے۔ لیکن اسکا یہ ظلم ہمیشہ جاری نہ رہے گا کیونکہ یہ خود وہ قوتیں پیدا کرتا ہے جو آخر میں اسے تہ و بالا کر دیں گی۔

اجتماع سرمایہ کا قانون :- مارکس نے یہ بات بتائی کہ سرمایہ داری کاروبار دن بدن بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ اس نے پہلے سے آزاد مقابلہ کی جگہ بڑے ٹرسٹوں کو پیدا کرتے دیکھ لیا تھا اور پیش گوئی کر دی تھی کہ سرمایہ داری کاروبار کی تعداد اسی نسبت سے کم ہوتی جائیگی جس نسبت سے انفرادی کاروبار کی وسعت میں اضافہ ہوگا۔ اس کا گمان تھا کہ اس عمل سے نہ صرف کاروبار کی تعداد بلکہ خود سرمایہ داروں کی تعداد میں بھی تخفیف ہوگی۔ بلکہ اس کے بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے اس کے نزدیک ایک کاروبار کا مالک ایک شخص ہو۔ لہذا وہ سمجھتا تھا کہ سرمایہ داروں کی صفوں سے آدمی برابر نکل نکل کر بے املاک لوگوں کے گروہ میں شامل ہوتے رہیں گے اور جہانتک تعداد کا تعلق ہے ہوتے ہوتے سرمایہ دار دن بدن کمزور ہوتے جائیں گے۔ اس نے یہ اصول صرف صنعت ہی پر نہیں بلکہ زراعت پر بھی عائد کیا تھا۔ اسے توقع تھی کہ زمینداروں کے رقبے روز بروز بڑھتے جائیں گے اور ان کی تعداد دن بدن گھٹتی جائے گی۔ یہ صورت حالات روز بروز نظام سرمایہ داری کے عیوب اور ناانصافیوں کو زیادہ روشن

طریقہ سے پیش کرے گی اور اس طرح مخالف قوتوں کو دن بدن زیادہ ابھارے گی۔

معاشی طبقوں کی جنگ :۔ مارکس مزدور اور سرمایہ دار کو ایک گہرے تضاد کی صورت میں تصور کرتا [illegible] کے خیال میں ہر آدمی یا تو کلیتہً ایک ہے یا کلیتہً دوسرا اور اگر [illegible] نہیں تو [illegible] مزدور [illegible] جن کے پاس کچھ نہیں سرمایہ دار [illegible] کے پاس سب کچھ ہے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے ۔ نظام سرمایہ داری [illegible] مزدور اس کی حیثیت [illegible] جاتی ہے ویسے ویسے بورژوا اور [illegible] [illegible] ہوتی جاتی ہے ۔ ان دو قوتوں [illegible] کے اغراض چونکہ متضاد ہیں [illegible] یہ باہمی جنگ پر مجبور ہوتے ہیں جس سے اقتدار [illegible] اندرونی انتشار کی قوتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مزدور رفتہ رفتہ اپنی ذات سے بیجا فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف [illegible] ہیں ، پہلے تو مقامی حیثیت سے پھر قومی اور آخر کار بین الاقوامی [illegible] جب یہ بین الاقوامی طور پر متحد ہونا سیکھ جائیں گے تو انکی فتح لازمی ہے ۔ [illegible] نافذ کردیں گے کہ ساری زمین اور سرمایہ مشترک ملک ہو ، بیجا فائدہ اٹھانے کا [illegible] ہو جائے گا ، مالکان دولت کا ظلم اب ممکن نہ رہے [illegible] جماعت کی تقسیم مختلف طبقوں میں باقی نہ رہے گی ، اور سب آدمی آزاد ہو جائیں گے۔

یہ سارے خیالات اشتراکی اعلان ہی میں موجود ہیں جو نہایت حیرت انگیز قوت اور تاثیر کی تصنیف ہے جس میں نہایت جامع ، اختصار کے ساتھ دنیا کی عظیم الشان قوتیں ، انکا معرکہ جنگ اور اسکا اٹل نتیجہ بیان کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب [illegible] تحریکت کے نشوونما میں [illegible] اہمیت رکھتی ہے اور جن مسائل کو بعد میں "سرمایہ" کے اندر زیادہ تفصیل اور بہت مقالات کے ساتھ بیان کیا گیا ان کا اسقدر عمدہ بیان اس میں موجود ہے کہ اس کے خاص خاص حصوں کا علم ہر اس شخص کے لئے لازمی ہے جو چاہتا ہے کہ اس اثر و تسلط کو سمجھے جو [illegible]

سنے مزدور طبقہ کے قائدین میں سے ایک بڑی تعداد کے ذہن اور تخیل پر حاصل کر لیا ہے۔

یہ یوں شروع ہوتا ہے: "یورپ کے سر پر ایک آسیب سوار ہے، اشتراکی کا آسیب قدیم یورپ کی تمام قوتیں اس آسیب کو اتارنے کے لئے باہم ایک اتحاد مقدس میں شامل ہوگئی ہیں پوپ اور زار، میٹرنخ اور گیزو، فرانسیسی انتہاپسند اور جرمن پولیس کے جاسوس۔ کونسا مخالف فریق ہے جسے اس کے با اقتدار حریفوں نے اشتراکی کہہ کر [illegible] وہ فریق مخالف کہاں ہے جس نے خود اپنے [illegible] انتہاپسند فریقوں کو نیز اپنے قدامت پسند حریفوں کو اشتراکی ہونے کی [illegible] ہو؟"

معاشی گروہوں کی جنگ کوئی نئی بات نہیں: "ساری موجودہ جماعت کی تاریخ طبقات معاشی کی کشمکش کی تاریخ ہے" اس کشاکش میں معرکہ ہر مرتبہ یا ہیئت اجتماعی کی ایک انقلابی ترتیب نو کی صورت میں ختم ہوا یا جنگ آزما طبقوں کی یکساں تباہی میں۔"

[illegible] عہد نے، جو بورژوا طبقہ کا عہد ہے، اس سماجی جنگ کو سادہ کر دیا ہے۔ ہیئت اجتماعی بہ حیثیت کل روز بروز دو بڑے مقابل لشکروں میں منقسم ہوتی جا رہی ہے۔ دو بڑے طبقوں میں جو بلا واسطہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں: یعنی بورژوا (سرمایہ دار) اور بے مایہ مزدور" اس کے بعد منصب داری کے زوال کی تاریخ آتی ہے جس کے سلسلہ میں بورژوا کا بہ حیثیت انقلابی قوت کے بیان آتا ہے "تاریخ میں بورژوا نے نہایت انقلابی حصہ لیا ہے" اس ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے جو مذہبی اور سیاسی خرابیوں کے پردہ میں ہوتا ہے اس نے کھلے بندوں، بے حیائی سے، براہ راست اور وحشیانہ فائدہ اٹھانا شروع

کر دیا ہے" اپنی پیداوار کے لئے روز افزوں بازار کی ضرورت بورژوا کو سارے
کرۂ ارض پر لئے پھرتی ہے" سو سال سے بھی کم عرصہ کے اقتدار میں بورژوا طبقہ
نے اس سے زیادہ وسیع اور عظیم پیدائشی قوتیں پیدا کر دیں جتنی تمام سابقہ نسلوں
نے [illegible] کرنے کی تھیں [redacted] تعلقات اب زنجیریں تھیں،" انکا توڑنا
ضروری تھا۔ چنانچہ یہ توڑ دی گئیں" اور ایسی ہی ایک تحریک ہماری آنکھوں
کے سامنے بھی جاری ہے" جن ہتھیاروں سے بورژوا طبقے نے منصب داری
کے قصر کو منہدم کیا تھا وہی اب [redacted] کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن
[illegible] یہی نہیں کہ وہ ہتھیار تیار کر دئے ہیں جو اس کی موت کا باعث
ہوں گے بلکہ اس نے وہ آدمی بھی پیدا کر دئے ہیں جو یہ ہتھیار اٹھائیں گے یعنی
(کارگذار طبقہ) بے مایہ مزدور۔

اس کے بعد مزدوروں کی ناداری کے اسباب پیش کئے گئے ہیں۔ وہ ایک
کام کرنے والے (مزدور) کی پیدائش کا صرف تقریباً بالکل ان ذرائع گذر پر محدود
ہے جو اسے اپنے زندہ رکھنے اور اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے درکار ہیں۔
لیکن کسی چیز کی قیمت، اور لہذا محنت کی قیمت بھی اس کے صرف پیدائش کے برابر
ہوتی ہے۔ لہذا جس نسبت سے کہ کام کی کراہیت بڑھتی ہے مزدوری گھٹتی ہے۔
یہی نہیں بلکہ جس نسبت سے کہ مشین کے استعمال اور تقسیم عمل میں اضافہ ہوتا ہے اس
نسبت سے مشقت کا بار بھی بڑھتا ہے"

"جدید صنعت نے شفیق استاد کی چھوٹی دوکان کو صنعتی سرمایہ دار
کے بڑے کارخانوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ کارخانوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے
مزدوروں کے انبوہ سپاہیوں کی طرح منظم [redacted] صنعتی لشکر
کے سپاہیوں کی حیثیت سے یہ عہدیداروں اور حوالداروں کے ایک درجہ بدرجہ

مرتب نظام کے زیر حکم ہیں ۔ یہ بورژوا طبقہ اور بورژوا ریاست ہی کے غلام نہیں بلکہ ہر دن ہر ساعت مشین کے غلام ہیں اور ان سب سے بڑھکر خود اپنے بورژوا کارخانہ دار کی ذات کے غلام ۔ یہ استبداد جس قدر کھلے الفاظ میں منافع کو اپنا مقصد اور اپنی غایت ظاہر کرتا ہے اسی قدر چھوٹا ، قابل نفرت اور تلخ ہوتا جاتا ہے"

اس کے بعد یہ اعلان ان طبقات معاشی کی باہمی جنگ کے بڑھنے کے متعلق بتاتا ہے " مزدور طبقہ نشو ونما کے کئی منازل سے گذرتا ہے ۔ پیدایش کی گھڑی ہی سے بورژوا سے اس کی پیکار شروع ہو جاتی ہے ۔ پہلے پہل تو انفرادی حیثیت سے مزدور مقابلہ کرتے ہیں ، پھر ایک کارخانے کے مزدور ، پھر ایک صنعت کے کارگذار کسی مقام میں ان انفرادی سرمایہ داروں کے خلاف ہو جاتے ہیں جو براہ راست ان سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ یہ بورژوا پیدایش دولت کے حالات کے خلاف حملہ کرنے کے بجائے خود آلات پیدایش کے دشمن بن جاتے ہیں ۔

اس منزل میں مزدور ابھی سارے ملک میں پھیلے ہوئے اشخاص کا ایک بے ربط مجموعہ [illegible] باہمی مقابلہ کے باعث منتشر ۔ اگر یہ کہیں زیادہ منظم جماعتوں میں متحد [illegible] ہیں تو یہ خود ان کے قوی اتحاد کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بورژوا طبقہ کے اتحاد کا ، جو خود اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے [illegible] مزدور پیشہ طبقہ کو حرکت میں لانے پر مجبور [illegible] ابھی کچھ زمانہ تک انہیں حرکت دینے کی قوت بھی رکھتا ہے "

انفرادی مزدور اور انفرادی سرمایہ دار کا تصادم روز بروز دو معاشی طبقوں کے تصادم کی حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے ۔ [illegible] بورژوا کے خلاف اپنی جمعیتیں بنانا شروع کرتے ہیں (اتحاد ہائے صنعتی) اجرت کا نرخ اونچا

رکھنے کے لئے یہ باہم ملتے ہیں، اپنی ہنگامی بغاوتوں کے لئے پہلے سے انتظام کرنے کی غرض سے یہ مستقل انجمنیں بناتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ مقابلہ بلووں کی شکل اختیار کرتا ہے کبھی کبھی مزدور فتحمند ہوتے ہیں، لیکن محض عارضی طور پر۔ انکے معرکوں کا اصلی پھل انکے فوری نتیجے میں نہیں ہوتا بلکہ مزدوروں کے روز بروز وسعت پذیر اتحاد میں۔ اس اتحاد میں ان ترقی یافتہ ذرائع آمدورفت سے مدد ملتی ہے جو موجودہ صنعت نے پیدا کر دیے ہیں اور جو مختلف مقامات کے مزدوروں میں باہم تعلق پیدا کرا دیتے ہیں۔ متعدد مقامی معرکوں کو جنکی نوعیت ایک ہی تھی مرکزی حیثیت سے مجتمع کرکے معاشی طبقوں کی ایک قومی جنگ بنانے کے لئے اس تعلق کی ضرورت تھی لیکن معاشی طبقوں کی ہر جنگ سیاسی جنگ ہے۔ اور جس اتحاد کے پیدا کرنے کے لئے قرون وسطےٰ کے شہریوں کو اپنی خراب سڑکوں کے باعث صدیاں درکار تھیں وہ ریلوں کا بھلا ہو موجودہ مزدور طبقہ چند سال میں حاصل کر لیتا ہے۔ مزدوروں کی ایک معاشی طبقے میں اور لہٰذا ایک سیاسی فریق (پارٹی) کی شکل میں تنظیم برابر اس مقابلہ کی وجہ سے بکھر جاتی ہے جو خود مزدوروں میں باہم موجود ہے لیکن پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور پہلے سے مضبوط تر، قوی تر، پائندہ تر ہوکر بورژوا طبقہ میں جو باہمی مخالفتیں ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر یہ مزدوروں کے بعض مخصوص اغراض کو قانوناً تسلیم کرا لیتی ہے"۔

"بے مایہ مزدور طبقے میں عام طور پر پرانے اسباب علامت ہی چکتے ہیں مزدور بے املاک ہوتا ہے، اپنی بیوی بچوں سے اس کے جو تعلقات ہوتے ہیں ان میں اور بورژوا خاندانی تعلقات میں کوئی چیز مشترک باقی نہیں رہتی۔ موجودہ صنعتی محنت نے سرمایہ کی محکومیت، جو انگلستان اور فرانس، امریکہ اور جرمنی سب جگہ یکساں ہے اسے سیرت و خصائل قومی کے ہر اثر

سے خارج کر دیا ہے۔ قانون، اخلاق، مذہب اس کے لئے بس بورژوا تعصبات ہیں جن کی آڑ میں اتنے ہی بورژوا اغراض پوشیدہ ہیں۔ سارے گذشتہ طبقے جو غالب آئے انہوں نے اپنی حاصل شدہ حیثیت کو اور مضبوط کرنے کے لئے ساری جماعت کو اپنی شرائط تملیک کا پابند بنایا۔ مزدور ہیئت اجتماعی کی پیدائشی قوتوں پر کسی طرح قابض نہیں ہو سکتے۔ سوائے اس کے کہ اپنے سابقہ طریق تملیک اور لہذا ہر دوسرے سابقہ طریق تملیک کو مٹا دیں۔ ان کا اپنا تو کچھ ہے نہیں جسے یہ بچائیں اور محفوظ کریں ان کا مقصد ہے ملکیت شخصی کی تمام سابقہ حفاظتوں اور ضمانتوں کو تباہ کر دینا۔ تمام سابقہ تاریخی تحریکیں اقلیت کی تحریکیں تھیں یا اقلیت کے اغراض کے لئے تھیں۔ مزدوروں کی تحریک بہت بڑی اکثریت کی شعوری اور خود مختار تحریک ہو اور اسی بڑی اکثریت کے اغراض کے لئے۔ مزدوروں کا طبقہ جو موجودہ جماعت کی سب سے نچلی تہ ہے اس وقت تک نہ حرکت کر سکتا ہے نہ اپنے کو ابھار سکتا ہے جب تک کہ دفتری ہیئت اجتماعی کی ساری کی ساری اوپر کی تہیں پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں نہ اڑ جائیں۔"

مارکس کہتا ہے کہ اشتراکی سارے مزدور طبقہ کے ساتھ ہیں۔ یہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اشتراکیوں پر ایک الزام یہ اور لگایا جاتا ہے کہ یہ ملکوں اور قوموں کے مٹانے کے آرزومند ہیں۔ "مزدور کا کوئی ملک نہیں۔ ہم ان سے وہ چیز نہیں چھین سکتے جو وہ رکھتے ہی نہیں۔"

اشتراکیوں کا سب سے پہلا مقصد مزدوروں کے ہاتھوں سیاسی قوت کا حصول ہے۔ یہ اشتراکیوں کا نظریہ ایک جملہ میں بند کیا جا سکتا ہے: "ملکیت شخصی مٹانا۔"

اس قسم کے الزامات کے جواب میں کہ اشتراک عیسائیت کا مخالف ہے تاریخ

کی مادی تشریح استعمال کی گئی ہے ۔" اشتراک کے خلاف مذہبی، فلسفیانہ یا عم
مبنی نقطہ نظر سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ زیادہ گہری تحقیق کے
نہیں۔ اس کے سمجھنے کے لئے کیا کوئی گہرا وجدان درکار ہے کہ انسان کے
آرار، اور تصورات مختصراً انسان کا شعور ہر اس تبدیلی کے ساتھ بدلتا رہتا
اس کے وجود مادی کی کیفیات، اس کے معاشرتی تعلقات اور اس
جماعتی زندگی میں پیدا ہو؟

ریاست کی طرف [illegible] کا [illegible] بالکل آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔
سے کہا جاتا ہے کہ " جدید ریاست کی [illegible] تمام بورژوا طبقہ کے معاملا
مشترکہ کے انتظام کے لئے ایک کمیٹی ہے ،، تاہم [illegible] پہلا قدم ریا
اقتدار ہونا چاہئے ۔" ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ مزدور طبقہ کے
انقلاب میں پہلا قدم یہ ہے کہ مزدوروں کو حکمراں طبقہ بنا دے، جمہوریت
سر کرے۔ مزدور طبقہ اپنے سیاسی اقتدار کو اس غرض کے لئے استعمال
کرے گا کہ رفتہ رفتہ بورژوا طبقہ سے سارا سرمایہ چھین لے اور تمام آ
پیش و دولت کو مرکزی حیثیت سے ریاست کے ہاتھ میں جمع کر دے یعنی
بطور طبقہ حکمراں منظم مزدوروں کے ہاتھ میں اور پیداواری قوتوں
[illegible] قدر تیزی سے ممکن ہو بڑھائے ۔"

اعلان آگے چل کر فوری اصلاحات کا ایک پروگرام پیش کرتا ہے جس سے
اول اول تو موجودہ ریاست کی قوت میں بہت اضافہ ہوگا لیکن یہ کہا گیا ہے کہ
جب اشتراکی انقلاب تکمیل کو پہنچ جائے گا تو ریاست کا [illegible]
[illegible] میں ختم ہو جائے گا۔ جیسے اینگلس ایک دوسرے موقع پر کہتا ہے
کہ جب مزدور طبقہ ریاست کی قوت اپنے ہاتھ میں لے لیگا " تو ساتھ ہی معاشی طبقوں

کے تمام اختلافات اور خصومتوں کا خاتمہ بھی کر دیگا چنانچہ ریاست کا وجود بھی بحیثیت ریاست کے ختم ہوجائے گا" اس طرح اگرچہ واقعتاً مارکس اور انگلس کی تجاویز کا نتیجہ ریاستی اشتراک ہوتا ہم ان پر ریاست کو عظمت دینے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

"ساری دنیا کے مزدوروں کو اشتراک حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ایک اپیل پر ختم ہوتا ہے "اشتراکی اپنے خیالات اور مقاصد کو چھپانے کو حقیر جانتے ہیں۔ یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ انکے مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ تمام موجودہ جماعتی حالات کو بہ جبر تباہ کر دیا جائے۔ حکمراں طبقے اشتراکی انقلاب کے ڈر سے کانپیں! مزدوروں کے پاس سوائے اپنی زنجیروں کے کچھ کھونے کو نہیں۔ فتح کرنے کو انکے لئے ایک عالم ہے۔ تمام ممالک [illegible] متحد ہوجاؤ!

اس اشتراکی اعلان کی اشاعت کے بعد جلد ہی روس کے علاوہ براعظم کے تمام بڑے ملکوں میں انقلاب بپا ہوا لیکن سوائے شروع شروع میں فرانس کے یہ انقلاب نہ معاشی تھا نہ بین الاقوامی۔ ہر دوسری جگہ اسے قومیت کے خیالات نے ابھارا تھا۔ چنانچہ وقتی طور پر خوف زدہ ہونے کے بعد دنیا کے حکمرانوں نے [illegible] اقتدار حاصل کرلیا جو قومی خیالات میں لازماً موجود ہوتی ہیں۔ اور ایک بہت مختصر سی ظفرمندی کے بعد یہ انقلاب ہر جگہ جنگ اور ردعمل کی شکل میں ختم ہوا۔ اشتراکی "اعلان" کے خیالات شائع ہوگئے قبل اس کے کہ دنیا انکے لئے تیار ہوتی۔ لیکن اس کے مصنفوں نے ہر ملک میں اس اشتراکی تحریک کی ابتدا اپنی آنکھوں سے دیکھ لی جو روزافزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے، حکومتوں پر روز بروز زیادہ اثر ڈال رہی ہے، جو روسی

انقلاب پر حاوی ہے شاید وہ دن دور نہیں کہ یہ تحریک دہ بین الاقوامی فتح حاصل کرنے کا اہل اپنے کو ثابت کر سکے جس کی طرف اعلان کے آخری جملے دنیا کے مزدور کو دعوت دیتے ہیں۔

مارکس کے شاہکار "سرمایہ" نے "اشتراکی اعلان" کے تفصیلوں میں حجم اور مواد کا اضافہ کیا۔ اس نے "قدر زاید" کا نظریہ پیش کیا جو سرمایہ داری قائم بیجائے واقعی کل پرزوں کی تشریح کا مدعی ہے۔ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے اور ہم خالص نظریات میں اسے مشکل ہی سے ایک اضافہ تسلیم کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ ہم اسے تجریدی الفاظ میں مارکس کی اس نفرت کا ترجمہ سمجھیں جو اسے اس نظام سے [illegible] انسانی زندگیوں سے مادی دولت بناتا [illegible] مداحوں نے اسے سمجھا ہے نہ کہ بے لوث تحلیل علمی کی حیثیت [illegible] نظریہ قدر زاید کی تنقیدی تحقیق میں خالص معاشی نظریہ کی بہت سی [illegible] اور محدود بحثیں آجائیں گی اور اشتراک کی علمی صحت یا عدم صحت پر اسکا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوگا۔ اس لئے موجودہ کتاب کی حدود میں اس کا شامل کرنا ممکن معلوم ہوتا [illegible] خیال میں اس کتاب (سرمایہ) کے بہترین حصے وہ ہیں جو معاشی واقعات سے بحث کرتے ہیں اسلئے کہ مارکس انکا نہایت ہمہ گیر علم رکھتا تھا۔ انہیں واقعات سے اسے توقع تھی کہ وہ اپنے چیلوں میں وہ پائدار اور غیر فانی نفرت پھونک سکے گا جو انہیں مرتے دم تک معاشی طبقوں کی جنگ میں سپاہی بنائے رکھے گی۔ اس نے جو واقعات جمع کئے ہیں وہ ایسے ہیں جو چین کی زندگی بسر کرنیوالے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت کے لئے عملاً نامعلوم ہیں۔ یہ بڑے ہیبت خیز واقعات ہیں اور جو معاشی نظام انہیں پیدا کرتا ہے اسکے متعلق تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ نہایت عیب [illegible] کے انتخاب واقعات کی چند مثالیں بہتسے اشتراکیوں کی تلخی کی تشریح کا کام دیں گی:۔

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کو ناٹنگم کے مجلس گھر میں مسٹر بروٹن چارلٹن مجسٹریٹ ضلع نے ایک جلسہ کے صدر کی حیثیت سے بیان کیا کہ دیس کی صنعت سے آبادی کے جس حصے کا تعلق ہے اس میں ناداری ومصیبت کا عالم یہ ہے کہ حکومت کے دوسرے حصوں میں کیا ساری دنیا میں ایسی حالت نہ ملیگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نو نو، دس دس برس کے بچے اپنے میلے کچیلے بستروں سے صبح ۲، ۳ یا ۴ بجے باہر گھسیٹ لئے جاتے ہیں اور انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ محض گزارہ پر رات کے ۱۰، ۱۱ یا ۱۲ بجے تک کام کریں ۔ انکے ہاتھ پاؤں گھسے جاتے ہیں، انکی ہڈیاں گھلی جاتی ہیں ۔ انکے چہرے سفید پڑ جاتے ہیں، اور انکی انسانیت اترتے اترتے مطلق پتھر کی طرح کے جمود کی ایسی سطح پر پہونچ جاتی ہے جس کا تصور ہی تکلیف دہ ہے ۔"

لندن کے ایک جیوری کے سامنے تین آدمی کھڑے ہیں ۔ ایک گارڈ، ایک انجن چلانیوالا، ایک جھنڈی دکھلانے والا ۔ ایک ہیبت ناک ریل کے حادثہ نے سیکڑوں مسافروں کو دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے ۔ ملازموں کی غفلت اس حادثہ کا سبب ہے اور یہ بیک آواز جیوری کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ دس یا بارہ سال پہلے انکا کام روزانہ صرف ۸ گھنٹہ رہتا تھا ۔ پچھلے پانچ چھ برس سے بڑھ کر ۱۴، ۱۸ اور ۲۰ گھنٹہ روزانہ تک ہوگیا ہے اور جب چھٹیاں منانے والوں کا زیادہ زور ہوتا ہے اور تفریح کی گاڑیاں چھوڑی جاتی ہیں تو انکا کام بلا وقفہ ۴۰ یا ۵۰ گھنٹہ تک چلتا ہے ۔ یہ معمولی آدمی ہیں جن یا دیو تو نہیں ہیں ۔ ایک نقطہ پر پہنچکر انکی محنت نے جواب دیدیا ۔ انپر جمود طاری ہوگیا ۔ انکا دماغ سوچنے سے معذور ہوگیا اور انکی آنکھیں دیکھنے سے ۔ آن سراپا مزدور، انگریز ارکان جوری

نے حکم لگایا کہ انہیں قتل انسانی کے جرم میں عدالت بالا کے سپرد کیا جائے اور اپنے حکم کے ساتھ ایک نرم تنبیہ میں یہ مقدس امید ظاہر کی کہ ان کے سرمایہ داروں کا بر آئندہ (قوت) محنت کی کافی مقدار خریدنے میں ذرا زیادہ فراخدل ہونگے اور اپنے ملازموں سے کام لینے میں ذرا زیادہ "اعتدال" زیادہ "نفس فراموشی" اور زیادہ "کفایت [illegible] کام لیں گے۔

جون ۱۸۶۳ء کے آخری ہفتے میں لندن کے تمام روزنا[illegible] ہاتھوں موت" کے "سنسنی خیز" عنوان کے ماتحت میں ایک عبارت شائع کی [illegible] میری این واکلے نامی ایک ۲۰ سالہ دوشیزہ کی موت کا ذکر تھا جو ایک نہایت معزز لباس سازی کے کارخانے میں ملازم تھی جس پر ایلیزا کا خوش آئند نام رکھنے والی ایک خاتون متصرف تھیں۔ یہ لڑکی اوسطاً ½۱۶ گھنٹے، اور خاص بکری کے موسم میں بلا وقفہ ۳۰ گھنٹے کام کرتی تھی۔ اور اس کی رو بہ زوال قوت کو وقتاً فوقتاً شیری پورٹ شراب یا کافی کی فراہمی سے دوبارہ زندہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت بکری کا موسم زوروں پر تھا۔ نووارد شہزادی ویلز کی آمد کی تقریب میں ناچ ہونے والے [illegible] میں جو معزز خواتین مدعو تھیں ان کے لئے پل بھر میں شاندار لباس تیار کرنے تھے۔ میری این واکلے نے اور ۶۰ لڑکیوں کے ساتھ بلا وقفہ ½۲۶ گھنٹے کام کیا۔ ایک کمرہ میں ۳۰ لڑکیاں کام کرتی تھیں جس میں ان کے لئے جتنے مکعب فٹ ہوا درکار تھی اس کی صرف ایک چوتھائی پہنچ سکتی تھی۔ رات میں یہ دو دو مل کر ایک ایسی کوٹھری میں جہاں دم گھٹتا تھا اور جو کمرہ خواب کو دفتیوں سے تقسیم کرکے بنائی گئی تھیں اور یہ کارخانہ لندن کے بہترین لباس سازی کے کارخانوں میں تھا۔

میری بین واسکے جمعہ کو بیمار پڑی، اتوار کو مرگئی، اور ایلیزا نماتون کو بڑا تعجب ہوا کہ ماتھ بھی جو کام لیا تھا اسے ختم کئے بغیر! ڈاکٹر مسٹر کیز نے جو بستر مرگ پر بہت دیر میں بلائے گئے تھے، جوری کے سامنے شہادت دی کہ "میری بین واسکے آدمیوں سے بالکل بھرے ہوئے کمرہ میں بہت دیر تک کام کیا اور ایسی کوٹھری میں سونے کی وجہ سے مرگئی جو بہت تنگ تھی اور جس میں ہوا کے جانے کا انتظام بہت خراب تھا" ڈاکٹر صاحب کو آداب حسنہ کی تعلیم دینے کے لئے جوری نے فیصلہ کیا کہ "متوفیہ [illegible] مرضہ وغیرہ وغیرہ"

آزادی تجارت کے حامی کابڈن اور براٹ کا پرچہ مارننگ اسٹار چلا اٹھا کہ "ہمارے سفید غلام جو کہ محنت سے قبر کا منہ دیکھتے ہیں اکثر خاموشی سے گھلتے رہتے ہیں اور بالآخر مرجاتے ہیں"[1]

ایڈورڈ ششم: اسکی حکومت کے پہلے سال [illegible] قانون نافذ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کام کرنے سے انکار کرے تو یہ اس شخص کا غلام قرار دیدیا جائے جس نے اسپر کام چوری کا الزام لگایا ہے۔ آقا اپنے غلام کو کھانے کے لئے روٹی اور پانی، ہلکی سی یخنی اور ایسا بچا کھچا گوشت دے جو اس کے خیال میں اس کے لئے موزوں ہو۔ آقا کو حق ہے کہ جس کام پر چاہے اسے مجبور کرے چاہے یہ کام کتنا ہی نفرت انگیز کیوں نہ ہو۔ اور یہ چابک اور زنجیر کی مدد سے۔ اگر غلام دو ہفتے غائب رہے تو یہ ساری عمر کے لئے غلام ہو جائے گا اور اس کی پیشانی اور پشت پر حرف S داغدیا جائے گا۔ اگر یہ تین مرتبہ بھاگ جائے تو مستحق موت مجرم کی حیثیت سے اسے پھانسی دی جائے۔ آقا اسے بیع کر سکتا ہے۔ ورثہ میں دے سکتا ہے، غلام

---

(۱) جلد اول صفحہ ۲۳۹ - ۲۴۰

کی حیثیت سے کرایہ پر دے سکتا ہو، بالکل جیسے کسی ذاتی چیز یا مویشی کو اگر غلام اپنے آقا کے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کریں تو بھی انہیں سزا موت دی جائے منصفان امن کو جب خبر پہنچے تو چاہئے کہ ان بدمعاشوں کو گھیر کر انکا شکار کرے۔ اگر کوئی آوارہ گرد کہیں ۳ دن تک بیکار پھرتا پکڑا جائے اسے اس کے مقام ولادت پر لیجانا چاہئے، لال دہکتے ہوئے لوہے سے اس کے سینہ پر حرف V داغنا چاہئے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر سڑک کوٹنے یا کسی اور کام پر لگا دینا چاہئے۔ اگر یہ آوارہ گرد غلط مقام(۱) پیدائش بتلائے تو یہ ساری عمر کے لئے اس مقام کا غلام بنا دیا جائے یعنی اس کے باشندوں اور اس کی جمعیت بلدی [illegible]م پر حرف S کا داغ دید یا جائے۔ ہر شخص کو اختیار ہو کہ آوارہ گردوں کے بچوں کو مددگار کی طرح لیجائیں، نوجوانوں کو ۲۴ سال کی عمر تک اور لڑکیوں کو ۲۰ سال تک اگر یہ بھاگیں تو اس عمر تک اپنے استادوں کے غلام رہیں، ان آقاؤں کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو انہیں زنجیروں میں جکڑیں کوڑوں سے ماریں۔ ہر آقا اپنے غلام کے گردن، بازو یا پیر میں ایک لوہے کا کڑا ڈالے جس سے اسے آسانی سے پہچانا جاسکے اور بھاگ نہ پائے۔ اس قانون کا آخری حصہ یہ ہے کہ بعض غریب لوگ ایسے مقامات یا ایسے اشخاص کے ملازم بنائے جاسکتے ہیں جو انہیں کھانا پینا دینے کو راضی ہوں اور انکے لئے کام فراہم کریں۔ حلقہ کے غلاموں کی یہ قسم انگلستان میں انیسویں صدی میں عرصہ تک "چوکیداروں" کے نام سے قائم رہی"

اسی نوع کے واقعات کا صفحہ [illegible] صفحہ اور باب [illegible] باب، جن میں سے ہر ایک اس تقدیری نظریہ کی مثال میں پیش کیا گیا ہے جس کے یقینی دلائل سے ثابت کرنے

(۱) جلد اول صفحہ ۵۸، ۵۹

مارکس مدعی ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر جذبات رکھنے والے مزدور پیشہ پڑھنے والے کو آگ بگولا کر دے اور سرمایہ کے ہر مالک کو جس میں شرافت اور انصاف یکسر مفقود ہی نہ ہو گیا ہو ناقابل برداشت شرم سے پانی پانی نہ کر دے۔

کتاب کے تقریباً ختم پر ایک نہایت مختصر سے باب میں جو اجتماع سرمایہ کا تاریخی رجحان کے زیر عنوان ہے۔ مارکس ایک لمحہ کے لئے اس امید کی ذرا سی جھلک آنے دیتا ہے جو موجودہ مصیبت سے پرے کہیں بہت دور ہے۔

"جب تبدیلی ہیئت کا یہ عمل قدیم جماعت کو سرتاپا پراگندہ کر چکے گا، جب کام کرنے والے ایک مزدوروں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ذرائع محنت سرمایہ میں، جب سرمایہ داری طریقہ پیدائش دولت خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گا، تو محنت کا مزید خدمت جماعت میں صرف ہونا، زمین اور دیگر ذرائع پیدائش کا جماعت کے فوائد کے لئے اور لہذا مشترک ذرائع پیدائش کی حیثیت سے استعمال ہونا، نیز شخصی ملکیت رکھنے والوں کی مزید بے دخلی، یہ سب چیزیں ایک دوسری شکل اختیار کریں گی اب جس کی بے دخلی ہو گی وہ مزدور نہیں جو خود اپنے لئے کام کرتا ہے بلکہ سرمایہ دار ہوگا جو [illegible] مزدوروں سے بیجا فائدہ اٹھاتا ہے [illegible] دخلی خود سرمایہ داری پیدائش دولت کے مضمر بالذات قوانین سے عمل میں آتی ہے یعنی سرمایہ کے اجتماع مرکزی سے۔ ایک سرمایہ دار ہمیشہ کئی کو مارتا ہے۔ اس مرکزیت یا چند کے ہاتھوں کئی کی بے دخلی کے ساتھ ساتھ روز افزوں طور پر عمل محنت کی تعاونی شکل نشو و نما پاتی ہے۔ نیز صنعت میں حکمت کا بالارادہ استعمال زمین کی باقاعدہ کاشت، آلات محنت کی تبدیلی ایسی شکلوں میں [illegible] مشترک حیثیت سے قابل استعمال ہیں۔ سارے ذرائع پیدائش کے استعمال میں اس طرح کفایت کہ نہیں صرف متحدہ اور جماعتی [illegible] ذرائع [illegible] تمام اقوام کا ایک دنیا کے بازار میں ایک دوسرے سے خلط ملط۔ اور اس [illegible] کو ساتھ اقتدار

سرمایہ داری کی بین الاقوامی نوعیت۔ جیسے جیسے اکابرین سرمایہ کی تعداد گھٹتی ہے اور یہ اس تبدیلی کے تمام فوائد کو غصب کر کے اپنے اجارہ میں لیتے جاتے ہیں اسکے ساتھ ہی ساتھ فلاکت، ظلم، غلامی، ذلت اور فائدہ بیجا کا انبار بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کی بغاوت بھی بڑھتی ہے، ایک طبقہ جس کی تعداد روز بڑھتی جاتی ہے اور جو خود سرمایہ داری اور پیدائش دولت کی ضرورتوں کے اثر سے منضبط، متحد اور منظم ہے۔ سرمایہ کا اجارہ طریقہ پیدائش کے لئے زنجیر بن جاتا ہے، اس طریقہ پیدائش کے لئے جو اسی کے ساتھ [illegible] تھا اور جس نے اسی کے ساتھ اور اسی کے ماتحت ترقی پائی تھی۔ ذرائع پیدائش کی مرکزیت اور محنت کا جماعتی استعمال اب ایسے نقطہ پر پہنچ گئے ہیں جہاں وہ اس سرمایہ داری کے خول کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ خول پھٹتا ہے۔ سرمایہ داری ملکیت شخصی کی موت کا گھنٹا بجتا ہے۔ بے دخل کرنے والے بے دخل کئے جاتے ہیں۔" (۱)

بس صرف اسقدر۔ اس کے علاوہ شروع سے آخر تک مشکل ہی سے کوئی اور [illegible] جو اداسی کو دور کرے۔ اور پڑھنے والے کے دماغ پر اسی بیدردانہ دباؤ میں اس قوت کا بڑا حصہ مضمر ہے جو اس کتاب نے حاصل کی ہے۔

مارکس کی تصنیف سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول آیا تاریخی ارتقار کے [illegible] جو اس نے بتائے ہیں وہ صحیح ہیں؟ دوم، کیا اشتراک پسندیدہ چیز ہے؟ دوسرا سوال پہلے سے بالکل بے تعلق ہے۔ مارکس ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اشتراک کا آنا لازمی ہے، لیکن اس کی دلیل دینے سے اسے مشکل ہی سے کچھ سروکار نظر آتا ہے کہ جب یہ آئیگا تو اچھی چیز بھی ہو گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جب یہ آئے تو اچھی چیز ہو۔ چاہے مارکس کی تمام وہ دلیلیں غلط ہی ہوں جو اس نے اس کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ اسکا آنا

(۱) جلد اول صفحہ ۸۸-۷۸۹۔

لازمی ہے۔ واقعہ یہ ہو کہ زمانہ نے مارکس کے نظریات میں سے بہتوں میں کمزوریاں ظاہر کی ہیں دنیا کی ترقی اس کی پیش گوئی سے بیشک اتنی کافی مشابہت رکھتی ہے کہ اسے نہایت غیر معمولی وقت نظر کا آدمی ثابت کر دے، لیکن اتنی مشابہ نہیں کہ سیاسی یا معاشی تاریخ کو اس کی پیشگوئی کے بالکل مطابق کرنے کے لئے کافی ہو۔ قومیت کا جذبہ، گھٹنے کا کیا ذکر، اور بڑھ گیا ہے اور اس پر وہ عالمگیر رجحانات فتح نہیں پا سکے ہیں جو مارکس نے نہایت ٹھیک طور پر مالیات میں دیکھے تھے۔ اگرچہ بڑے کاروبار اور بڑے ہو گئے ہیں اور بہت بڑے رقبہ میں اجارہ کی منزل پر پہنچ چکے ہیں تاہم ان میں حصہ داروں کی تعداد اسقدر کثیر ہے کہ ان افراد کی تعداد جن کے اغراض نظام سرمایہ داری کے ساتھ وابستہ ہیں۔ برابر بڑھتی گئی ہے علاوہ بریں اگرچہ بڑے کارخانے زیادہ بڑے ہو گئے ہیں تاہم ساتھ ساتھ اوسط درجہ کے کارخانے بھی تعداد میں بڑھتے رہے ہیں اسی اثنا میں مزدور جنہیں مارکس کے خیال کے مطابق محض گذارہ کی اس سطح پر ہی رہنا چاہئے تھا جس پر وہ انیسویں صدی کے نصف اول میں انگلستان میں تھے۔ انہوں نے بجائے اس کے دولت کی عام فراوانی سے فائدہ حاصل کیا ہے اگرچہ اس درجہ نہیں جتنا کہ سرمایہ داروں نے۔ اجرت کا مفروضہ قانون آہنی جہانتک متمدن ممالک کی محنت کا تعلق ہے غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اگر ہمیں آج سرمایہ داری ظلم کی ایسی مثالیں ڈھونڈنی ہوں جن سے مارکس کی کتاب بھری پڑی ہے تو ہمیں اپنے مواد کے اکثر حصے کے لئے ان علاقوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا جہاں ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے نچلی نسلوں کے انسان ہیں۔ یہ کہ آج دنیائے محنت میں ہنرمند مزدور "رئیس" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے بعد سوال ہے کہ وہ سرمایہ دار کے خلاف بے ہنر مزدوروں سے یا ان کے خلاف سرمایہ دار سے ملے۔ اکثر یہ خود ایک چھوٹا موٹا سرمایہ دار ہوتا ہے، اور اگر انفرادی حیثیت سے یہ خود نہ بھی ہو تو اسکا "اتحاد صنعتی" یا اس کی "انجمن احباب" تو ظن غالب ہے کہ ہوگی۔ لہذا معاشی طبقوں کی جنگ میں وہ شدت قائم نہیں رہی۔ بجائے اس کے

نادار مزدور اور بہمہ دار سرمایہ دار کے صریحی منطقی تضاد کے اب تو غریب اور امیر کے درمیان مدارج ہیں بیچ کی منزلیں ہیں۔ خود جرمنی میں جو ارتودکس مارکسیت کا گھر بن گیا تھا اور جس کی نہایت ترقی یافتہ اور طاقتور اشتراکی جمہوری پارٹی "سرمایہ" کے مسائل کو لفظی حیثیت کے علاوہ اور ہر طرح منزل من اللہ جانتی تھی خود وہاں جنگ سے قبل زمانہ میں تمام طبقوں کے اندر دولت کی بیحد فراوانی نے اشتراکیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے عقائد پر نظر ثانی کریں اور انقلابی رویہ کے بجائے ارتقائی رویہ اختیار کریں۔ ایک جرمن اشتراکی برنشتائین نے جو عرصہ تک انگلستان میں مقیم تھا ایک "ترمیمی" تحریک کی ابتدا کی اور بالآخر اشتراکی پارٹی کے بڑے حصہ کو اپنا حامی بنا لیا۔ ارتودکس مارکسیت کے خلاف اس کی نکتہ چینی اس کی کتاب "ارتقائی اشتراک" میں پیش کی گئی ہے۔ اور تمام وسعت مذہب کے حامی مصنفین کی طرح برنشتائین کا کام بھی زیادہ تر یہ ظاہر کرنا تھا کہ خود بانیان مذہب اپنے مذہب کے مسائل پر اس درجہ سختی سے قائم نہ تھے جتنا کہ انکے متبعین۔ مارکس اور انگلز کی تحریروں میں بہت کچھ چیزیں ہیں جو اس شدید ارتودکسی میں نہیں کھپتیں جو انکے تبعین میں پیدا ہو گئی تھی۔ علاوہ اس نکتہ چینی کے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں ان متبعین کے خلاف برنشتائین کی تنقید انقلاب کے مقابلہ میں رفتہ رفتہ ارتقائی اور تدریجی عمل کی حمایت پر مشتمل ہے۔ یہ مذہب کی اس بیجا خصوصیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے جو اشتراکیوں میں بہت عام ہے اور اس بین الاقوامیت کی دھار بھی کند کرتا ہے جو بلاشبہ مارکس کی تعلیم کا جزو ہے۔ یہ کہتا ہے کہ جہاں [illegible] شہری بنا تو پھر وطن کا بھی پابند ہو جاتا ہے اور وہ اس قوم پرستی کی حمایت کرتا ہے جس کے متعلق جنگ نے ثابت کر دیا کہ یہ اشتراکی طبقوں میں عام ہے۔ یہ یہاں تک کہتا ہے کہ یورپی قوموں کو ممالک حارہ پر بوجہ اپنی اعلیٰ تہذیب کے حق حکومت حاصل ہے یہ تعلیم انقلابی امنگ کو مدھم کرتی اور اشتراکیوں کو لبرل فرقہ کا دست چپ بنا دیتی ہے۔ لیکن جنگ سے قبل مزدوروں کی روز افزوں مرفہ الحالی نے خیالات کی اس نشوونما

کو ناگزیر بنا دیا تھا۔ آیا جنگ اس بارے میں حالات بدلیگی اس کا جاننا فی الحال ناممکن ہے۔
برنشتاین اس عاقلانہ قول پر اپنی تصنیف ختم کرتا ہے: "ہمیں مزدوروں کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ واقعی ہیں۔ اور یہ نہ تو اس درجہ عالمگیر طور پر نادار ہیں جیسا کہ اشتراکی اعلان میں بیان کیا گیا تھا، نہ تعصبات اور کمزوریوں سے ایسے پاک ہیں جیسا کہ ان کے درباری ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں۔"

برنشتاین مارکسی ارتودکسی کے اس زوال کا نمائندہ ہے جو اندر سے شروع ہوا ہے۔ سنڈکیت کا اس پر باہر سے حملہ ہے، یعنی ایک ایسے مذہب کے نقطہ نظر سے جو مارکس اور انگلز سے زیادہ بنیادی اور انقلابی ہونے کا مدعی ہے۔ مارکس کیطرف سنڈکلی رویہ کا پتہ سوریل کی چھوٹی سی کتاب "اختتام مارکسیت" اور اس کی بڑی تصنیف "افکار بابتہ تشدد" سے جس کا انگریزی ترجمہ باجازت مصنف ت۔ ا۔ ہیوم نے کیا ہے (مطبوعہ ۱۹۱۵ء ایلن وا یون) برنشتاین نے جہاں تک مارکس پر نکتہ چینی کی ہے اسے بالاتفاق نقل کرنے کے بعد سوریل ایک دوسری قسم کی نکتہ چینی شروع کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے (اور یہ سچ بھی ہے) کہ مارکس کی نظری معاشیات مذہب منچسٹر سے بہت قریب ہے۔ اس نے اپنے شباب کے زمانہ کی ارتودکس معاشیات کو بہت سی ایسی باتوں میں تسلیم کر لیا ہے جو اب غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ سوریل کے نزدیک مارکس کی تعلیم میں واقعی اصلی چیز طبقات معاشی کی جنگ ہے۔ جو کوئی اسے زندہ رکھے وہ اشتراک کی روح کو ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ زندہ رکھ رہا ہے جو اشتراکی۔جمہوری ارتودکسی پر حرف بحرف اڑے ہوئے ہیں۔ اس جنگ طبقاتی کی بنیاد پر جیسی سنڈکلیوں نے مارکس پر وہ تنقید کی جو اس تنقید سے جس پر ہم ابھی تک غور کر رہے تھے بہت زیادہ گہری ہے۔ ارتقاء تاریخی کے متعلق جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے مارکس کے خیالات میں تھوڑی بہت غلطی ہو سکتی تھی تاہم ممکن تھا کہ وہ سیاسی و معاشی نظام جو یہ پیدا کرنا چاہتا تھا اتنا ہی پسندیدہ ہوتا جتنا کہ اس کے متبع

فرض کرتے ہیں۔ لیکن سندکلیوں نے محض امر واقعہ کے بابتہ ہی مارکس کے خیالات پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ اس مقصد پر بھی جو اس کے پیش نظر ہے اور ان ذرائع کی عام نوعیت پر جو یہ تجویز کرتا ہے۔ مارکس کے خیالات نے ایسے زمانہ میں صورت اختیار کی تھی کہ ابھی جمہوریت کا وجود نہ تھا۔ اسی سال جب کتاب "سرمایہ" شائع ہوتی ہے انگلستان میں شہری مزدوروں کو پہلی مرتبہ حق رائے ملا اور شمالی جرمنی میں بسمارک نے عام حق انتخاب منظور کیا۔ فطری بات تھی کہ جمہوریت سے جو جو حاصل ہو سکتا ہے اس کے متعلق بڑی بڑی امیدیں باندھی جائیں۔ ارتوذکس معاشیئن کیطرح مارکس کا بھی گمان تھا کہ انسان کی رائے کم و بیش ذاتی یا اپنے طبقہ کے معاشی اغراض سے بنتی ہے۔ سیاسی جمہوریت کے طویل عملی تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ اس معاملہ میں احرار و اشتراکی دونوں کے مقابلہ میں وسرائیلی اور بسمارک فطرت انسانی کے بہتر جاننے والے تھے۔ یہ بات روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے کہ ریاست پر ذریعہ حریت کی حیثیت سے اعتبار کیا جائے یا سیاسی فرقوں کو اس بات کے لئے کافی قوی آلہ تسلیم کیا جائے کہ وہ ریاست کو قوم کی خدمت پر مجبور کر سکیں۔ سوریل کہتا ہے کہ جدید ریاست "ذہنیئن کی ایک جماعت ہے جس کے ہاتھ میں کچھ مراعات ہیں اور ایسے ذرائع (جنہیں سیاسی کہا ہے) جن سے یہ ذہنیئن کے ان دوسرے گروہوں کے حملوں سے اپنے کو بچا سکے جو ملازمت عامہ کے فوائد حاصل کرنے کے مشتاق ہیں۔ ان ملازمتوں کو حاصل کرنیکے لئے سیاسی فرقے بنتے ہیں اور یہ خود ریاست سے مشابہ ہوتے ہیں "۔

سندکلی آدمیوں کو فرقوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ پیشہ کے لحاظ سے منظم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس یہی طبقات معاشی کی جنگ کا صحیح تصور اور [illegible] چنانچہ یہ پارلیمنٹ اور انتخابات کے ذریعہ ہر سیاسی عمل کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ جس کارروائی کو پیش

امتیاز مارکسیت" صفحہ ۲

کرتے ہیں وہ انقلابی سنڈیکیت اور اتحاد صنعتی کا براہ راست اور بلاواسطہ عمل ہے۔ سیاسی عمل کے مقابلہ میں صنعتی (معاشی) عمل کا آوازہ جنگ فرانسیسی سنڈکلیوں سے بہت دور تک پہنچ گیا ہے۔ یہ امریکہ کی "دنیا کے صنعتی مزدوروں" کی تحریک میں پایا جاتا ہے، اور برطانیہ کے "صنعتی اتحادیوں" اور گلڈ اشتراکیوں میں۔ اس کے حامی اکثر مارکس سے مختلف مقصد بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ جہاں ریاست ساری طاقت رکھتی ہو فرد کے لئے کبھی کافی آزادی نہیں ہو سکتی چاہے یہ ریاست اشتراکی ریاست ہی کیوں نہ ہو۔ ان میں سے بعض سرتاسر نراجی ہیں اور ریاست کو مطلقاً معدوم دیکھنا چاہتے ہیں دوسرے صرف اس کے اختیار میں تخفیف کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے مارکس کی جو مخالفت پہلے سے نراجی طرف سے موجود تھی وہ بہت قوی ہو گئی ہے۔ ہم اگلے باب میں اسی مخالفت کی قدیم شکل سے بحث کریں گے۔

ہندوستان اور مسئلہ تعلیم

(اقتباس از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے آنجہانی)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح   کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا!

ہندوستان میں غیر سرکاری ذرائع سے ابتدائی اور نیز اعلیٰ ادبی اور صنعتی تعلیم کی اچھی خاصی اشاعت ہوئی ہے۔ مسٹر جے این ٹاٹا آنجہانی نے اپنی دولت کا ایک معقول جز بلند پایہ سائنٹفک تعلیم کے لئے وقف کیا۔ بنگلور کا سائنس انسٹی ٹیوٹ اپنے وجود کے لئے انہیں کا رہین احسان ہے۔ بوس انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ ٹیکنولاجیکل انسٹی ٹیوٹ (جس کے ساتھ نامور ماہر کیمیا سر پی۔ سی۔ رائے کا وجود گرامی وابستہ ہے) جس میڈیکل کالج، یہ سب مراکز تعلیم تمام وکمال یا بڑی حد تک پرائیویٹ جدوجہد ہی کے نتائج ہیں۔ حال یہ ہے کہ بعض سرکاری یونیورسٹیاں بھی بعض پرائیویٹ اشخاص کی فیاضیوں کی بہت کچھ دست نگر ہیں ان بزرگوں میں سرگرو داس بنرجی کا نام نامی واسم گرامی خاص طور پر لیا جا سکتا ہے ہندو یونیورسٹی بنارس اعلیٰ ترین ادبی تعلیم دینے کے علاوہ ایک انجنیئرنگ کالج بھی چلاتی ہے لیکن مس میو اپنے قارئین کرام کے دلوں میں اس دعوے کو نقش کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستانی لوگ اشاعت تعلیم کے ذیل میں کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں اور یہ کہ ہندوستانی زعمائے قوم گورنمنٹ کو مفت کا الزام دیتے ہیں کہ وہ خدمت تعلیم کے فریضہ سے تغافل برت رہی ہے! ہندوستان کی تعلیمیافتہ جماعت کی اس علمی سرد مہری اور ناسپاسی کے افسانے کی بنیاد حسب معمول وہ ایک معتبر راوی کے بیان پر رکھتی ہے، چنانچہ یہ بیانات ایک زبردست لیکن خیر سے غیر معروف ومجہول الاسم بنگالی قانون پیشہ بزرگ کے اعترافات پر مبنی ہیں جنہیں مس موصوفہ نے شرف مصاحبت بخشا اور جنہوں نے اگرچہ بیشمار روپیہ اپنی قانونی

پرکشش کے ذریعے سے اپنے اہل ملک کی جیبوں سے گھسیٹا لیکن جن کو قوم کی تعلیم کی راہ میں مدت العمر ایک پیسہ دینے کی توفیق نہوئی ! ایسے عجیب الخلقت بزرگوں کا ہندوستانیوں کی تعلیمی خیر خواہی پر مصر ہونا بجا ہی ہے !

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

لیکن آخر کار اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تعلیم ایک ایسا کام ہے جس کی ذمہ داری جدید اصول حکمرانی کی رو سے حکومت ہی پر ہے۔ غیر سرکاری کوششیں چاہے وہ کتنی ہی وسیع اور قابل داد ہوں، زمانہ حاضر کی کسی قوم کی تعلیمی ضروریات و مہمات کی حریف نہیں ہوسکتیں! مسٹر فشر نے، جو برطانیہ کے ناموراہر تعلیم ہیں اور جو سنین گذشتہ میں انگلستان کے وزیر معارف رہ چکے ہیں، اپنی تقریروں میں بار بار اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ دنیا کے تمام متمدن ممالک میں پبلک کی تعلیم و تربیت حکومت کا فرض عین ہے - واقعہ یہ ہے کہ یہ حکومت کا " فرض " بھی ہے اور " حق " بھی کہ وہ ہر حال میں اس بات پر نظر رکھے کہ شہریوں کی جس دنیا کی وہ سیاسی رہنما ہے وہ قعر جہالت میں نہ گرنے پائے ! اپنے ایک پبلک اعلان میں صاحب موصوف نے جن کے خیالات مسائل تعلیم میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں، فرمایا

" لیکن اگرچہ حکومت نوعمر مزدوری پیشہ لوگوں کو محنت مزدوری سے منع نہیں کرسکتی تاہم اس کو طالب العلمی اور مزدوری کے مابین ایک مخصوص رابطہ و توازن قائم رکھنا چاہیے حکومت کو زیبا ہے کہ وہ تعلیم عامہ کو اپنے عقائد دینی میں داخل کرلے، لیکن ساتھ ہی اُس کا فرض ہے کہ تعلیم کے مقام بلند کی معرفت بھی حاصل کرے ! اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ تعلیم کے معنی محض نوشت و خواند کی تعلیم نہیں ہیں بلکہ زیر تعلیم لوگوں کے صفحہ دماغ اور لوح دل پر اخلاق و سیرت انسانی کا ایک دیرپا نقش کندہ کردینا ! ایک دوسری ضرورت یہ ہے کہ قوم کے ہر بچے کے دل میں حق تعلیم کا احساس پیدا کیا جائے ! تعلیم گورنمنٹ کا ناگزیر فریضہ ہے عوام الناس کے اندر علم و حکمت کی اشاعت کے مقصد عظیم کو اُسے کسی حالت میں

بھی پس پشت نہ ڈالنا چاہئے اور نہ مصارف کی کمی کا خیال ان خدمات عالیہ میں حائل ہونا چاہئے! ..... اس کو تعلیم کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام ترتیب دینا چاہئے جس کی امداد سے ملک کے ہر فرد کو اپنے نفس کی ان تمام قوتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملے جو [illegible] کے اندر ودیعت کی ہیں! ساتھ ہی اس کو مخصوص صورتوں میں غیر معمولی امداد و سرپرستی کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا چاہئے!

[illegible] حقوق و فرائض" کی اس فہرست کو آپ سنتے ہیں! اس میٹو کو جا کر کوئی خبر کر دے کہ ہندوستانی شوریدہ سر لیڈر ہی نہیں جو حکومت ہند سے تعلیم عامہ کے [illegible] بار کو برداشت کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند!

عہد حاضر کے ایک سیاست داں کی نظر میں تعلیم ملکی کا جو اہم ترین نصب العین ہے اس کے بعض اطراف کو بے نقاب کرنے کے لئے ہم مسٹر فشر کی بعض دوسری تقریروں سے ایک آدھ اقتباس اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ صاحب موصوف فرماتے ہیں:۔

"زمانہ حال کی ہر دلعزیز تعلیم کا نظریہ ہے کہ ملک کے ہر مرد عورت کو فرائض شہریت کی بجا آوری کے لئے تیار کیا جائے۔ ان سب کو زندہ رہنے کا حق ہے، لیکن بعض کو اپنے ملک و ملت کی خاطر "تسلیم جاں" کا فریضہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے! ہر نفس کو خطرۂ جہالت وضلالت سے بچانے کی ضرورت ہے اور یہ کام حکومت کا فرض اولین ہے! واقعہ یہ ہے کہ یہ شے فرائض حکومت سے بھی اعلیٰ و ارفع چیز ہے، تعلیم ایک شخص کا تمدنی مطالبہ ہی نہیں ہے بلکہ بحیثیت انسان کے اس کا ایک پیدائشی حق ہے اور ایک فطری ضرورت ہے! [illegible] انسانی ہستی کا ایک جائز رجحان ہے، کہ صحیفۂ قدرت میں ہر شے جو قابل معرفت ہے اس کو جانے، ہر قابل استفادہ چیز سے متمتع ہو، ہر صحیح جذبے سے لطف اندوز ہو، اور ہر بشری امید سے اپنی تسکین قلبی اور تشفی روحانی کا مقصد حاصل کرنے [illegible]

اپنی بریڈ فورڈ کی تقریر میں مسٹر فشر نے فرمایا:

"جس وقت میں نے قوم کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا تو میں یہ دیکھ کر سخت حیرت زدہ اور رنجیدہ ہوا۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ بشرطِ مشاہدہ ہر دوسرا شخص بھی میرے اس احساس میں شریک ہوگا۔ کہ اب بھی برطانیہ عظمیٰ کے لاکھوں مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو اس زندگی کے اُن دلفریب عطیوں کو قبول کرنے سے معذور ہیں جو زندگی انکے سامنے پیش کرنے کیلئے تیار ہے! کتنے آدمی ہیں جو کتابوں سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکتے؟ کتنی بڑی تعداد ہے جو مصوری و موسیقی کی لذت بخشی سے ناآشنا ہے! الغرض بشریت کا کتنا معتدبہ حصہ ایسا ہے جن کے لئے حیاتِ انسانی کی وہ نعمتیں ناقابلِ فہم ہیں جو ہمارے دل و دماغ کی تربیت سے پیدا ہوتی ہیں اور جن کے ہم گویا خالق معنوی ہیں! یہ لوگ ایک خشک میکانکی شغلت میں گرفتار رہیں، آہن و فولاد کی مشینوں سے پابزنجیر ہیں۔ اُنکی تاریک زندگیاں شاعری کے کسی لمحہ منیرہ سے روشن نہیں ہوتیں، اُنکی مادیات کے زنگ سے آلودہ دل کسی عین کی صیقل سے صاف نہیں ہوتے۔ دنیا اپنے دامن میں جو عظمتیں اور شوکتیں رکھتی ہے انکا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، ان کو اتنی دماغی دلبستگی بھی نصیب نہیں کہ جن آلات اور مشینوں کو وہ [illegible] اور مویشیوں کی طرح چلاتے ہیں انکے متعلق اُس علمی اصول اور فلسفیانہ کلیہ ہی کو معلوم کریں جو اس انسانی صنعتی کارگاہ کے اندر بطورِ روح رواں کام کر رہا ہے۔ الغرض اُنکی مادیت میں کوئی روحانیت نہیں، انکی کثافت میں کوئی لطافت نہیں، اُنکی پستی میں کوئی بلندی نہیں، اُنکی ارضیت میں کوئی سمادیت نہیں، اور ان کو فطرت سادہ نے جو کچھ دیدیا ہے اُس میں اپنے انسانی عمل تخلیق سے کسی طرح کا اضافہ کرنیکی ان میں کوئی طاقت نہیں! میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ہمارے لئے اس پر صبر کرنا ممکن ہے کہ زمین پر یہ سب چیزیں ممکن الحصول ہوں اور پھر بشریت کا ایک وسیع حصہ ان سے اس افسوسناک طریقے سے محروم رہے؟! کم از کم ہم کو اپنا موجودہ پروگرام

اس طرح ترتیب دینا چاہئے کہ مستقبل کسی حد تک ہماری ماضی کی مجرمانہ کوتاہیوں کا کفارہ پیش کر سکے ، اور ہم اس وقت اس خوشگوار توقع ہی سے اپنے قلوب کو کچھ تسلی دے سکیں کہ زمین کے دورِ آئندہ میں ایک ایسی دنیا تعمیر ہو سکے گی جو انسان پر اُن "نعمتوں کا اتمام" کرے گی جو پردۂ غیب اور عالم امکان میں اس کے لئے منتظر ہیں ! "

دار العلوم میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :

"وسیع مفہوم میں وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو ہم اپنی قوم کو ملنے کے خواہشمند ہیں ؟ بس یہی کہ وہ اپنے شہری بن سکیں ، اپنے سارے حقوق و فرائض کو پہچانیں ، صحیح الجسم ہوں اور صحیح الدماغ ، اپنے تمام کاروبار اعمال زندگی کو انجام دینے کی پوری اہلیت و اہلیت رکھتے ہوں ، اور اپنے فرصت کے لمحوں کو ذہنی دلچسپی اور تخلیقی لذت اندوزی میں تبدیل کرنیکا فن لطیف جانتے ہوں ! "

مسٹر فشر اپنے زمانۂ خدمت میں برابر تعلیم عامہ کے غیر معمولی طور پر اہم اور زندگی ہونے پر زور دیتے رہے ۔ انہوں نے سال بسال تعلیمی بحث کے لئے زائد از زائد رقوم دیں ، اور دوران جنگ کی نازک ترین حربی و سیاسی ضرورتوں کے مقابلے میں بھی تعلیمی مالیہ کی قطع و برید نہ ہونے دی بلکہ اُس کے تدریجی اضافے کو حسب معمول جاری رکھا ۔ تمامی صیغوں اور سررشتوں میں کفایت و تخفیف مصارف کے عالمگیر نعرۂ جنگ کے مقابلے میں انہوں نے کیا ہی خوب فرمایا :

" میں بھی کفایت ہی چاہتا ہوں ، اور نیز اضافۂ آمدنی ۔ لیکن سمجھ لیجئے کہ کس چیز کا ؟ انسانوں کا اور انسانیت کا جو ملک کی قیمتی ترین متاع ہے اور سب سے زیادہ قابل قدر جنس ! آج اسی " انسانی سرمایہ " کی حفاظت ہمارے پیش نظر ہے ! ماضی میں یہ دولت بے بہا بُری طرح تاراج ہوئی ہے ۔ لیکن اب ہم اس کی بے بدل قدر و قیمت سے ناآشنا نہیں رہ سکتے ! "

بلند نفس نشر کا تعلیمی نصب العین بنیئے۔

میں مستقبل میں ایک ایسے معشر انسانی کے ظہور کا متمنی ہوں جس کے ہر فرد کو بلا قید جنس و عمر اور بدون امتیاز تمول و فقر و دولت تعلیم سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع حاصل ہوگا! موجودہ غم انگیز و خجالت آفریں صورت حال یہ ہے کہ دولتمندوں کے ہاتھ میں قلم ہے اور غربا کے ہاتھ میں کدال!"

مس میو ایک خالص برطانوی مشن پر ہندوستان آئی تھی۔ ہندوستان میں تعلیم پر جو گہر افشانی اس نے کی ہے اس کے اندر یہ باطل کوشانہ روش بے نقاب نظر آتی ہے! وہ ہندوستان کی اصلاحات کی ثناء و صفت میں قدرے بہت رطب اللسان ہے اور اس بات پر اس نے خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ زور دیا ہے کہ اصلاح یافتہ کونسلوں میں جبکہ چند دیگر امور کے علاوہ تعلیم عامہ کا شعبہ بھی صیغہ جات منتقلہ میں داخل کر دیا گیا ہے تو اب بھی اگر ملک میں رفتار تعلیم سست اور نشر علوم و معارف کا حلقہ تنگ رہے تو اس کے لئے اہل ہند کو اپنے ہموطن وزرائے تعلیم ہی کا ممنون احسان ہونا چاہئے! مس میو نے ان الفاظ میں اپنے خبث باطن اور اپنے جہل مرکب دونوں کا ثبوت دیا ہے! اس کو خبر نہیں کہ صوبجاتی حکومتوں میں طریق کار کیا ہے! وہ ہندوستانی وزراء کی بے بسی کو دیکھنے سے قاصر نہیں رہ سکتی تھی بشرطیکہ وہ ادنیٰ تامل ان سیاسی تماشا گاہوں کی جنگ ہائے زرگری کو دیکھنا چاہتی۔ ہندوستان کے ملت پرست عناصر "اصلاح یافتہ" کونسلوں میں صیغہ جات منتقلہ و غیر منتقلہ کے درمیان غیر مساویانہ و غیر منصفانہ تقسیم زر پر مسلسل و پر زور احتجاج کرتے رہے ہیں۔ میدان تعلیم کے اندر وزراء کوئی حقیقی اقدام ترقی کرنے سے معذور محض ہیں، اس لئے کہ روپیہ انتظامی کونسلوں کے ممبروں کے ہاتھ میں ہے جو سیاہ و سفید کے مختار ہیں اور وزراء ہر وقت انکے دست کرم کے محتاج رہتے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کا وہ عجیب و غریب نظام حکومت جو امپیریل سروس کے

تازے صیغوں کے لئے بیک جنبش قلم ایک کرور روپیہ کے مزید عطیہ کا اعلان کرسکتا ہو
اور جو سالانہ اسّی کرور روپیہ کا گنج قارونی فوج پر بہاتا ہے، وہ اُس وقت پورا تنگدل
اور تہیدست ہوتا ہے جبکہ تعمیر قومی کے ان کارہائے نافعہ کے لئے رقوم کے تعین کا موقع
آتا ہے جو غریب ہندوستانی وزراء کے سر تھوپے گئے ہیں!

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا!

مسٹر ریجی، گورنمنٹ ہند کے کمشنر تعلیم کا پیام امید سنئے:

"مرکزی اور نیز صوبجاتی حکومتوں کی محدود مالیات کو دیکھتے ہوئے ملک کے اندر مستقبل قریب میں کسی عاجلانہ تعلیمی انقلاب پیدا کرلینے کی امید قطعاً خارج از بحث ہے!"

ہم انگلستان کی سی قسمت کہاں سے لائیں جس کے مایہ ناز فرزند فشر نے ملک کے سامنے پیہم اعلانات کئے کہ جنگ کے زمانے میں بھی تعلیم قومی کی راہ میں جو رقم صرف ہوگی وہ ایک "زر محفوظ" اور ایک "تاجرانہ لاگت" ہوگی! جس کے ضائع ہونیکا کوئی خوف نہیں ہے۔ تخفیف اخراجات کے ہمہ گیر شور شغب اور جنگ عظیم کی قیامت آفرین رستخیز کے درمیان وہ پورے سکون خاطر اور خوش انجامی کی کامل امید کے ساتھ کثیر المصارف اور گراں بار تعلیمی بجٹوں کی ترتیب و تیاری میں مشغول تھا! یہ فیاض منش برطانوی عاشق تعلیم شاید خودکشی کرلیتا اگر ہندوستان کی وزارت تعلیم کی کرسی پر متمکن ہوکر وہ مسٹر ریجی کی زبان فیض ترجمان سے یہ دانش فروشانہ موعظت سنتا کہ:

"تعلیم عام کی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے جس پر یلغار کرکے ہم اس تک جا پہنچیں!"

مسٹر فشر نے تعلیمات کے موضوع پر جو ارشادات فرمائے ہیں وہ اہل ہند کیلئے خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان و برطانیہ کے آئینی تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے

وہ ہندوستان کے لئے مخصوص طور پر کارآمد ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں ہر دوسرے ملک کے کسی اور ماہر تعلیم کے مقابلہ میں مسٹر فشر کے افکار و تجاویز زیادہ مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ نشہ سلطنت کا وہ زبردست تعلیمی مرشد اعظم ہے جس نے ان تعلیمی حقایق اور اُن تعلیمی کلیوں کو اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کیا ہے جو ہر خودوار اور ترقی دوست ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہیں۔ آہ! ہم ہندوستانی اپنے وطن کے اندر اپنے کاروان تعلیم کے خود سالار کارواں نہیں ہیں! ہمارے صوبجاتی وزرائے تعلیم کی ہستی ہمارے لئے اور بھی تلخ کامیوں اور حسرت آفرینیوں کا سبب ہے: صیغۂ تعلیم کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے، اور خزانۂ عامرہ کی کلید سرکاری رکن مجلس منتظمہ کی گرفت میں! اس صورت حالات کی ستم ایجادی قابل داد ہے!

از صحن خانہ تا بلب بام، ازان من ۔ وز سقف خانہ تا بہ ثریا، ازان تو!

عالم کے مختلف جدید العہد نظامات تعلیم کے مطالعہ کے بعد مسئلہ تعلیم قومی کے باب میں بعض اہم کلیات کا استخراج کیا جاسکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) قوم کا صیغۂ تعلیم اُس کے عسکری سررشتہ مدافعت وطنی کا ہمسر و ہم قیمت ہے آخر الذکر اگر چمن ملت کی بیرونی خار دار چار دیواری ہے تو اول الذکر اُس کے اندرونی صحن و گلزار کی بہار ہے! ایک ترقی یافتہ قوم کی اشتہائے عالیہ کی غذا علوم و معارف ہی ہیں! قوم کے بام عروج پر پہنچنے کے لئے سب سے زیادہ یقینی نردبان ترقی تعلیم ہی ہے!

(۲) قومی تعلیم کا بار گراں پرائیوٹ حوصلہ مندیوں کے دوش پر اٹھانیکی کوشش کرنا ناممکنات کو عملی جامہ پہنانیکی سی ہرزہ کاری ہے! اس میں شک نہیں کہ قومی تعلیم کے جہاز کی ناخدائی قوم کے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے، لیکن ملک کا سارا خزانہ اور صیغہ مالیات کی کنجی انکے دوسرے ہاتھ میں ہونے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے!

(۳) یہ خیال کہ حکومت کو صرف ابتدائی تعلیم کی پرائیویٹ سرگرمیوں کی اپنی

مالی امداد سے سرپرستی کرنی چاہئے زمانے کے ساتھ رخصت ہوگیا ہے۔ تازہ ترین اور صحیح ترین نظریہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کا فرض تعلیم کی اولین منازل کی دستگیری پر ختم نہیں ہوجاتا۔ قوم کی اقتصادی و مادی مرفہ حالی کا انحصار ایک کامیاب صنعتی و حرفتی تعلیم پر ہے اور ان مہمات سے سرکاری خزانہ ہی عہدہ برآ ہوسکتا ہے، ایک دوسرا فریضہ حکومت کا اعلیٰ تعلیم بھی ہے۔ یہ جسم قومی کے اندر وسیع دل اور بلند دماغ پیدا کرتی ہے۔ ملک کے اندر ایسے زعمائے قوم جو قومی مشکلات و خطرات کی آزمائشوں میں ملک کے لئے "سالک باخبر" بن سکیں، اعلیٰ تعلیم ہی وجود میں لاسکتی ہے اور ایسے مخصوص افراد ایسی شجر طیبہ کے گل و ثمر بنکر قوم کے ہاتھ آسکتے ہیں۔ پس تعلیم کا یہ شعبہ اس اہم ترین قومی ضرورت کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

(۴) تعلیم کا یہی مفہوم نہیں ہے کہ قوم کے بچوں کو معمولی نوشت و خواند اور حساب و کتاب کے ابتدائی اصول سے آشنا کرکے چھوڑ دیا جائے۔ اس کے مقاصد اس سے بمراحل زیادہ بلند اور وسیع ہیں: اس کے اندر قوم کے ہر نونہال کی جسمانی [illegible]ی تنویر افکار، اخلاقی تہذیب نفس، اور روحانی تزکیۂ قلب سب ہی داخل ہے!

(۵) ملک کے ہر بچے کی ایسی تربیت جو اس کو قوم کا ایک فرزند رشید، ریاست کا ایک مفید شہری، دنیا کا ایک کامیاب آدمی، انسانیت کا ایک قابل فرد، اور عالم کا ایک شاندار انسان بنادے بغیر اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ اس کار عظیم کو حکومت اپنے سارے وسائل مال اور اپنے جملہ ذرائع عزم و ہمت کے ساتھ اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے!

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

مقالہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی معلم جامعہ ملیہ کے گذشتہ سال یوم تاسیس کے موقع پر شعبہ تاریخ کیطرف سے پیش کیا تھا۔ ہم اسے تین نمبروں میں شائع کریں گے پہلے دو نمبروں میں وہ حصہ ہے جس میں ادب فارسی کی تاریخ غزنوی سے پہلے دکھائی گئی ہے اور تیسرے نمبر میں وہ حصہ جس میں سلطان کے ادبی ذوق اور اس کی علم دوستی کا ذکر ہے۔

ایران کی موجودہ زبان دراصل زمانہ مابعد اسلام کی پیداوار ہے اس سے پہلے جو زبان رائج تھی وہ پہلوی یا دری وغیرہ اس کی مختلف شاخیں تھیں۔ ایران میں جب اسلامی [illegible] تو قدرتی طور پر عربی زبان بھی تمام ملک پر چھا گئی یہانتک کہ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ایران کے تمام دفاتر بھی فارسی سے عربی میں ہو گئے چنانچہ اس زمانہ میں ایرانیوں کی [illegible] تصانیف میں تقریباً سب عربی میں ہیں اہل عجم نے عربی میں اس قدر دسترس حاصل کر لی کہ خود عرب انکا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اسلام کے مایہ ناز مشاہیر امام ابوحنیفہ۔ نظام الدین طوسی۔ امام بخاری، امام مسلم، امام غزالی، سیبویہ، جوہری، بوعلی سینا، قطب الدین رازی، قطب الدین شیرازی، عبدالقاہر وغیرہ سب ایرانی عجمی تھے۔ ابن مقفع ایرانی الاصل تھا جس نے عرب میں تربیت پائی اسکی سی علمی و ادبی قابلیت کے لوگ، خود عرب کی سرزمین میں بھی بمشکل پیدا ہو سکے۔ اسکی بعض کتابوں درۃ الیتیمہ۔ کلیلہ و دمنہ وغیرہ کا جواب باوجود سخت کوشش کے عربوں سے بن نہیں پڑا۔

علاوہ بریں ایک بڑا سبب ایران میں عربی زبان کی ترویج کا یہ ہوا کہ ایرانی زبان علمی حیثیت سے تقریباً تہی مایہ تھی، چند مذہبی اور تاریخی کتابیں اس کے علمی و ادبی لٹریچر کی کل کائنات تھیں۔ برخلاف اس کے اسلام نے تھوڑی مدت میں ادب و دانش کے سرمایہ میں اس قدر ترقی اور علم و فن کی شاخ میں وہ تنوع اختراعات اور جدتیں پیدا کر دیں کہ ایک ایران ہی کیا منحصر ہے تمام قوموں کو اس کے سامنے اپنا قدیم لٹریچر بے وقعت اور ہیچ نظر آنے لگا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ اقوام کے علوم و فنون کی درخشانی کو بالکل ماند کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مصر اندلس، افریقیہ وغیرہ کی اصلی زبانیں رفتہ رفتہ فنا ہو گئیں اور آخر کار عربی نے انکی جگہ لے لی بے شک عربی زبان نے ایرانی دل و دماغ پر بھی کچھ اس طرح تسلط حاصل کر لیا تھا کہ اگر دو ایک صدی تک اور یہی حالت رہتی تو دوسرے ممالک کی طرح ایران کی زبان کا حشر بھی نہایت درد ناک ہوتا لیکن یہ صورت حال کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔ تیسری صدی ہجری میں بغداد کی خلافت کو زوال شروع ہوا۔ بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے اور نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کا آفتاب اقبال بھی ڈھلنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ایرانی امراء و سلاطین اور ایرانی علما نے بھی اپنی زبان کی جانب توجہ کی لیکن دو صدیوں سے برابر عربی زبان کا سکہ رائج تھا اس لئے قدیم فارسی میں عربی الفاظ اس کثرت سے گھل مل گئے تھے کہ اصلی زبان بالکل متغیر ہو چکی تھی اور عربی و فارسی

---

(۱) فارسی زبان کا جو سرمایہ عربی زبان میں آیا اس میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ہندسہ کا پتہ نہیں ملتا۔ یہانتک کہ نہایت کدو کاوش سے کسی فارسی حکیم کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا حالانکہ یونانی حکما مثلاً ارسطو افلاطون، بقراط اور جالینوس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے انکی وجہ اسکے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کے زمانہ سے پہلے فارسی کا ذخیرہ اکثر برباد ہو چکا تھا (رسائل شبلی صفحہ ۲۱۸)

کی اس آمیزش سے ایک نئی زبان تیار ہوگئی تھی اور اگرچہ فارسی زبان سے عربی الفاظ کو نکال [illegible] کی بہت [illegible] کوششیں ہوئیں لیکن ظاہر ہے کہ اسمیں کامیابی کیونکر ممکن تھی ، فردوسی اس عہد میں سب سے پیش پیش ہے شاہنامہ میں عربی الفاظ لانے سے اُس نے بہت احتراز کیا ہے پھر بھی اسے اس میں پوری کامیابی نہ ہوسکی - اور اب بھی یہی مخلوط زبان جدید تغیرات کے ساتھ ایران میں مروج ہے -

فارسی شاعری کی ابتدا

ایران میں شاعری کی ابتدا کب سے ہوئی ؟ یہ مسئلہ بہت مختلف فیہ ہے بعض مورخین کا خیال ہے کہ زمانہ قبل اسلام میں شعر شاعری کا وجود ہی نہ تھا بعض کا خیال ہے کہ شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا ، بعض ایرانی تذکرہ نویسوں نے یہ بھی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ قدیم شعرا کی شاعری عربوں کے غلبہ [illegible] ضائع ہوگئی - اس لئے کہ عربوں نے محض مذہبی تعصب کی بنا پر ایران کے کتب خانوں کو جلا ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کا تمام سرمایہ علم و ادب ہمیشہ کے لئے خاک میں مل گیا اور قدیم فارسی شاعری بھی اسی آتش تعصب کی نذر ہوئی - لیکن اس خیال کی لغویت کو مولنا شبلی رسائل شبلی میں اچھی طرح ثابت کرچکے ہیں[1] شعرالعجم[2] میں بھی ایک جگہ فرماتے ہیں :-

> "اسلام سے قبل کی زبان [illegible] حضرت عمر کے زمانہ سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے حجاج کے زمانہ سے عربی میں ہوگئے - لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی [illegible] اور جب خود فارسی زبان

---

(۱) رسائل شبلی بعنوان " اسلامی کتب خانے " صفحہ ۳۶ - [illegible] ، و بعنوان " تراجم " صفحہ [illegible]

(۲) شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۱۲

سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا"
بہرحال یہ خیال بہت مضحکہ خیز ہے کہ فارسی لٹریچر کی بربادی کا سبب مسلمان ہیں یہ محض قومی اور وطنی عصبیت کا نتیجہ اور واہمہ کی خلاقی ہے، شاعری کے متعلق ایک خیال یہ بھی ہے کہ ایران میں شاعری مذہبًا ممنوع تھی، المعجم میں اس کے متعلق ایک روایت بھی پائی جاتی ہے مگر وہ نہ روایتًا قابل استناد ہے اور نہ درایتًا قابل تسلیم۔

اس مسئلہ پر مولانا عبدالرحمٰن صاحب مصنف مراۃ الشعر نے بھی اپنی تحقیقی رائے لکھی ہے جو اس قابل ہے کہ ناظرین کے سامنے پیش کی جائے آپ "قدیم فارسی اور شعر" پر تبصرے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

... کوئی کہتا ہے کہ فارسی میں شعر تھا لیکن وزن سے خالی تھا میں سمجھتا ہوں یہ عرب فاتحین کی رائیں ہیں اولاً انہیں مغالطہ ہوا سمجھے کہ فارسی شعر میں وزن نہیں ہے اور چونکہ خود اُن کے نزدیک وزن ضروری تھا اس لئے کہدیا کہ فارسی میں شعر ہی نہیں اور یہی دوسرا مسلک بن گیا۔ عربی فارسی کتابوں میں کہیں کہیں فارسی شعروں کا ذکر آیا ہے لیکن اس قدر مجمل ہے کہ اس سے صاف و صریح نتیجہ نکالنا آسان نہیں۔ لیکن میں اس اجمال و قرائن و قیاس سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فارسی میں شعر تھا مگر اس میں عربی کی طرح وزن حقیقی اور لازمی نہ تھا، بیشتر وزن غیر حقیقی تھا اور عرب تھے وزن حقیقی کے عادی جب سننے والوں نے سنا تو اپنے شعر کے مقابلہ میں ناموزوں پایا، [illegible] کہدیا یہی نقلاً قابل تسلیم معلوم ہوتا ہے اور یہی تقاضائے عقل بھی ہے ورنہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ جس قوم کے جشنہائے عیش و عشرت کی آجتک عالم میں دھوم ہے جس کی کوئی بزم کوئی محفل نغمہ و سرود سے خالی نہ ہوتی تھی جس کی عبادت و پرستش میں بھی زمزمہ و سرود کو دخل نہ تھا جس کی مٹی ہوئی زبان نے

بھی چاستہ ۔۔۔ اور ترانہ جیسے متعدد الفاظ انواع شعر کے لئے باقی چھوڑے جس کی ۔۔۔ مذاقی نازک خیالی ہمیشہ مسلم رہی جس کی ذہانت وطباعی کا ارسطو ۔۔۔ ف کیا جس کی طاقت وتہذیب ایران ور دم سے ٹکراتی اور ہندوستان کو دباتی رہی جس کے سیاسی وتجارتی تعلقات ان لوگوں سے رہے جن کے ہاں ۔۔۔ اور والمیک جیسے شاعر پیدا ہوئے اُس قوم میں ازابتدائے عزت تا انتہائے زوال شاعری نہ پیدا ہوا اور اسلامی فتوحات کے بعد عرب کے صدسالہ اختلاط سے اسی قوم میں شعرو شاعری اس طرح پھیلے کہ بن میں آگ لگ جائے ۔ اور ہر طرف شعلے ہی شعلے نظر آئیں یہ کیونکر سمجھ میں آجائے ۔

کوئی شک نہیں کہ مولانا کی فیصلہ کن تحریر بہت کچھ غور و توجہ کی مستحق ہے مصنف نے جس مجتہدانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر فرمایا ہے وہ لائق ستائش ہے لیکن پھر بھی اگر ایک جویائے حق کو تسکین نہ ہو تو غالباً مولنا بھی اُسے اس بات کا حق دیں گے کہ وہ تحقیق کا قدم اور آگے بڑھائے ۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے قدیم ایرانی تذکرہ نگاروں کی تقلید میں کسی نہ کسی نہج سے سارا الزام عربوں ہی پر رکھا ہے کہ وہ چونکہ وزن غیر حقیقی کے عادی تھے اس لئے انھوں نے فارسی کی بے وزن شاعری دیکھ کر سرے سے ایرانی شاعری ہی سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ دعوی نقلی ثبوت کا بھی محتاج تھا جو افسوس ہے کہ کہیں نظر نہ آیا ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کسی قسم کی غیر موزوں شاعری تھی جسے تسلیم کرنے سے اس طرح انکار کر دیا گیا۔ اور پھر اس انکار کا اس قدر ناگوار ۔۔۔ ہی طرح سے ناپید ہو گئی ۔ اور آج قدیم شاعری کا ایک شعر بھی محفوظ نہیں ۔ یہ امر ہم پہلے گوش گزار کر چکے ہیں کہ قدیم فارسی لٹریچر کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے موجود ۔۔۔ سامنے ایران کی کوئی قدیم ترین تصنیف ہے تو وہ اوستا ہے ۔ یہ زرتشت کی تصنیف یا وحی آسمانی ہے جو اس پر نازل ہوئی

متمنی اور ساعی رکھا ہے . . . . . . محمد صالح دربار شاہجہانی کا مصنف تھا
اُس نے اپنی ایک کتاب "عمل صالح" میں عربی اصطلاحات عروض کی جگہ
خالص پارسی اصطلاحات گھڑی تھیں جسکا نمونہ یہ ہے۔

قصیدہ کے لئے چگامہ ۔ غزل کے لئے چامہ
ردیف ۔ پساوند ۔ وزن شعر ۔
نثر ۔ پراگندہ ۔ نظم
تخلص ۔ داغ

ایرانیوں کی خوش مزاجی نازک خیالی اور ذہانت وطباعی سے کسے انکار [illegible] اس حقیقت کو بھی ہم آشکارا کر چکے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ایرانیوں نے عربی ادب اور علوم وفنون حتیٰ کہ مذہب کی بھی خود عربوں سے زیادہ خدمت کی لیکن اس سے نتیجہ نکالنا آسان نہیں کہ اسلام کے غلبہ سے پہلے ایران خود بھی علوم وفنون کا سرمایہ دار تھا۔ جناب مسلم عظیم آبادی ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں۔

"فارسی روایات کے مطابق سکندر نے جب ایران فتح کیا تو مجوسیوں کی دینی کتابیں تلف کر دیں، باقی کتب فلسفہ، نجوم، طب، زراعت وغیرہ وغیرہ [illegible] ہونکر اسکندریہ اور یونان اٹھوائے گیا اس طرح ایران کی جو کچھ متاع علم کی منتقل ہو گئی پانچ صدیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی نے قدرۃً عجم کا دماغ کند بنا کر اُسے وحشت وجہالت کی پستی میں گرا دیا۔ اور علوم وفنون تو الگ رہے، مذہب بھی بھلا بیٹھے۔ ساسانی عہد میں بعض اولوالعزم بادشاہوں [illegible] احیاء علوم کی کوشش کی مگر وہ نسبتاً ایسی حقیر ہے کہ مصر ویونان کے مقابلہ میں انکا نام نہیں لیا جا سکتا۔ [illegible] کے علاوہ خط کی دقت نے پارسی علوم کو پنپنے نہیں دیا۔ جس دن مالدار زبان عربی نے اپنے وسیع خزانے

سے انکو لغات دئے۔ اور لغات کے ساتھ آسان خط مہیا کر دیا۔ اُنکے دماغ
کی مہر ٹوٹ گئی۔ اور زبان چل پڑی، خود قرآن شریف ایک عظیم الشان لٹریچر
ہے عربی شاعری کے اعلیٰ نمونے اُنکے سامنے آئے ''

ایک مستند فارسی تذکرہ نویس لکھتا ہے۔

چوں آفتاب ملت حنیفی و دین محمدی سایہ بر دیار عجم انداخت لطیف طبعان فرس را با فضلائے عرب اتفاق محاورہ پدید آمد و از انوار فضائل ایشاں اقتباس کردند و بر اسالیب لغت عرب وقوف گرفتند۔ و اشعار مطبوع آبدار حفظ کردہ بغور آں فرو رفتند و بر حقائق [illegible] آں اطلاع یافتند و ہم بر آں منوال قسائج فضائے کہ نتائج طبع ایشاں بود یافتن گرفتند

(قلعہ دہلی کے)

میوزیم پر ایک عام نظر

پچاس سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں دہلی میونسپل بورڈ کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال کے کسی کمرہ میں ایک میوزیم قایم ہوا تھا جس کے بانی ایف ایچ کوپر ڈپٹی کمشنر دہلی تھے، مگر اس میوزیم کی بنیاد کسی خاص مقصد کے ماتحت نہیں رکھی گئی۔ نہ تو یہ کوشش تھی کہ دنیا کی تمام چیزیں جو آج عجیب سمجھی جاتی ہیں یا کل سمجھی جائیں گی، [illegible] یکجا ہیں اور نہ چیزوں کو جمع کرتے وقت یہ خیال پیش نظر تھا کہ اس میں وہی چیزیں لائی جائیں جو کسی خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوں۔ قدیم بدھ کے مجسموں کے ساتھ ساتھ جے پور کی صدریاں، فنون لطیفہ کی نادر اشیاء کے ساتھ ساتھ بچوں کے کھلونے اور اسی قسم کی [illegible] چیزیں تھیں جن سے یہ میوزیم معجون مرکب بن گیا تھا، چنانچہ ایک موقعہ پر محکمہ آثار قدیمہ کے ایک فاضل افسر نے جب اس میوزیم کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میوزیم ایک (Rowling) وحشت ناک جنگل ہے (Wilderness) موصوف کے یہ الفاظ بے شبہ ہمارے اس مفہوم کی [illegible] توضیح اور اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں، میوزیم کی یہ شکل کچھ تو ان اسباب سے [illegible] کی وجہ سے بھی کہ کوئی ماہر فن منتظم میوزیم کو ایسا میسر نہ آیا کہ وہ اس کی باقاعدہ تشکیل پیش کرسکتا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں محکمہ آثار قدیمہ کیطرف سے موجودہ وائسرائے لارڈ کرزن کی توجہ میوزیم کیطرف مبذول کرائی گئی، مگر اس درخواست کا بجز اس کے کوئی نتیجہ نہ ہوا کہ اس کا کام محکمہ کے سپرد کردیا گیا۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں سر جان مارشل نے (جو محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے) یہ تجویز پیش کی کہ نوبت خانہ یا نقار خانہ میں ایک تاریخی عجائب خانہ ہو جس میں دہلی قلعہ کی

تاریخ سے متعلق چیزیں رکھی جائیں، لارڈ کرزن نے اس تجویز کو پسند کیا لیکن اس مرتبہ بھی ۱۹۰۱ء تک کوئی عملی قدم نہ بڑھایا گیا بے توجہی اور بے پروائی کے اس عالم میں یہ پرانا عجائب خانہ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ کوئی نیا عجائب خانہ بھی نہ قایم ہو سکا ۱۹۰۸ء میں اس پرانے میوزیم کے ٹوٹ جانے کے بعد ارباب نظم و نسق کچھ ہوش میں آئے اور جنرل مارشل کی پرانی تجویز اس سال زیر عمل آنا شروع ہوئی۔ غیر متعلق چیزیں جو اس جدید میوزیم کے دائرہ مقاصد سے باہر تھیں وہ دوسری جگہوں پر جہاں وہ رکھی جا سکتی تھیں بھیجدی گئیں، بدھ مت کے مجسمے اور نیز اسی قسم کے دوسرے بت لکھنؤ اور لاہور کے عجائب خانہ میں جینیوں کے تین بت متھرا میں اور ان کے علاوہ اسی قسم کی دوسری چیزیں بھی ادھر ادھر منتقل کر دی گئیں اور از سر نو ۱۹۰۹ء میں تاریخی اشیاء کا ایک عجائب خانہ [illegible] (قلعہ میں) میں قایم کیا گیا، اور ابھی دو سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ قلعہ کی ایک دوسری عمارت ممتاز محل میں یہ عجائب خانہ منتقل کر دیا گیا، اس عجائب خانہ میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے زیادہ تر قلعہ دہلی سے متعلق تمام چیزیں فراہم پہنچائی گئی ہیں کچھ تو شاہان دہلی کے اسباب اور سامان ہیں جو کسی [illegible] تھا آئے کچھ ان کے اور انہیں کے متعلقین کے آلات اور ہتھیار، کچھ تاریخی پتھر جن پر کندہ کی ہوئی تحریریں ہیں، کچھ شاہی مہریں ہیں اور کچھ فرامین اور اسناد، تصویریں بھی ہیں زیادہ تر شاہان مغلیہ اور ان کے درباریوں کی، قلعے کے اندر اور باہر کی عمارتوں کے نقشے بھی ہیں جن میں سے اکثر شاہی عمارتیں یا ان سے متعلق دوسری عمارتیں ہیں، قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ہیں جو کسی کسی شاہی کتب خانہ سے متعلق تھیں اور بہترین خطاطوں کے خوشخطی اور خوشنویسی کے نمونے بھی جن میں سے اکثر کا تعلق قلعے سے ضرور تھا۔ یہ سب چیزیں نو حصوں میں تقسیم کی جاتی ہیں، فرنیچر[1] اور نیز دیگر سامان، ہتھیار[2] اور آلات، مہریں[3] اور کتابت، فرامین[4] اور اسناد[5]، ڈرائنگ[6] اور عکسی تصاویر، نقشہ[7]، قلمی تصویریں[8]، قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں، بہترین[9] خطاطوں کے خوشنویسی کے نمونے،

یوں تو تاریخی حیثیت سے ان میں کی ہر ہر چیز اپنی جگہ پر کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور رکھتی ہے، مگر باوجود اس کے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنی نوعیت میں زیادہ عجیب یا تاریخی حیثیت سے زیادہ اہم ہیں، شاہی اسباب اور سامان کا وہ تاریخی اور قیمتی قالین جو اپنی صنعت و بناوٹ میں بےمثل ہے اور جس کو کبھی دلی کے آخری تاجدار کے زیر دست ہونیکا شرف حاصل تھا آج تک اسی حال میں باقی ہے، اور اسی بادشاہ کا وہ زرق برق لباس بھی جس سے [illegible] انہ کے طرز لباس اور پوشش کا پتہ چلتا ہے، زینت محل کے بعض سونے اور موتیوں کے زیورات بھی موجود ہیں اس سکشن کی زیادہ عجیب و غریب چیز جو میوزیم کی زینت ہے وہ اورنگزیب [illegible] ہے جس کو وہ اپنے شاہی دورے پر استعمال کرتے تھے جہاں صاف پانی ملنے کا امکان ہوتا وہاں پانی اس فلٹر میں بھر دیا جاتا اور صاف ہوکر اس کے باریک سوراخوں سے گرتا، یہ فلٹر صرف پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے بنایا گیا ہے، جس پر یہ عبارت کندہ ہے

آب منظر سنگ صافی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی [illegible]

[illegible] آلات میں زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی علی مردان خاں کی تلوار ہے تلوار پر سنہری نستعلیق حروف اور فارسی زبان میں دو عبارتیں کندہ ہیں، ایک دستہ کے سطح پر اور دوسری پشت پر، پشت پر یہ عبارت کندہ ہے، ایں شمشیر خاص از حضور عباس خلد اللہ ملکہ و سلطانہ خانہ زاد علی مردان خاں سرفرازی یافت،

[illegible] عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تلوار فارس کے بادشاہ عباس صفوی کیطرف سے (جن کا عہد حکومت ۱۵۸۵ء سے ۱۶۲۹ء تک رہا ہے) علی مردان خاں کو ملی تھی، علی مردان خاں جنکا اصل نام علی مردان بیگ ہے گنج علیخاں کے بیٹے تھے۔ گنج علیخاں شاہ عباس صفوی [illegible] انہیں ارجن بابا کا خطاب بادشاہ کی طرف سے دیا گیا اور یہ پہلے کرمان کے سرقند حار کے حاکم بنائے گئے، باپ کی وفات پر علی مردان خان کو خان بابا ثانی کا خطاب مرحمت ہوا تھا، لیکن اس کے کچھ سال بعد شاہ عباس صفوی کی جگہ پر انکے پوتے گدی پر

متمکن ہوئے۔ علی مردان خاں نے انکی بیجا سختیوں سے ملول ہوکر شاہجہاں کو قندھار کا علاقہ سپرد کر دیا اور خود دہلی شاہجہاں کے ہاں پناہ گزیں ہوئے یہاں انکی بڑی آؤ بھگت ہوتی شاہجہاں کی طرف سے امیرالامرار کا خطاب ملا اور اس حالت میں جبکہ وہ پناہ گزیں یہ تلوار ہندوستان بھیجی گئی۔ کچھ دن علی مردان خاں کے پاس تھی کہ اس کے بعد یہ تلوار نواب اودھ سعادت علیخاں کے قبضہ میں آئی جنہوں نے اس پر ۱۲۱۲ھ میں یہ عبارت کندہ کرائی۔

اعلی الاعلی

وزیرالملک نواب سعادت علیخاں بہادر ۱۲۱۲ھ

شاہجہاں کی بھی ایک تلوار مع نیام اور پیٹی کے موجود ہے جو انکی جنت مکان ہو۔ اس کے دستے پر ۹۹ نام خدا کے سنہرے حرفوں میں کندہ ہیں ایک اور عبارت سنہرے حرفوں میں کندہ ہے جس سے شاہجہاں کی تلوار ہونے کی تصدیق ہوتی ہے

عبارت: لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

ہست این شمشیر خاص صاحبقران ثانی شاہ غازی بادشاہ بحر و بر شاہجہاں ل ۱۰۰ ۷ عمل ابو ۱۰۴ نصرت بخش

نصرت بخش کے متعلق عام خیال ہو کہ یہ اس تلوار کا نام ہے۔ ایک خنجر ہے جو شاہ طہماسپ شاہ ایران کا ہی یہاں رکھا ہوا ہے اس پر جو عبارت کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مظفر شاہ کاشانی کا بنایا ہوا ہے۔

عمل مظفر کاشانی

فیضی کا لکھا ہوا ایک کتبہ جس کا پتھر ایک قدیم مسجد سے لایا گیا ہے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مسجد جواب بالکل شکستہ حالت میں پڑی ہے دلی دروازہ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ مغل طرز کی بنی ہوئی ہے اور اس کے بانی صدر جہاں شیخ عبدالنبی تھے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ کی اولاد سے تھے اور اکبر کے دربار میں بڑا ممتاز درجہ

ہوئے تھے، یہ کتبہ اسی مسجد کا ہے جس کی لمبائی ۳ فٹ ۶ انچ اور چوڑائی دو فٹ ½ ۲ انچ ہے۔ عربی قطعہ فیضی کا کہا ہوا خط نسخ میں کندہ ہے جس سے فیضی کی عربی شعر گوئی کی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے اور مسجد کی تاریخی نوعیت کا بھی۔

فی زمان الخلیفہ اکبر [illegible] — اید اللہ [illegible]

قد بنی بقعۃ مقدسۃ — شلہا لایکون فی الانقطاع

شیخ الاسلام فخر المرسلین — شیخ ارض الحدیث بالاجماع

[illegible] — معدن العلم منبع الانتفاع

[illegible] ایں بنا فیضی — سال العقل قال خیر بقاع

[illegible] فرامین اور اسناد میوزیم کی اہم ترین چیزوں میں سے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے ان کا ہر ہر لفظ قابل مطالعہ ہے، اور خصوصیت کے ساتھ ان مورخین کے لئے جو ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں تصویروں میں علاوہ شاہان دہلی کی ان تصویروں کے جو مختلف وقتوں اور مختلف حیثیتوں سے بنائی گئی ہیں ایک ایرانی خاتون کی تصویر قابل دید ہے، تصویر حسین مصور کی بنائی ہوئی ہے، مصور نے سادگی اور بھولے پن کا نقشہ تصویر میں نمایاں کیا ہے جس سے یہ تصویر صد درجہ دلکش اور جاذب ہو گئی۔ ایک اور تصویر جس میں افیونیوں کی ایک [illegible] دکھائی گئی ہے صد درجہ مضحکہ ہے دیکھتے ہی بے ساختہ ہنسی آتی ہے، ان لوگوں کی صورت ڈراونی ہے، گردن پتلی پتلی، ہڈیاں اُبھری ہوئی، گال پچکے ہوئے حقہ ہر ایک کے سامنے رکھا ہوا ہے پینک میں اونگھ رہے ہیں اور منہ سے حقہ لگا ہوا ہے بعضوں کے سر اونگھتے اونگھتے زمین تک پہنچ چکے ہیں، اور اسی بیہوشی کی حالت میں بدن کا کچھ حصہ بھی کھل گیا ہے، غالب اور کبیر داس کی تصویریں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور نظام الدین اولیا اور دوسرے صوفیائے کرام کی تصویریں اچھی کھینچی گئی ہیں، اکبر ثانی کا ایک جلوس بھی جس سے اکبر کے شان و شوکت کا اظہار ہوتا [illegible]

بہت خوب دکھایا گیا ہے ایک اور تصویر بہادر شاہ ثانی آخری تاجدار دہلی کی ہے جب کہ بستر مرگ پر ہیں، یہ تصویر بہت موثر ہے۔

قلمی کتابوں میں جو سب کی سب شاہی کتب خانے سے متعلق تھیں خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ایک نسخہ جو باعتبار اپنی قدامت اور عمدہ کتابت کے ایک امتیازی شان رکھتا ہے کوفی اور نسخ خط کے درمیان لکھا گیا ہے شروع کے [illegible] میں ہیں حاشیہ رنگ برنگ کے بیل بوٹوں سے آراستہ کیا گیا ہے، شاہنامہ فردوسی کا ایک قدیم اور مصور نسخہ (دو جلدوں میں) جو شاہی کتب خانہ کی خاص کتاب تھی یہاں موجود ہے۔ ایک اور قلمی نسخہ بخشا[illegible] خاں کی بیاض ہے اس میں کچھ تو خود انہیں کے کہے ہوئے اشعار اور کچھ مستند شعرائے فا[illegible] کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کیا گیا ہے یہ کتاب ۱۱۰۷ھ کی لکھی ہوئی ہے [illegible] لکھنے والے مختلف مشہور خطاط ہیں، میوزیم کا ایک اور دلچسپ شعبہ وہ ہے جس میں مشہور اور ممتاز کاتبوں کی خطاطی کے نمونے ہیں ان خطاطوں کے ناموں کی فہرست جن کی تحریریں [illegible] میں محفوظ رکھی گئی ہیں طویل ہے، لیکن خاص طور پر عبدالرحیم فرمان نویس، میر علی تبریزی، عرب شیرازی، میر علی الکاتب، میر محمد باقر قابل ذکر ہیں۔ عبدالرحیم(۱) فرمان نویس کے ہاتھ کا ایک [illegible] نستعلیق خط میں لکھا ہوا میوزیم میں محفوظ ہے۔ فرمان پر ۱۰۲۴ھ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔ خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ میر(۲) علی تبریزی کا بھی ہے، عرب شیرازی کی لکھی ہوئی ایک دعائیہ

---

(۱) عبدالرحیم جہانگیر کے دربار کا خاص فرمان نویس تھا جو آقا عبدالرشید مشہور خطاط کے شاگرد تھے قطعہ اور فرمان میں دوسرے خطاطوں کی نسبت سے انکے خط میں متانت زیادہ ہوتی تھی ان کو عنبریں قلم کا خطاب ملا تھا

(۲) میر علی تبریزی امیر تیمور کے زمانہ کے مشہور خطاط تھے۔ خط نستعلیق کے متعلق کچھ اصول انہوں نے بنائے جس سے انکی کافی شہرت ہوئی اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خط نستعلیق کے موجد تھے۔

نظم[1] ہے جو خط نستعلیق کا عمدہ نمونہ ہے یہ عبداللہ قطب شاہ آخری حکمران گولکنڈہ کے لئے ۱۶۷۲ء۔ ۱۰۸۳ھ میں لکھی گئی ہے۔

میر علی[2] الکاتب کا بھی خوشنویسی کا ایک نمونہ موجود ہے اور میر محمد[3] باقر کا بھی۔

یہ ایک مجمل خاکہ ہے میوزیم کے اس مفصل نقشے کا جو ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم ہر حصے پر الگ الگ نظر ڈالیں گے اور ان تمام تاریخی جواہر پاروں کا ایک ایک کرکے جائزہ لیں گے جو اس خزانے میں محفوظ ہیں۔

---

(۱) نظم:

تا بود بر سپہر گردندہ — در جہاں بادشاہ عبداللہ
[illegible] مہر تابندہ — دشمن شاد باہ باغم و آہ

(۲) میر علی الکاتب ہرات کے سادات سے ہیں باپ کا نام محمود ہے، یہ میر علی سلطان کے شاگرد ہیں عربی فارسی کے اچھے عالم اور شعر گوئی میں بھی باکمال تھے انہوں نے اپنا تخلص مجنوں رکھا تھا، کچھ دن بخارا میں سکونت اختیار کرنیکے بعد ادہر آدہر مختلف مقامات میں گھومتے رہے، یہ ایک مشہور خطاط تھے انکے زمانے کی جو بہترین تحریریں اب ملتی ہیں عام طور پر انہیں کی طرف منسوب کیجاتی ہیں، چنانچہ غلام محمد ہفت قلمی اپنی کتاب تذکرہ خوشنویساں میں انکے خط کی تعریف میں لکھتے ہیں

. گلشن خط را رنگ و بوے تازہ و رونق بے اندازہ دادہ، مشام عالم را از ریاض دریائین معطر ساخت ودر اصول وصفا از ہمہ خوب تر نوشت،

انکی منظوم خطوط سبعہ جو کہ سلطان مظفر کے صاحبزادے کے لئے کیا تھا بہت مقبول ہوئی۔

(۳) میر محمد باقر عالمگیر کے خوشنویس ہیں، بادشاہ کو انکا خط بہت پسند تھا جیسا کہ اکثر رقعات میں اسکا تذکرہ کیا ہے، عالمگیر انکو استاد اور والا جاہ کے لقب سے سرفراز فرماتے تھے۔ غلام محمد نے انکے خط کی تعریف اپنے ان الفاظ میں کی ہے۔

خطش عزیز بسیار شیریں ودلچسپ ومضبوط بنظر در آمدہ

مذاہب اسلامی کی ابتدا

مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے عقاید کے مختلف تغیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی حلقوں میں اکثر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما چند خارجی اثرات کے ماتحت ہوا۔ ممکن ہے بعض لوگ اس رائے کو پسند کریں اس لئے کہ بدعات و فتن کے ظہور اور مختلف فرقوں کی ضلالت اور بے راہ روی کی توجیہ کے لئے یہ ایک عمدہ نظریہ ہے لیکن ہمارے نزدیک اس قسم کے عاجلانہ مفروضات علمی تحقیقات کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں۔ اس میں [illegible] ہیں کہ مذاہب اسلامی میں بے شمار خارجی عناصر موجود ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی ابتدا بھی خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔ اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تمدن اسلامی کا آغاز بھی خارجی اثرات سے ہوا۔ تمدن اسلامی میں ان اجزا کی کمی نہیں جو کسی نہ کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ ہیں باایں ہمہ کوئی شخص بھی اسلامی تہذیب و تمدن کی جدت و بداعت سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کسی تحریک میں خارجی عناصر موجود ہوں اور وہ خارجی تہذیبوں کے زیر اثر رہی ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا اصلی سرچشمہ خود اسی کی ذات میں پوشیدہ ہو۔ بعینہ یہی کیفیت مذاہب اسلامی کی ہے۔ واقعات پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ مذاہب اسلامی کی ابتدا ان داخلی اسباب کی بنا پر ہوئی جو دین اسلامی میں از خود رونما ہو گئے تھے۔ کچھ ان قدرتی سوالات کی وجہ سے جو انسانی طبائع میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں اور کچھ اس ربط و ضبط کے باعث جو جماعت اسلامی کے مختلف اور متضاد عناصر میں پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں یہ کیونکر ممکن تھا کہ جب تک خود ملت اسلامیہ کے داخلی شئون اور تعلیمات قرآنی کے اندر اصولی اور عقلی مباحث کا امکان نہ ہوتا محض خارجی اثرات کی بنا پر اسلامی دینیات کا آغاز ہو جاتا۔ خارجی اثرات نے بعض مذہبی تحریکات پر اپنا نقش چھوڑا ہے اور ایک حد تک ان کی تشکیل میں حصہ لیا ہے لیکن ان کا موجب نہیں ہو سکے

پھر جن اثرات کو ہم 'خارجی' قرار دیتے ہیں ان میں سبھی خارجی نہیں۔ اگر بعض مسلم اقوام نے اپنے فطری رجحانات کے مطابق چند دینی مسائل کی ابتدا کی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مسائل جماعت اسلامی کے غور وفکر کا نتیجہ نہیں تھے۔ اگر عرب ان افکار سے نا آشنا تھے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دینیات اسلامی کا نشو ونما عربوں ہی کے حصے میں نہیں آیا تھا نہ یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی توجہ صرف انہی مسائل پر رہتی جو عربی مذاق کے مطابق تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو دنیا علم وحکمت سے خالی نہیں تھی۔ ضرور تھا کہ دنیائے قدیم کا یہ علمی ترکہ مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں میں کوئی نہ کوئی حصہ لیتا۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ جماعت انسانی کے عقلی اور مذہبی مسائل نے اس زمانے میں کیا صورت اختیار کی۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ قدیم افکار کا کس قدر حصہ خود بخود اسلام میں منتقل ہو گیا لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس سے اسلامی دینیات کے آزادانہ نشو ونما میں کوئی فرق نہیں آتا۔ باعتبار زمانہ اسلام کا ظہور ایک خاص وقت پر ہوا اور اس وقت آب وگل کا جو بھی سرمایہ موجود تھا اس سے اسلام نے اپنی زبردست قوت تخلیق کی بدولت ایک نیا عالم تعمیر کیا۔ یہی وہ جانفزا تحریک تھی جس سے دنیائے قدیم کے مردہ جسد میں ایک نئی روح پیدا ہوئی اور جس نے آگے چل کر مسلمانوں کی عنان توجہ علم وعمل کی مختلف ضروریات کی طرف موڑ دی۔ مسلمانوں کی تمام سرگرمیوں میں اسی ایک جذبے کی کارفرمائی ہے۔ بغیر اس کے نہ مشرق کی مردہ اور تارک عمل اقوام میں زندگی کی کوئی حرکت پیدا ہو سکتی تھی نہ یونانی افکار اور ایرانی ادارات میں اس قدر قوت باقی رہ گئی تھی کہ کسی جدید اور زبردست روحانی تحریک کے بغیر ان کو از سر نو زندہ کیا جا سکتا۔ بہرکیف اسلام کی ذہنی تاریخ کے مطالعہ میں ان علمی اور عملی محرکات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو اسلام کی اندرونی قوت کا نتیجہ تھے اور جنہوں نے اسلامی افکار و آراء کے نشو ونما میں مختلف اسباب کی حیثیت اختیار کی ہے۔ اس اعتبار سے ہم مذاہب اسلامی کے متعلق چند ایسے حقائق کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان کی ابتدا و آغاز کا مسئلہ صاف ہو جائے گا۔

مدینہ منورہ میں ابتدا ہی سے دینیاتی بحثوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

شروع شروع کے یہ سب مسائل فقہی بحثوں سے متعلق تھے لیکن اس زمانے میں بھی ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کو معراج کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف الرائے پاتے ہیں[1]۔ ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے قضا و قدر کے متعلق سوالات کئے جاتے تھے اور ان کا آپ نے جواب بھی دیا[2]۔ عربوں کے علمی رجحانات کے باوجود ان میں اس قسم کے مباحث کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ لیکن اگر شروع شروع میں ان پر زیادہ زور نہیں دیا گیا تو محض اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی اثر کی بدولت ان کے دلوں پر مذہب کی حقیقت کچھ اس طرح جاگزیں ہو گئی تھی کہ [illegible] کے ذہن میں اس قسم [illegible] ہوتا تھا تو ایمان و اعتقاد کے متعلق کسی موشگافی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ پھر عرب اپنے قومی اور اجتماعی مسائل میں اس طرح منہمک [illegible] وقت نظری امور پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ باوجود اس کے یہ بالکل ممکن تھا کہ خود عرب ان تمام مباحث کی طرف توجہ کرتے جو کسی عقیدے کے تسلیم کر لینے سے از خود پیدا ہو جایا کرتے [illegible] اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی نہایت سادہ تھی لیکن وہ اپنے گرد و پیش کے [illegible] تھے۔ تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے[3]۔ قرآن مجید کے [illegible]

---

[1] شبلی: الکلام حصہ اول صفحہ ۱۴۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے معراج میں خدا کو دیکھا تھا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں ہرگز نہیں دیکھا تھا۔

[2] [illegible] الاحتجاج الطبرسی: امیر المومنین سے ایک روز قضا و قدر کے معنی پوچھے گئے [illegible] فرمایا قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کا اتباع اور گناہ سے اجتناب اور قدر کا مطلب ہے پاکیزہ [illegible] یہ کہو کہ انسان مجبور ہے ...... اور نہ یہ کہ قادر ہے، ملاحظہ ہو دسواں باب صفحہ ۱۰ تا ۱۴۔

[3] "تمام قدیم اقوام کی طرح عرب بھی تقدیر کے قائل تھے۔ ان کی قدیم شاعری......کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ظہور اسلام [illegible] قسمت [illegible] جھکا رکھا تھا۔ ان کے نزدیک انسان تقدیر کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا تھا۔ تعلیمات اسلامی سے ان کے ذہن میں ایک انقلاب پیدا ہوا...... اور انہیں اخلاقی ذمہ داریوں (دیکھو صفحہ آئندہ)

ہوتا ہے کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل عربوں میں یہ خیال پیدا کیا ۔ اور یہ وہ خیال ہے جس کی جاہل سے جاہل شخص سے لیکر بڑے سے بڑے عالم کو ہمیشہ ضرورت رہیگی ۔ کہ قضائے الٰہی کے اٹل اور غیر متغیر نظام کے ساتھ انسان کی ذاتی نجات اس کے اپنے عمل سے وابستہ ہے ۔ اس سے طبائع میں جہد و توکل کے دوگونہ خصائص پیدا ہوئے اور عربوں نے محسوس کیا کہ جس چیز کو وہ اپنی مجبوری کا ایک ناگوار سبب سمجھتے تھے وہی اُن کے لئے امید اور قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوا ۔ لیکن خیالات کا یہ انقلاب جس تیزی کے ساتھ رونما ہوا تھا اُس کے سبھی متحمل نہیں ہو سکے۔ احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض متجسس یا نفاق انگیز طبائع جبر و اختیار کے اس ظاہری تضاد سے کچھ بہت زیادہ مطمئن نہیں ہوئیں ۔ یہ لوگ حکم الٰہی کے متعلق طرح طرح کے شبہات ظاہر کرتے تھے ۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بڑی سختی کے ساتھ فہمائش کی کہ قضائے الٰہی سے انکار کرنا کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں لیکن ان حدیثوں میں بھی جن میں وجوب تقدیر کی شدت کے ساتھ حمایت کی گئی ہے انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر برابر زور دیا گیا ہے ۔ کسی نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا " یا رسول اللہ مشرکین کی اولاد کا انجام کیا ہوگا ؟" آپ نے فرمایا اس کا انحصار ان کے اعمال پر ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں اگرچہ یہ امر کو پسند نہیں کیا جاتا تھا کہ لوگ دین کے معاملے میں غیر ضروری غور و فکر سے کام لیں لیکن اس قسم کے سوالات کو بالکل روکا بھی نہیں جاتا تھا لہٰذا اگر شہرستانی نے دینی مباحث کی ابتدا ان اسباب سے کی ہو جو عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھتے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ۔ تاریخ مذاہب اسلامی کے ایک جلیل القدر مصنف نے لکھا ہے :-

(مباحث (اسلامیہ) میں تمام شبہات منافقین کے شبہات سے پیدا ہوئے جب انہوں

(۔۔۔) کا احساس ہوا ۔ Spirit of Islam صفحہ ۴۰۱، دسواں باب بالخصوص ملاحظہ ہو ۔

نے دین کے [illegible] اوامر و نواہی پر اظہار رضامندی نہیں کیا۔ غیر ضروری باتوں میں خیال آرائی کی اور ایسی چیزوں کے متعلق سوالات کئے ..... جن سے انہیں روکا گیا تھا۔ جیسا کہ حدیث ذوالخویصرۃ التمیمی سے ظاہر ہوتا ہے جس نے آنحضرت صلعم سے کہا تھا "اے محمدؐ! عدل کر تو عدل نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا اگر میں عدل نہیں کرتا تو پھر کون عدل کریگا۔ اس پر بھی اس لعین نے اپنے سوال پر اصرار کیا اور کہا کیا تو ایسی ہی تقسیم سے اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے۔ یہ صریح خروج ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جو کوئی سچے امام پر اعتراض کرتا ہے خارجی ہو جایا کرتا ہے۔ لیکن اس سے بڑا خارجی کون ہوگا جس نے سچے رسول پر اعتراض کیا۔ کیا یہ شخص صریح طور پر [illegible] [illegible] نہیں
آنحضرت نے فرمایا اس شخص سے ایک ایسی قوم پیدا ہوگی جو دین سے کوئی تعلق نہیں رکھیگی.....[1]

یہ کیفیت منافقین کی ہوگی [illegible] (هل لنا) الامر من [illegible] من شیء[2] پھر ان کا یہ کہنا کہ اگر ایسا ہوتا (لو کان لنا من الامر شیء[3]) تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے[4] اور ان کا یہ کہنا کہ اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا تو وہ ہم مرتے نہ قتل ہوتے[5]۔ کیا یہ صریحا قدر نہیں [illegible] طرح مشرکین کا ایک گروہ کہتا تھا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا اور کسی کی عبادت نہ کرتے[6]۔ پھر [illegible] کیا ہم [illegible] کھلائیں جسے اللہ کھلانا نہیں چاہتا[7]۔ کیا یہ [illegible] جبر نہیں ہے [illegible]

---

[1] بخاری [illegible] باب قتل الخوارج والملحدین۔
[2] کیا ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟ " قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت [illegible]
[3] قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت [illegible]
[4] ما قتلنا ههنا ۔ قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۴
[5] لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا ۔ قرآن مجید، سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۶
[6] لو شاء اللہ ما عبدنا من دونه من شیء ۔ قرآن مجید، سورۃ النحل، آیت ۳۵
[7] أنطعم من لو یشاء اللہ أطعمه ۔ قرآن مجید، سورۃ یٰسین، آیت ۴۷

کا ایک اور گروہ تھا جس نے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے تصرفات افعال میں بحث کی حتی کہ قرآن میں یہ کہہ کر ان کا رد کیا گیا کہ ویرسل الصواعق فیصیب بھا من یشاء وہم یجادلون فی اللہ و ھو شدید المحال[1] اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہوا جب ابھی آنحضرت صلعم صاحب قوت و شوکت اور صحیح و سالم تھے۔ لیکن منافق ...... اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مسلمانوں کو دھوکا دیتے تھے یوں کبھی کبھی ان کے باطنی نفاق کا اظہار رسول اکرم کے افعال و اعمال پر نکتہ چینی کی صورت میں ہو جایا کرتا تھا۔ انہی سے شبہات پیدا ہوئے۔[2]

ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں شبہات پیدا ہوتے تھے ضروری نہیں کہ منافق ہی ہو۔ بہرحال اس عبارت کے بعد علامہ موصوف نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان اجتہادی اختلافات کا تذکرہ کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رونما ہوئے یعنی (۱) واقعۂ قرطاس، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں دوات و کاغذ طلب کیا تو حضرت عمر نے کہا آپ پر تکلیف کا غلبہ ہے۔ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے (۲) جیش اسامہ کا معاملہ جو دوران مرض میں مرتب ہوا اور اس امر میں تذبذب تھا کہ رسول اللہ صلعم کو حالت مرض میں چھوڑ کر کوچ کرے یا نہیں۔ (۳) جب آنحضرت صلعم کا انتقال ہوا تو حضرت عمر نے کہا کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے ہیں (۴) اس امر میں بھی اختلاف تھا کہ آپ دفن کہاں کئے جائیں مکہ میں یا مدینہ میں یا بیت المقدس میں (۵) مہاجرین و انصار نصب امام کے معاملے میں متفق الرائے نہیں تھے (۶) حضرت فاطمہؓ وراثت کی دعویدار تھیں لیکن اس کے جواب میں یہ حدیث پیش کی گئی کہ ہم نبی ہیں ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا (۷) آغاز خلافت کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ جن لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہے ان کا قتل جائز ہے یا نہیں (۸) حضرت عمر کی جانشینی پر بھی اعتراض

---

[1] وہ بھیجتا ہے بجلیاں اور ان میں سے جسے چاہتا ہے پکڑ لیتا ہے اور وہ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور اللہ بڑا صاحب قوت ہے۔ قرآن مجید، سورۃ رعد، آیت ۱۳

[2] شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل لابن حزم، جزء اول، صفحہ ۱۰ - ۱۹

ہوا لیکن حضرت ابوبکر نے کہا میں نے جو کچھ کیا ہے امت کی بھلائی کے لئے کیا ہے (۹) حضرت عمر کے بعد پھر اختلاف رونما ہوا حتی کہ لوگوں نے حضرت عثمان پر اتفاق کیا لیکن ...... آپ نے حکم ابن امیہ ...... کو واپس بلا لیا ...... حضرت ابوذر غفاری کو ربذہ میں جلاوطن کر دیا ...... عبداللہ بن سعد کو پناہ دی ...... اپنی لڑکی کی شادی مروان میں حکم سے کی اور اسے افریقہ کے مال غنیمت کا ایک خمس دیدیا ...... عبداللہ بن عامر کو بصرہ میں عامل بنایا ...... (۱۰) امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں ...... طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہا) نے بیعت کے بعد خروج کیا [illegible] کا واقعہ پیش آیا ...... خوارج نے جنگ کی ...... بن سبا اور اس کی جماعت [illegible] وضلالت کی ابتدا ہوئی اور رسول اللہ کا یہ کہنا صحیح ہوا کہ علی محب غالی اور مبغض دونوں [illegible] ہیں گے۔ علامہ [illegible] کہتے ہیں اس کے بعد اختلافات کی دو قسمیں ہوگئیں۔ وہ اختلافات جن کا تعلق امامت سے تھا اور اصولی اختلافات۔

لیکن ان اجتہادی اختلافات میں بھی کبھی کبھی اصولی اختلافات کی جھلک نظر آتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر تشریف لے گئے ہیں جہاں سے آپ چالیس دن کے بعد واپس آجائیں گے۔ شیعوں کی ایک جماعت کے عقیدۂ رجعت سے کس قدر مشابہ ہے۔ البتہ ابوالفدا نے حضرت عمر کا نام نہیں لیا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک جماعت نے آنحضرت صلعم کی [illegible] انکار کیا۔ وہ لوگ کہتے تھے آنحضرت صلعم کیونکر فوت ہو سکتے ہیں۔ آپ ہم پر شاہد ہیں آپ فوت نہیں ہوئے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرح آسمان پر اٹھالئے گئے ہیں[۲]۔ بخاری میں یہ روایت مذکور نہیں لیکن یہ الفاظ موجود ہیں کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو میری بات سنو محمد صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوگئے تو حضرت عمر نے ایسا محسوس کیا گویا انہوں نے اس آیت کو پہلی مرتبہ سنا "وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم[۳]۔ یہاں تک کہ وہ غش کھا کر گر پڑے

---

[۱] شہرستانی، صفحہ [illegible] [۲] ابوالفدا: المختصر فی اخبار البشر جزو اول، صفحہ ۱۵۲

[۳] قرآن مجید، سورۃ آل عمران آیت ۱۴۳

پھر یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا "خدا تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کریگا"[۵۱] اس سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات پر ایک جماعت کے دل میں واقعی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ آپ فوت نہیں ہوئے[۵۲]۔ بہرکیف ان روایات سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ قدیم خیالات دلوں میں موجود تھے اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا دولت اور ملکیت دولت کے متعلق اختلاف کرنا ایک زبردست معاشی اور اصولی بحث کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں نے طرح طرح کے سوالات کئے ہیں اور اگرچہ آنحضرت صلعم نے کثرت سوال کو پسند نہیں فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روش بھی یہی رہی لیکن طبائع میں ہر قسم کے خیالات جمع ہو رہے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد تو ان کا دائرہ اور بھی وسیع ہو تا گیا۔ اعلام الموقعین میں ابن قیم لکھتے ہیں:

> آنحضرت صلعم نے "اغلوطات" ... منع فرمایا۔ ابوبکر ابن ابی شیبہ کہتے ہیں مجھ سے عیسیٰ ابن یونس نے اوزاعی سے اسناد کے ساتھ ایسی ہی روایت کی ہے۔ چنانچہ اوزاعی ... ہے کہ اغلوطات سے مراد "صعاب المسائل" ہیں۔ اور ولید بن مسلم نے اوزاعی سے، اوزاعی نے عبداللہ بن سعد بن عبادہ بن قیس الضابحی سے اور عبداللہ ...... نے معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کی ہے کہ وہ معاویہ کے پاس مسائل کا ذکر کر رہے تھے معاویہ نے کہا کیا تم جانتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکل مسائل سے منع فرمایا ہے ... ابو عمر کہتے ہیں ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوالات کو ناپسند فرمایا اور آپ نے ... اللہ تعالیٰ قیل وقال اور کثرت سوال کو پسند نہیں کرتا ...[۵۳]

---

[۵۱] بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ

[۵۲] حاشیۃ السندی:۔ "بخاری کا یہ کہنا کہ عمر بن الخطاب لوگوں سے باتیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عمر لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ آنحضرت فوت نہیں ہوئے اور روایت ہے کہ آنحضرت صلعم فوت نہیں ہوں گے جبتک کہ ... منافقین کو ہلاک نہیں کر دیگا" ملاحظہ ہو حاشیہ بخاری، مطبوعہ مصر، جز ثالث صفحہ ۵۶۔ [۵۳] (دیکھو صفحہ آئندہ)

ان عبارات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دینی مباحث کی داغ بیل مدینہ منورہ ہی میں پڑ چکی تھی۔ لہذا اگر ہم ان واقعات کی بنا پر یہ خیال قائم کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم ہی کے زمانے میں اختلافات کی بہت کافی گنجائش تھی تو غیر مناسب نہیں ہوگا۔ بہرکیف تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب سیاسی اور اجتماعی تفرقوں کی بنا پر مسلمان شیعی، خارجی، اور اموی جماعتوں میں منقسم ہو گئے تو یہ اختلافات بھی خاموشی کے ساتھ کام کرتے [illegible] کے ساتھ پوری شدت سے منظر عام پر آ گئے شیعی اور خارجی جماعتیں [illegible] پر مسئلہ امامت کا تھا لیکن خوارج قضیۂ تحکیم کے ساتھ ایک طرح سے عقائد و اعمال کی باہمی نسبت کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا تھا۔ کہ کتاب الٰہی کے سوا کسی اور کو اپنا حکم بنانا گویا کتاب کا انکار کرنا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جماعت کی یہ غلطی تھی کہ انہوں نے قرآن کو چھوڑ کر حضرت [illegible] اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حکم مانا۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے کافر ہو جاتا ہے[1]۔ پھر ان فرقوں کی تشکیل و تنظیم سے وہ اصولی اور فروعی مباحث نہایت تیزی کے ساتھ رونما ہوتے گئے جو آگے چل کر متعدد دینی مسائل کا مرکز بننے والے تھے۔ چنانچہ خوارج کے نعرہ ان الحکم الا للہ اور شیعوں کی امامت منصوص کے ساتھ بنو امیہ میں قدیم عربی خیالات کے ساتھ قسمت کا عقیدہ از سر نو جاگزیں ہو رہا [illegible] ملت اسلامیہ میں تفریق پہلے ہی رونما ہو چکی تھی۔ سیاسی اور اجتماعی انقلابات نے مذاہب اسلامی کے نشو و نما کو اور زیادہ آسان کر دیا۔ یہی خیال مولانا شبلیؒ نے علم الکلام میں ظاہر کیا ہے۔ اختلافات [illegible] اسباب بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے:

> [illegible] عقائد کے اگرچہ یہ سب اسباب فراہم تھے لیکن ابتدا پالیٹکس یعنی ملکی [illegible] [illegible] زمانے میں چونکہ سفاکی کا بازار گرم رہتا تھا۔ طبیعتوں میں شورش پیدا ہوئی

[illegible] ابن قیم الجوزی، اعلام الموقعین جلد اول، صفحہ [illegible]

[1] قرآن مجید، سورۃ مائدہ آیت ۴۴: ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ہم الکٰفرون

لیکن جب کبھی شکایت کا لفظ کسی کی زبان پر آتا تھا تو طرفداران حکومت یہ کہکر اُسے چپ کرا دیتے تھے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے ہم کو دم نہیں مارنا چاہئے۔ آمنا بالقدر خیرہ و شرہ۔ حجاج بن یوسف کے زمانہ میں جو ظلم و جور کا دیوتا تھا معبد جہنی ایک شخص تھا جس نے صحابہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور دلیر اور راست گو تھا۔ وہ امام حسن بصری کے حلقہ درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے امام صاحب سے عرض کی کہ بنو امیہ کی طرف سے قضا و قدر کا جو عقیدہ پیش کیا جاتا ہے کہاں تک صحیح ہے۔ امام صاحب نے کہا "یہ خدا کے دشمن جھوٹے ہیں"۔ وہ پہلے [illegible] امیہ کی زیادتیوں پر طیش میں بھرا ہوا تھا۔ اب علانیہ بغاوت کی اور جان [illegible]

[illegible] بعد غیلان دمشقی نے اس خیال کو ترقی دی۔ وہ حضرت عثمان کا غلام تھا اور [illegible] بن حنفیہ سے بیک واسطہ تعلیم پائی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو [illegible] آزادانہ خط لکھا اور بنو امیہ کے مظالم پر توجہ دلائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے [illegible] توشہ خانہ کے نیلام کی خدمت سپرد کی وہ بر سر عام نیلام کرتا تھا اور پکار پکار کر [illegible] وہ مال و اسباب ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کیا گیا تھا" اس وقت اسلام کی قدیم سادگی بہت کچھ باقی تھی تاہم توشہ خانہ میں تیس ہزار جرابیں نکلیں۔ غیلان نے کہا "صاحبو اس ظلم کی کچھ حد ہے کہ عوام فاقے کرتے تھے اور ہمارے فرمانروا تیس تیس ہزار جرابیں توشہ خانہ [illegible] رکھتے تھے ...... ہشام بن عبدالملک ...... غیلان کی کارروائیاں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ تخت نشینی کے ساتھ اس کو طلب کیا اور بغاوت انگیزی کے جرم میں اس کے [illegible] ...... آخر اسی جرم میں جان سے مارا گیا۔

اسی زمانہ میں جہم بن صفوان پیدا ہوا۔ وہ بھی امر بالمعروف کے اسی جرم پر قتل ہوا۔ لیکن یہ خون خالی نہیں گئے اور امر بالمعروف کا مسئلہ زیادہ پھیلا اور اس قدر زور پکڑا کہ ایک گروہ کثیر ...... بالآخر معتزلہ کے لقب سے پکارا گیا ...... [illegible] جب ولید تخت نشین ہوا تو اس فرقے کا ستارہ شہزادوں سے [illegible] زور پکڑ چکا تھا یہاں تک کہ خود خاندان بنی امیہ میں یزید بن الولید

یہ مذہب [illegible] گیا ...... اس کے طرفداروں میں ایک عمرو بن عبید تھا جو مذہب اعتزال کا بہت بڑا امام گزرا ہے۔

[illegible] دمشق نے اگرچہ جبر و قدر کے مسئلہ پر توجہ دلائی لیکن جب ایک دفعہ کسی وجہ [illegible] خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تو بڑھتی گئی یہاں تک کہ [illegible] تھا کہ خلق قرآن تنزیہ و تشبیہ صفات باری وغیرہ کی بحثیں چھڑ گئیں [illegible] نے ہی دو نہیں بیسوں فرقے [illegible]

واقعات کے مطالعہ سے بھی اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے جس طرح [illegible] کے خلاف خوارج میں امام کی ذات کے متعلق انسانی جمہوریت کا خیال پیدا ہوا۔ اسی طرح جب [illegible] نے اپنی ہر زیادتی کے لئے قضا و قدر کا عذر پیش کرنا شروع کیا تو اہل [illegible] انسان کی اخلاقی ذمہ داری پر زور دیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ مختلف عقائد ان مختلف جماعتوں کیلئے [illegible] کے ساتھ ہی ارض شام میں مرجیہ کا ظہور ہوا جو کہ [illegible] تھی کہ گناہ سے کفر لازم نہیں آتا۔ یہ دوسرا حربہ تھا جو شیعی اور خارجی جماعتوں کے خلاف اہل شام کو [illegible] کے نزدیک یہ فرقہ اس زمانے کے سیاسی حالات کا ایک قدرتی نتیجہ تھا

۱؎ شبلی، علم الکلام، حصہ اول، صفحہ ۱۶-۱۷

۲؎ شہرستانی: الملل والنحل، حاشیہ کتاب الفصل، صفحہ ۱۸۶۔ رجا کے دو معنی ہیں تاخیر اور رجا امید [illegible] فرقے کا اطلاق اول الذکر پر [illegible] کہ انہوں نے عمل کو نیت پر مؤخر رکھا۔ البتہ دوسرے معنوں میں یہ مطلب ہوگا کہ مرجیہ [illegible] معصیت کوئی ضرر نہیں پہنچاتی جیسے کفر کے ساتھ اطاعت بیکار ہے۔

[illegible] دمشق میں جس سے کسی شیعہ یا خارجی کو اتفاق نہیں ہو سکتا تھا خیالات کا جو عالم تھا ان کیلئے ان کے عقائد کس قدر ضروری تھے ...... ان کو [illegible] نہیں کہا جا سکتا ...... دولت [illegible] کے ساتھ [illegible] ہو گیا اس لئے کہ اب ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ۳؎ براؤن، تاریخ ادبیات ایران، جلد اول، صفحہ [illegible]

محدثین نے بھی اس فرقے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا[۱]۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ واقعات تھے جو مسلمانوں کے ذہنی اضطراب سے ملکر طرح طرح کے دینیاتی مباحث کا موجب ہوئے۔ مرجیہ اور قدریہ یا معتزلہ کی بنا نہ مسیحی اثرات کا نتیجہ تھی جیسا کہ فان کریمر نے ظاہر کیا ہے[۲] نہ یہ محض عجمی اقوام کی اسلام دشمنی تھی جسے غلطی سے ابن حزم نے تمام اصولی اختلافات کا باعث قرار دیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:

دین اسلامی میں اکثر فرقے اس لئے پیدا ہوئے کہ وسعت سلطنت اور دوسری اقوام پر غلبہ اور برتری کے اعتبار سے ایرانی تمام اقوام سے افضل تھے۔ وہ اپنے آپ کو احرار اور ابناء کہتے تھے اور دوسروں کو غلام۔ لیکن جب ان کی سلطنت عربوں نے چھین لی جو اہل ایران کے نزدیک [illegible] تو یہ ان کے لئے ایک عظیم الشان مصیبت تھی۔ لہذا انہوں نے [illegible] اسلام میں رخنہ اندازی شروع کی لیکن اللہ تعالیٰ نے حق کا بول بالا کیا۔[۳]

اب یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہر ایرانی محض اس ارادے سے اسلام قبول کرتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں کوئی فتنہ برپا کر سکے۔ یہ کہنا کہ کسی ایرانی نے خلوص نیت سے اسلام قبول نہیں کیا ایک ایسا دعویٰ ہے جسے کوئی شخص تسلیم نہیں کریگا۔ علاوہ ازیں اسلام نے جس عظیم الشان مذہبی تحریک کی بنا رکھی تھی اس کا یہ تقاضا تھا کہ متمدن دنیا اپنے معتقدات پر ایک مرتبہ پھر نظر ثانی کرتی۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کا ہر طبقہ اپنی مخصوص دشواریوں کو حل کر رہا تھا اور اس کے ساتھ عقائد اسلامی میں نئے نئے خیالات سرایت کر رہے تھے۔ یہ اسلام ہی کی ہمہ گیر روح تھی جس نے مسلمانوں کی ہر علمی اور عملی تحریک کے لئے نقطۂ آغاز کا کام دیا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح امت اسلامیہ کے داخلی شئوں سے دینی [illegible] آغاز ہوا۔ مسلمان علما نے نہ عیسائیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ وہ کسی ایرانی

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان۔ کنز العمال جزو اول، باب فی ذم القدریہ والمرجیہ۔ شبلی، علم الکلام، جزو اول صفحہ ۲۶۔

[۲] تمدن اسلامی پر ایک نظر [illegible] geschichtliche Streifzüge

[۳] ابن حزم: کتاب الفصل فی الملل والاہوا والنحل، جزو ثانی صفحہ ۱۱۵۔

سازش کے زیر اثر تھے ۔ دراصل وہ تمام خیالات جو مذاہب اسلامی کی تہ میں کام کرتے رہے اس وقت کے اخلاقی اور ذہنی ماحول میں موجود تھے ۔ جب ان کا تصادم تعلیمات قرآنی سے ہوا تو نئے نئے مباحث کا آغاز ہوا ۔ ہمیں اس امر سے انکار نہیں کہ ان خیالات کا بہت سا حصہ مذاہب اسلامی میں ملگیا اور ان سے مسلمانوں کے اکثر فرقے متاثر بھی ہوئے لیکن دینیات اسلامی کا نشو و نما ایک آزادانہ تحریک تھی جو از خود مسلمانوں کے اندر رونما ہوئی ۔ جس طرح مدینہ منورہ میں فقہی مذاہب کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے ایک غیر معمولی ذہانت کے ساتھ قرآن و حدیث، فقہ، تفسیر، [illegible] علوم کی طرف توجہ کی ـــ یاد رہے کہ ان کا یہ علم کسی بیرونی سرچشمے سے ماخوذ نہیں تھا ـــ اسی طرح دینی مسائل کی ابتدا ہوئی ۔ اسلام کے اولین فقہا اور محدثین کے ساتھ [illegible] ہیں جنہوں نے مذہب کے معاملے میں غور و فکر سے کام لیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے امام جعفر الصادق (رضی اللہ عنہ) کی بدولت مسلمانوں میں ایک نہایت ہی خوشگوار ذہنی تحریک کا آغاز ہو رہا تھا[1] ۔ امام [illegible] ولی صوفی اور عالم دینیات خیال کیا جاتا ہے ۔ بنو امیہ کے عقیدۂ تقدیر کے متعلق انکی جو رائے تھی وہ معبد جہنی کے واقعہ سے ظاہر ہوسکتی ہے[2] ۔ مسلمانوں کی یہی ذہنی سرگرمیاں تھیں جو ان کے سیاسی اور اجتماعی تفرقات اور مختلف مسلم اقوام کے افکار و آراء سے ملکر مذاہب اسلامی کا سنگ بنیاد ثابت [illegible] اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تمام وہ ارتجاعی اور ملحدانہ تحریکیں جو اسلام [illegible] قدیمی عقائد کا نتیجہ ہوں یا ثنویت اور یونانیت کا، وہ سب کی سب مذاہب اسلامی کی ابتدا سے مؤخر تھیں ۔

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ان خیالات کی طرف توجہ کریں جن سے بظاہر اس امر کی تصدیق ہوجاتی ہے "کہ مذاہب اسلامی کا نشو و نما مسیحی اور ایرانی اثرات کے ماتحت شروع ہوا ۔

---

۱ ملاحظہ ہو "اسپرٹ آف اسلام" اور ابن خلکان، وفیات الاعیان ۔

۲ ملاحظہ ہو ابن خلکان [illegible]

انگلستان کا ایک فاضل مستشرق لکھتا ہے :۔

اسلامی دینیات کا نشو و نما ..... آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد شروع ہوا جب تک آپ زندہ تھے ... ظاہر ہے کہ کوئی نظام دینیات قائم نہیں ہو سکتا تھا ... بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی بدعات کی ابتدا مبہم سی ہے ..... قدیم اہل الاہوا کے متعلق ہمیں نامکمل سے قصص ملتے ہیں ..... بایں ہمہ تاریخ کے اس دھندلکے میں دو فرقوں کا پتہ چلتا ہے جن پر اس زمانے کے تاریخی واقعات اور فلسفیانہ ضروریات کا بہت کافی اثر تھا۔ ان میں سے ایک مرجیہ ہے دوسرا قدریہ ..... خوارج اور شیعہ بنو امیہ کو کافر سمجھتے تھے۔ لیکن مرجیہ کہتے تھے کہ بنو امیہ مسلمانوں کے فی الواقعہ (ملحصر ۃ ؟) حاکم ہیں اور ..... قائل ہو ..... لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں ... . معلوم ہوتا ہے اس طرح مرجیہ کی ابتدا ہوئی ۔ گویا سیاسی اعتبار سے وہ خوارج کے تشدد فی الدین کے مخالف تھے۔ قدریہ کا ظہور ذہن انسانی کے ایک عقلی اقتضا کا نتیجہ تھا ۔ افراد و اقوام کو خدا کے حکم مطلق اور انسانی عمل کی آزادی میں جو تضاد نظر آتا ہے اسی سے انکی منکرانہ زندگی کا آغاز ہوا ہے ۔ یہی کیفیت اسلام کی تھی ..... جب تک مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے رہے ان کے خیالات پر خدا کے حکم مطلق کا عقیدہ حاوی رہا ..... اسی فرقے کے بانیوں میں سے ایک معبد الجہنی تھا جو ۸۰ھ میں الحاد کے جرم میں مقتول ہوا اس کے بعد مصنف نے معبد الجہنی اور امام حسن بصری کی اس گفتگو کا ذکر کیا ہے جس کی طرف اس سے پہلے اشارہ ہو چکا ہے) ..... تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فرقہ بندی کا رجحان پیدا ہوا .. ... مرجیہ اور قدریہ کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن ان کا کچھ حصہ کٹر اسلام میں مل گیا اور کچھ ایک جدید فرقے میں ..... اس فرقے کا آغاز بھی حسن بصری کی طرف منسوب ہے جن کی ذات معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں تمام

کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جب خانہ جنگی کا آغاز ہوا تو انکو اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس ہوا ...

جو سرگرمیوں کا مرکز تھی کسی نے آپ سے پوچھا . . . مرجیہ اور وعیدیہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مرجیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو جب بھی وہ مسلمان ہی رہتا ہے لیکن وعیدیہ کہتے ہیں کہ وہ کافر ہو جاتا ہے...... پیشتر اس کے کہ امام موصوف جواب دیں عمرو بن عبید یا واصل ابن عطا دونوں میں سے کسی نے کہا کہ اس کی حیثیت دونوں کے بین بین ہو گی۔ ایسا شخص نہ مسلمان ہو گا نہ کافر...... اس کے بعد وہ امام صاحب کے [illegible] سے نکل کر مسجد کے ایک دوسرے حصے میں چلا گیا تاکہ وہاں اپنے خیالات کو باقاعدہ بیان کر سکے ...... اس پر امام صاحب [illegible] معتزل عنا اور اسی سے اس نئے فرقے کا نام معتزلہ ہوا...... اس سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں ایک ایسی جماعت موجود [illegible]

مذکور بالا سے ہمارے پچھلے بیانات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن اس قدر لکھنے کے بعد مسٹر میکڈانلڈ مستشرقین کے اس مفروضہ نظریے سے [illegible] کر کے اسلام کے نشو و نما کو بھی انکا [illegible] ٹھہراتے ہیں لیکن جس کی تائید میں وہ کسی تاریخی شہادت کو معقولیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے اس امر کی تقویت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ مرجیہ اور قدریہ [illegible] کے اثرات کے ماتحت [illegible] مسٹر میکڈانلڈ کہتے ہیں [illegible]

[illegible] ہم دینیات یونانی کے ساتھ بازنطینی اور شامی مذاہب کی آویزش کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ شیعہ اور خوارج کی سیاسی بدعات کا ظہور [illegible] عراق اور ایران میں ہوا لیکن خالص مذہبی بدعات کی ابتدا [illegible] سے پہلے شام میں بالخصوص دمشق میں ہوئی جو اموی خلفا کا مستقر تھا...... دولت امویہ نے بہت سی باتو[illegible]

D. B. Macdonald Muslim [illegible]ology

فصل سوم باب اول صفحہ ۳۰

میں عرب قبل اسلام کے خیالات کو اختیار کر لیا تھا۔۔۔۔ ان کے زمانہ میں سرجیس ۔۔۔ ایک اموی خلیفہ کا خزانچی تھا۔ سرجیس کے بعد یہ عہدہ اس کے بیٹے یوحنا کو ملا ۔۔۔۔ جو یونانی کلیسا کا آخری امام ہے۔ اسی کے ہاتھوں یونانی دینیات کی تکمیل ہوئی ۔۔۔۔ اس کی اور اس کے شاگرد تھیوڈر ابوکرا کی تحریروں میں اسلام پر مناظرانہ رسالے موجود ہیں جلکو اس انداز میں لکھا گیا ہے گویا عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان بحث ہو رہی ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس سے اس زمانے کے خصائص کا اظہار ہوتا ہے۔ مرجیہ اور قدریہ اور یونانی کلیسا اور یوحنائے دمشقی کے خیالات میں جو مشابہت پائی جاتی ہے اس کی تشریح کی یہی ایک صورت ہے۔[1]

اب لقیہ اس امر پر غور کیجئے کہ ازمنۂ قدیم کی وہ مسخ شدہ عیسائیت جس میں ہر طرح کے مشرکانہ تخیلات کام کر رہے تھے اور جس کے پیروؤں کی ساری زندگی دن بدن وثنیاتی صورت اختیار کر رہی تھی ذات الٰہی اور خود مذہب کے متعلق ان اعلیٰ اور ارفع تخیلات کا کیونکر موجب ہو سکتی تھی جو اسلام کے ساتھ ظہور میں آئے۔ مسٹر میکڈانلڈ نے حمایت مذہب کے جوش میں یوحنائے دمشقی کی تحریروں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کے قدیم مذاہب اور بالخصوص عیسائیت کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ تھی سب کو معلوم ہے۔ عیسائیت کے اس خوفناک انحطاط اور اس کی انتہائی پستی کو دیکھتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے کسی طرح اسلام یا فرقہ ہائے اسلامی متاثر ہو سکتے تھے۔ بایں ہمہ مسٹر میکڈانلڈ کا خیال ہے کہ :-

بحیثیت مجموعی اگرچہ یہ مسئلہ مزید تحقیقات کا محتاج ہے لیکن یونانی دینیات نے اسلام پر جو اثر ڈالا ہے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ صرف یہ امر کہ دونوں نے ذات و

---

[1] D. B. Macdonald, Muslim Theology

فصل سوم، باب اوّل، صفحہ ۱۳۲ - ۱۳۱

[illegible] الٰہی کے مسئلہ پر جب عدم زور دیا ہے اس بات کا بہت کافی ثبوت ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ [illegible] مغرب بالخصوص علمائے اسپین کے خیالات میں جو تشدد پایا جاتا ہے وہ فلسفیانہ اور [illegible] اثرات کا نتیجہ ہے۔[1]

[illegible] کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر میکڈانلڈ نے واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دو چیزوں کی ظاہری اور سطحی مشابہت سے بلا وجہ ایک کو اس کی علت اور دوسری کو اس کا نتیجہ [illegible] دو چیزوں میں مشابہت کا موجود ہونا اس امر کا ثبوت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسری [illegible] ماخوذ ہے۔ تاریخی حقائق علت و معلول کے اس مفروضہ رشتہ کے اور بھی مخالف [illegible] گزشتہ صفحات میں ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ جبر و قدر اور دوسری بحثوں کا آغاز کیونکر ہوا۔ باعتبار زمانہ یہ سب بحثیں عہد اموی سے مقدم تھیں۔ فان کریمر نے لکھا ہے کہ عقیدۂ "قدر" کی بنا ان دو عیسائی علماء نے ڈالی جو دمشق میں رہتے تھے اور [illegible] یوں سے میل جول رکھتے تھے یعنی یوحنائے دمشقی اور تھیوڈور ابو کارا۔[2] اس امر [illegible] مسلمانوں میں یہ خیالات مشرقی کلیسا میں بہت پہلے رونما ہو چکے تھے اور معبد جہنی یوحنائے دمشقی کا معاصر تھا لیکن دمشق کی کسی مسیحی جماعت سے ربط و ضبط رکھنے کی بجائے امام حسن بصری کے حلقہ درس میں شریک ہوتا تھا ہم فان کریمر اور مسٹر میکڈانلڈ کے مناہج تحقیق کے ماتحت یہ فرض کر لینے میں کہیں زیادہ حق بجانب ہیں کہ مشرقی کلیسا کے یہ خیالات اسلامی اثرات کا نتیجہ تھے۔ بہرکیف اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ خوارج اور شیعہ جماعتوں کے ظہور میں کسی مسیحی یا غیر اسلامی اثر کا [illegible] بلکہ یہ آویزش خلافت کے [illegible] کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ لہٰذا اگر شیعی اور خارجی فرقوں کے مقابلہ میں مرجیہ اور قدریہ [illegible]

---

[1] D. B. Macdonald, Muslim Theology فصل سوم باب اول صفحہ ۲۲۔

[2] فان کریمر: تمدن اسلامی پر ایک نظر۔

ظہور ارضِ شام میں ہوا تو اس لئے نہیں کہ یوحنائے دمشقی یا تھیوڈور ابوکارا کا قیام دمشق میں رہتا تھا بلکہ اس لئے کہ ارضِ شام کا یہ قدیم شہر خلفائے امویہ کا مرکز تھا اور ان کے جور و استبداد اور 'جبری' رجحانات کے خلاف اگر احتجاج ہو سکتا تھا تو یہیں اور یہیں یہ لوگ خوارج کے اُن سخت اور متشددانہ خیالات کے خلاف جو احساسِ معصیت سے پیدا ہوئے اپنے انجام کو امید و اطمینان کی نظر سے دیکھتے ہوئے 'رجا' پر زور دے سکتے تھے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ یہ خیالات صرف دمشق تک محدود تھے غلطی ہوگی۔ مدینہ منورہ کے بعد اگرچہ دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز دمشق ہوا لیکن ملت اسلامیہ کی ذہنی اور علمی مرکزیت کوفہ اور بالخصوص بصرہ کے حصے میں آئی تھی۔ یہیں مسلمانوں کی متفرق جماعتیں ــــ بالخصوص عرب اور ایرانی ــــ اپنی گزشتہ روایات اور باہمی ربط و ضبط کی بدولت مختلف مسائل کی طرف متوجہ ہوئیں اور یہیں سے عقیدہ 'قدر' کی رو معبد جہنی کے ساتھ شام میں پہنچی۔ رفتہ رفتہ مذہب اعتزال نے ایک باقاعدہ فرقہ کی صورت اختیار کی اور آگے چل کر جب مسلمان علما کے ایک طبقے نے فلسفہ و حکمت کے مطالعہ کے بعد اپنے آپ کو 'حکما' کے نام سے موسوم کیا تو عقیدہ اور عقل کے باہمی تضاد کو دور کرنے کے لئے علم کلام کی بنیاد پڑی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مذاہب غیر سے ربط و ضبط کی وجہ سے مسلمانوں نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہوں ان کا جواب دینے کی کوشش کی جائے۔ یہ مختصر کیفیت ہے مذاہب اسلامی کی ابتدا اور ان کے نشو و نما کی۔ معلوم ہے خود مسٹر میکڈانلڈ بھی نادانستہ طور پر ان حقائق کو محسوس کر رہے تھے اس لئے کہ اپنے گزشتہ خیالات کے اظہار کے بعد انہیں فوراً اس امر کو تسلیم کرنا پڑا کہ :-

مسلمان عیسائی علما کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے۔ دراصل یہ خیالات باہمی ربط و ضبط اور بحث و مباحثہ میں منتقل ہو رہے تھے۔ یوحنائے دمشقی کے رسالے کی ترتیب ہی سے اس امر کا پتہ چلتا ہے جس کی عبارت یوں ہے کہ اگر عرب تم سے یہ کہے تو اس کے جواب میں یہ کہنا ....[1]

پھر آگے چلکر لکھتے ہیں :-

یونانی فلسفہ، زرتشتیت، مانویت، حران کی قدیم وثنیت، یہودیت، عیسائیت یہ سب چیزیں فضا میں موجود تھیں اور اپنا اثر ڈال رہی تھیں [1]

بالفاظ دیگر یہ سب خیالات اس وقت کے ذہنی اور مذہبی ماحول میں موجود تھے اور علمائے [illegible] میں پہلے ہی سے اس امر کی بحث کافی گنجائش تھی کہ اگر کوئی جدید مذہبی تحریک پیدا ہو تو وہ سرِ دست ان خیالات کی طرف توجہ کریں۔ لیکن ان خیالات کے اُبھرنے کے لئے جو افراد و اقوام کے حافظہ میں ایک غیر شعوری صورت اختیار کر چکے تھے کسی شدید محرک کی ضرورت تھی۔ لہذا جون [illegible]

---

[1] D. B. Macdonald, [illegible] gy (نشان مذکورہ)
فصل سوم، باب اول، صفحہ [illegible]

خوش قسمتی سے میرے پیش نظر کتب خانہ جامعہ کا وہ نسخہ ہے جو زندان جبل پور میں مولانا محمد علی مدظلہ کے زیر مطالعہ رہ چکا ہے۔ مولانائے محترم نے مسٹر میکڈانلڈ کے اس جملے پر یہ نہایت ہی صحیح خیال ظاہر کیا ہے کہ "یہ خیالات پہلے ہی سے فضا میں موجود تھے ..... یوحنائے دمشقی کو غالباً مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کی مخالفت منظور تھی جس کے جواب میں مسلمانوں نے ایک اور نظام "سولاسٹیت" مرتب کیا۔ مولانا کی اصل عبارت یہ ہے :-

The ideas were in the air the commonplaces of the times. What John of Damascus did [illegible] to prepare a defence of the proselytising activities of the Mussalmans and Mussalmans in reply built up another system of scholastics.

D. B. Macdonald, Muslim Theology

فصل سوم، باب اول، صفحہ [illegible]

مسلمانوں کی داخلی زندگی میں نئے نئے انقلابات رونما ہوئے اسی لحاظ سے یہ تمام افکار منظر عام پر جلوہ گر ہوتے گئے۔ اس طرح اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مذاہب اسلامی کا ظہور اور اُن کی تشکیل و انضباط کسی مسیحی یا ایرانی اثر کا نتیجہ نہیں تھا۔ نہ اس کے اسباب و علل کے لئے ہمیں کسی غیر اسلامی سرچشمے کی تلاش کرنی چاہیئے۔ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب کی بنا ایک آزادانہ تحریک تھی جو از خود رونما ہوئی کچھ اس غور و فکر کی گفتگو سے جس کا آغاز مدینہ منورہ ہی میں ہو گیا تھا اور کچھ عرب اور نو مسلم اقوام کے باہمی اختلاط و ارتباط کی وجہ سے جس سے مسلمانوں کے [illegible] ایک جدید ذہنی تحریک کا آغاز ہوا۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی دینیات اور اس کے مختلف مذاہب خارجی افکار سے متاثر ہوئے ہیں بلکہ ایک [illegible] ثابت ہوئے ہیں [illegible] یہ محض اس لئے کہ جس دنیا میں اسلام کا ظہور ہوا تھا [illegible] قدیم افکار اور ادارات [illegible] ہو چکے۔ جب ان قدیم افکار و ادارات کا تصادم اسلامی تعلیمات سے ہوا تو ان کا ایک [illegible] اسلام میں مل گیا اور باقی یا تو ہمیشہ کے لئے محو ہو گئے یا اپنا دھندلا سا نقش مذاہب اسلامی [illegible] گئے۔

عینک فروش

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی مجھے معمولی سواری گاڑی کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی سے تو اختلاج ہونے لگتا ہے اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنا ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے سست قدم راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کرے تو دن بھر میں منزل سے زیادہ دور نہ ہٹے گا لیکن وہ مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار [illegible] تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آسکتا ہے مگر جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اسے آدھی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی تھی اتنی ہی آنے میں لگے گی۔ کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے مگر یہ بتائے کہ پچھلے مہینے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا، جہاں آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو لے کر چاٹتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مسلم مگر زندگی میں انکا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں غرض مجھے ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے۔ میرا سر چکراتا ہے طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے بات بات پر غصہ آتا ہے۔ ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے لئے منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کی کوئی ضرورت نہیں [illegible]

میں ڈیوڑھے درجے کے ایک [illegible] میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو بنچیں تھیں۔ میرے [illegible] تین مسافر اور تھے۔ ان [illegible] کی طرح [illegible]

موٹے معلوم ہوتے تھے، دوسری نظر میں اس سے بھی زیادہ موٹے اور تیسری نظر میں یہ
انکشاف ہوتا تھا کہ گو انکی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں۔ یہ بزرگ
میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً
انکے چہرے کی زیارت ہوتی تھی۔ مجھے انکے مٹاپے سے اور انکے یوں بیساختہ سونے
سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آکر خراٹے بھی لینے لگتے تھے
تو بیساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انہیں اٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہئے
کہ دروازے سے باہر پھینک دوں

میں بنچ کے ایک سرے پر تھا اور میرے [illegible] ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھے تھے جن
کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ انکے لب خشک تھے، چہرے
کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بنچ کے دوسرے
سرے پر ایک پیرمرد نیم دیسی نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے جنہیں میں نے اکثر ریل
میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ انکے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا
تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر چونکہ یہ کھٹکا رہتا تھا
کہ وہ میرے اس [illegible] تہذیب حرکت کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی
آج موقع پاکر میں نے اتنا معلوم کر لیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ
[illegible] تھا اسے نہ پڑھ سکا۔

[illegible]ل میں باتیں نہیں کرتا اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اسی لئے حتی الامکان
[illegible] تو یہ تقدیر ہی سے ملتا ہے
[illegible] ساتھ تین مسافر تھے مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کریگا
[illegible] مرد آدمی کا شمار [illegible] زمرے کی ذیل میں تھا
ہی نہیں۔ رہے [illegible] تو یں حضرات جو میری بنچ پر تھے ان میں سے نوجوان تو بیچارے

حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ اس سفر میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی لڑھکنے، پل ٹوٹنے، آدمیوں کے گرنے کچلنے، مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا گاڑی ...... اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے نوجوان رفیق گھبرا اکر اس انداز سے اٹھے گویا جیسے اترنا چاہتے ہیں، مگر جب انہوں نے کھڑکی کے پاس جاکر اسٹیشن کا نام پڑھا تو کسی قدر مایوسی کے ساتھ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے [illegible] ہی گاڑی ٹھہرتے ہی آنکھ کھولی اور پیچھے ہی بیٹھے اسٹیشن کی طرف مڑکر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انہوں نے اس کریہہ آواز سے جو شاید گلے سے [illegible] ون کو بلایا اور تھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی، پوری، کباب، دہی بڑے، گرم امرود، الم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا شاید انہیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے اس لئے انہوں نے یہ ذخیرہ جمع کر لیا ہے لیکن جب انہوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو دیکھتے دیکھتے چند منٹ میں [illegible] ن رسد ان کے صندوق شکم میں جاکر غائب ہو گیا کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا پھر آستین سے منہ پونچھا، ڈکار لی، گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں اور چشم زدن میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی اور پیر مرد نے جو اب تک برابر مطالعے میں مشغول تھے دفعتہً کتاب بند کر دی اور نوجوان مسافر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ کہاں تشریف لیجا رہے ہیں" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے یہ بات بیحد ناگوار ہوئی۔ سفر [illegible] اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص سے تعارف نہ ہو اس سے بے ضرورت گفتگو کرنا [illegible] میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں

آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہیں وہ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ تمہیں دخل در معقولات کا کیا حق ہے اس لئے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ وہ نوجوان پیرمرد کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ مگر نوجوان نے ڈوبی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا "کیا عرض کروں کہاں جا رہا ہوں" اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دیر تک چلا۔ غصہ تو مجھے ضرور آیا مگر اسی کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے

"آپ بہت اداس معلوم ہوتے ہیں"

"جی ہاں کچھ ایسی ہی پریشانیاں ہیں"

"آخر معلوم تو ہو وہ کونسی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کر دیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں"

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکر گزار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا"

"آپ کیوں ایسا حوصلہ پست کرتے ہیں اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہوگی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہوگا"

"نہیں ایسا نہیں۔ راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں۔ اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے شور و شر سے امین زندگی کی

کشکش سے محفوظ امن وعافیت سے دن گذار سکتا ہے، جہاں نہ اسے اپنے بھائیوں کی غفلت، جہالت، پستی، نکبت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے اور نہ انکی نامہربانی، ناشکرگذاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر رکھنا پڑیں گے، جہاں نہ وہ اپنی قوم کے تنزل کے احساس سے تڑپے گا اور نہ اسکی اصلاح کوشش کر کے پچھتائے گا۔ میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی سوسیائی سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑوں خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر لوں اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں۔"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں؟"

"سنئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور یہیں میرا شجر حیات پنپ سکتا تھا اب آپ یہ پوچھئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس کا میں جواب دیتا ہوں میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اسے سن کر دکھے گا۔ آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے یعنی عقیدہ اور امید اور وہ چیز دیدی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی۔ جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا۔ اس وقت میرا سینہ ایمان کے نور سے معمور تھا اور میرا دل امید کے ولولے سے لبریز۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان والوں میں ایمان ہے، خلوص ہے، درد ہے، قابلیت ہے، ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے، صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے مجھے امید تھی کہ یہ چیزیں ذرا سی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح [illegible] عقلمندوں کے لئے ایک اشارہ کافی ہے اسی طرح ہندوستانیوں کے لئے صرف ایک ترانہ امید ایک

نعرہ مستانہ چاہیے ۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے غلامی کا طوق اُتار کر پھینک دیں گے جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے ۔ اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لئے باعث حیرت اور قابل تقلید ہوگا ۔ یہ تھا میرا عقیدہ یہ تھی میری امید ۔

مگر افسوس میں کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا ۔ تصور اور واقعے میں اتنی نسبت بھی تو نہ تھی جتنی چیزیں اور نام اُس کے [illegible] ہیں اور [illegible] اُٹھا کر دیا جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں رہ نوردوں کو رہنماؤں کا پیام پہنچائیں کچھ سونے والے اُٹھے کچھ مسافروں نے آگے قدم بڑھایا ۔ ہمارا دل خوش ہوا ، ہماری ہمت بڑھ گئی ۔ مگر یہ اطمینان عارضی تھا کیونکہ راہ کی دشواریوں نے چلنے والوں کے چھکے چھڑا دیئے [illegible] معلوم ہوا کہ کچھ رہنما راہزن نکلے اور کچھ راہ سے نابلد ۔ ان میں [illegible] پیروؤں کو لوٹ کر چل دیئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اس پر جھگڑنے لگے دائیں کو مڑیں یا بائیں کو آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں ۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا ، یہ پھل بلا مدتوں [illegible] کا تو یہ دیکھ کر جی چھوٹ گیا ہاتھ پیر شل ہو گئے زبان بند ہو گئی افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہو گئی مایوسی رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ میں [illegible] کی نیند سوتا رہے گا ۔ غلامی کی ذلت اٹھاتا رہے گا ۔ یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیاباں کی طرف چل دیا [illegible] کہ کم سے کم اپنی روح کو اس ذلت اور پستی سے بچاؤں اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کے [illegible] کر دوں ۔

[illegible] تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریب ہستی کا پردہ اُٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے عشق کے یاس کا غلبہ ہو گیا [illegible] اُسے یہ راستہ دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائے [illegible] رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں

کی تعلیم کرنے۔ بہرحال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیرمرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے اُن کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک کچھ ہمدردی کے، افسوس کے، دُکھ کے آثار نظر آئے۔ مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و اطمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انہوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سنی [illegible] عمل ہے اس کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب [illegible] انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہے کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہے [illegible] دیوانگی میں یہ تدبر کیوں؟ آپ کی [illegible] انجام تو آپ نے اپنا کام کرتے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی؟"

"جناب انسان [illegible] ہے اور تدبر تفکر کی تاکید بھی کی [illegible] ن نہ پروانہ ہے کہ حسن سوزندہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشق سوزاں کی ایک ادا پر گھل گھل کر مر مٹے۔ اُس کی مستی ہوشیاری کے سہارے جیتی ہے اُس کی دیوانگی دانائی کے پروں پر اڑتی ہے۔ عشق انسان کے دل میں شوق منزل پیدا کرتا ہے اور ذوق سفر۔ عقل اُسے راہ سجھاتی ہے، اور اس کے لئے زادِ راہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ [illegible] جانتا ہوں لیکن میری عقل یہ کہتی ہے کہ ملک و قوم کے پنپنے کی کوئی امید نہیں تو اپنی روح کو بچاؤ اور اس کی بالیدگی [illegible] کرو۔"

"الحمدللہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اُسے عشق کا [illegible] سمجھتے ہیں [illegible] ہمارے اہل حال کے یہاں تو عقل بیچاری [illegible] عشق کی [illegible]

سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہوگئی۔ عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہو کہ یہ آپ کی ہنگامہ زندگی سے مایوسی اور گوشہ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ پہلے اس بات کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کو مایوسی خدانخواستہ نظام عالم اور قانون زندگی سے نہیں بلکہ انسانوں سے ہو، اپنے ملک کے انسانوں سے۔ آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص اور ایثار، ہمدردی اور استقلال کا پھل نہیں ملتا بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی قوم ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہیں کہ ر[illegible] مستقبل کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر اُن سے روگردانی کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ [illegible] بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہو۔ مگر یہ دوسری قسم کی مایوسی یعنی اپنے ملک اور اپنی قوم کی طرف سے ناامیدی جو آپ کے سر پر منڈلا رہی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں، اگر سچی ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائدار مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے نہیں قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہو۔ ہند[illegible] کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کے اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ خواب غفلت سے چونک اٹھے ہیں۔ اُنکی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش کر رہا ہے۔ انہوں نے راہ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے، ٹھوکریں کھاتے ہیں مگر پھر سنبھل جاتے ہیں تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کوئی اس کا دعوے نہیں کر سکتا کہ اُسے انجام کا یقینی علم ہے بڑے سے بڑا دانشمند

علامات پر حکم لگتا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اٹھی ہے یہ اب رکنے والی نہیں۔ بیشک جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے بہت نشیب و فراز دیکھیں گے مگر کسی نہ کسی دن منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ مسلسل کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ زندگی کا یہ قانون ہے۔ دنیا کا یہ دستور ہے خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی کامیابی کو رو رہے ہیں وہ ایک بڑے سلسلے کی کڑی تھی اس کا وہ ٹکڑا جو ... زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس سلسلے کو ناتمام چھوڑنا بزدلی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتھوڑے کی چوٹ کھانے دیجئے کہ وہ فولاد بن جائے پھر کڑی میں کڑی پڑتی جائے گی سلسلہ [illegible] چلا جائے گا اور توڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

"خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے۔ آپکی باتوں کا جو اثر دل پر ہوا [illegible] تو بعد میں ہوگا مگر اس وقت معلوم ہوتا ہے جیسے تیز بخار مدت کے بعد اتر [illegible] کی کیفیت میرے دل سے تقریباً بالکل جاتی رہی [illegible] امید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرا نوردی کی ایک مدت معین کر لوں اور اسے پورا کر کے واپس آؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بنانا چاہئے لیکن [illegible] اگر زنگ آلودہ ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ انسان کچھ دن تنہائی میں رہ [illegible]۔ دنیا کی آلائشوں میں رہ کر تو یہ کثافت دور نہیں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور [illegible] اپنے حق میں ہے صحیح نہیں۔ آپ کا بخار اگر اترا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض کو دفع کرنے کی قوت موجود تھی اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈھتی تھی۔ آپ کی مایوسی اگر دور ہو گئی ہے تو اس

کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے امید کی تہ ابھرنے کو مستعد تھی اور ایک ہلکی سی چھیڑ کی منتظر تھی۔ میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تیماردار تھا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیہ نفس کے ہفتخواں کو طے کر لیں گے یہ بہت بڑا دھوکہ ہے جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے۔ خلوت کے سکون کا انعام اسی کو ملتا ہے جو جلوت کی سعی کے امتحان میں پورا اتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ وہی زندگی کی آگ دور کر سکتی ہے جو اسے فولاد [illegible] اسکے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے کہ فولاد جلا پاتے پاتے شیشہ بنے، جو خام کار ابتدا میں تنہائی اختیار کرتے ہیں ان کے دل کا زنگ دور نہیں ہوتا بلکہ ہوائے نفس سے اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ خواہشات و جذبات کی مستی کو نشہ معرفت، غرور نفسانی کو تمکین روحانی خودی کو خدا سمجھنے لگتے ہیں خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں۔ ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیشک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ راہنما بھی ہیں ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہو سکتا ہے مگر راہنما بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خیر و شر کا امکان زندگی ہے۔ یہی دنیا ہے۔ کمزور دل اس وگدے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط دل اسی میں یکسوئی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے میں مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنیوالا ہے اسی پر مجھے اترنا ہے۔ وہ دیکھئے سگنل گذر گیا۔ اب صرف چند منٹ باقی ہیں اس لئے میں آپ کے سوال کے جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور اپنی زبان میں "سمجھا بھی دیا۔ سنئے۔

کاٹئے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح — جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
سعی سے اکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں — جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا — نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں — غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تسکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا — رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی — پر بھلا سکتے ہیں اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انھیں ہو یا نہ ہو — ہیں اُسے پانی دئے جاتے کسانوں کی طرح
کام سے کام اپنے انکو گو ہو عالم نکتہ چیں — رہتے ہیں جیسے دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن تحسین احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار — [illegible] بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آگیا۔ اب میں جاتا ہوں خدا حافظ۔ میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے اپنا قصد بدلا یا نہیں کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دیدیا تو پھر کچھ کی ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون۔ [illegible] کر لیجئے۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر پیرمرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اتر کر چل دیئے۔ مجھے بھی اس اسٹیشن پر ایک گاڑی بدلنا تھا۔ میری گاڑی [illegible] کی تھی۔ صرف [illegible] درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ نوجوان کا ارادہ کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی دی اور میں مجبوراً اور [illegible] میں ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں گھس گیا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا [illegible] سر جھکائے گہرے فکر میں ڈوبے بیٹھے ہیں اور موٹے مسافر کھڑکی سے سر نکالے [illegible] شداوی میں چائے والے کو پکار رہے ہیں۔

نمودِ سحر

از مولوی سید ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری

اے نمودِ صبح اے رنگینیٔ دورِ حیات
تیری لطف انگیزیوں میں غرق ہے یہ کائنات

تو نے آکر بھر دیا پھولوں میں حسنِ تازگی
ہر غنچے میں اک روحِ تبسم پھونک دی

تو نے ہر ذرے کو رشکِ مہرِ تاباں کر دیا
یعنی حسنِ شاہدِ فطرت کو عریاں کر دیا

منتشر ہے سارے عالم میں ہوائے مشکبار
صرف گلشن ہی نہیں آئینہ ہے ہر کوہسار

اے نمودِ صبح تجھ سے ہے بہارِ کائنات
حسنِ فطرت کو ہے تیری وجہ سے حاصل ثبات

وہ ستاروں کا تبسم اور وہ حسنِ آبشار
وہ نسیمِ صبح کا تھم تھم کے چلنا بار بار

وہ طیورِ صبح خواں کی زمزمہ پردازیاں
سبزۂ خوابیدہ کی وہ بار بار انگڑائیاں

چاندنی میں جھومنا سبزے کا وہ مستانہ وار
کیف پرور کس قدر ہیں یہ ادا ہائے بہار

وہ ہوائے سرد، وہ جنگل، وہ رنگینی تری
کوہساروں کی ہوا ہے برف میں ڈوبی ہوئی

ڈوبتے تاروں کا چشموں میں وہ دلکش انعکاس
گویا مخمل پر ستارے جڑ دئے ہیں پاس پاس

آسماں کو صبح کی سرخی نے رنگیں کر دیا
یا مطلا ہو گئی ہے دہر کی ساری فضا

وہ ترنم ریز نغمے وہ وفورِ بے خودی
اور وہ طاری ہر اک دل پر سرورِ بے خودی

اک ترانہ بن گئی ہے باغ کی ساری فضا
طائروں کی نغمہ پیرائی ہے کیسی دلربا



شذرات

محمد عنایت اللہ صاحب کا چندہ بابت ممبری اردو اکادمی وصول ہوا ہے۔ مگر ان کا پتہ دفتر سے گم ہو گیا ہے۔ وہ براہ مہربانی اپنے پتے سے دفتر کو جلد اطلاع دیں تاکہ رسالہ جات انکے نام جاری کر دیا جائے اور جو کتاب تیار ہونیوالی ہے وہ تیاری کے بعد بھیجی جائے۔

یہ جولائی کا نمبر ستمبر کے پہلے ہفتہ میں قارئین کرام کی خدمت میں بھیج جائے گا۔ اگست کا نمبر بھی انشاء اللہ ستمبر کی ابتدائی تاریخوں میں چھپ جائے گا۔

اردو اکادمی نے منجملہ اور کاموں کے ایک یہ کام بھی اپنے ذمے لیا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے جو کتابیں اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب [illegible] ان میں سے منتخب کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں شائع کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کتاب "عربوں کا تمدن" [illegible] ہو چکی ہے اور دوسری "سیرۃ نبوی" اور [illegible] عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ اردو میں شائع کرنا مفید نہیں کیونکہ انکو پڑھ کر ہندوستان کے [illegible] تاریخ اسلام کو یورپ والوں کی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ اس لئے ضروری معلوم ہو[تا] ہے کہ جس مصلحت کی بنا پر اردو اکادمی [illegible] کام شروع کیا ہے اُسکی تشریح کر دی جائے [illegible] اکادمی کے ارکان کو اس مسئلے پر رائے قائم کرنے میں [illegible]

پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ آج کل مستشرقین کا عام رویہ اسلامی تمدن کیطرف سے

کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ میں اسلام پر کتابیں لکھنے والے کلیسا کے آلۂ کار تھے
انکا مقصد یہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو اسلام کو بدنام کریں چاہے اس میں ہزاروں بے بنیاد
افسانے گھڑنا پڑیں اور سچائی کا خون ہو جائے۔ مگر اب رنگ بدل گیا ہے۔ اب مستشرقین
کے گروہ پر کلیسا کا مطلق اثر نہیں بلکہ مذہب کا بھی کم ہے۔ اب انکا مقصد عمومًا یہ ہوتا ہے
[illegible] مسلمانوں کے قدیم اور جدید تمدن کی سچی تصویر پیش کریں۔ ان کی تصنیف
و تالیف کی محرک ہمیشہ سچی علمی تحقیق کی لگن نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنی
قوم کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں سے واقف ہونے کا موقع دیں تاکہ اسے مسلمانوں
سے معاملت کرنے میں، ان پر سیاسی غلبہ پانے اور ان سے تجارتی فوائد بٹورنے میں
آسانی ہو۔ بہرحال خواہ ان کا مقصد تحقیق علمی ہو یا افادی دونوں صورتوں میں وہ
بڑی محنت اور کاوش سے سچے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں

[illegible] انسان ہیں اور دور دراز ملکوں، غیر زبانوں اور اجنبی قوموں [illegible]
پوری واقفیت حاصل کرنا انکے لئے مشکل ہے اس لئے یہ اپنی تصانیف میں غلطیاں بھی
کرتے ہیں خصوصًا مذہب اسلام کی اصل روح کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں کھاتے ہیں کیونکہ
عام طور پر ان میں خود اپنے مذہب کی روح بھی نہیں ہوتی بلکہ سرے سے مذہب کے
متعلق انکے تصورات بہت ناقص ہوتے ہیں تاہم یہ لوگ عمومًا بہت قابل ہوتے ہیں اور
برسوں عرق ریزی کر کے کتابیں لکھتے ہیں اس لئے ان کتابوں سے وہ طالبان علم جو ان کا نیچو
[illegible] کو نکھا ہیں، بڑے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔

اردو اکادمی چاہتی ہے کہ اردو داں طبقے کے ہاتھوں میں انکی کتابوں کے ترجمے
پہنچائے۔ انگریزی داں طبقہ انکی کتابیں [illegible] پڑھتا ہے لیکن چونکہ اس کے اکثر افراد

اسلامی علوم کے اصل ماخذوں سے بالکل بیگانہ ہوتے ہیں اسلئے ان کتابوں پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آتے ہیں۔ مگر اردو داں طبقہ میں وہ علماء بھی موجود ہیں جو اسلامیات پر عبور رکھتے ہیں اور ان کتابوں کو تنقید کے معیار پر پرکھ کر انکے حسن و قبح سے پڑھنے والوں کو آگاہ کرسکتے ہیں تاکہ وہ ان سے مفید معلومات حاصل کریں [illegible] انکے غلط نتائج سے قطع نظر کرلیں۔

اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جو کھلی ہوئی خامیاں ان کتابوں میں ہوں انکی ترجمہ کرنے والے خود تصحیح کردیں لیکن پورا حق تنقید ادا کرنا ماہرین فن کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان کی تنقیدوں کو شائع کرنے کے لئے رسالہ جامعہ حاضر ہے اور ان میں [illegible] اور ایرادات جو صحیح اور اہم ہوں کتابوں کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کئے جاتے ہیں بلکہ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ کرکے مصنفوں کو یا ان [illegible] کو بھیجے جاسکتے ہیں۔

[illegible] عربوں کے تمدن پر جو تنقیدیں شائع ہوئی ہیں ان میں سوائے رسالہ معارف کی تنقید کے اور کسی [illegible] اکادمی کو کوئی مدد نہیں ملی اس میں بعض ایرادات قابل تسلیم تھے اور ماننے کے لئے اکادمی تنقید نگار کی شکرگزار ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انداز تحریر میں ناگوار مناظرے کا رنگ (مناظرہ صرف [illegible] نہیں بلکہ مترجم سے بھی) آگیا تھا اور مترجم نے اس کا جو جواب [illegible] جامعہ میں شائع کیا اس میں بھی یہ رنگ غالب تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب اکادمی کی طرف سے نہ تھا جامعہ میں یہ اسی حیثیت سے شائع ہوا جیسے کسی اور رسالہ میں شائع ہوتا۔ جناب مدیر معارف اسے معارف میں شائع کرنا چاہتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا پیام جب پہنچا تو یہ مضمون چھپ چکا تھا۔ "[illegible]" میں بھی اس مضمون پر ایک نوٹ لکھا گیا ہے

اور آئندہ نمبروں میں کتاب پر مفصل تنقید لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ جناب مدیر سچ کے نزدیک معارف کی تنقید ضرورت سے زیادہ نرم ہے کیونکہ اس میں "ہذیان سرائی" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے اور "جامعہ ملیہ اسلامیہ" اور "تحقیق" کو واوین کے اندر نہیں لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ جناب مدیر "جامعہ ملیہ" کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اس میں نہ تو عالمانہ تنقید کا رنگ ہوتا ہے نہ [illegible]ت کا، نہ مرشدانہ ہدایت کا بلکہ مخالفانہ طنز کا۔ حالانکہ یہ اصلاح کا کوئی مفید طریقہ نہیں [illegible]ت کا اثر جب ہوتا ہے کہ وہ خلوص سے کیا جائے اور [illegible] تلخ ہو مگر ترش نہ ہو۔ طنزیہ کلمے لوگوں کے دلوں میں ایک طرح کی ضد پیدا کرتے [illegible] دوسروں کو امتحان میں ڈالتے ہیں جس میں وہ خود کبھی پورے نہیں [illegible]

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۲

از جنوری تا جون ۱۹۲۹ء

ادب

اجتماعیات

سیاسیات

حصہ نظم

اقتباسات

تنقید وتبصرہ

(رسائل و اخبارات)

[illegible]درات -

جنوری ۵،۷-۸۰ فروری ۵،۱-۹۲ مارچ ۲،۷-۰۰

اپریل ۵،۱۵-۳۱۸ مئی ۵،۲۹۵-۴۰۰ جون ۵،۴-[illegible]

مضمون نگاران جامعہ بابتہ [illegible] از جنوری تا جون [illegible]

اثر مرحوم شاگرد حضرت خواجہ میر درد رح

[illegible] دہلوی

[illegible] سبحانی (مولانا)

اسرائیل احمد خانصاحب (مولوی)

اسلم صاحب جیراجپوری (مولانا)

[illegible] خانصاحب بی اے (کیمبرج) (ملک)

بدر الدین چینی صاحب متعلم جامعہ

برٹرینڈ رسل

جمیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ)

حامد علیخانصاحب [illegible]

درد کاکوردی صاحب (حضرت)

ذاکر حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی (ڈاکٹر)

زبید احمد صاحب (از لندن)

[illegible] صاحب بی اے (از آکسفورڈ)

سید سلیمان صاحب ندوی

سلیم الزمان صدیقی صاحب پی ایچ ڈی (ڈاکٹر)

شفیق الرحمن صاحب [illegible]

شاپور کرپانی صاحب (حضرت)

صفی صاحب لکھنوی (حضرت)

عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (ڈاکٹر سید)

عبد العلیم احراری صاحب بی اے (آنرز)

فرحت اللہ بیگ صاحب (مرزا)

مسٹر [illegible] ہینکے

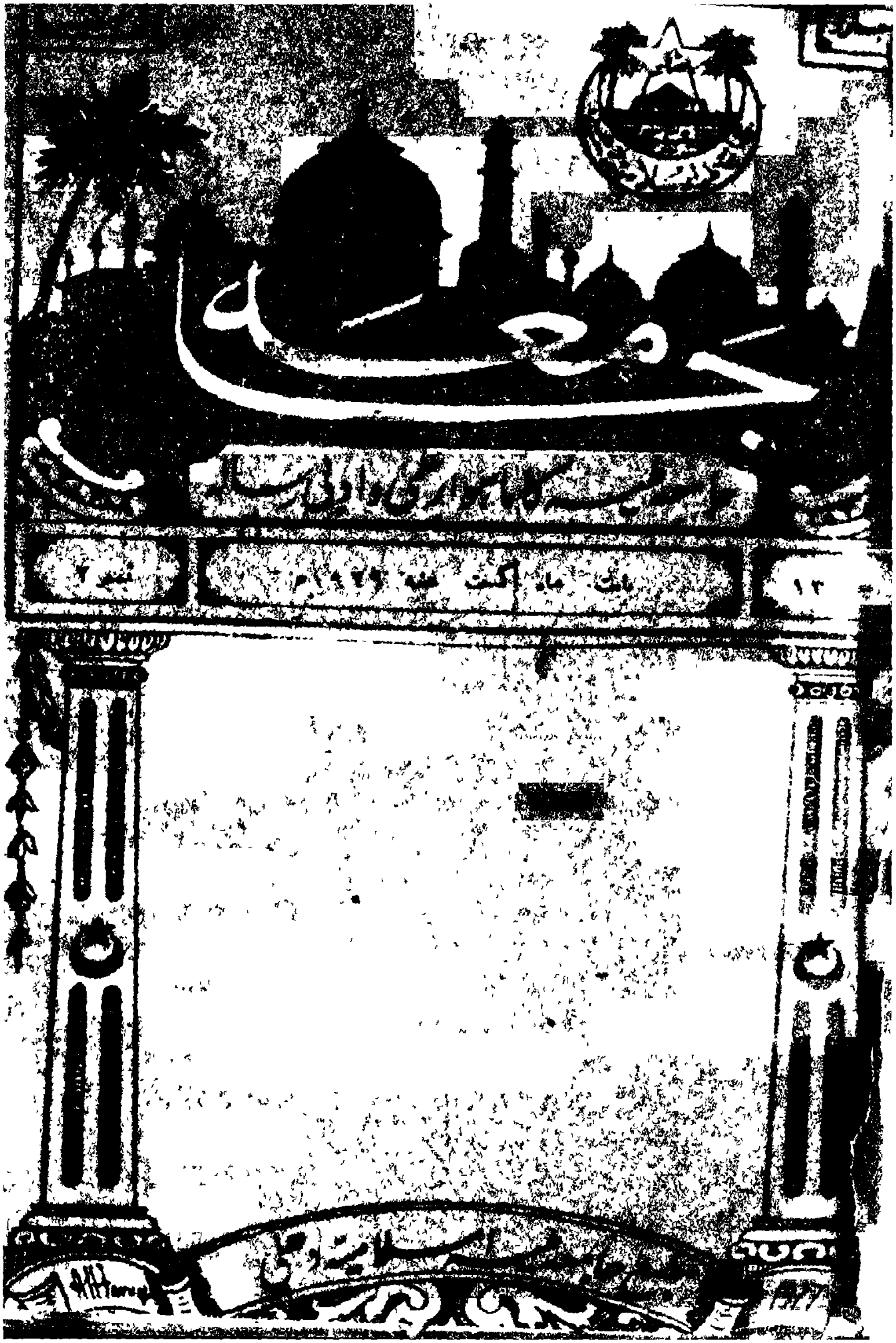
[illegible] صاحب بی اے [illegible]

[illegible] محوی صاحب (مولانا)

[illegible] اسرائیل

نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ)

یوسف حسین خانصاحب بی اے (از پیرس)



جامعہ
بابت ماہ اگست
۱۲
نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۳ | بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۹ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب ۲

باکونین اور نراج

عام ذہن میں نراجی ایک شخص ہے جو بم پھینکتا [illegible] خوفناک جرم کرتا ہے خواہ اس وجہ سے کہ وہ کم و بیش پاگل ہے یا انتہا پسند سیاسی خیالات کو اپنے مجرمانہ رجحانات کیلئے پردہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ خیال ظاہر ہے کہ ہر طرح ناقص ہے۔ بعض نراجی بم پھینکنے میں یقین رکھتے ہیں۔ بہت سے نہیں رکھتے۔ پھر یہ کہ دوسرے عقائد کے لوگ بھی [illegible] حالات میں بم پھینکنے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ مثلاً جن آدمیوں نے سراجیوو میں وہ بم پھینکا تھا جس سے موجودہ جنگ شروع ہوئی وہ نراجی نہ تھے، قوم پرست تھے۔ اور اگر ہم نہایت چھوٹے حصہ سے قطع نظر کیجائے جنہوں نے ٹالسٹائے کا عدم مقاومت کا رویہ اختیار کرلیا ہے، تو وہ نراجی جو بم پھینکنے کے موافق ہیں دوسرے لوگوں سے اس بارے میں کوئی اہم اصولی اختلاف نہیں رکھتے۔ اشتراکیوں کی طرح نراجی بھی گویا معاشی طبقوں کی جنگ پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ بم استعمال کرتے ہیں تو اسی طرح جیسے حکومتیں اغراض جنگ کے لئے بم استعمال کرتی ہیں۔ لیکن ہر ایک بم کے مقابلہ میں جو ایک نراجی تیار کرتا ہے، حکومتیں لاکھوں تیار کرلی ہیں اور ہر ایک آدمی کے مقابلہ میں جس نے نراجی تشدد کے ہاتھوں جان دی ہے ریاست کے تشدد سے لاکھوں مارے جاتے ہیں۔ لہذا ہم تشدد کا یہ سوال جو عام تخیل میں اس قدر اثر رکھتا ہے اپنے ذہن سے بالکل دور کرسکتے ہیں۔ کیونکہ نراجی خیال والوں کے لئے یہ نہ تو لازمی ہے نہ انکے ساتھ مخصوص۔

نراج . جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ، ایک نظریہ ہے جو ہر قسم کی جبریہ حکومت کے مخالف ہے ، اگر ریاست جبر و تشدد کا مجسمہ ہے جو سماج پر حکومت کرتا ہے تو یہ ریاست کا مخالف ہے جس حکومت کو نراج برداشت کر سکتا ہے وہ آزاد حکومت ہونی چاہئے ، نہ صرف اس معنی میں کہ یہ اکثریت کی حکومت ہو بلکہ اس معنی میں کہ سب اس پر راضی ہوں - نراجی پولیس اور قانون فوجداری کے خلاف ہیں اس لئے کہ انکے ذریعے جماعت کے ایک حصہ کی مرضی دوسروں پر عائد کیجاتی ہے ، انکے خیال میں جمہوری حکومت اس وقت تک حکومت کی دوسری شکلوں پر کچھ زیادہ قابل ترجیح نہیں جبتک کہ اقلیت کو جبر واقعی یا امکانی کے ذریعہ اکثریت کی مرضی پر مجبور کیا جاتا ہے - نراجی مذہب میں حریت خیر اعظم ہے اور اس حریت کی تلاش کا سیدھا راستہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ فرد پر جماعت کا جو بھی جبریہ قابو و اختیار ہے یک قلم اٹھا دیا جائے -

اس معنی میں نراج کوئی نیا مسئلہ نہیں - ایک چینی فلسفی چوانگ تسو نے جو ۳۰۰ سال قبل مسیح تھا نہایت قابل تعریف طریقہ سے اسے پیش کیا ہے :

"گھوڑوں کے سم ہوتے ہیں کہ انہیں پالے اور برف پر لیجائیں . بال ہوتے ہیں کہ انہیں ہوا اور سردی سے بچائیں - یہ گھاس کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں اور میدان میں اپنے سموں پر اڑ جاتے ہیں - یہ ہے گھوڑوں کی حقیقی فطرت ، عالیشان عمارتیں ان کے لئے بیکار ہیں -

ایک دن پو لو یہ کہتا ہوا نمودار ہوا : "میں گھوڑوں کا انتظام کرنا جانتا ہوں ۔" تو اس نے انہیں داغ دئے ، انکے بال کاٹے ، سم تراشے ، اور لگامیں چڑھائیں ، سر سے باندھا ، پچھاڑیاں کیں ، اور انہیں اصطبلوں میں رکھا . نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دس میں سے دو تین مر گئے پھر اس نے انہیں بھوکا پیاسا رکھا ، قدم چلایا اور دلکی ، مالش کرائی اور کھریرا کرایا ، آگے پھندے دار لگام کی مصیبت ، پیچھے گرہ دار چابک کا خوف ، حتیٰ کہ آدھے سے

زیادہ ختم ہو گئے

کمہار کہتا ہے: میں جو چاہوں مٹی کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ اگر گول بنانا چاہوں تو پرکار استعمال کرتا ہوں، چوکور بنانا ہو تو مربع

بڑھئی کہتا ہے: "میں جو چاہوں لکڑی کے ساتھ کر سکتا ہوں، اگر اسے خمیدہ بنانا ہو تو قوس استعمال کرتا ہوں، اگر سیدھا تو مسطر"

لیکن ہم آخر یہ سمجھ کس بنا پر سکتے ہیں کہ مٹی اور لکڑی کی فطرت اس پرکار قوس و مسطر کے استعمال کی متقاضی ہے۔ تاہم ہر زمانہ میں پولو کی تعریف ہوتی ہے، گھوڑوں کے انتظام میں اسکی ہنرمندی کی اور مٹی اور لکڑی کے معاملے میں کمہاروں اور بڑھئیوں کی ہنرمندی کی جو لوگ سلطنت پر حکومت کرتے ہیں ان سے بھی یہی غلطی سرزد ہوتی ہے

اچھا، میں سلطنت پر حکمرانی کو بالکل مختلف نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں۔

لوگوں میں بعض فطری جبلتیں ہوتی ہیں۔ کپڑا بننا اور اپنے کو ملبوس کرنا، زمین جوتنا اور اپنا پیٹ بھرنا۔ یہ ساری انسانیت کے لئے مشترک ہیں اور سب اس پر متفق ہیں ایسی جبلتوں کو "آسمان سے بھیجا ہوا" کہتے ہیں۔

لہذا جس زمانہ میں فطری جبلتیں غالب تھیں تو آدمی آہستہ چلتا تھا اور اس کی نگاہ استوار تھی۔ اس زمانہ میں پہاڑوں پر سڑکیں نہ جاتی تھیں، نہ کشتیاں تھیں نہ پانی پر پل۔ سب چیزیں اپنے اپنے مخصوص دائرے کے لئے پیدا کی جاتی تھیں۔ پرند اور چرند کی پود بڑھتی تھی، پیڑ بوٹے پھلتے پھولتے تھے۔ اول الذکر کو ہاتھ سے تھام سکتے تھے، کوئی چاہتا تھا تو اوپر چڑھ کر کوے کے گھونسلے میں جھانک آتا کیونکہ اس زمانے میں انسان چرند اور پرند کے ساتھ رہتا تھا، ساری مخلوق ایک تھی۔ بھلے اور برے آدمی کی تفریق نہ تھی۔ سب چونکہ یکساں بے علم تھے لہذا انکی نیکی راہ نہیں بھٹک سکتی تھی۔ سب چونکہ بری خواہشوں سے یکساں آزاد تھے لہذا ایک فطری وحدت و یگانگت کے عالم میں تھے

جو وجود انسانی کا کمال ہے۔

لیکن جب عقلاء پیدا ہوئے جنہوں نے خیرات کی رکاوٹ راہ میں ڈالی اور پڑوسی کے حقوق کی بیڑیاں ڈالیں تو شبہ نے دنیا میں راہ پائی اور جب انہوں نے موسیقی کے متعلق جھمیلا اور رسوم کی بابت دانستہ کلکل شروع کی تو سلطنت کے اندر انتشار پیدا ہو گیا۔(۱)

جس معنی میں ہمیں اس سے سروکار ہے اس میں موجودہ نراج زمین اور سرمایہ کی مشترک ملکیت کے عقیدہ سے وابستہ ہے اور اس طرح نہایت اہم اعتبارات سے اشتراک سے قریب ہے۔ اس مذہب کو صحیح طور پر نراجی اشتراک کہتے ہیں لیکن اس میں چونکہ عملاً سارا موجودہ مسئلہ نراج شامل ہے لہذا ہم فی الحال انفرادی نراج کیطرف سے قطع نظر کر کے اپنی تمامتر توجہ اس کی اشتراکی شکل پر مبذول کر سکتے ہیں۔ اشتراک (خالص) اور نراجی اشتراک دونوں اس ادراک سے پیدا ہوئے ہیں کہ شخصی سرمایہ بعض افراد کی دوسروں پر ظلم کا باعث ہے۔ ارتودکس اشتراک یقین کرتا ہے کہ اگر ریاست تنہا سرمایہ دار ہو جائے تو فرد آزاد ہو جائیگا برخلاف اس کے نراج کو اندیشہ ہے کہ ایسی حالت میں شاید ریاست کو شخصی سرمایہ دار کے تمام ظالمانہ رجحانات ورثہ میں ملیں گے۔ لہذا یہ ایک ایسے ذریعہ کا متلاشی ہے جس سے ملکیت مشترک اور ریاست کے اختیار میں زیادہ سے زیادہ تخفیف باہم ملجائیں بلکہ آخر میں جاکر ریاست قطعاً معدوم ہی ہو جائے۔ یہ اشتراکی تحریک کے اندر ہی اس کے انتہائی پہلوئے چپ کی حیثیت سے پیدا ہوا۔

بعینہ اسی معنی میں جس میں مارکس کو جدید اشتراکیت کا بانی کہا جاسکتا ہے، باکونین کو اشتراکی نراج کا بانی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مارکس کیطرح باکونین نے مسائل کا کوئی مختتم اور منظم خاکہ نہیں تیار کیا۔ اس سے بہت قریب پہنچنے میں ہمیں اس کے تبع کروپاٹکن کی تحریروں

---

(۱) "ایک چینی صوفی کی (فکاہات)"

سے دے گی۔ جدید نراج کی توضیح کے لئے ہم باکونین کی زندگی (۱) اور مارکس سے اس کی مخالفت کی تاریخ سے ابتدا کریں گے اور اس کے بعد نراجی نظریہ کا ایک مختصر سا بیان پیش کریں گے جیسا کہ یہ جزواً خود اس کی اور زیادہ تر کروپوٹکن کی تصانیف میں ملتا ہے۔

میخائل باکونین ایک روسی امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہے جو اپنی خدمت سے سبکدوش ہو کر اپنے دیہی علاقہ میں آبسا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں باکونین پیٹرس برگ کے توپخانہ کے مدرسہ میں شامل ہوا اور ۱۸ سال کی عمر میں یہ ایک رجمنٹ میں [illegible] بھیجا گیا جو سرکار منسک ([illegible]) میں تعینات تھی۔ ۱۸۳۰ء کی پولی بغاوت ابھی ابھی دبائی جا چکی تھی۔ بہوت و خوف زدہ پولینڈ کے منظر نے "بقول گیلوم نوجوان افسر کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا اور اس میں استبداد کی طرف سے نفرت پیدا کرنے میں مدد دی"، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال کی آزمائش کے بعد اس نے اپنا فوجی پیشہ ترک کر دیا۔ اس نے ۱۸۳۴ء میں اپنے عہدہ سے استعفا دیا اور ماسکو جا کر چھ سال فلسفہ کی تعلیم میں صرف کئے۔ اس دور کے سب طلبہ فلسفہ کی طرح یہ بھی ہیگل کا متبع ہو گیا [illegible] میں اس امید کے ساتھ کہ آگے چل کر پروفیسر ہو جائے گا یہ برلن میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے آیا لیکن اس زمانے کے بعد اس کے خیالات میں بڑی تیز تبدیلی ہوئی۔ اسے اب ہیگل کا یہ قول تسلیم کرنا ناممکن معلوم ہونے لگا کہ جو کچھ ہے مطابق عقل ہے۔ یہ ۱۸۴۲ء میں ڈریسڈن منتقل ہو گیا جہاں اسے Deutsche Jahrbücher کے ناشر آرنلد روگے سے واسطہ رہا۔ اس زمانہ میں یہ انقلابی بن چکا تھا اور اگلے ہی سال اس نے اپنے آپ کو نیکلسی حکومت کے عتاب کا مورد بنا لیا۔ چنانچہ سوئزرلینڈ جانے پر مجبور ہوا۔ یہاں جرمن اشتراکیوں کے ایک گروہ سے یکجائی کا موقع ملا، لیکن سوئس

---

(۱) نراجی نقطہ نظر سے باکونین کے حالات زندگی اس کے مجموعہ تصانیف (شائع کردہ گیلوم۔ پیرس) کی دوسری جلد میں ملیں گے۔

پولیس تنبیہ کر ہی چکی تھی، اور روسی حکومت نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ لہذا یہ پیرس چلا گیا اور یہاں ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء تک رہا۔ [illegible] خیالات و آراء کی تشکیل میں پیرس کے یہ سال بہت اہم تھے۔ یہاں اس کی پرودھاں سے واقفیت ہوئی جس نے اس پر کافی اثر ڈالا، نیز جارج سینڈ اور بہت [illegible] مشہور لوگ [illegible] ہی میں اس کی واقفیت مارکس اور انگلز سے پیدا ہوئی جن سے اسے ساری عمر معرکہ آرائی کرنی تھی۔ بہت [illegible] بعد ۱۸۷۱ء میں اس نے اپنے اور مارکس کے اس زمانہ کے تعلقات کو یوں بیان کیا :-

[illegible] سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا، اور آج بھی اگرچہ وہ خیالات کے اعتبار [illegible] ہوا نہیں ہے مگر علمیت کے اعتبار سے میرا اس سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا [illegible] وقت معاشیات کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے ابتک مابعد الطبیعی تحریروں سے رہائی نہ حاصل کی تھی، اور میرا اشتراک بس فطری و جبلی تھا۔ وہ اگرچہ مجھ سے کم عمر تھا، تاہم اسی زمانہ میں دہریہ تھا، نہایت واقف کار مادہ پرست، اور سوچا سمجھا اشتراکی۔ ٹھیک اسی زمانہ میں اس نے اپنے موجودہ نظام کی اول بنیادیں ترتیب دی تھیں۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر ملا کرتے تھے، کیونکہ میں اس کی علمیت اور مزدوروں کے باب میں اس کی دلی اور گہری دلچسپی کے باعث (جس میں ہمیشہ ذاتی خودبینی کی بھی آمیزش ہوتی تھی)، اس کی بڑی عزت کرتا اور اس کی گفتگو کا دل سے اشتیاق رکھتا تھا کیونکہ یہ گفتگو ہمیشہ سبق آموز اور دانشمندانہ ہوتی تھی، بشرطیکہ اس کی تہ میں کوئی حقیر نفرت نہ ہو جیسا افسوس ہے کہ اکثر ہوتا تھا۔ لیکن ہم دونوں میں صاف بے تکلفی کبھی نہ تھی۔ ہمارے طبائع اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ وہ مجھے جذباتی خیالی کہتا تھا اور ٹھیک کہتا تھا، میں اسے خودبیں متفنی اور مکار کہتا اور میں بھی ٹھیک کہتا تھا۔"

باکونین ارباب اختیار کی دشمنی کا مورد بنے بغیر کبھی ایک جگہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکا

ایک تقریر کے سبب سے جو اس نے ۱۸۳۰ء کی پولی بغاوت کی تعریف میں کی روسی سفارت کی درخواست پر نومبر ۱۸۴۷ء میں اس کا فرانس سے اخراج ہوا۔ اور روسی سفارت نے اسے عام ہمدردی سے محروم رکھنے کے لئے یہ بے بنیاد خبر پھیلا دی کہ یہ روسی حکومت کا کارندہ ہے لیکن چونکہ اسکا رویہ قابل اعتراض ہے اس لئے ہمیں اسکی ضرورت نہیں رہی، فرانسیسی حکومت نے جان بوجھکر خاموشی اختیار کی اور اس طرح اس قصہ کو اور ترا کسایا اور یہ الزام کم وبیش زندگی بھر اس کے سر رہا۔

فرانس چھوڑنے پر مجبور ہوا تو بروسلز گیا۔ یہاں مارکس سے واقفیت کی تجدید ہوئی۔ اسکے ایک خط سے جو اسی زمانہ کا لکھا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں وہ شدید نفرت موجود تھی جس کے لئے بعد کو اتنے وجوہ پیدا ہوگئے " یہ جرمن کاریگر بورن اشٹیڈ مارکس اور انگلز اور خصوصاً مارکس یہاں اپنی معمولی شرارت کر رہے ہیں۔ خود بینی کمینہ، غیبت سے معمور نظری حیثیت سے بر خود غلط، عمل کے اعتبار سے مجبور رہے، علمی زندگی اور سادگی افکار میں کورے، انشا پردازی اور مناظرے کے کاریگر اور اس کے ساتھ قابل نفرت کبر و نخوت میں مدہوش فوائر باخ بورژوا ہے، لفظ بورژوا ایک لفظ ہے جسے اتنا دہراتے ہیں کہ جی متلانے لگے لیکن سب کے سب سر سے پیر تک پکے دیہاتی بورژوا۔ مختصر یہ کہ جھوٹ اور حماقت، حماقت اور جھوٹ۔ اس صحبت میں آزادی سے پوری سانس بھرنا بھی ممکن نہیں۔ میں ان سے الگ تھلگ رہتا ہوں اور نہایت قطعی طور پر اعلان کر چکا ہوں کہ میں انکے اشتراکی اتحاد کاریگران میں کبھی شامل نہ ہوں گا اور اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔"

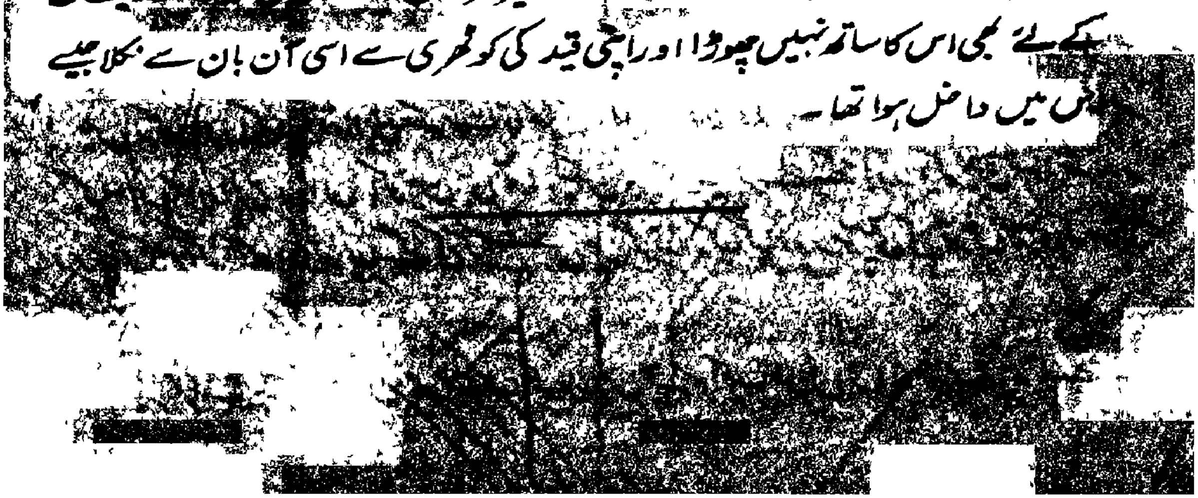
۱۸۴۸ء کے انقلاب کی وجہ سے یہ پیرس واپس گیا اور وہاں سے جرمنی آیا۔ ایک معاملہ میں مارکس سے اسکا جھگڑا ہوا، جس کے متعلق بعد کو اس نے خود اقرار کیا کہ اس میں مارکس حق پر تھا۔ پراگ میں یہ سلاونی کانگریس کا رکن بنا اور ایک سلافی بغاوت

ابھارنے کی بیکار کوشش کرتا رہا۔ ۱۸۴۸ء کے اواخر میں اس نے "سلافیوں کے نام بیان" لکھی جس میں ان سے کہا گیا ہے کہ دوسرے انقلابیوں سے مل کر تین ظالم سلطنتوں کو تباہ کردو یعنی روس، اسٹریا اور پروشیا۔ مارکس نے اخبار ونیس اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ بھی خود مختاری کی تحریک عبث ہے کیونکہ سلافیوں کا کوئی مستقبل نہیں کم سے کم ان علاقوں میں جہاں وہ جرمنی اور آسٹریا کے محکوم ہیں۔ باکونین نے اس معاملہ میں [illegible] جرمنی وطن پرستی کا الزام لگایا اور مارکس نے اس پر اتحاد سلافی کی حمایت کا اور اسمیں شبہ نہیں کہ دونوں الزام بجا تھے۔ لیکن اس قضیہ سے پہلے ایک زیادہ سخت جھگڑا ان دونوں میں ہو چکا تھا۔ مارکس کے [illegible] نے بیان کیا تھا کہ جارج سینڈ کے پاس ایسے کاغذات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باکونین روسی حکومت کا کارندہ ہے اور منجملہ ان لوگوں کے [illegible] ال کی پولی گرفتاریوں کے ذمہ دار ہیں۔ باکونین نے [illegible] ہے کہ الزام کو جھٹلایا اور جارج سینڈ نے اس اخبار کی ادارت کو لکھکر اس بیان کی کلی تردید کی۔ یہ تردیدیں مارکس نے شائع کر دیں اور باہم برائے نام سمجھوتا ہو گیا لیکن اس وقت سے لیکر آئندہ کبھی ان دونوں حریف قائدوں میں مخالفت ٹھنڈی نہ پڑی اور یہ ایک دوسرے سے ۱۸۶۴ء تک نہیں ملے۔

ان [illegible] رد عمل ہر جگہ جڑ پکڑ رہا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں ڈرسڈن میں بغاوت کے بعد [illegible] دنوں کے لئے شہر انقلابیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ پانچ دن تک اسے انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور ایک انقلابی حکومت قائم کی۔ ان انقلابیوں نے پروشی فوجوں کا جو مقابلہ کیا اس کا روح رواں باکونین ہی تھا۔ لیکن یہ مغلوب کر لئے گئے اور باکونین ہوائنر اور رچارڈ واگنر کے ساتھ بھاگنے کی کوشش میں گرفتار کیا گیا اور موسیقی کی خوش نصیبی کہ موخرالذکر گرفتاری سے بچ گیا۔

اب بہت سے مجلسوں اور مختلف ملکوں میں قید کا ایک طویل زمانہ شروع ہوتا ہے۔

۲۴ جنوری ۱۸۵۱ء کو اس پر سزائے موت کا حکم لگایا گیا۔ لیکن ۵ مہینہ کے بعد یہ حکم بدل دیا گیا اور اسے آسٹریا کے سپرد کر دیا گیا جو اسے سزا دینے کی سعادت کا طالب تھا۔ آسٹریوں نے بھی مئی ۱۸۵۱ء میں اس پر سزائے موت کا حکم لگایا اور پھر یہ حکم بھی حبس دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔ آسٹروی قید خانوں میں اس کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں اور ایک قید خانہ میں تو اسے کمر کی پیٹی سے دیوار سے باندھ دیا گیا تھا۔ باکونین کو سزا دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص مسرت حاصل ہوتی تھی کیونکہ آسٹریوں سے اب روسی حکومت نے اسے طلب کیا اور انہوں نے اس کے سپرد کر دیا۔ روس میں اسے پہلے پطرس اور پولوس کے قلعہ میں قید رکھا گیا اور بعد کو شلوسل برگ میں۔ یہاں اسے فساد خون کا عارضہ ہو گیا اور اس کے سارے دانت گر گئے۔ اس کی صحت بالکل خراب ہو گئی اور اس کے لیے ہر غذا کا ہضم کرنا ممکن ہو گیا۔ لیکن اگرچہ اس کا جسم کمزور ہو گیا تھا، تاہم اس کی روح کمزور نہیں ہوئی تھی۔ اسے سب سے زیادہ ایک بات کا ڈر تھا۔ یہ کہ کہیں قید کے کمزور کرنے والے اثر سے یہ کسی دن ذلت کی اس حالت پر نہ پہنچ جائے جس کی مشہور مثال سلویو پیلیکو ہے۔ یہ خوف تھا کہ یہ کہیں نفرت کرنا نہ چھوڑ دے، کہیں بغاوت کا وہ جذبہ جو ہمیشہ رہتا تھا اس کے دل سے مٹنے نہ لگے، کہیں یہ اپنے سزا دینے والوں کو معاف کر کے اپنی قسمت پر قانع و صابر نہ ہو جائے۔ لیکن یہ خوف غیر ضروری تھا۔ اس کی قوت نے ایک دن کے لیے بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور یہ اپنی قید کی کوٹھری سے اسی آن بان سے نکلا جیسے اس میں داخل ہوا تھا۔



ترکی اور جنگ عظیم

قصہ شروع ہوا آسٹریا کے ولی عہد کے قتل سے اور ختم ہوا جنگ عظیم کے اعلان پر
ان دنوں ترکی میں کوئی یہ گمان بھی نہ کرتا تھا کہ اسکا نتیجہ ایسی عالمگیر تباہی کی شکل میں
نکلے گا۔ اس تباہی کی ذمہ داری پر میں بحث [illegible] اگر جرمنی کی معاش اور فوجی ترقی
اور اسکا مادی فلسفہ اس جنگ کے معین تھے تو اب یہ بھی تو معلوم ہو چکا ہے کہ اتحادیوں
کی طرف بھی ایسے ہی [illegible] اور اتنی ہی جارحانہ تیاریاں عرصہ سے جاری تھیں
لیکن جن وجوہ سے ہم اس عام تباہی میں شریک ہوئے ان پر ایک نظر تکلیف دہ سہی لیکن
دلچسپ ضرور ہے۔ ہمارے شامل ہونے سے ہی مشرق قریب میں ۴ سال جنگ رہی، دنیا
کو بہت کچھ دکھ پہنچا! اور خود ترکی قوم کی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور ایسی تکلیفیں اٹھانی
پڑیں جنکا اٹھانا کچھ ضروری نہ تھا۔ اپنی شمولیت کی وجوہ بتانے سے پہلے میں قارئین کرام
کی توجہ تین خاص کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتی ہوں جن سے واقعات پر بہت کچھ
روشنی پڑتی ہے۔ پہلی کتاب تو پروفیسر آرل ( ) کی تصنیف ہے "بغداد ریلوے"
جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف غیر متعصب آدمی ہے حق بات معلوم کرنا چاہتا
ہے اور ایسے زمانہ میں اس نے اپنی کتاب لکھی ہے جب دونوں طرف سے پروپگنڈا کے
بادل چھٹ چکے تھے اس لئے یہ معاملات کو صاف صاف دیکھتا ہے۔ اور چونکہ کتاب
خاص معاشی ہے اس لئے جو شخص اس معاشی معمہ کو سمجھنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے یہ
کشمکش ہوئی اسے اس کتاب میں نہایت اچھی اور غیر جانبدار سند ملے گی۔
دوسری کتاب روسی مختار تھا نہ قسطنطنیہ کے ترجمان اول مینڈلسٹن کی تصنیف ہے
سلطنت عثمانیہ) یہ کتاب ۱۹۱۷ء

میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے نوجوان ترکوں کی بابتہ بہت زیادہ مواد جمع کیا ہے۔ اور ان اسباب کی بابتہ جنہوں نے ترکی کو جرمنی کی طرف شریک جنگ کرایا۔ اس مصنف کا بس ایک مقصد ہے اور اس نے اپنا تمام مواد اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے جمع کیا ہے اور اسے ہر طرح توڑ مروڑ کر اسی کام کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کا نقطہ نظر کم وبیش وہی ہے جس پر دنوں میں سار[illegible]ت کے ساتھ، اندھے پن اور تنگی دل سے یقین رکھتی تھیں۔ اس مصنف کے دلائل کی روح یہ ہے کہ ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے [illegible] ہیں۔ ترکوں کو معمولی انسان [illegible] اور نوجوان ترکوں کو تو ارمینوں کے قتل کے باعث عادی مجرم جاننا چاہئے۔ کتاب میں ارمینوں کے قتل کا تفصیلی [illegible] دوسری اقلیتوں کی بابتہ بہت مبالغہ آمیز الزامات ہیں جن کے متعلق اس کا دعوٰے ہے کہ ترک انہیں یک قلم مٹا دینا چاہتے تھے لیکن مجھے اس بات میں بلغاریوں کے ہاتھ سے ترکوں کے قتل کا ذکر کہیں نہ ملا، نہ ۱۹۱۲ء کے مظالم کا، نہ ترکوں کے اس قتل عام کا جو ا[illegible] [illegible] مشرقی ترکی میں داخل ہو کر ۱۹۱۵ء میں کیا تھا، اور جس کا ذکر [illegible] سیدھی زبان میں انہی روسی افسروں نے کیا ہے جنہوں نے ان ارمنی مظالم سے بیزاری ظاہر کی تھی۔ کثرت مواد کے باوجود اس کتاب سے مجھ پر پہلی مرتبہ روشن ہوا کہ میرے ملک اور میری قوم کے متعلق اس زمانہ میں یورپی دماغ میں کیسی لاعلاج تنگی تھی اور کیسا یکطرفہ پن۔ اور پہلی مرتبہ میری سمجھ میں آیا کہ نوجوان ترکوں کے دلائل میں سچ مچ واقعیت تھی۔ بہر حال ہمارے ایک سابق وزیر اعظم کے بیانات میں (جنہیں مصنف نے اپنی کتاب کے مطالب کی رد میں خود نقل کیا ہے) ترکوں کی جانب سے کافی مواد اور نہایت قوی اور ناقابل انکار دلائل موجود ہیں۔

منڈلسٹن کی کتاب کے بالکل مخالف ایک تیسری کتاب ہے، "اسباب جنگ" جو مسٹر[illegible] کی تصنیف ہے اور ابھی حال میں پیرس سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں

ان رجحانات سیاسی کا ذکر ہے جو جنگ سے پہلے دنیا پر چھائے ہوئے تھے : زاری روس کی سیاست جس کا مقصد آسٹریا کو اور بلقان میں ترکی کو ختم کر دینا تھا ، اور فرانس کی سیاست جو روس کی حمایت کرتی تھی تاکہ جرمنی کو پیس دے اور الساس لورین کا صوبہ واپس لے لے جو تقی بے وج ایک پرانا سربی رکن سیاست [illegible] سیاسی مقاصد کے تیاری کے زمانے میں نیز ایام جنگ میں سیاسی کام کرتا تھا ۔ اس [illegible] نے نہایت دلچسپ سیاسی دستاویزیں بھی نقل کی ہیں [illegible]

میں خود تو جنگ کی [illegible] شرکت جنگ کی حمایت نہیں کرتی چاہے وہ کسی طرف سے ہوتی ۔ لیکن اگر کوئی اس راز کے سیاسی دلائل کی گتھیوں کو سلجھانے اور ان نوجوان ترک قائدوں کی کیفیت ذہنی کو سمجھنے کی کوشش کرے تو اسباب بالکل واضح ہو جاتے ہیں : پہلا سبب تو خود مختاری کی خواہش تھی یعنی غیر ملکیوں کے مراعات کو مٹا دینے کی خواہش ۔ نوجوان ترکوں نے بہت سخت کوشش کی کہ اتحادی دولوں کی ہمدردی حاصل کریں ۔ لیکن بے سود ۔ اتحادی انہیں غیر جانبدار دیکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے عوض کچھ دینے کو تیار نہ تھے ۔ دوسرا سبب روسی سامراج کا موروثی اور جائز خوف ۔ یہ ادر [illegible] روس کو قسطنطنیہ دینے کا وعدہ ۱۹۱۴ء میں کیا گیا یا ۱۹۱۶ء میں نوجوان ترک یہ ضرور جانتے تھے کہ روایتی اور سیاسی اعتبار سے روس انگلستان کا [illegible] اسے پھانسنے کے لئے انگلستان ترکی کو ضرور نرم چارہ کی طرح استعمال کرے [illegible] سبب ترکی کی افسوسناک مالی حالت تھی ۔ غیر جانبدار رہنے کے لئے بھی ترکی کو مالی مدد درکار تھی اور یہ مالی مدد اتحادیوں سے مل نہ سکتی تھی ۔ دور حاضر کے ایک [illegible] بر نے مجھ سے بیان کیا کہ جب انگلستان نے ہمارے [illegible] ضبط کئے اور انکے وام دینے سے بھی انکار کیا تو حکومت پر جنگ کے موافق عنصر کا بہت اثر پڑا اور وہ اس طرف ڈھل گئی ۔ بالغرض اگر یہ بیان پوری حقیقت حال پر حاوی نہ ہو تو اس کے ایک اہم جزو پر ضرور حاوی [illegible]

اور اس سے ترکی کی شدید مالی احتیاج کا پتہ چلتا ہے۔ چوتھا سبب اتحادیوں کا کھلم کھلا اور متعصبانہ طور پر عیسائیوں کی حمایت کرنا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ عیسائی اقلیتوں کو مدد دی کہ یہ مسلم و ترک اکثریت کے مقابلہ میں معاشی بلکہ سیاسی تفوق تک حاصل کرلیں۔ پانچواں سبب یہ تھا کہ جرمنی کو ترکی کمزوریوں سے پوری پوری ذہنی و نفسی واقفیت تھی اور اس نے صحیح لمحہ کے انتخاب میں نہایت ہوشیاری سے کام لیا۔

نوجوان ترکوں کے قائدوں نے اپنے جنگ میں شامل ہونے کے موافق جو دلیلیں بھی ممکن تھیں سب کی سب [illegible] کیں، اور ترک قوم کو جس میں اتحادی بہت ہردلعزیز تھے اتحادیوں کے خلاف ابھارنے کی سب کوششیں کیں۔ عجیب سی بات ہے کہ ترکی رائے [illegible] اس وقت اتحادیوں [illegible] ہوئی اور نوجوان ترکوں کے دلائل کو اس نے اس وقت صحیح تسلیم کرنا شروع کیا جب نوجوان ترک برسراقتدار نہ رہے۔ یونانی قبضہ اور انگریزوں کی شہ پر یونانی مظالم اُدھر اور زمیں فرانسیسیوں کی سرپرستی میں ارمنوں کے مظالم جب سامنے آئے تو لوگ کہنے لگے کہ دیکھو اتحادیوں کے انصاف اور حکومت کا یہ نمونہ ہے اور اسے اتحاد و ترقی والوں نے جنگ سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔

[illegible] میں عام آبادی ہی نہیں بلکہ خود اتحاد و ترقی کے اکثر اہل فکر اور بااثر لوگ جنگ کے مخالف تھے۔ صرف انور پاشا اور ایک چھوٹا سا فوجی گروہ جنگ کے موافق تھا اور ان کے ساتھ کچھ ایسے لوگ جو جنگ سے مالی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا بات تھی لوگ جنگ کو [illegible] سمجھتے تھے۔ اگرچہ ڈرتے بہت لوگ تھے اور بے چین بھی تھے اس لئے کہ ترکی میں حکومت فوجی کی قوت سے واقف تھے۔

شروع اکتوبر میں دو شخص میرے پاس ملنے آئے اور ان سے دو یادگار گفتگوئیں ہوئیں پہلے جمال پاشا، وزیر بحر آئے۔ اور بیگم جمال کے ساتھ میرے یہاں آکر چار پی (?)۔

میں نے ان سے صاف صاف کہا "مجھے تو ڈر ہے کہ ہماری حکومت جنگ کی طرف

چل رہی ہے" وہ ہنسے گویا میں نے کوئی بے معنی بچوں کی سی بات کہی ہے مجھے انکے چہرہ کا نہایت قطعی انداز اب تک یاد ہے جب انہوں نے کہا "نہیں، نہیں، خالدہ خانم، ہم جنگ میں شریک نہ ہونگے"۔ میں نے پوچھا "اور وہ کیسے؟" جواب ملا "میرے پاس اتنی قوت ہے کہ میں ان لوگوں کو سمجھا سکوں کہ جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ اگر میں اس میں ناکام ہوا تو میں استعفیٰ دیدوں گا۔ جنگ میں شامل ہونا سخت حماقت ہوگی"

تین دن بعد جاوید بے ملنے آئے۔ یہ کچھ مایوس اور شکستہ خاطر سے تھے اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بہت پریشان ہیں۔ میں نے ان سے بھی وہی سوال کیا۔ انہوں نے کہا "اگر یہ لوگ جنگ میں شریک ہوئے تو میں مستعفی ہوجاؤں گا۔ ہم اگر جیت بھی گئے تو تباہ ہوجائیں گے۔ اور لوگ بھی ہیں جو استعفار دیدینگے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ ہم انہیں جنگ میں شامل ہونے سے روک لیں گے۔ طلعت بھی اس وقت جنگ کے مخالف ہیں"

اسی مہینہ کی اٹھارہ تاریخ کو ترکی جنگ میں شریک ہوگیا۔ جاوید بے اور انکے کچھ ساتھیوں نے استعفاد دیدیا لیکن جمال پاشا مستعفی نہ ہوئے۔

چند ہی روز بعد جمال پاشا رخصت ہونے آئے۔ یہ تیسرے لشکر کے سردار مقرر ہوئے تھے یعنی روسی محاذ پر۔ خوب بشاش تھے اور اپنی رائے میں تبدیلی کے وجوہ بیان کرتے تھے۔ ان کی خاص دلیل وہی روس والی دلیل تھی۔ انہیں یقین تھا کہ اگر اتحادی جیتے تو قسطنطنیہ روس کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ اور چونکہ غیر جانبداری کی صورت میں اتحادی کوئی کافی ضمانت نہیں دیتے اس لئے ترکی فوج کا یہ فرض اول ہے کہ روس کے مخالفوں کی مدد کرے۔ اور اگر جرمن اور ترک جیتے جس کا انہیں کامل یقین تھا، تو ترک ایسے آزاد ہوجائیں گے جیسے کبھی پہلے نہ ہوئے تھے اور خارجی مداخلتیں اور مراعات بالکل ختم ہوجائیں گی۔

آج یہ سوچکر کیسا افسوس ہوتا ہے کہ اگر اتحادی اسوقت مراعات کے ہٹا دینے پر راضی ہوجاتے اور قسطنطنیہ کی بابت کوئی یقین دلا دیتے تو فوجی جماعت ترکی کو جنگ میں

نہ گھسیٹ سکتی ۔

جاوید بے معتوب تھے اور انکی سختی سے نگرانی ہوتی تھی، کچھ دنوں تو یہ گھر سے نہ نکلے انتہا پسند اور اتحاد و ترقی والے نہایت سختی سے ان پر حملے کرتے تھے اور بعض نے انہیں غدار تک ٹھہرایا ۔

جمال پاشا کو بعد میں جو تھے لشکر کا سردار بنایا گیا اور انہیں شام بھیجا گیا ۔ انکے سپرد مصر پر حملہ کرنا اور انگریزوں کو مصروف رکھنے کا کام ہوا تا کہ انگریز شامی محاذ پر اپنے لشکر جمع کر دیں

گیلی پولی کی دل ہلا دینے والی مدافعت ترکی میں جنگ کا سب سے پہلا اہم واقعہ تھا ۔ میں یہاں اس کی فوق البشری شجاعت اور قربانی کا ذکر نہ کروں گی ۔ میرے نزدیک تو ساری عزت اور سارا فخر عام ترکی سپاہی کا حق ہے جسکا نہ کوئی نام جانتا ہے ۔ یہ اور جو متحرک تصاویر میں شخصیت وقت کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے نہیں آسکتا ۔ مسٹر میسفیلڈ کی کتاب "گیلی پولی" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز جیسی قوم نے اس معرکہ میں کتنے آدمی اور کتنا سامان کیا ۔ اور اسی کتاب سے ترکی فوج کی قوت مدافعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جس نے اتحادیوں کی افواج اور بیڑوں سے گیلی پولی کو بچایا ۔ سپاہیوں میں نہایت قومی احساس تھا کہ وہ ترکی ارض پاک کے دروازوں کی حفاظت کر رہے ہیں اس سے زیادہ احساس اس بات کا تھا کہ وہ اس روسی بھوت سے لرز رہے ہیں جس کی شکل اتحادی افواج نے انکے ذہنوں میں پیدا کر دی تھی ۔

دردانیال پر جب اتحادیوں کا حملہ ہوا ہے تو بہت سے خاندان قسطنطنیہ سے آئے تھے ۔ اور میں نے بھی اپنے بچوں کو بردسا بھیجدیا تھا ۔ تقریباً ۵ مارچ کے معرکۂ عظیم کے وقت یوسف اکچورہ نے قوم پسند مصنفوں کو "ترک یوردو" کے دفتر میں جمع ہونے کی دعوت دی اور نہایت سنجیدگی سے اس پر غور شروع ہوا کہ اگر اتحادی افواج دردانیال سے گزر کر قسطنطنیہ میں داخل ہوگئیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اس مصیبت میں انہیں قسطنطنیہ

ہی میں ٹھہرنا چاہئے یا کسی محفوظ تر مقام پر جا کر کام کرنا اور لوگوں کے سینوں میں قومیت کے جذبات اور تخیلات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

بڑی لمبی لمبی نشستیں ہوئیں، اور طولانی بحثیں، اور سب نے آخر میں جا کر ایک [illegible] کی سی شکل اختیار کی۔ لیکن انکی گرمی اور حدت کبھی کم نہ ہوئی۔ ڈاکٹر مدنان چونکہ حاضرین میں سب سے زیادہ ٹھنڈے آدمی سمجھے گئے اسلئے صدارت انہیں کے سپرد ہوئی۔

پہلے تو ہر ایک کو اپنا قومی عقیدہ بیان کرنا پڑا۔ نوجوان مصنفوں کوپرلو نواد اور عمر سیف الدین نے کہا کہ قوم پرستی نام نفس قومی کی تلاش اور دریافت کا اور قوم کے افراد کو اسکا درس دینے کا۔ نفس قومی کے عناصر بنیادی کے تعین ہیں یہ دونوں غیر معین سے خیالات [illegible] عمر نے جو بعد کو [illegible] گیا تھا ایک دفعہ مجھ سے ہنسی ہنسی میں اقرار کیا کہ ہمارا استاد گوک الپ ضیاء جو اس وقت قسطنطنیہ میں موجود نہیں وہ تو ہمیشہ نفس قومی کے اجزاء کو بدلتا رہتا ہم لوگ کبھی کوئی صاف بات اسلئے نہیں کہہ سکتے کہ کہیں آگے چل کر اسکے بالکل خلاف بات پیش کرنی ہو۔

آغا اوغلو احمد نے جو ایک پرانے قوم پرست ہیں، کہا کہ قومیت ایک مشترک ذہنیت کا نام ہے جو چار عناصر سے مرکب ہے یعنی زبان مذہب، نسل، اور رسوم۔ ان چار عناصر پر اور انکے مدارج اہمیت پر پھر سارا مباحثہ ہوتا رہا۔ چونکہ ترکی قوم پرستی کے سیاسی رجحانات کا دارومدار بڑی حد تک ان عناصر کے مدارج کی اہمیت ہی پر تھا اس لئے یہ بحث نہایت [illegible] اور سبق آموز تھی۔ حسین زادہ علی نے جو ایک محترم رکن اتحاد و ترقی اور پرانے قوم پرست تھے کہا کہ مذہب اور زبان اہم تر عناصر ہیں۔ اور نسل اس کے بعد آتی ہے۔ انہوں نے فرمایا ایک مسلم حبشی جو ترکی بولتا اور اپنے کو ترک کہتا ہے مجھ سے بہ نسبت اس ماگیار کے قریب تر ہے جو نسلاً ترک ہے، وہ گویا ذرا نرم شکل میں اتحاد اسلامی کے حامی تھے، نوجوان لوگ نسل اور زبان پر زیادہ مصر تھے اور مذہب کو سب سے کم اہمیت کی چیز بتلاتے تھے یہ گویا

"اتحاد تورانی" کے حامی تھے۔

آخر میں جلسہ نے یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ جو مصنف ترکی قومیت کے خیال کا مجسمہ ہیں انہیں قسطنطنیہ میں ٹھہرنا چاہیئے یا نہیں اور چلا جانا چاہیئے۔ اس موقع پر ایک نوجوان صحیفہ نگار محمد علی توفیق نے ایک جوشیلی تقریر کی جو خطابت کی تاثیر سے پر تھی اور جس میں مشورہ دیا گیا تھا مصنف یہ نہیں کہ قسطنطنیہ میں ٹھہریں بلکہ انہیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے کو شہید کرائیں ... کے اعلان پر اپنے خون سے مہر لگائیں۔ اگرچہ ان دنوں اپنے کو شہید کرا دینا کچھ مشکل نہ تھا پھر بھی جو مصنف اس شرف کے اہل سمجھے گئے تھے انکی کچھ عجیب سی حالت تھی۔ امین جن کا نام سب سے اول تھا اپنے ہاتھ باندھے بیٹھے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔ میرا نام بھی انتخاب میں آیا تھا اور میں سوچتی تھی کہ محمد امین اس وقت موت کے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بہت سے دوستوں کی آنکھوں میں نمی دکھائی دیتی تھی اور میں تو سمجھتی ہوں ... ایام میں یہ سب سے بڑا مذاق تھا جو کیا گیا۔

دردانیال کا حملہ تو گذر گیا، لیکن مشرقی اناطولی محاذ پر گڑبڑ شروع ہوگئی۔ ارمنوں کے اخراج اور اس کے خوفناک نتائج کے متعلق افواہیں برابر پھیل رہی تھیں۔ چرچا تھا کہ ارمنیوں نے ترکی گانوں جلا ڈالے اور ترکوں کا قتل عام کیا۔ اسکا بھی چرچا تھا کہ انکے انقلابی مرکز ترکی فوج کے لئے اندرون ملک میں پریشانی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ ان واقعات کے ... بعد حکومت نے ایک کتاب شائع کی جس میں مشرقی اناطولیہ کی سازشوں کو طشت از بام کیا گیا۔ جب اخراج شروع ہوا تو عام رائے دل سے حکومت کی مخالف تھی لیکن ملک جنگ میں مبتلا تھا اور اس مسئلہ کے متعلق کوئی چیز شائع بھی نہ ہوئی تھی۔ ترکی آبادی کے لئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ اگر عام طور پر حکومت کی یہ کارروائی ناپسند کیجاتی تھی لیکن لوگوں کو ترکی کے شدید خطرے کا پورا احساس تھا اور سب سمجھتے تھے کہ اگر فوج کو شکست ہوئی تو ترک لٹ جائیں گے بلکہ صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے لوگ جانتے تھے کہ

ارمینوں کے انقلابی مرکز ترکوں کے خلاف اتحادیوں کی کارروائیوں کو کامیاب بنانے کے لئے کمین گاہ کا کام دیتے تھے۔ اس سیاسی دلیل کے علاوہ جس کو ارمینوں نے خواہ مخواہ اپنی سفاکانہ اعمال سے حق بجانب بنا دیا تھا ایک معاشی دلیل بھی تھی جس کی اخلاقی تائید جرمن کرتے تھے۔ وہ یہ تھی کہ ارمینوں کے معاشی تفوق کو ختم کیا جائے اور اس طرح منڈیاں ترکوں اور جرمنوں کے لئے خالی ہوں۔ [illegible] ذرا شک نہیں کہ جس سیاست خارجی نے ترکوں اور ارمینوں دونوں کو قتل کرایا وہ خوب جانتی تھی کہ فطرت معاشی دنیا میں بھی خلا کو پر کر دیتی ہے اور ملکی اقوام کے باہمی قتل سے جو جگہیں خالی ہونگی انہیں یورپی ممالک کی خاص آبادی ہی پر کرے گی۔

[illegible] انسان کو اپنے نوع کے قتل پر آمادہ کرتی ہیں؛ تخیلین کے اصول اور [illegible] مادی اغراض جو ان اصولوں کی اتباع سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہمیں تخیلین کے اصول زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، اس لئے کہ اگر آدمی ان سے اتفاق بھی نہ کرے تو ان کی عزت ضرور کرنی ہوتی ہے۔ طلعت انہیں تخیلین میں تھا۔ میں نے طلعت کو ارمینوں کے اخراج کے بعد سے بہت کم کہیں دیکھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ ایک دن اس مسئلہ پر بحث کرتے کرتے جوش میں آگئے اور ذرا درشت لہجہ میں کہا "خالدہ خانم، دیکھو۔ میرا دل بھی ویسا ہی اچھا ہے جیسا تمہارا، اور انسانی تکالیف کا خیال مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا لیکن یہ شخصی معاملہ ہے اور میں دنیا میں اپنی قوم کی خدمت کے لئے زندہ ہوں اپنے احساسات کی خاطر نہیں۔ کسی مقدونی یا ارمنی لیڈر کو جب کبھی ساری دنیا میں کہیں موقع ملتا ہے تو وہ چوکتا نہیں۔ جنگ بلقان کے زمانہ میں اتنے ہی ترک اور مسلمان قتل ہوئے، لیکن دنیا نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جبتک کوئی قوم اپنے اغراض کے لئے پوری کوشش کرتی ہے اور کامیاب ہوتی ہے۔ اس [illegible] دنیا اس کی قدر کرتی ہے اور اس کے اعمال کو اخلاقی مانتی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے لئے

میں اپنی جان دینے کو تیار ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کے لئے جان دونگا" ۱۹۲۲ء
میں ایک ارمنی نے انہیں برلن میں گولی کا نشانہ بنایا۔

۱۹۱۱ء میں میں نے ترک اوجک میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی، حاضر زیادہ تر اتحاد و ترقی والے تھے، تقریر ارمنی مسئلہ اور قومی معیشت کے متعلق تھی۔ آج ارمنی مسئلہ کے متعلق میرا جو خیال ہے اس وقت اس سے بالکل مختلف تھا۔ مجھے ارمنی مظالم کا علم نہ تھا اور میں یہ نہ سمجھتی تھی کہ اگر دوسری جگہ ایسے ہی حالات ہوتے تو دوسرے ہم سے سو گنا زیادہ سخت ثابت ہو [illegible] اس تقریر میں میں نے نہایت خلوص [illegible] کے ساتھ کی مخالفت [illegible] یہ ظاہر کیا کہ اس سے ظالموں کو مظلوموں سے زیادہ نقصان ہوگا۔ کوئی سات سو آدمی موجود تھے۔ میں نے تقریر ختم کی تو نوجوانوں نے خوب تالیاں بجائیں لیکن ایک مکتب کا ایک نوجوان طالبعلم جس کا نام شکری افلاطون تھا، اٹھا اور [illegible] سبھی کو پکار کر کہا: "جناب صدر، میں بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اور ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حق دوسری طرف ہے" ایک اور شخص اٹھا اور بولا "شکری افلاطون جس طرز کی گفتگو کرنا چاہتا ہے اسکی اجازت اوجک کو نہ دینی چاہئے۔ ہم اس قسم کا ایک لفظ سننا نہیں چاہتے۔" میرے نزدیک بڑی ناواجب بات تھی، لیکن صدر شکری افلاطون کی تقریر سننے پر حاضرین کو آمادہ نہ کرسکے۔ دوسرے ہی دن مجھے ارمنیوں کے ہاتھوں ترکوں کے قتل عام کے متعلق ایک بڑی سی کتاب ملی۔ میں نے یہ بھی سنا کہ اتحاد و ترقی کے بعض ارکین مجھ پر بہت خفا ہوئے اور یہ تجویز ہوئی کہ مجھے سزا دیجائے لیکن طلعت پاشا نے انکار کردیا۔ اور کہا "وہ اپنے ملک کی خدمت جس طرح ٹھیک سمجھتی ہے کرتی ہے۔ اسے اپنے خیالات ظاہر کرنے دو وہ سچی مخلص عورت ہے" البتہ ان نوجوان اہل فکر کی تعداد جو مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے بہت گھٹ گئی، لیکن طلعت پاشا نے اپنے [illegible] رویہ میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔

ادبیات ایران کی ترقی میں
سلطان محمود غزنوی کا حصہ

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عہد کے خلفاء و سلاطین خصوصاً خلفائے عباسیہ کے ذوق علم نے نہ صرف ایران بلکہ یونان و روم اور ہندوستان کے علما کو ایک مرکز پر مجتمع کر دیا تھا خود عربوں پر اس وقت مذہبی جوش کا پورا تسلط تھا۔ علاوہ بریں فطرتاً وہ بجائے ذہنی و دماغی کاوشوں کے عادی ہونیکے سیاست و تدبر ملکی فتوحات کی طرف زیادہ مائل تھے اس لئے انہوں نے اگر اسوقت عربی علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تو یہ قدرتی بات تھی لیکن خود ایران اسوقت عرب مسلمانوں کی محکومی میں داخل تھا اس کی زندگی اور اسکی قومیت کی بقا کی اگر کوئی صورت ہوسکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ وہ فاتح اور غالب قوم کی مذہبی سرگرمیوں اور اسکی اشاعت علوم و فنون کی کوششوں میں پوری اعانت کرے۔ بلاشبہ ایرانیوں نے ایسا کیا اور بعض حیثیتوں سے محکوم قوم حاکموں سے بھی فوقیت لے گئی۔ عرب و ایران کے اسی ذہنی اختلاط نے وہ شاندار علمی کارنامے انجام دئے جن پر آج اسلام کو بجا طور پر فخر و ناز ہے۔ پروفیسر براون لکھتے ہیں:۔

یہ فرض کر لینا کسی طرح صحیح نہیں کہ مسلمانوں کی فتح ایران کے بعد دو تین صدیاں ایران کی ذہنی تاریخ کا سادہ ورق تھیں۔ برخلاف اس کے یہ نہایت عجیب اور بے نظیر دلچسپیوں کا دور گزرا ہے عہد قدیم اور عہد جدید کے تداخل و امتزاج کی تشکیل۔ اور خیالات کے باہمی تجاذب اور اعتدال کا زمانہ تھا کسی معنی

میں بھی یہ جمود یا موت کا زمانہ نہ تھا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے کچھ مدت کے لیئے ایران کی علٰحدہ ہستی رک گئی، کیونکہ یہ اُس عظیم الشان اسلامی سلطنت میں جذب ہو گیا۔ جو جبل الطارق سے لیکر جیحون تک وسیع تھی لیکن اقلیم دماغی میں اس نے بہت جلد وہ غلبہ حاصل کر لیا جس کا استحقاق اہل ایران کی قابلیت اور فطری جودت و ذکاوت نے اسے دے رکھا تھا۔

اہل ایران میں ذہنی و دماغی جوہر پہلے سے موجود تھے ضرورت اس بات کی تھی کہ ان خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا جائے چنانچہ اسلام نے یہ اہم کام کیا اور ایرانیوں نے وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے جن سے خود اسلام کی وقعت و عظمت کو چار چاند لگ گئے۔

مصنف مراۃ الشعر نے قدیم فارسی کے وجود کے ثبوت میں باربدا اور اُس کی شاعری کا بھی نہایت اہمیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے لیکن مولانا مسلم عظیم آبادی کی رائے اس معاملے میں بالکل مختلف ہے:۔

قدیم فارسی شاعری کی تلاش میں باربدا در تین چار اور بھاٹوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ عرب شاعر خالد بن فیاض نے جو پہلی صدی کے آخر میں گذرا ہے۔ باربد کا افسانہ عربی میں لکھا ہے، باربد ایک بھاٹ تھا۔ جو خسرو پرویز کو گا بجا کر خوش کیا کرتا تھا۔ یہ نہایت مغلوب الغضب بادشاہ تھا۔ جب کوئی ناگوار بات اُس کے کانوں تک پہنچانا ہوتی تو اہل دربار، باربد کی موسیقی اور بولوں کے ذریعہ سے آگاہ کرتے۔ چنانچہ بادشاہ کے شدیز نامی گھوڑے کی موت کی خبر باربد نے اُسے کس طرح گا کر دی ہے خالد نے عربی نظم میں اس کو بتایا ہے مگر عربی میں اس قسم کے افسانے اور چٹکلے بہت ہیں جن کو تاریخی رنگ دیکر دلچسپ اور مقبول طبع بنایا گیا ہے۔

اگر باربد کی اصلیت تسلیم بھی کر لیجائے تو اس کے بول شعر نہ تھے چنانچہ عوفی کا بیان ہے :-

"نوائے خسروانی کہ آں را باربد در صورت دادہ است بسیار است نا از وزن شعر و قافیہ و مراعات تناظران دور است بداں سبب تعرض کردہ نہ…"

درحقیقت موسیقی اور شاعری دو چیزیں الگ الگ ہیں اور بھاٹوں کا وجود بجائے تہذیب و تمدن کی علامت کے ہمیشہ اور ہر ملک کی تاریخ میں وحشت وبربریت کی نشانی رہا ہے آجتک غیر مہذب پہاڑی علاقوں میں بھاٹ پائے جاتے ہیں جو اپنے گایا کرتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے دور وحشت میں امیروں کے درباروں میں آزاد آوارہ گرد بھاٹ پہنچا کرتے تھے جنکی صحیح تصویر مشہور افسانہ نویس اور قومی شاعر سر والٹر سکاٹ نے اپنی تصانیف میں کھینچی ہے۔ ..... سرحدی پٹھانوں میں بھی بھاٹ موجود ہیں۔ مگر انکا وجود تمدن تہذیب اور علم و ادب سے جو کچھ علاقہ رکھتا ہے محتاج بیان نہیں "

علامہ شبلی نے بھی باربد اور اسکی شاعری کے متعلق کم و بیش انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قدیم شاعری کے ثبوت میں اکثر یہ دو شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

ترا بہ گیہاں نوشہ بدی — جہاں را بہ دیدار توشہ بدی

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ — نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

ان میں سے پہلا شعر شاہنامہ میں بھی موجود ہے جب کوئی درباری بادشاہ سے عرض معروض کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس شعر کو پڑھ لیتا ہے۔ دوسرا شعر بہرام گور کا بتایا جاتا ہے ایک مرتبہ شیر کا شکار کر کے پرجوش تفاخرانہ لہجہ میں بے ساختہ اس کے منہ سے یہ موزوں الفاظ نکل گئے۔ بہرام گور کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے عرب میں تربیت پائی جو اس زمانہ

میں شعر و شاعری کا مرکز تھا اس لئے اس میں یہ مذاق پیدا نہ ہونا تعجب تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے کچھ عربی اشعار بھی نقل کئے ہیں مگر اس فارسی "شعر" کے متعلق عوفی کا خیال ہے کہ یہ صرف چند موزوں الفاظ ہیں انکو شعر نہیں کہا جا سکتا۔ لب الالباب میں اس شعر کو جس طرح لکھا ہے وہ بہ نسبت نظم کے نثر سے زیادہ مشابہ ہے لیکن دوسرے تذکرہ نویسوں نے جنکا تمام تر ماخذ لباب الالباب ہے اصلاح و تحریف کے بعد بالکل فارسی بحر میں کر دیا ہے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایران جیسے متمدن اور ترقی یافتہ ملک میں ناممکن تھا کہ شعر و شاعری کا وجود نہ ہوتا خصوصاً جبکہ وہاں فطری صلاحیتیں بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں لیکن [illegible] کا جواب اس طرح دیتے ہیں۔

> "ایران کی سینکڑوں تلمیحات اور روایتیں آج موجود ہیں ایران کا فلسفہ اور علوم [illegible] رہے لیکن علمائے ایران کے نام اور انکے اقوال آجتک کتابوں میں نقل ہوتے چلے آتے ہیں۔ یورپ کے محققوں نے پہلوی زبان کی بہت سی کتابیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالی ہیں لیکن چار شعر بھی ہاتھ نہیں آئے فارسی کے قدیم اشعار نہ ملتے تو نہ ملتے لیکن شعرا کا نام تو زبان پر ہوتا ....."

اس سے پہلے کہیں تذکرہ ہو چکا ہے کہ جب دولت عباسیہ میں ضعف و انحطاط شروع ہوا تو تمام بڑے بڑے صوبے خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے، اور انکی بجائے مستقل حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت خراسان میں قائم ہوئی۔ ظاہر ہے کہ دربار کی شان و شوکت کے لئے دوسرے لوازم کے ساتھ شاعروں کا ہونا بھی ضروری تھا چنانچہ اس زمانہ میں متعدد فارسی شعرا پیدا ہو گئے یہ تیسری صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ تھا فارسی شاعری نے حقیقت یہ ہے کہ اسی زمانہ میں جنم لیا۔ ورنہ اس سے پیشتر کم و بیش دو سو سال تک ایران میں تقریباً بالکل خاموشی چھائی رہی۔ یہ سچ ہے کہ اس عرصہ میں کبھی کبھی کچھ چرچا ہو جاتا تھا [illegible] ثبوت ہے کہ ایرانیوں کے نہاں خانہ

فطرت میں شاعری کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں لیکن کوئی ہوا دینے والا نہ تھا اس لئے عرصہ تک وہ یونہیں دبی پڑی رہیں اور جب یہ بات حاصل ہوگئی تو تھوڑے ہی عرصہ میں ایران میں شاعری اس طرح پھیل گئی جیسے "بن میں آگ لگ جائے"، لیکن یہ امر ہنوز حل طلب ہے کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر اس قدر طویل عرصہ تک ایرانیوں کی زبان گنگ رہی اور ایران ایک شاعر بھی پیدا نہ کرسکا۔ مولانا شبلی نے اس کے مختلف اسباب بتائے ہیں ایک موقع پر لکھتے ہیں:

"اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا اس کو مذہبی نشے سے اس قدر لبریز کردیتا تھا کہ اُسے سوائے مذہب کے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا۔ خود عرب کو دیکھو وہ ملک جس کے ذرے ذرے سے شاعری کی آوازیں آتی تھیں۔ اسلام کے آتے ہی دفعتہً چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ولید کے زمانہ میں جب [illegible] قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت [illegible]ی نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی اس لئے شاعری بھی عربی رہی شعرا جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح انکی زبان کیونکر سمجھتا اور نہ سمجھتا تو انکی داد کیا دیتا"

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

ایک بڑا سبب یہ بھی ہوا کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم وفنون اور ادب و انشا کا سرمایہ اس قدر وسیع کرلیا تھا اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اُس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے قیمت نظر آتا تھا۔ دوسری تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں۔ یعنی ایران، مصر، شام، اندلس ان تمام ممالک میں اسلامی علوم وفنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم وفنون کو بالکل ماند کردیا اس لئے عرب کی شاعری کے آگے دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری

کرتے شرم آتی تھی، خراسان، شام، مصر وغیرہ میں سینکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہو گئے تھے، لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی میں کہتے تھے ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عجمی شعرا کا مفصل تذکرہ لکھا ہے (۱)

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں :-

"اصل یہ ہے کہ اسلام جب ایران میں آیا تو ایک مدت تک عرب براہ راست حکمراں رہے حتیٰ کہ بنوامیہ کے زمانہ تک صوبوں اور اضلاع کے حاکم بھی عرب ہی ہوتے تھے عباسیوں کے دور میں وزارت عجم کے ہاتھ میں آئی اور برامکہ کے مشہور خاندان نے اس قدر اقتدار حاصل کر لیا کہ عنان سلطنت بھی گویا اس کے قبضہ میں آگئی . . . . . شخصی سلطنتوں میں علوم و فنون بھی سلطنتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ اس لئے جب تک ایران میں خالص عرب کی حکومت رہی فارسی شاعری نے زبان نہیں کھولی" (۲)۔

لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ایرانیوں کو اپنی زبان کی طرف سے بے توجہی نہ تھی اس میں شک نہیں کہ عربی علم و ادب میں انہوں نے زبردست کمال حاصل کیا اور علم و ادب کی ہر شاخ میں مہارت پیدا کی، یہ بھی صحیح ہے کہ شروع شروع میں عربی علم و ادب نے دل و دماغ کو اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ اپنی زبان نظروں میں ذرا بھی نہیں جچتی تھی، پھر بھی اپنی ملکی زبان کی محبت دل سے کیونکر دور ہو سکتی تھی۔ عربی میں وہ جو کچھ کہتے تھے محض خلفاء و سلاطین کی قدر دانی اور صلہ کی خاطر۔ برعکس اس کے فارسی شاعری کا کوئی قدرداں نہ تھا اس لئے کچھ کہتے بھی تو حوصلہ افزائی کون کرتا اور صلہ کہاں سے پاتے لیکن باوجود اس کے جہاں کہیں انہیں ذرا سا بھی موقع مل جاتا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ

(۱) شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۷ (۲) شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۱ و ۱۲

ہ کرنے تھے ۔ چنانچہ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں اس کی ایک مثال نظر آتی ہے مامون الرشید کی ماں عجمی تھی خود دربار میں عجمیوں کی کثرت تھی اس لئے عجمی شعرا کو اپنی زبان زندہ کرنے کے لئے یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اور عباس مروزی نے یہ فارسی قصیدہ مامون کی خدمت میں پیش کر دیا ۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود در فرقدین
گسترانیدہ بفضل وجود در عالم یدین

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را
دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین

کس بدین منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت
مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بیں

لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت
گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

مامون نے اس کے صلہ میں ہزار اشرفیاں دیں، لیکن مامون پھر بغداد چلا گیا اسلئے فارسی شاعری پر خاموشی چھا گئی ۔

ہم بتا چکے ہیں کہ دولت عباسیہ کے زوال کے وقت پہلا شخص جس نے خود مختاری اور استقلال کی جانب قدم بڑھایا ہے خراسان کا حاکم عام یا گورنر تھا ۔ اس خاندان نے جو خاندان طاہریہ کے نام سے مشہور ہے کم و بیش ۵۰ برس تک شاہانہ کر و فر کے ساتھ خراسان پر حکومت کی خود یہ خاندان عربی النسل تھا اور فارسی سے بہت کم ذوق رکھتا تھا لیکن چونکہ حکومت خراسان میں تھی اور شاہانہ شان و شوکت کے لئے شاعروں کا وجود ضروری تھا، اس لئے حنظلہ ۔ محمود وراق فیروز مشرقی وغیرہ کئی شاعر پیدا ہو گئے ۔ یہ فارسی شاعری کی ابتدا تھی اور یہیں سے اس نے آہستہ آہستہ ترقی کے قدم اٹھانا شروع کئے ۔ یعقوب صفار اور اس کے خاندان کے عہد میں بھی ابو سلیک گورگانی وغیرہ دو ایک اچھے شاعر پیدا ہوئے ۔ لیکن فارسی شاعری کو حقیقی معنی میں ترقی و عروج سامانی خاندان کے زمانہ میں شروع ہوا ۔ اس خاندان کی قدر افزائیوں سے فارسی شاعری میں چار چاند لگ گئے اور تھوڑے عرصہ میں شاعری نے حیرت انگیز ترقی کر لی ۔ ایران میں عربی اثرات کے خلاف ردعمل

کی ابتدا ابھی یہیں سے ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سامانی خاندان کا سلسلہ نسب بہرام چوبین تک پہنچتا ہے اس لئے اس خاندان میں حکومت و اقتدار کے آنے کا مطلب یہی تھا کہ عجمی شان و شوکت جاہ و جلال دوبارہ عود کر آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا عجمی و ایرانی علوم و فنون اور ادبیات کی سرپرستی ہونے لگی شعرائے ایران کی حوصلے کے موافق قدردانی کیجانے لگی۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کو اس وقت کی زبان میں قلمبند اور منظوم کرنے کا خیال اسی عہد میں پیدا ہوا اور دقیقی کو یہ کام سپرد کیا گیا جس کی تکمیل بعد میں آکر فردوسی نے کی سامانی خاندان کی یہی قدردانیاں اور حوصلہ افزائیاں تھیں جنہوں نے بہت سے باکمال شعرا پیدا کر دئے فارسی زبان کو انہوں [illegible] زندگی بخشی جو خود انکی اور انکے آباؤ اجداد کی زبان تھی اور جو [illegible] بلہ میں دوسری زبانوں کی طرح مٹ جانیوالی تھی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ پیدا کہ عربی زبان کی جو ہیبت ایرانیوں کے دلوں پر بیٹھ گئی تھی وہ زائل ہونے لگی اور ان کی سمجھ میں آیا کہ دوسری زبانوں کی طرح فارسی میں بھی بہت کچھ صلاحیتیں موجود ہیں خود سامانی خاندان قدردان علم و فن ہونیکے ساتھ صاحب کمال اور سخن سنج تھا اس نے دیکھا ایرانی اپنی قومی و ملکی خصوصیات سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے ہیں اور ان کی محنت و قابلیت ایک غیر زبان پر صرف ہو رہی ہے انکی دور اندیش نظر نے یہ بھی تاڑ لیا کہ اگر کچھ دنوں اور یہی رفتار رہی تو ایران اپنا قومی و ملکی عز و وقار کھو بیٹھے گا۔ اس لئے اس خاندان کے حکمرانوں نے ایرانی علوم و ادبیات کی قدرافزائی میں فراخ دلی اور سیر چشمی سے کام لیا فارسی شعرا کے بیش قرار مشاہرے مقرر کئے بہت سی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کرائے ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا کتابیں لکھوائیں اپنے اسلاف کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لئے شاہنامہ کی بنیاد ڈالی۔ غرضکہ انہوں نے عرب کے مقابلہ میں عجم کو زندہ کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا جو انکے امکان میں تھا چنانچہ اس زمانہ میں فارسی کے ان گنت شعرا پیدا ہوگئے۔ جن میں رودکی[1]، دقیقی[2]، ابو شکور بلخی

اور مروزی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے علی قدر مراتب فارسی شاعری

---

(۱) رودکی اس دور کا مشہور شاعر ہے تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا۔ سامانیوں کے عہد میں سینکڑوں شعرا تھے لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے شریف گورگانی کہتا ہے۔

از یں چندیں نعیم جاودانی   کہ ماند از آل سامان و آل ساماں

ثنائے رودکی ماندست و مدحش   نوائے باربد ماندست و دستاں

رودکی کا اصلی نام محمد جعفر، رودک نخشب یا نسف کے ضلع میں ایک گاوں تھا بعض کے نزدیک وہ رودک (ایک باجہ کا نام) اچھا بجاتا تھا۔ مادرزاد اندھا تھا۔ ۸ سال کے سن میں قرآن حفظ کیا فن قرات میں تکمیل کی، شاعری بھی اسی وقت سے شروع کر دی ساتھ ساتھ علوم متداولہ میں کمال حاصل کیا۔ آواز اچھی تھی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں کامل تھا۔ آخر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں رسائی ہوئی بادشاہ کی جانب سے زیادہ قدر دانی کا اظہار رہا۔ اور رفتہ رفتہ رودکی کو اسقدر دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امرا بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سواری میں دو سو زریں کمر غلام رکاب کے ساتھ چلتے سلطان نصر بن احمد نے کلیلہ دمنہ نظم کرائی اور ۴۰ ہزار درہم انعام دیے عنصری کہتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

(تفصیل کے لئے دیکھو شعر العجم جلد اول بیان رودکی)

(۲) اصل نام منصور بن احمد وطن بخارا۔ ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابو المظفر نے کی لیکن جب اسکا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں ملا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، دقیقی نے یہ خدمت قبول کی اور کم و بیش ۲۰ ہزار شعر لکھے جو آج شاہنامے میں شامل ہیں مثنوی کے ساتھ قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی۔ شعرا سی کی غزل کے ہیں۔ (بر صفحہ ۱۱۸)

کو ترقی دینے کی زبردست کوششیں کیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ طاہریہ خاندان سے لیکر اس وقت تک فارسی شاعری نے طفولیت سے نکل کر کس طرح جوانی میں قدم رکھا ہے وہی زبان جس میں پہلے لوگوں کو ایک شعر بھی کہتے شرم آتی تھی تھوڑی مدت میں کس طرح بام عروج پر پہنچ گئی اور کس طرح اس کا دامن علمی و ادبی خزانوں سے مالا مال ہوگیا۔ یہ درحقیقت ایرانی امرا و سلاطین کی قدردانیاں اور حوصلہ افزائیاں تھیں جنہوں نے ایران کی دماغی کاوشوں کے سیلاب کا رُخ پھیر دیا۔ عربی ایک غیر ملکی زبان تھی پھر بھی ایرانیوں نے عربی ادب اور علوم [illegible] میں ایسی حیرت انگیز مہارت، ذہانت اور طباعی کا ثبوت دیا کہ خود عربوں کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ فارسی خود گھر کی زبان تھی اور جب انہیں خود اپنی زبان کو ترقی دینے کا موقع ملا تو اس میں انہوں نے اور بھی کمال دکھا دیا اور تھوڑی سی مدت میں اتنی ترقی کرلی کہ دوسری قوموں کو اس کے لئے طویل عرصہ درکار ہوتا۔ تاہم چونکہ امرا و سلاطین کی عام طور پر توجہ شاعری کی طرف تھی اس لئے اہل ملک کا بھی

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد | آرے دہد و لے بہ عمر دگر دہد
من عمر خویش را بہ صبوری گزاشتم | عمر دگر بباید تا صبر بر دہد

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور مے و معشوق پر لکھی ہے جس کے چار شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں

روا فگندا سے صنم ابر بہشتی | زمیں را خلعت ارد بہشتی
زمیں برساں خون آلودہ و | ہوا برساں خون آلودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک | مثال دوست بر صحرا نوشتی
ستے رخسار او ہمرنگ یاقوت | مئے بر گونہ جیا سہ کنشتی
جہاں طاوس گونہ گشت گوئی | بجائے نرمی و جائے درشتی

دقیقی شاہنامہ نظم کرنے میں مصروف تھا کہ ایک نوجوان نے قتل کر دیا (شعرالعجم جلد اول)

زیادہ تر رجحان اسی طرف رہا۔ اور تھوڑے سے وقفہ میں فارسی شاعری کا مذاق گھر گھر پھیل گیا غرضکہ فارسی زبان اپنی ترقی و عروج کے لئے بڑی حد تک ایرانی امرا و سلاطین کی رہین منت ہو۔ سامانی خاندان کے علاوہ ایران میں اور بہت سے خاندانوں نے عروج حاصل کیا اگرچہ ان میں آپس میں اپنے جاہ و اقتدار کے لئے گہری رقابت اور دشمنی ہوتی تھی اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے لئے موقع کا منتظر رہتا تھا لیکن پھر بھی انمیں کوئی چیز یا یہ الاشتراک سی تو اپنی زبان کو ترقی دینے کا جذبہ تھا ان میں سے اکثر نہ صرف یہ کہ شعرا اور علما کے قدردان ہوتے تھے بلکہ خود بھی انہیں علم و ادب میں اچھی خاصی دستگاہ ہوتی تھی۔ شاعری کی ترقی میں انکی نکتہ سنجی اور قابلیت علمی کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ شاعر کی قدر و منزلت انکے یہاں حکومت کے کسی اہم رکن سے کسی طرح کم نہ تھی بڑے بڑے شہنشاہ شعرا کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتے تھے شاعروں کے گھر پر ملاقات کے لئے جاتے تھے۔ مشہور سلاطین کے یہاں ملک الشعرا کا عہدہ قائم تھا جس کی بیش قرار تنخواہ ہوتی تھی ملک الشعرا کے علاوہ دربار میں اور بھی بہت سے شاعر ہوتے جو مختلف موقعوں پر مدحیہ قصائد لکھکر انعام حاصل کرتے چنانچہ محمود کے دربار میں علاوہ ملک الشعرا عنصری کے چار سو شاعر تھے۔ شعرا کی ان قدردانیوں کی تہ میں علاوہ زبان کی خدمت کے ایک اور جذبہ بھی کام کر رہا تھا اور وہ یہ کہ شعر بقائے نام اور شہرت دوام کا سب سے بڑا ذریعہ ہو۔ شریف گورگانی کہتا ہے۔

ازاں چندیں نعیم جاودانی — کہ ماند از آل ساساں و آل ساماں
ثنائے رودکی ماند ست مدحش — نوائے باربد ماند است دستاں

نظامی عروضی کہتے ہیں۔

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد — کہ از رفعت ہمی با سر ندا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برجائے — مدیح عنصری ماند است برجائے

اسمیں شک نہیں کہ شاہان ایران کی یہ فیاضیاں اسراف و تبذیر کی حد تک پہنچ گئی تھیں

لیکن اسمیں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسقدر غیر معمولی فیاضی، اور داد و دہش سے کام نہ لیا جاتا تو شاعری کو اس قدر فروغ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

> یہ فیاضیاں اصول سلطنت کے لحاظ سے جائز تھیں یا ناجائز اسکا فیصلہ شاعری کی تاریخ سے تعلق نہیں رکھتا لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ [illegible] نے شاعری کی ترقی و وسعت میں آب حیات کا کام دیا تمام ملک میں شاعری کا مذاق پھیل گیا بڑے بڑے حکما اور علما علوم و فنون چھوڑ کر شاعر بن گئے فیاضیاں نہ ہوتیں تو اقلیم سخن کو خیام، انوری، نظامی، ناصر خسرو، [illegible] کہاں سے ہاتھ آتے۔

چونکہ فارسی شاعری سلاطین و امرا کے دامن دولت میں تربیت پا رہی تھی اور روز بروز ترقی و وسعت حاصل کر رہی تھی تا آنکہ سلطان محمود کا زمانہ آیا یہ وقت فارسی ادبیات کی ترقی و عروج کے شباب کا تھا۔ محمود کی ادبی سرپرستیوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور فارسی شاعری ترقی کے انتہائی منازل تک پہنچ گئی ایران کے مشہور شعرا فردوسی عنصری۔ اسدی طوسی۔ منوچہری۔ فرخی۔ حکیم سنائی جن میں سے ہر ایک یکتائے روزگار ہے۔ سب اسی عہد کی پیدا وار ہیں۔

رائنر ماریا رلکے

(نمبر ۲)

(مئی کے نمبر میں ڈاکٹر سلیم الزمان صاحب اس جرمن شاعر کے کلام کی خصوصیا بتا چکے ہیں ۔ اب وہ اسکی چند منتخب نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں)

آوازیں

ماخوذ از "دس بوخ در بلد"

عنوان

امیر اور خوش نصیب کیوں نہ چپ رہیں ،
کوئی کیوں جانے کہ وہ کیا ہیں ۔
لیکن محتاج تو اپنے تئیں دکھائیں گے
وہ تو کہیں گے
کہ لوگو دیکھو میں اندھا ہوں
یا نہیں ہوں تو ہو جاؤں گا ،
یا بڑی آفت ہے مجھپر جینا ،
یا میرا بچہ بیمار ہے ،
یا یہ دیکھو میں پیوند ہوں اور پیوند دل پر رکھو
اور شائد اتنے ہی پر بس نہیں
اور چونکہ لوگ جیسے سب چیزوں کو دیکھے انکو
دیکھتے جاتے ہیں اور گزرتے جاتے ہیں

اس لئے وہ مجبوراً گاتے ہیں۔
اور ان سے اچھے اچھے گیت سننے میں آتے ہیں
البتہ آدمی زاد عجیب مخلوق ہے
اس کو مجہول راہبوں⁽¹⁾ کے مل مل کر گانے میں زیادہ مزا آتا ہے۔
لیکن خدا خود [illegible] کے گیت سننے آتا ہے اور دیر تک سنتا ہے
جب یہ مجنون اسے سناتے ہیں۔

[illegible]ھے کا گیت

میں اندھا ہوں، اے باہر والو⁽²⁾، ایک عذاب ہے یہ،
ایک نقیض ہے، ایک تضاد ہے یہ،
ایک دن دو نا رات چوگنا بوجھ۔
اپنا ہاتھ اپنی جورو کے کاندھے پر رکھ لیتا ہوں
اپنا بیرنگ ہاتھ اس کی بیرنگ بیرنگی پر،
اور وہ مجھکو ایک خالی عالم میں لئے پھرتی ہے
تم کتراتے ہو، ذرا ہٹتے ہو، جگہ دیتے ہو، اور سمجھتے ہو

---

(۱) ان راہبوں کیطرف اشارہ ہے جو قرون وسطیٰ میں رومن کیتھاک گرجوں میں گانے کے لئے اختہ کردئے جاتے تھے تاکہ انکی آوازوں کی شیریني قائم رہے۔
(۲) مترجم اس اندھے کیطرف نظر التفات چاہتا ہے جو ساری دنیا کو "اے باہر والو" کہکر مخاطب کرتا ہے اور جسکے درد بھرے دل اور کانوں کیلئے لوگوں کے ذرا ہٹ بچکر نکل جانیکی آہٹ پتھروں کے ٹکرانے کی کرخت آواز سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان آہٹوں سے اسمیں اپنی مجبوری اور معذوری کا احساس برابر تازہ ہوتا رہتا ہے

کہ تمہارے ہنسنے بجنے کی آوازیں پتھروں کے ٹکرانے کی آوازوں سو شیریں تر ہیں -
لیکن تم غلطی پر ہو۔ میں تنہا
پیتا ہوں، رنج سہتا ہوں، شور کرتا ہوں۔
میرے اندر نالوں کا ایک طوفان ہے۔
اور مجھے پتہ نہیں چلتا کہ یہ میرے اندر کون چلا رہا ہے
میرا دل یا میری انتڑیاں -
[illegible] نے یہ گیت ؟ کچھ تم نے تو گائے نہ تھے یہ ،
اور گائے بھی تھے تو بالکل اسی انداز سے نہیں
تمہارے کھلے کھلے گھروں میں تمہارے لئے
روز کے روز ایک نئی گرمی، ایک نئی روشنی نازل ہوتی ہے -
اور تم ایک دوسرے کے چہروں سے متاثر ہوتے ہو
اس سے آدمی آدمی کا خیال کرتا ہے -

شرابی کا گیت

میرے اندر نہ تھا - جا آتا تھا، آتا تھا -
میں نے روکنا چاہا -
شراب نے روکا -
(اب کچھ یاد نہیں کہ کیا تھا)
پھر اس نے میرے لئے کبھی یہ چیز ردگی کبھی وہ -
پھر میں نے اپنے تئیں بالکل اس کے حوالے کر دیا -
میں سڑکی

اور اب میں اس کا کمیں ہوں،
مجھے جدھر چاہے پھینکے، میری اوقات پر تھوکے،
چاہے ابھی اس جانور کے ہاتھ بیچ دے،
جس کا نام موت ہے
اور جب اس نے مجھ میلے کچیلے پتے کو چیت لیا
جیسے اپنی کھوپڑی کی پپڑیاں کھجائیں
اور مجھے لید کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

خودکشی کرنیوالے کا گیت۔

اور بس ایک لمحہ۔
بار بار یہ لوگ میرے پھندے کو
کاٹ دیتے ہیں۔
کچھ دن ہوئے میں بالکل تیار تھا،
بلکہ میری انتڑیوں میں
جیسے کچھ ادھر والوں کی سی آوازیں تک آنے لگی تھیں۔
بار بار منہ میں کچھ دئے کھڑے ہیں۔
زندگی کا چمچہ۔
نہیں، اب مجھ سے یہ نہیں نگلا جاتا
اگلنے دو خدارا اگلنے دو۔
جانتا ہوں کہ زندگی اچھی اور مزے کی چیز ہے
ورنہ دنیا ایک بھری ہانڈی ہے

لیکن میرے خون میں وہ نہیں اترتی
میرے تو اس نے صرف سر کو پکڑ لیا ہے ، سر کو
اوروں کے لئے پالنا ہے میرے لئے آزار ،
سمجھو تو سبھی لوگو کہ وہ آدمی کے حلق سے نہیں اترتی
اب تو مجھے ایک ہزار برس تک
پرہیز ہی [illegible]

امین کی یوسف زلیخا

دکھنی اردو کے مواد فراہم کرنے کے سلسلے میں اب میں پیرس کے قومی کتبخانہ
سے استفادہ کر رہا ہوں مکرم دوست مسٹر یوسف حسین خاں کے حسب ارشاد
ایک مضمون ناظرین "جامعہ" کی ضیافت طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے
گر قبول افتد زہے عز و شرف ۔

ہاشمی

یورپ کے عظیم الشان کتب خانوں میں جہاں دیگر زبانوں کے مخطوط محفوظ ہیں وہاں ہماری اردو کے مخطوطے بھی زینت کتب خانہ بنے ہیں۔ لنڈن(۱) کے مشہور کتب خانوں کے علاوہ پیرس اور برلن میں بھی ان کا کافی ذخیرہ ہے جس پر تفصیل سے کام کرنے کے لئے ایک بڑے وقت کی ضرورت ہے۔

انگلستان کے کتب خانوں سے جو مواد حاصل ہوا ہے وہ کئی سو صفحات کا متقاضی ہے رسالہ معارف اور نیرنگ خیال وغیرہ کے ذریعہ کچھ حالات پیش کئے گئے ہیں۔

پیرس کا کتب خانہ Bibliothèque Nationale سے موسوم ہے اس کے ذخیرہ کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہے۔ اس کی عمارت وسط شہر میں نہایت عظیم الشان اور شاندار ہے۔ برٹش میوزیم کی طرح یہاں بھی مطالعہ کے علحدہ(۲) علحدہ مقام ہیں۔ انتظامی

---

(۱) لندن کے تین کتب خانوں میں اردو مخطوط ہیں یعنی انڈیا آفس۔ برٹش میوزیم رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ اس کے علاوہ اڈنبرا۔ آکسفوڈ اور کیمبرج اور ایڈن میں بھی اس کا مواد ہے۔

(۲) برٹش میوزیم میں مطالعہ کے تین مقام ہیں۔ مطبوعہ کتب کے مطالعہ کا مقام۔ مخطوطوں کے مطالعہ کی جگہ اور مشرقی علوم کے مطالعہ کا مقام۔ مگر پیرس میں دو مقام ہیں آخرالذکر مقام علحدہ نہیں ہے

حالت کے لحاظ سے انگلستان کے ہر کتب خانہ کو فوقیت دیجا سکتی ہے۔ اردو مخطوطوں کی گرد آلود حالت سے قیاس ہوتا ہے وہ عرصہ دراز سے زیر مطالعہ نہیں رہے ہیں۔ انکی کوئی علحدہ فہرست نہیں ہے بلکہ مرہٹی۔ ہندی۔ بھاکا وغیرہ کے ساتھ ان کو شامل کرکے انڈین [illegible] مخطوطوں سے انکو موسوم کیا گیا ہے مذکورہ کیٹلاگ ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی ہے جس کا مصنف [illegible] A. Cam ba tam ہے۔

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ کل مخطوطوں کی وضاحت کیجائے جس کے لئے کوئی اور وقت چاہئے۔ البتہ یہاں صرف ایک مخطوطہ کی صراحت کیجاتی ہے۔

زیر بحث مثنوی یوسف زلیخا کا نمبر (۶۵۲) اور ان کی تعداد (۱۴۹) اور فی صفحہ (۱۷) سطر ہیں۔ نستعلیق میں لکھی گئی ہے مگر خوش خط نہیں ہے۔

یہ مثنوی محمد امین کی تصنیف ہے۔ انکے متعلق قدیم تذکرہ جات [illegible] البتہ ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے اور اس کا پہلا شعر بھی بطور نمونہ درج کیا ہے۔ مؤلف اردوئے قدیم نے اسپرنگر کی صراحت کو اپنی تالیف میں اردو کا جامہ پہنایا ہے مثنوی کے متعلق کوئی مزید اضافہ نہیں کیا۔

جہانتک میرا خیال ہے اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے کیونکہ آج تک جس [illegible] مضامین دکنیات وغیرہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں ان میں غالبًا اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس مخطوطہ کی اہمیت زیادہ ہوجاتی ہے۔

امین کا نام محمد امین ہے یہ گجرات کے رہنے والے صوفی المشرب قادریہ طریقہ کے بزرگ تھے عالمگیر کے عہد میں زندہ تھے اسی زمانہ میں اپنی مثنوی لکھی۔ انکے کلام سے انکے صوفی ہونے کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ مثنوی جیسا کہ قبل ازیں ظاہر کیا گیا ہے خاصی ضخیم ہے اس کے اشعار کی تعداد (۲۱۱۴) ہے اور تاریخ تصنیف [illegible] الاول ۱۰۰۸ھ۔ ان امور کو خود مصنف نے بیان کیا

ہے ملاحظہ ہو۔

اگیارہ سو اوپر جب تو گزرے — برس ہجرت محمد مصطفیٰ کے
بیتان چالیس سو پر چودہ اور سو — میں لکھا گودمری کے بیچ سن لیو
جمادی الاول میں اتوار کے روز — اتھی تاریخ دو جی دے دل افروز
پیسی کے وقت لکھ رہیا امین رے — الہی تون محبت سب کیتن دے

(ص ۱۹۸)

امین نے اس کو فارسی سے گجراتی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کو گوجری سے اور "گودمری" سے موسوم کیا ہے۔ مصنف نے اکثر جگہ اس کا ذکر کیا ہے مگر یہ نہیں بیان کیا کہ کس کی فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

سبب رے اب یوں امین کا — لکھے گوجری میں یوسف زلیخا
ہر یک جاگہ قصہ ہے فارسی میں — امین اسکوں اتارے گوجری میں

(ص ۱۰)

پڑا ہوے جو کوئی فارسی کون — وہی جانے حقیقت دے سو دل من
اسے جو ناں پڑا ہووے بچارا — سو کیا بوجھے اتون کا عشق سارا
میں اس کے واسطے کیتی یہ گجری — حقیقت سب عیاں ہووے اون کی

(ص ۲۹۵)

یہ مں آتا ہے میرے دل میں یون — زلیخا اور یوسف کے قصے کون
کروں پورا سنے سو ہووے خوشحال — سنے اس کے جگت کے چھورے جنجال
الہی تیں منجھے توفیق جو دی — تو میں کی فارسی سین گوجری کی

(ص ۲۹۴)

مثنوی میں حسب رواج قدیمہ اول حمد ہے [illegible] شعر ہیں اس کے بعد

نعت میں (۱۲۹) شعر اسی میں معراج کے متعلق بھی صراحت ہے پھر وہ خلفائے راشدین کی منقبت کا عنوان قائم کرتے ہیں اسی سلسلہ میں امام حسینؓ فاطمہ زہراؓ امام ابو حنیفہ و امام مالک و امام شافعی اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کی ہے۔ اس کے بعد عشق کی توصیف کرتے ہوئے قصہ کی ابتدا کی ہے۔ قصہ کو بھی عنوانات کے تحت لکھا ہے۔ آخر میں خاتمہ سے پہلے عالمگیر کی مدح کی ہے اور اس کی عدالت کا ذکر کرتے ہوئے دعائے خیر کی ہے۔

قاضی محمود بحری نے اس کے کچھ ہی عرصہ بعد "من لگن" ۱۱۱۲ھ میں لکھی مگر زبان کے لحاظ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے اس کی زبان قاضی صاحب سے بہت صاف ہے۔ بطور مقابلہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بحری نے حمد اور نعت میں لکھا ہے:-

اے رب ترا رتی رتی ہے	رت رت رتی رتی ہے
اوٹھ اے قلم اس گھڑی نگر جایا	[illegible]
ہے نانوا حد نشان احمد	سرخی سوا حد ہے یان احمد

یا مثلاً عالمگیر کی مدح کرتے ہیں:-

اب بول تون مدح بادشاہ کا	ہور اس کی کمالیت کلاہ کا
جس کی بود و باش بن کی عادت	عالمگیر ہے [illegible] عبادت
یک ملک نہیں جوان لیا نہیں	یک نفس نہیں جوان کیا نہیں
شدا بد لیسر ہور دانا	یک علم نہ سب بنے سیانا

نعت میں امین کے اشعار ملاحظہ ہوں:-

[illegible] سن خالق کی اے یار	کہ وو نو جگ کا ہے ؟ کرن ہار
وہی تا بود حون حسب کو کرے بود	[illegible] سب کون حیاتیں دے کے خوشنود

محمد کی سنو معراج کی بات — ایمن بخشے نبی کوں رب نے درجات
نبی کی سن کے صفتاں خوش کرو دل — شفاعت وہ کریں گے روز محشر

عالمگیر کی مدح :-

زمانے شاہ اورنگ زیب کے ہیں — [illegible] تھا کوں ایمن ایمن [illegible]
الٰہی توں ایسا عادل شہنشا [illegible] — رکھیں جب لگ رہے قائم [illegible]

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے ایمن نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ مگر اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا کہ [illegible] معلوم ہوتی ہے اور یہی اسکے صاحب سخن ہونے کی کافی [illegible] مختلف مقامات سے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے اسکے کلام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

قصہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں :-

ارے ساقی پیالا بھر شتابی — ایمن کے ہاتھ دے ذرا اشتابی
بلورین جام کی بہتر مئے لعل — توں پڑ کر کرا ایمن کو خوش دل

زلیخا کی شادی عزیز مصر سے ہونے کا ذکر :-

پیالا لا اسے ساقی لا یزالی — تو اسیں بھر شراب پرتگالی
پھوپھوں تیموس نے کیتی فکر یوں — مصر کے بیچ یک قاصد کو بھیجوں
لکھی تیموس نے یک کتابت — عزیز مصر کوں بکئیں نزاکت
لکھا یوں کر کے یک بیٹی ہے میری — اسے آتی رہیں مانگے بہتیری
اروم و شام اور روبے ملک سوں — ولے آتا نہیں کوئی میری من سوں
میرا دل یونکہ ہے بیاہوں مصر میں — تو کچھ ہوئے تمنا [illegible]

(ص ۱۵۷)

شادی ہونے کے بعد عزیز مصر کو زلیخا دیکھتی ہے اور اپنے خواب کی صورت ہونے

سے اتم کرتی ہے :-

دیکھی صورت عزیز مصر کی جب   پڑی دھرتی اوپر بھرا سے کر تب
کہ واویلا کہ واویلا کر دائی   بخت رب نے میری اوندھی دکھائی
دیتو کچھ اور تھا ایتو ہے کچھ اور   ایتو دشمن رہا اس دوست کے ٹھور
ہمیں وے کد ملیگا مجھ ستیں دوس   الے ہیات اور افسوس افسوس
ہمیں کیونکر ملیگا محبوب وے شاہ   [illegible] آہ صد آہ

(ص ۹۹)

یوسف غلاموں کے بازار میں فروخت کے لئے لائے جاتے ہیں قیمت کا تعین نہیں ہوتا لوگوں کا ہجوم ہے زلیخا جنگل کی سیر سے واپس آرہی ہے اور مجمع کا سبب دریافت کرکے غلام کو دیکھنے کے لئے پردہ اٹھاتی ہے اور خواب والی صورت پاکر بے قرار ہوجاتی ہے :-

زلیخا نے سو تب پردہ اٹھا کر   صورت یوسف کی نظروں بیچ لیا کر
پچھاناں ہے وہی دل یار جانی   کہ جس کارن ہوں پھرتی تھی دِوانی
یوسف دیکھ کر رونی پکاری   پڑی ہو بےخبر کر کر کے زاری
سواری کون شتابی لیکہ بھاگے   زلیخا کو لے آئے گھر کے آگے
اتارے گھر میں تب ہوئی خبردار   پوچھی تب دائی نے یوں اسکو گفتہ
پھری پھر عقل اور سدہ کان گئی تھی   ایسی تو بے خبر کیوں ہو رہی تھی

(ص ۱۰۱)

یوسف کی قیمت بہت زیادہ ہے عزیز مصر انکے خریدنے سے عاجز ہو کر زلیخا کے پاس آکر بیان کرتے ہیں میرے اتنی دولت نہیں جس کو دیکر یوسف کو خریدوں یہ سنکر زلیخا بیشتر مول دیکر یوسف کو لانیکی فرمایش کرتی ہے :-

عزیز نے تب کہا نہیں مجھ کنے زر   کریں اسکوں لے آؤں مول دیکر

جو کوئی میری متاع ساری ملاوے   تو بھی یوسف کا آدھا مول پاوے
زلیخا لے تب ایک ڈبا نکالا   بھرے تھے اس بہتر موتی سوالا
دیا ڈبا کہا اب لیا تون کر مول   [illegible] موتی تون اب ٹک کتیں کھول

(ص ۱۰۲)

یوسف فرید ہوکر آئے زلیخا ان کی والہ و شیدا ہوگئی اور اپنے عشق سے بے قرار ہوکر پہلے دائی کے ذریعہ [illegible] خود آکر یوسف سے التجا کی یوسف جواب میں کہتے ہیں :-

کہا یوسف نے یوں سن اے زلیخا   تو بی ہر انے میں ہوں [illegible]
[illegible] ہو سکتا نہیں کام   نہ کر مجھے تون عاجز کون یوں بدنام
[illegible] تو عشق میں لبستا نہیں کئیں   ہوا محمد زبان سب جا عشق کیتن

(ص ۱۲۴)

یوسف قید ہوئے برسوں مقید رہے قید سے رہا ہوئے اور ترقی کرتے [illegible] زلیخا اپنے کئے پر نادم ہوئی۔ جوانی گزر گئی بڑھاپا آگیا تمام مال دولت خیرات میں دے چکی اور غربت میں بسر ہونے لگی۔ یوسف کو اس کا خیال بھی نہیں رہا ایک مدت کے بعد یوسف کا اس طرف گزر ہوا جہاں زلیخا رہا کرتی تھی۔ زلیخا کو یوسف کا آنا معلوم ہوا سامنے آئی اور اس موقع پر پہلے شوق اور بے تابی سے کہتی ہے۔

کرلے یوسف منجہ تیں نان پچھانے   پچھانان تجکو میں لے یار جانی
وہی میں ہوں زلیخا نام میرا   وہی یوسف تیں دل آرام میرا
وہی میں ہوں جو تیں تیرے سین تان   دیکھا صورت بی کیتی منجکوں حیران
وہی میں ہوں جو تیں تیرے وطن سوں   گری منجہ بہ وطن اور دکھ دیا [illegible]
وہی میں ہوں جنے تجکوں لیا تھا   لکھو کھا درہم [illegible]

(ص ۱۵۰)

ان امور کے بعد زلیخا کو گھر لاتے ہیں خدا سے دعا کرتے ہیں زلیخا جوان ہو جاتی ہے اور پھر یوسف اس سے شادی کرتے ہیں اور سب کی ضیافت کی جاتی ہے۔ داستان اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے بعد یوسف کا انتقال ہوتا ہے اس رنج سے زلیخا پہلے تین دن تک بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس کے بعد زلیخا کا بھی انتقال ہو جاتا ہے

اتوں سجدے ستیں سر نہیں اٹھایا | [illegible] میں جبریل آن پاس آیا
کہا یوسف کر سر کوں سوا دنچا | [illegible] را سوال درگاہ بیچ پہنچا
کری حق نے قبول لے عرض باری | جوانی کیتی [illegible]
خدانے دی اُسے پھر کر جوانی | توانا کیتی کھو کر ناتوانی
یہ سن خوش خبریا سر کوں اٹھایا | [illegible]
دیکھا مکھڑا شوروشن جوں جند سو | تین دو نور ستیں دیکھے بھرپور

(ص ۱۵۵)

پڑی بیہوش ہو کر پھر زلیخا | نہ تھا معلوم اس کو حال ایس کا
[illegible] رہی تین دن تک پھر بچاری | ہی چوتھے روز آئی ہوشیاری
بیٹھی اُٹھ کر یوسف پکاری | اپنے دل سرد ستیں آہ ماری
کہتی تھی یوں کہ سن یوسف پیارے | دعا آخر منجے تیں کیوں دیا رے
نہ چاہیے تم کوں اٹھ جنت میں جاؤ | منجے اس بھاگ سے بہتر جلاؤ
منجے کتوں چھوٹے ری چھوٹے یوسف | محبت کا سنے تم توڑے لے یوسف
[illegible] بہتر جلائے نین منجے رے | نہ آیا ترس کچھ آخر تجھے رے
ارے ہہات اور ہہات ہہات | نہ لینے تم مجھے کیوں آپنے سات
[illegible] بیتاب ہو کر | پڑی بچھڑا سے کر دھرتی کے اوپر

(ص ۱۸۵)

اس پر کتاب ختم نہیں ہوتی آخر میں ساقی نامہ آخر میگوید " کا عنوان ہے خاتمہ میں عالمگیر کی مدح اور تاریخ تصنیف وغیرہ کے اشعار آئے ہیں. کتاب ذیل کے شعر پر ختم ہوتی ہے:۔

کہ سب کوئی کرے اس کے اوپر پیار
پڑے دل جان سیتی ہو کے ہشیار

اس تفصیل سے امین کے طرز کلام کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور شاعری میں انکا کیا رتبہ قرار دیا جا سکتا ہے خود ناظرین غور فرما سکتے ہیں۔ مخطوطے میں کتابت کی تاریخ اور کاتب کے نام کے علاوہ جس کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس کا نام بھی درج ہے ملاحظہ ہو:۔

باتمام رسید کتابت یوسف زلیخائے ہندی دکھنی تصنیف محمد امین بخط احمد علی گوپاموی بخاطر صاحب والا مناقب کپتان ڈایر صاحب در ماہ جمادی الاول ۱۲۴۲ھ

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں عام طور سے دکھنی اور گجراتی وغیرہ کو ہندی دکھنی سے موسوم کیا جاتا تھا۔

اس مختصر صراحت سے امید ہے "یوسف زلیخا" کا ایک خاکہ ذہن نشین ہو جائے۔

فلسفۂ انند

انتخاب از "رس" مصنفہ پنڈت حبیب الرحمٰن صاحب (غیر مطبوعہ)

سنسکرت کے ماہرین علم الجذبات کا خیال ہے کہ انسان کے دل میں قدرت نے مستقل جذبات ودیعت کئے ہیں: محبت، شگفتہ دلی، افسوس، غصہ، حوصلہ یا اکٹ، خوف، اذیت، تعجب، سکون۔

شاعری اور ناٹک میں یہی جذبات اپنے اسباب و آثار کی مدد سے ارتقائی مدارج سے گزر کر وجدان میں پہنچتے ہیں تو ایک غیر محدود لذت کا مزہ بخشتے ہیں اسی کا نام رس ہے

---

(۱) جن اسباب و آثار کی وساطت سے جذبات مذکور ارتقائی مدارج سے گزر کر رس کہلاتے ہیں انکی تفصیل یوں سمجھنا چاہئے مثلاً جذبہ محبت کے رس بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ڈراما اور شاعری میں وہ شخصیت پیش کیجائے جس سے کسی کو محبت ہوتی ہے، اور پھر محبت ہو جانیکے بعد موسم بہار۔ موسیقی اور چاند وغیرہ (جذبہ محبت کو مشتعل کرنیوالی اشیاء) کا بیان کیا جائے تاکہ جذبہ مذکور خوب بھڑک اٹھے پھر اس جذبہ کے اثر سے جو تغیرات عاشق پر طاری ہوتے ہیں (اشکباری وغیرہ) انکا تذکرہ ہونا چاہئے تیسرے درجہ پر پہنچکر جو خوشی۔ جنون۔ امید۔ ناامیدی وغیرہ فوری و آنی جذبات دریائی موجوں کی طرح عاشق کے قلب میں پیدا ہونے لگتے ہیں اسکا سماں کھینچنا چاہئے۔ محبت کے درس میں مذکورہ بالا شخصیت محرک اساسی کہلاتی ہے اور موسم بہار اور چاند وغیرہ ہیجان پیدا کرنیوالی اشیاء محرک کے نام سے تعبیر کیجاتی ہیں۔ نیز اشکباری اور دیگر معلولات جذبہ کا نام اثرات رکھا گیا ہے اور تیسرے درجہ پر جو اثرات نمودار ہوتے ہیں انکو منقلبات کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ (باقی صفحہ ۱۳)

رسوں کی تعداد۔ عشق۔ ہنسی۔ رحم۔ غضب۔ بہادری۔ دہشت۔ نفرت۔ حیرت
اطمینان۔ یہ نورسس ہیں۔

ان میں سے عشق (شرنگار) کے رس کی تعریف یہ ہے۔ شرنگ عشق کے دیوتا (کاموں) کے ابھرنے کو کہتے ہیں اس ابھرنے کا سبب اور زیادہ تر اعلیٰ ہیرو سے متعلق رس عشق کا رس کہلاتا ہے۔

[illegible] اور بے وفا طوائف کو چھوڑ کر دوسرے اقسام کی عورتیں اس میں [illegible] ہوتی ہیں [illegible] (تمام بیویوں سے یکساں سلوک [illegible] والا) اور اس کے مانند ہیرو زہرہ، چاند [illegible] کی ستار گنگناہٹ اور ایسی ہی دوسری چیزیں اس میں محرک [illegible] تی ہیں، محبت نما پرشکن ابرو اور الفت آمیز نگاہیں [illegible] ت ہیں۔ غضب۔ موت۔ سستی اور کراہت کو چھوڑ کر بقیہ کل جذبات عارضی اس میں منقلبات بنتے ہیں، اس کا جذبۂ مستقل محبت ہے۔ مثال نئی دلہن۔ سونی خواب گاہ [illegible] سے خالی) دیکھکر پلنگ سے قدرے آہستہ آہستہ اٹھی اور اٹھکر بناوٹی نیند سوئے محبوب (شوہر) کے چہرے کو بہت دیر تک بغور دیکھا (کہ کہیں جاگتے تو نہیں ہیں) [illegible] اطمینان سے اس کا بوسہ لیا لیکن اس بناوٹی [illegible] کے رخساروں پر (خوشی کی وجہ سے) اقشعرار[1] دیکھکر اس نوعروس کا چہرہ شرم سے نڈھال [illegible] ہو گیا اور اس کے محبوب (شوہر) نے ہنس ہنس کر اسے بہت دیر تک [illegible] دیا۔

مثال بالا میں ہیروئن کے دل میں موجودہ محبت کا محرک اساسی ہیرو ہے۔ اور خواب گاہ کا خالی ہونا محرک ہیجی ہے۔ اطمینان سے بوسہ لینا اثر محبت ہے۔ آہستہ آہستہ اٹھنے

[illegible] زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے جلدی جلدی بدلتے رہتے
(1) [illegible] رونگٹے کھڑے ہو جانا

سے خوف بھی ۔ کے ساتھ شوق خفی ، اور بغور دیکھنے سے ظاہر و نمایاں ہونیوالا خوف اور شرم متقلبات ہیں ، اسی طرح اس مثال میں ہیرو کی محبت کا محرک اساسی ہیروئن ہے ۔ اس کے (ہیروئن کے) چہرہ کا نڈھال ہونا ہیج ہے ۔ دیر تک پیار کرنا اثر محبت ہے ، خوشی اور ہنسی جذبات عارضی یعنی متقلبات ہیں ، ان محرک ، اثر اور متقلبات کے سمجھنے والے ناظرین عشق کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں "

عشق کے رس کی دو قسمیں ہیں لیرا فراق لیرا وصال ۔

جب محبت ہو جانے پر چاہت تو گہری ہو لیکن وصل محبوب نصیب نہ ہو تو اسے فراق کہتے ہیں ۔ فراق کی اندرونی توضیح سمجھنے کے لئے حسب ذیل حالتوں کا بیان ضروری ہے ۔

آرزو ۔ تفکر ۔ یاد ۔ تذکرہ اوصاف ۔ بے چینی ۔ بڑ ۔ پاگل پن ۔ بلائے تنہائی ۔ بے حسی موت ۔ یہ دس حالتیں فراق کے وقت عشاق پر طاری ہوتی ہیں انکی تعریفات حسب ذیل ہیں

وصل کی تمنا کا نام آرزو ہے ۔

محبوب سے ملنے کی ترکیب سوچنے کو تفکر کہتے ہیں ۔

ذی شعور اور غیر ذی شعور کی تمیز نہ رہنا پاگل پن ہے ۔

دل کے بہکنے سے پیدا ہونیوالی بے تکی باتوں کو بڑ کہتے ہیں ۔

ٹھنڈی سانس ، بدن میں زردی اور لاغری پیدا کرنیوالی اندرونی حالت کو بلائے تنہائی کہتے ہیں ۔

اعضا اور قلب کے بے حس و حرکت ہونیکا نام بے حسی ہے ۔

بقیہ حالتیں واضح ہیں اور تعریف کی محتاج نہیں ۔

واقعی دیدار سے پیدا ہونیوالی آرزو کی مثال ۔

اس بھولی چتون والی حسینہ کردہ محبت آلود ، الفت سے پر ، شناسائی کی وجہ سے گہری چاہت میں مستغرق ، فطری طور پر دلکش اور شیریں ، خفیہ حرکات و سکنات کیا میری وہ

سے کبھی پھر ذبح ہونگے جن کو ذرا سا یاد کرتے ہی فوراً آنکھ وغیرہ حواس خارجی کے مشاغل روک کر میری رُوح ایک گہری مسرت میں محو ہو جاتی ہے۔

عملیات (ورد وظائف) کے ذریعے دیدار حاصل ہونے کی آرزو کی مثال:۔

”عشق کے دیوتا کی حقیقی [illegible] جسم کو میں کیسے دیکھوں گا اس سوچ میں پریشان ہیرو کو رات میں نیند [illegible]

اس مقام پر کسی ہیروئن کو عمل کے ذریعے دیکھ کر مشتاق ہیرو کا تفکر ظاہر ہو رہا ہے۔

بے چینی کی مثال: تمہاری جدائی میں وہ نازک بدن لمبی لمبی سانسیں لیتی ہے۔ زمین پر لوٹتی ہے تمہاری راہ دیکھتی ہے، اور دیر تک گریہ وزاری میں مصروف رہتی ہے۔ اور اپنے لاغر ہاتھ ادھر ادھر پٹکتی ہے [illegible] ہی میں تمہارا وصل ہو جائے اس تمنا میں نیند چاہتی ہے۔ لیکن بدقسمتی اسے سونے نہیں دیتی۔

بڑ کی مثال:۔ پچھلی شب میں ذرا دیر کے لئے آنکھ لگتے ہی یہ ہماری سہیلی ”ملے ہما دیو کہاں جاتے ہو؟“ کہتی اور بڑبڑاتی ہوئی کسی کی خیالی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے جاگ اٹھتی ہے۔

بے حسی کی مثال: کنول کی سیج پر پڑا جسم تو بالکل بے حس ہے۔ ہاں لمبی سانس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جان باقی ہے۔ (اگرچہ مخالف رس ہونے کی وجہ سے موت کا بیان نہیں کیا جاتا۔ لیکن پھر بھی موت کی مانند حالت کا بیان کرنا چاہئے اور موت کی تمنا کا بھی اور اگر جلدی ہی پھر زندگی نصیب ہو جائے تو موت کا بھی بیان کر دیا جاتا ہے)

پہلی مثال: وہ نازک بدن ہارسنگھار کے پھول کھلے دیکھ کر تو کسی نہ کسی طرح زندگی قائم رکھ سکی لیکن اس وقت مرغ کی اذان سن کر بیچاری نہ معلوم کس حالت میں ہو گی (ہارسنگھار کے پھول آدھی رات میں کھلتے ہیں) آدھی رات تک تمہارا انتظار کرتے کرتے انہیں دیکھ کر آتش جدائی سے پریشان وہ نازنین کسی نہ کسی طرح [illegible] مرغ کی آواز سے صبح سمجھ کر نہ معلوم کس حال میں ہو گی۔

دوسری مثال: بھنورے اپنی مستانہ گنگناہٹ سے اطراف کو پرکریں صحرائی صندل سے آئی ہوئی صندل بیز ہوا، آہستہ آہستہ چلتی رہے۔ آموں کے بور پر بیٹھی ہوئی مست کوئل پانچویں سُر میں اپنی میٹھی راگنی الاپتی رہے اور پتھر سے بھی سخت تر میری جان بھی اب رخصت ہو۔

تیسری مثال: جیسے کادمبری نامی کتاب میں پنڈریک کی موت اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے کا بیان ہے۔

فراق کی چار قسمیں ہیں۔ اول "پہلا رنگ"۔ دوسرے روٹھنا۔ تیسرے پردیس جانا۔ چوتھے رحم در فراق۔

خوبصورتی وغیرہ اوصاف حمیدہ کے سننے اور دیکھنے سے ایک دوسرے پر عاشق ہیرو اور ہیروئن کی وصل سے قبل کی حالت کا نام "پہلا رنگ" ہے۔ پہلا رنگ تین طرح کا ہوتا ہے۔ نیلا (نیلگوں) کسوتی۔ مجیشٹی۔ جو اوپری چمک دمک تو زیادہ نہ دکھائے لیکن دل سے کبھی جدا نہ ہو وہ "نیلا رنگ" کہلاتا ہے جیسے رامچندر اور سیتا کا رنگ محبت۔

کسومی رنگ وہ ہوتا ہے جس میں دلکشی بہت ہو لیکن قائم نہ رہے۔

مجیشٹی رنگ اسے کہتے ہیں جس میں دلکشی بھی ہو اور قیام بھی۔

غصہ ہو جانے کا نام روٹھنا ہے۔ یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک محبت سے پیدا ہوتا ہے دوسرا رقابت کی آگ سے۔ محبت کی الٹی رفتار ہوتی ہے اس لئے دونوں کے دل میں باہمی محبت ہونے پر بھی جو بلا سبب ایک دوسرے پر غصہ پیدا ہو اُسے محبت کا روٹھنا کہتے ہیں۔

محبت میں ہیرو کے روٹھنے کی مثال: نیند کا بہانہ کر کے یونہی آنکھیں میچے والے حضرت مجھے بھی تھوڑی جگہ دو۔ رخسار چومنے سے مقشعر الاعضا ہوتا جی (شاہ صاحب) اب کیسی دیر ہو گی۔

دونوں کے ایک ہی وقت روٹھنے کی مثال: دونوں محبت کی وجہ سے روٹھے ہیں اور دونوں ہی بناوٹی نیند سو رہے ہیں نیز آہستہ آہستہ روک روک کر لی ہوئی ایک دوسرے کی سانسوں

پر دونوں ہی کان لگائے پڑے ہیں، دیکھیں ان دونوں میں کون بہادر ہے (اگر یہ روٹھنا منانے تک نہ قائم رہے تو اسے عشق کے رس کی قسم (فراق) نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وصل کے رس کا متعلقہ جاننا چاہئے اس کی مثال حسب ذیل ہے۔

بھویں ٹیڑھی کرنے پر بھی (علامت غصہ پیدا کرنے پر بھی) نظر، زیادہ پُر اشتیاق ہوتی جاتی ہے۔ گفتگو بند کر دینے پر بھی [illegible] (عورتوں کی غصہ [illegible] کی گالی) منہ مسکرانے لگتا ہے دل سخت کر لینے پر بھی جسم میں اقشعرار ہونے لگتا ہے۔ پھر بھلا اکا سا بنا ہونے پر غصہ کو کیسے نبھا سکوں گی؟ (جب سالار کی فوج ہی دوسروں سے جا ملے تو سپہ سالار بیچارہ کیا کریگا)

اسی کی دوسری مثال: دل میں [illegible] کی خواہش پیدا ہونے پر بھی اپنا اپنا بھرم (خودداری) قائم رکھنے کے لئے [illegible] چپ چاپ علٰحدہ بیچ پر بے چین پڑے [illegible] ہیرو، ہیروئن کی آہستہ [illegible] بھری ترچھی نظروں کے ذریعہ سے چار آنکھیں ہوتے ہی جنگ محبت ختم ہو گئی [illegible] ہنستے ہوئے ہم آغوشی ختم ہوئی۔

شوہر کا دوسری عورت میں عشق دیکھنے پر یا قیاس کرنے پر یا کسی سے سن لینے پر عورتیں [illegible] کیوجہ سے روٹھتی ہیں (دوسری عورت سے شوہر کی محبت کا قیاس تین طرح پر ہوتا [illegible] میں دوسری [illegible] کے متعلق باتیں بڑبڑانے کی وجہ سے یا شوہر میں وصل غیر کی علامتیں ملنے سے یا شوہر کے منہ سے اچانک دوسری عورت کا نام نکل جانے سے)

دوسری عورت میں شوہر کا عشق دیکھکر روٹھنے کی مثال: ہیرو کو دوسری ہیروئن کی آنکھوں سے پھونک کر زرگل ہٹاتے دیکھکر اس عورت کی دونوں آنکھیں آتش غضب سے سرخ ہو گئیں۔

وصل غیر کی علامات ملنے کی وجہ سے روٹھنے کی مثال: جسم کی تازہ خراش ناخن کو کپڑے سے چھپاتے ہو۔ اور دانتوں سے زخمی ہونٹ ہاتھ سے دبا رہے ہو لیکن یہ بتاؤ کہ [illegible] عورت کے وصل کی گواہ، چاروں طرف پھیلتی ہوئی اس نئی خوشبو کو چھپانے [illegible]

ضرورت۔ بددعا یا خوف کیوجہ سے ہیرو کے دوسرے [illegible] یا ز) مقام پر چلے جانے

کو پردیس جانا کہتے ہیں۔ اس حالت میں ہیروئن کے جسم اور کپڑوں میں میلاپن۔ سر میں صرف ایک جوڑا (خاص طور پر آرائشگی کے ساتھ نہ گوتھ کر سب بالوں کی ایک چوٹی بنا لینا) ہوتا ہے [illegible]ماں نصیب نازنین ٹھنڈی سانسیں لیتی ہے اور روتی اور زمین پر لوٹتی ہے)

پردیس جانیکی مثال: کسی انتہائی ضرورت کیوجہ سے پیارا شوہر پردیس جانے کے لئے تیار ہے۔ نازنین کو اس واقعہ سے جانکنی کی سی تکلیف ہو رہی ہے۔ تپش اور درد تنہائی کی زیادتی کے اثر سے پگھلی ہوئی روح آنکھوں [illegible] آنسوؤں کی شکل میں برابر بہہ رہی ہے اتنے میں شوہر نے باہر سے آکر محبت آمیز نگاہوں سے اپنی محبوبہ کو خوش کرتے ہوئے سفر کے لئے رخصت چاہی۔

شوہر۔ اے حسینہ ہم جاتے ہیں (اس سوال پر مجبو[illegible]ر پر منع کرنا مناسب نہ سمجھا اور بدشگونی کے خوف سے اپنے کو مانع سفر نہ بنایا لیکن اپنے سرتاج کو در پردہ طور پر سفر سے روکنے کے لئے جو بلیغ گفتگو کی وہ حسب ذیل ہے)

[illegible] اے پردیسی جاؤ۔

اے نازک اندام بیکار رنج مت کرو۔

[illegible] اے پردیسی مجھے تمہارے جانے میں رنج کیوں ہوگا

مرد۔ اگر رنج نہیں ہے تو پھر یہ لگاتار آنسو کیوں بہا رہی ہو۔

عورت۔ تم جلدی نہیں جاتے اس لئے

مرد۔ مجھے بھیجنے کے لئے تمہیں اتنی جلدی کیوں ہے۔

عورت۔ تمہارے ساتھ ساتھ جانے کے لئے کمربستہ۔ میری جان کی یہ گھبراہٹ ہے

ہیرو اور ہیروئن میں سے ایک کے مر جانے پر دوسرے کو جو غمگینی ہوتی ہے اس کو رحم" درفراق" کہتے ہیں لیکن یہ قسم اسی وقت صادق آتی ہے جب اس مردہ ہستی کے اسی دنیا میں اسی جسم کے ساتھ پھر ملنے کی امید ہو، جیسے کادمبری نامی کتاب میں مہاشویتا

اور پنڈریک کا واقعہ، اگر پھر ملنے کی امید ٹوٹ جانے یا دوسری زندگی میں ملاقات کا سہارا ہو تب تو صرف رحم ہی کا رس ہوتا ہے۔ لیکن پنڈریک کے مرنے پر ہاتف غیبی کے زندگی کی خوشخبری سنانے کے بعد اس کے ملنے کی امید میں جذبۂ محبت میں ایک گونہ تازگی اور روئیدگی پیدا ہو جانے کی وجہ سے، اسوقت عشق کا رس تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر ہاتف غیبی کی آواز سے پہلے رحم ہی کا رس ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک افسوس ہی کا دور دورہ رہتا ہے محبت مفقود اور کالعدم ہو جاتی ہے جو عشق کے رس کی بنیاد ہے۔

ایک دوسرے کی محبت میں چور ہیرو اور ہیروئن کا باہمی دیدار و ارتباط سے مستفید ہونا وصل کہلاتا ہے۔

بوس و کنار اور دیگر اس کے غیر محدود اقسام کا شمار نہیں کیا جا سکتا اس لئے وصل کی ایک ہی قسم مانی جاتی ہے۔

چھر موسموں۔ سورج اور چاند۔ طلوع اور غروب۔ صبح کی سیر۔ چاندنی رات کا کھیل۔ صندل لگانا۔ زیورات کی آراستگی اور دوسری صاف ستھری خوشگوار اشیاء بیان پر وصل کے مضامین مشتمل ہوتے ہیں۔ یہی بھرت منی نے کہا ہے۔ اگرچہ وصل اپنی غیر محدود قسموں کی وجہ سے قابل شمار نہیں، اس وجہ سے ذاتی طور پر ایک ہی مانا جاتا ہے لیکن پھر بھی پہلے رنگ۔ روٹھنے۔ پردیس جانے اور حدرقابت کے بعد واقع ہونیکی وجہ سے اسے بعض لوگوں نے چار قسم کا مانا ہے مقصد یہ ہے کہ وصل اس وقت تک کامل وصل نہیں ہے جب تک کہ فراق کے بعد واقع نہو اور فراق کی چار قسمیں ہیں لہذا وصل کی بھی چار قسمیں ہوئیں چنانچہ کہا گیا ہے۔ کہ بغیر فراق کے وصل مکمل ہی نہیں ہوتا۔ جیسے کسی دوسری مناسب چیز میں رنگنے کے بعد کپڑے پر اصلی (مقصود) رنگ خوب چڑھتا ہے (یہی وجہ ہے کہ اکثر رنگریز ہلکوں کے پانی میں کپڑوں کو رنگنے کے بعد دوسرے رنگ میں رنگنے کا رواج ہے۔ یہ اس وجہ سے تاکہ رنگ مقصود خوب چڑھے) اسی طرح فراق کے بعد کا وصل بہ

ہی پُر لطف اور مکمل ہوتا ہے۔ اور فراق کی چونکہ چار قسمیں ہیں لہذا اس کے بعد واقع ہونے والے وصل کی بھی چار قسمیں ہوئیں۔ اس کی مثالیں بخوف طوالت نظر انداز کیجاتی ہیں

[illegible] تغیر شکل، آواز، لباس۔ اور حرکات و سکنات کا سین کھینچنے سے قلب میں ہنسی کا [illegible] ظاہر ہوتا ہے۔ اسکا جذبہ مستقل شگفتہ دلی ہے جس شخص کی بدلی ہوئی شکل آواز، اور [illegible]ش کو دیکھکر لوگ ہنستے ہیں، وہ اس کا محرک اساسی [illegible] محرک ہیج ہوتی ہیں۔ [illegible] ہنسنا اور چہرے کا [illegible] کے اثرات ہیں اور [illegible]سستی اور اخفاء جذبات اس کے منتقلیات میں داخل ہیں [illegible]

[illegible] جب آنکھوں میں کچھ شگفتگی [illegible] ذرا ذرا ہونٹ [illegible]

(۲) اگر انفعال [illegible] کیا تو کچھ دانت بھی چمکنے لگیں تو اُسے خندہ شیریں (انطرار) کہتے ہیں

(۳) اب [illegible] کے ساتھ ہلکی آواز بھی ہو تو اُسے خندہ نازک (کنکنا) کہتے ہیں۔

[illegible] وغیرہ میں کپکپی بھی پیدا ہو جائے تو وہ قہقہہ (کرکرہ) ہے

[illegible]) جس ہنسی میں آنکھوں میں پانی بھی آجائے وہ خندہ گریاں [illegible]

[illegible] ادھر اُدھر ہاتھ پیر بھی پھینکنے لگے تو وہ زہرقہ (انتہائی ہنسی) ہے

[illegible] لوگوں میں تبسم ہوتا ہے۔ درمیانی لوگوں میں خندہ نازک اور قہقہہ [illegible] ادنےٰ لوگوں میں [illegible] اور زہرقہ ہوتا ہے۔ ہنسی کی ان اقسام کی وجہ سے ہنسی کے رس کی بھی [illegible] قسمیں ہو جاتی ہیں۔

[illegible] وشنو شرما پنڈت کا حسب ذیل قول بیان کرکے کوئی ہنستا ہے:۔

"میرے اس سر پر جو ویدمنتروں کے ہر ہر رچ کے تلاوت کے ختم پر پانی (دم شدہ) کے چھینٹوں سے پاک کیا گیا تھا، طوائف نے تھوک کر ناپاک ہاتھ کا گھونسہ بنا کر دھم سے مارا" یہ کہکر ہائے ہائے کرکے پنڈت وشنو شرما رو رہا ہے۔

اس مثال میں وشنو شرما محرک [illegible] ہے اور اسکا رونا محرک [illegible]

میں پیدا ہونیوالی مسکراہٹ اور قہقہہ اس کے اثرات ہیں، دیکھنے والوں کی گھبراہٹ اور اضطراب منقلبات میں شامل ہے اور شگفتہ دلی اس کا جذبہ مستقل ہے۔

مرغوب اور محبوب شے کے ملنے اور غیر مرغوب کے حصول سے رحم کا رس نمودار ہوتا ہے۔ اس میں افسوس جذبہ مستقل ہوتا ہے اور مرے ہوئے اعزہ (قابل افسوس شخصیتیں) محرک اساسی ہوتے ہیں، اور انکی تجہیز و تکفین اور اس کے لوازمات محرک مہیج، پچھاڑیں کھانا۔ گریہ وزاری کرنا۔ تبدیلی رنگت۔ لمبی سانسیں بے حسی اور بڑا اس کے اثرات ہیں شکستہ دلی۔ پریشانی۔ مرض۔ تکان۔ تذکرہ۔ محنت۔ بے حوصلگی۔ سراسیمگی۔ جنون اور فکر اس کے منقلبات میں شامل ہیں۔ چونکہ اس کا جذبہ مستقل افسوس ہوتا ہے اس وجہ سے اسکا شمار رحم وہ فراق میں پھر وصل کی امید قائم رہنے کی وجہ سے اس رہتی ہے۔

ہے مادر محترم یہ جلدی کہاں جانے کے لئے ہے، یہ کیا ہوا۔ ہائے دیوتاؤں (بزرگوں) کی دعائیں کہاں گئیں۔ لعنت ہے ہماری اس (جوایسی مادر محترم کے مرنے پر بھی صحیح و سلامت ہے) جان پر۔ آسمان ٹوٹ پڑا۔ تیرے ہاتھ پیروں میں آگ دیدی گئی۔ آنکھیں جل رہی ہیں۔ اس طرح چلا چلا کر رونے کی وجہ سے عورتوں کی گلے میں پھنسی اور بھرائی ہوئی دردناک آوازیں تصویروں تک کو طرح طرح سے رلا رہی تھیں اور اپنے دردناک اثر سے در و دیوار کے ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتی تھیں۔

اس مثال میں جذبہ مستقل افسوس ہے۔ اس کا محرک اساسی مردہ عورت، اور عورت کا جلانا اور جلانے کے لوازمات محرک مہیج ہیں۔ شہر کی عورتوں کا رونا اثرات میں داخل ہے۔ بے بسی تکان اور غشی اس کے منقلبات ہیں۔

غضب کے رس میں غصہ جذبہ مستقل ہوتا ہے اور محرک اساسی دشمن اور دشمن کی حرکات مہیج ہوتی ہیں۔ چیں بر جبیں ہونا، ہونٹ چبانا۔ خم ٹھوکنا۔ جھڑکی دینا اپنے پچھلے

مناسب (بہادری کے) بیان کرنا۔ ہتھیار گھمانا غضب۔ گھبراہٹ۔ اقشعرار عرق ریزی۔ لرزہ سستی یہ اس کے اثرات ہیں، اعتراض کرنا، غضب آلود نگاہ سے دیکھنا۔ پریشانی اور خلش انتقام منتقلبات ہیں۔ (بھبھوڑنے۔ پھاڑ ڈالنے گھونسہ مارنے گرانے اور جنگ کے لئے بیتابی کے بیان سے یہ رس خوب جچتا ہے آنکھوں اور چہرے کے غصہ سے سرخ ہو جانا اسی رس کی علامت ہے۔ بہادری میں یہ علامت نہیں پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ بہادری رس کے رس میں حوصلہ جذبہ مستقل ہوتا ہے)

مثال۔ جن ہتھیار بند عدو شکن [illegible] صورت حیوانوں نے [illegible] (قتل اُستاد) گناہ [illegible]۔ جن لوگوں نے مشورہ دیا۔ جنہوں نے اسے دیکھنا روا رکھا [illegible] اور بھیم کے ساتھ میں اُن سب کے لہو گوشت اور چربی سے اطراف کے دیوتاؤں۔ (سنسکرت ادب میں ہر سمت کا مالک ایک دیوتا تسلیم کیا گیا ہے) کی دعوت کروں گا۔

اس مثال میں غصہ جذبہ مستقل ہے۔ اس کے محرک اساسی ارجن وغیرہ قاتل ہیں، اور قاتل کے والد کی موت اور مدد دینے والوں کا اپنے ہاتھوں میں ہتھیار گھمانا محرک مہیج ہے، اور قاتل کا عہد مذکور (دعوت کروں گا) اثرات میں شامل ہے اور "ایسا میں کروں گا" اس جملے سے مترشح گھمنڈ اس جگہ جذبہ منقلب ہے۔ اس تفصیل [illegible] بجنے والے تماشائی غضب کے رس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

[illegible] یہ رس عالی ظرف ہیروؤں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسکا جذبہ مستقل حوصلہ ہے اور فتح کرنے کے قابل مرد مقابل اس میں محرک اساسی ہوتا ہے اور مرد مذکور کی حرکات مہیج ہوتی ہیں، معاونین جنگ (ہتھیار یا فوج وغیرہ) کی تلاش اس کے اثرات میں شامل ہے۔ سکون۔ فیصلہ۔ گھمنڈ۔ تذکر۔ سوچ وبچار اور اقشعرار اسکے منقلبات ہیں۔

مثال۔ راون کا لڑکا (میگھناد) رامچندر جی کی فوج سے حسب ذیل خطاب کرتا ہے۔

"اے پیچ دیو تج بندرو! تم مت ڈرو کیونکہ راجہ اندر کے ہاتھی کے کوہان کو ریزہ ریزہ کرنے والے میرے تیر تمہارے جسم پر پڑتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اے لکشمن تو ایک طرف ہٹ جا۔ کیونکہ میرے غصہ کے لئے تو بھی مناسب محل نہیں ہے مجھے تو اس رام کی تلاش ہے جس نے اپنی ترچھی ابرو کے ادنیٰ اشارے سے سمندر کے بہاؤ کو روک دیا ہے۔

مثال بالا میں حوصلہ جذبہ مستقل ہے اور اسکا محرک اساسی رامچندر جی ہیں۔ اور سمندر کا بہاؤ روکنا محرک ہیج ہے۔ کمزور دل بندے کو بھی اور رامچندر جیسے جوانمرد سے لڑنے کی تمنا اثرات میں داخل ہے۔ اپنے گذشتہ کارنامے کی یاد اور "میرے تیر شرماتے ہیں" اس قول سے مترشح گھمنڈ منقلبات میں داخل [illegible]

باغی

سلمٰی لاگرلاف ایک زمانے میں معلمہ تھی۔ ۱۹۰۹ء میں اہل سویڈن کی قومی عید کے موقعہ پر اس کے سر پر تاج ادب رکھا گیا اور اس طرح وہ ملک کی ہر دلعزیز مصنفہ قرار پائی۔ اس نے بچوں کے متعلق قصوں کا ایک سلسلہ لکھا ہے جس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اسلئے کہ ان قصوں میں قدیم زمانے کی داستان نویسی کے عجائب وغرائب کا ایک پرلطف ادبی صنعکاری اور عہد حاضر کی فطرت نگاری اور واقعہ طرازی کے ساتھ امتزاج کیا گیا ہے۔ ... میں اس نے ممالک غیر کی سیاحت کی۔ اور اس کے بعد ہی اپنے مشہور قصص صقلیہ "پیش کئے"، اس سلسلہ کے اکثر افسانوں کو ادب انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔

سلمٰی لاگرلاف کا طرز تحریر سکون، بے تکلفی، قادرالکلامی، وسعت تخیل اور شعریت کے لوازم سے ممتاز ہے "باغی" جو اس کے تمام افسانوں کی جان ہے، اس کی جملہ ادبیانہ خصائص کا حامل ہے۔

ایک دہقانی نے ایک راہب کو مار ڈالا تھا اور جنگل میں بھاگ گیا تھا۔ متمدن دنیا کو ... سے وہ باغی بن گیا۔ اس کے سر کے لئے ایک انعام کا اعلان کیا گیا۔

جنگل میں وہ ایک دوسرے مفرور سے ملا یہ ایک نوجوان ماہی گیر تھا جو دور دراز جزائر سے ترک وطن کر کے آیا تھا۔ اس پر ایک جال کی چوری کا الزام تھا۔ چنانچہ بمصداق:

"قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو — خوب گذرے گی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو!"

دونوں میں خوب گاڑھی دوستی ہوگئی، انہوں نے پہاڑ کے سنگین دامن میں

اپنے رہنے کے لئے ایک غار کاٹ لیا اور ساتھ ساتھ رہنے لگے ۔ وہ ساتھ ہی ساتھ اپنا کھانا پکاتے تھے ، ساتھ ہی ساتھ مچھلیوں کا شکار کرتے تھے ۔ تیر بنانے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے ، اور باری باری سے اپنی صحرائی کمینگاہ سے نکل کر شکار کرتے تھے ۔

دہقانی کبھی جنگل کے محفوظ دامن کو نہ چھوڑ سکتا تھا اس لئے کہ وہ ایک سنگین جرم کا مرتکب ہوا تھا ، لیکن ماہی گیر جس کا جرم اتنا شدید نہ تھا وقتاً فوقتاً آبادی کی طرف نکل جاتا اور شہر کے مضافات و مفصلات میں پہنچکر اپنے شکار کے بدلے دودھ مکھن ، لباس اور تیروں کے پیکان لے آتا ۔ مچھلی کے علاوہ اس بازار میں پیش کرنے کے لئے اس کے پاس پہاڑی مرغ اور اس کے چمکیلے پر ، خوش ذائقہ دار گوشت والی جنگلی فاختہ اور خرگوش ہوا کرتے تھے ۔

انکا سنگستانی مسکن ۔ ایک عمیق غار تھا جس کے منہ کو چوڑی چوڑی پتھر کی سلوں سے بند کر دیا گیا تھا اور مزید حفاظت کے لئے خار دار جھاڑ جھنکاڑ کا ایک پردہ بھی کر دیا جاتا تھا ۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک عظیم صنوبر کا درخت تھا جس کی پیچ در پیچ جڑوں کے بیچ میں ہمارے ان صحرانشینوں کے باورچیخانے کے دودکش کا دھواں گم ہو جایا کرتا تھا ۔ اس طرح کسی بود و باش کی کوئی علامت دور سے نظر نہ آسکتی تھی ۔ غار تک پہنچنے کے راستہ میں ایک نالہ بھی حائل تھا جو پاس ہی کے پہاڑ کے دامن سے نکلکر بہتا تھا ۔ ان دونوں "صیدہائے رمیدہ" کے حق میں یہ جگہ ایک "حرم" کا حکم رکھتی تھی ۔

شروع شروع میں لوگوں نے انکو گرفتار بھی کرنا چاہا اور دہقانی انکے بہت درپے ہوئے ، یہ لوگ انکا تعاقب کیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر یہ خطرناک وحشی ہاتھ لگیں تو انکو بھیڑیئے یا ریچھ کا لقمہ بنوا دیں ۔ اکثر گاؤں کے کماندار جنگل کا محاصرہ کر کے گھیرے جاتے تھے اور پھر نیزہ بردار لوگ اندر گھستے اور کوئی جھاڑی یا کوئی نالہ بغیر جستجو کے نہ چھوڑتے ۔ دونوں باغی ایسے وقت اپنے تیرہ و تار غار میں چھپ کر بیٹھ جاتے ، وہ بالکل دم بخود رہتے اور خوف و دہشت سے لرزہ براندام ، اور جب انسان کا شکار کھیلنے والے ان شکاریوں

کی ٹولی شور وغل مچاتی ہوئی نکل جاتی تب اُنکی جان میں جان آتی۔

ایک دفعہ اسی قسم کے تعاقب اور دارو گیر کے سلسلہ میں ان دونوں روپوش باغیوں کو پورے دن بھر اس کالے غار میں گوشہ نشین رہنا پڑا، چنانچہ جو شخص ان میں قاتل تھا اس قید تنہائی کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ یکبارگی اس "تیرے" نکل کھڑا ہوا تاکہ کھلے میدان میں آکر اپنے دشمنوں کو دیکھ سکے۔ متعاقبین نے اس کو دیکھ پایا اور فوراً اس کے پیچھے ہوگئے اگرچہ موقع مخدوش تھا لیکن اُس کو یہ پسند تھا اور نامردوں کی طرح زندہ در گور رہنے سے اس مقابلہ کو وہ بہرحال ترجیح دیتا تھا، چنانچہ اب وہ آگے تھا اور لوگ اس کے پیچھے: وہ ے کو کودا، پہاڑ کے ڈھلان سے پھسلا، اور کوہستان کی عمودی بلندی پر چڑھ گیا۔ جان کے وت نے تازیانے کا کام کیا تھا، اس کے سارے اعصاب متحرک ہوگئے تھے اور ساری خوابیدہ عضلاتی طاقتیں بیدار! نقل و حرکت کرنے میں اس کا بدن ایسا لوچدار ہوگیا تھا جیسے کہ ایک فولادی اسپرنگ! اُس کا پاؤں جہاں پڑتا تھا صحیح پڑتا تھا، اُس کا ہاتھ جس چیز کو گرفت کرتا تھا مضبوط کرتا تھا، اُس کے چشم و گوش کی حس دو چند تیز ہوگئی تھی!!

درختوں کی پتیوں کی ایک ایک جنبش کے معنی وہ سمجھتا تھا! ہر بیجان پتھر کی حرکت غنی کی سخن فہمی کے لئے اُس میں ایک اور راگ پیدا تھا!

ایک بڑے اونچے پہاڑی کگارے پر چڑھ کر باطمینان تمام وہ بیٹھ گیا۔ نیچے تعاقب کرنیوالے آکر جمع ہوگئے تھے، لیکن سب بے بس تھے اور مفرور تک کسی کی رسائی ہونا کارے دارد کا معاملہ تھا، چنانچہ وہ اپنے دشمنوں کی اس بے دست و پائی پر فاتحانہ نعرے لگا رہا تھا اور حقارت آمیز الفاظ میں انکو چیلنج دے رہا تھا لوگ جب اپنے نیزوں کو پھینک کر اُس کے سر کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو وہ انکو بڑی چابکدستی سے گیند کی طرح جھیل لیتا تھا، اور پھر لوٹنکر اُنہی کے سر پر رسید کرتا تھا اُس کے اندر ایک وحشیانہ مسرت کا جوش تلاطم تھا۔ اسی حالت میں ایک پہاڑی پر اُس کی نظر پڑی جس کی چوٹی عام سطح کوہستان سے پست

اونچی نکلی ہوئی تھی اور اُس کے سر پر کلغی کی طرح ایک سربفلک صنوبر کا درخت اُگا ہوا تھا! درخت کی انتہائی بالائی شاخوں میں ایک شاہین کا گھونسلا تھا جو اُس بلند فضا میں ہولے جھولا جھول رہا تھا! دلیر باغی کی بلند حوصلگی اور بلند پروازی ان بلندیوں کے مناظر میں اپنی معراج پر تھی چنانچہ وہ دوسرے دن اسی درخت پر جا چڑھا اور بالکل اس کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ گرفتار کرنے والوں کا پڑاؤ بھی اسی نواح میں پڑا ہوا تھا اور وہ بدستور سرگرم جستجو تھے۔ لیکن وہ اُنکی تیز نظروں سے بالکل بے خوف اپنی سیمونی تفریح میں مصروف تھا۔ گھونسلے کے پاس جا کر اُس نے آشیانہ نشین شاہین کے بچوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ انکے ماں باپ اس مخدوش انسانی دستبرد سے بیتاب ہو گئے اور مداخلت کرنیوالے کے سر کے گرد منڈلانے لگے۔ وہ تیزی اور خونخواری سے اس پر جھپٹے مارتے لیکن وہ خوشی سے اُنکا خیر مقدم کرتا اور اُنکے خطرناک پنجوں کے وار کو اپنے کھلے ہوئے چاقو پر لیتا۔ شکاری پرندوں کی ساری حملہ آوری بیسود تھی اور ہمارے باغی کے لئے ایک دلچسپ سامان تفنن!

اب اُس کا شوق تفریح اور بھی تیز ہوا اور اس نے کیا کیا کہ عین گھونسلے میں پاؤں ڈال کھڑے ہو کر "ہنڈولے" کی طرح اُس میں جھولنا شروع کیا!

مگر اب جبکہ دیر کے بعد ہوش آیا تو متعاقبین دور نکل گئے تھے تفتیش کے دوران میں ان میں سے ایک کی بھی نظر ہمارے من چلے بچی پر نہ پڑی جو آسمان سے باتیں کرنیوالے ایک نرالے جھولے پر بچپنے کی ساری بے ہوشی اور بے پروائی کے ساتھ محو لہو و لعب تھا! مگر اب اُس نے آخر کار موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اُسکا جی لرز گیا اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ اس کی زندگی گویا تلوار کی دھار پر سدھی ہوئی تھی اور اُس کو اپنا حشر بہت ہولناک نظر آ رہا تھا! آخر کار بہزار خرابی وہ درخت سے صحیح سالم اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ اب وہ زمین پر تھا مگر ہراس دہیبت نے اُس کے دل میں ایسا گھر کر لیا تھا کہ

دعاب بھی کانپ رہا تھا۔ لغزش زدہ پاؤں کو سہارا دینے کے لئے اُس نے ایک درخت کا تنہ پکڑ لیا، اور بالآخر زمین پر چت لیٹ گیا اور ایک جھاڑی کے پردے میں اپنے آپکو چھپا لیا۔ اس وقت وہ ایسا ہیجان اور زار و نزار ہو رہا تھا کہ صرف ایک آدمی آسانی اسے گرفتار کر سکتا تھا!

ماہی گیر کا نام ٹارڈ تھا، وہ صرف سولہ سال کا تھا لیکن مضبوط اعصاب اور بڑے دل گردے کا نوجوان تھا۔ اُس کی بادیہ نشینی کو اب ایک سال ہونے آتا تھا

دہقانی کا نام برگ تھا، لوگ اسکو "دیو" کے نام سے پکار... خوبصورت سڈول جسم کا آدمی تھا ... ضلع کی آبادی میں سب ... اور خوش القامت تھا۔ وہ چوڑا سینہ اور کاندھے رکھتا تھا لیکن پھر بھی چھریرا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے ہاتھ بڑے نرم و نازک تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کام ... ہمیشہ نا آشنا رہے ہیں۔ اُس کے بال بادامی تھے اور اُس کے چہرے کے رنگ میں ایک صباحت تھی۔ لیکن جنگل میں رہنے سے اُس کے تیوروں میں قدرے خشونت پیدا ہو گئی تھی۔ شکاریوں کی سی نظر بازی کی مشق سے اُس کی آنکھیں بڑی تیز ہو گئی تھیں، اور ...نی پر ہلالی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اُس کے ہونٹ زیادہ چپک گئے تھے اور چہرے کا ...ید متغیر ہو گیا تھا۔ منہ کا گوشت پگھل گیا تھا اور رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ کنپٹیاں خشک ہو گئی تھیں اور اُن میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ الغرض جنگل کی جفاکشی کی زندگی سے جسم کی ساری نرمی و نزاکت رخصت ہو گئی تھی، اور ہر گوشت بدن میں بہت خشکی اور سختی آگئی تھی، لیکن اعصاب میں اسی نسبت سے مضبوطی بھی آگئی تھی۔ بالوں پر بھی تیزی سے سفیدی آرہی تھی۔

ٹارڈ نے جسمانی جمال و جلال کا ایسا پیکر عمر بھر نہ دیکھا تھا۔ اُس کو اپنے تخیل میں برگ ایک عظیم الشان شاہ بلوط معلوم ہوتا تھا۔ وہ آقا کی طرح اس کی خدمت کرتا تھا، اور

دیوتا کی طرح اس کی پرستش! "ٹارڈ بھی ایک رضا کار اور بے عذر غلام بنکر شکاری نیزہ اٹھا کر جنگل کو چلتا، اور مارا ہوا شکار خود ہی لاد کر لاتا، خود ہی پانی بھرتا، اور خود ہی آگ جلاتا۔ دیو ہیکل برگ ان ساری نیاز مندانہ خدمتوں کو شرف قبولیت بخشتا لیکن کبھی بھولے سے بھی ٹارڈ پر ایک نظر نوازش نہ ڈالتا، وہ اس کو ایک حقیر شے سمجھتا تھا، اور ایک قابل نفرت چور!

یہ لوگ اگرچہ باغی ہو گئے تھے، لیکن لوٹ مار پر بسر اوقات نہ کرتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش شکار اور ماہی گیری تھا۔ وہ ایسی امن پسندی اور خوش معاشی کی زندگی بسر کرتے تھے کہ اگر برگ ایک مقدس شخص کا قاتل نہ ہوتا تو گرد و نواح کے [illegible] کبھی [illegible] نہ ہوتے اور کوہستانی پناہ گاہ میں انکو بے خلل و خش زندگی بسر [illegible] لیکن وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک ایسے شخص کو کیفر کردار کو نہ پہنچایا گیا جس نے خدائے قدوس کے ایک خادم خاص (راہب) کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے ہیں تو گاؤں پر قہر خداوندی نازل ہو جائے گا! جب کبھی ٹارڈ آبادی میں اپنا شکار بیچنے کے لئے لیجاتا تو لوگ بخوشی اسکو خرید لیتے، اور کچھ زائد رقم بھی اس کو پیش کرتے۔ وہ اس سے یہ چاہتے تھے کہ وہ ان سے برگ کی مخبری کر دے کہ وہ اس کو اپنے مواخذے سے بری کرنے کے لئے بھی تیار تھے لیکن ٹارڈ ساری مراعات کو ٹھکرا دیتا اور اگر کبھی گاؤں والے خود ہی اس کے ساتھ ہو لیتے تا سراغ لگائیں تو وہ غلط راستہ اختیار کر لیتا اور انکو اسقدر سرگردان کرتا کہ پریشان ہو کر وہ اس تفتیش سے دستبردار ہو جاتے!

ایک دفعہ برگ نے ٹارڈ سے برسبیل تذکرہ پوچھا کہ کبھی لوگوں نے اس کو خیانت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب ٹارڈ نے اثبات میں جواب دیا اور برگ کو اس انعام کی مقدار معلوم ہوئی جو اس کام کے معاوضہ میں اس کو پیش کیا جاتا تھا تو اس نے بہت متعجب ہو کر کہا کہ "تم بڑے گدھے ہو کہ ایسے بڑے معاوضہ کو مفت میں ہاتھ سے دیدیا!"

برگ کی اس گفتگو پر ٹارڈ کی آنکھیں ایک ایسے جذبے سے منعکس ہوگئیں جس کا مشاہدہ اول اللذکر نے [illegible] محبت سے جس کو ایام شباب میں اُس نے اپنی محبوبہ بنایا ہو، کبھی اُس کی [illegible] ایسی مرغزار فستاں سے نہ دیکھا ہو گا خود اُس کے بچوں اور [illegible] نے کبھی ایسی محبت باقی نہ کی ہو گی!

"کہ آپ ایسا خیال فرماتے ہیں۔ آپ کو خبر نہیں کہ میں نے آپ کو اپنا دیوتا بنایا [illegible] آپ میرے مطلق ہیں جن کی حکومت کو میں نے اپنے اوپر بہ طیب خاطر قبول کیا ہے!"

برگ کے دل میں اس نوجوان کی طرف سے کچھ جگہ ہوئی، وہ اب ذرا قدر کی نگاہ سے اُس کو دیکھنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ لڑکا ایک خلوص و وفا کا پیکر ہے، اور اگرچہ وہ [illegible] دعوے کرنے کا عادی نہیں لیکن وقت پر اپنی جان پر کھیل جانے والا ہے! وہ [illegible] خطرات اور موسم کی بے رحمیوں کے سارے مصائب بھگتنے کے لیے تیار ہے [illegible] کی رفاقت اور خدمت سے محرومی گوارا نہیں کرتا۔

کبھی کبھی برگ اُس کے ان فدا کارانہ جذبات کی طرف اشارہ کرتا اور اس کی اس [illegible] سبب اُس سے پوچھتا تو وہ اس معمے کو حل نہ کر سکتا اور کچھ سراسیمہ سا ہو جاتا!

ٹارڈ کبھی رات کو آگ کے پاس نہ لیٹتا جو غار کے عقبی گوشہ میں گرمی پیدا کرنے کے لیے جلائی جاتی تھی، اُس کے نزدیک برگ کی جان کی حفاظت اور اُس کے مسکن کی نگہبانی [illegible] برگ سو جایا کرتا تو وہ سرک کر آتشدان کے پاس سے غار کے منہ پر چلا آتا اور وہاں ایک چوڑی سل پر بستر لگا کر لیٹتا! برگ نے ایک رات اس بات کو دیکھ لیا، اگرچہ اُس نے اپنے قیاس سے اس کی وجہ معلوم کر لی تاہم اُس نے ٹارڈ سے اُس کی [illegible] پوچھا۔ مگر ٹارڈ کوئی جواب نہ دینا چاہتا تھا۔ مزید پرسش اور کاوش سے [illegible] کے لیے اُس نے اپنے بستر کی جگہ بدل دی، اور دوستی کا [illegible]

پھر اپنی اصل "خوابگاہ" میں منتقل ہو گیا!

ایک رات برف کا سخت طوفان آیا۔ تمام شجر و حجر برف پوش ہو گئے۔ بلند صنوبر کے درختوں کی چوٹیوں سے لے کر نیچی سے نیچی جھاڑی کی جڑ تک برف کے تودوں میں اٹ گئی۔ یہ طوفان برف و باد اتنا شدید تھا کہ "باغیوں کے غار" کے بعض اندرونی گوشوں تک کی برف کی گلوں سے خبر لی۔ ٹارڈ جب صبح اُٹھا ہے تو وہ برف کے ایک کمبل میں لپٹا ہوا تھا! یہ ایک اندیشہ ناک افتاد تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ برف باری کے دو تین دن بعد ٹارڈ بیمار پڑ گیا۔ اُس کے سینہ کے رگ و ریشہ میں درد پیدا ہو گیا اور اُس کو تنفس میں دقت محسوس ہونے لگی۔ کئی دن تک وہ خاموشی اور صبر کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کرتا رہا، لیکن ایک دن شام کو جب وہ آگ پھونکنے کے لیے جھکا تو یکبارگی درد اور ضعف میں بیتاب ہو گیا بے اختیار گر پڑا، اور کسی طرح اُٹھ نہ سکا۔ برگ جھپٹ کر پاس آیا اور اس کو بستر میں آرام سے لیٹنے کی ہدایت کی۔ ٹارڈ اگرچہ درد کی شدت سے بے حال تھا لیکن ایسا نڈھال و نزار ہو رہا تھا کہ مطلق حرکت نہ کر سکتا تھا۔ وہ بیچارگی سے پڑا پڑا کراہ رہا تھا۔ آخر برگ نے اُس کو اپنی گود میں اُٹھایا اور بستر پر جا کر ڈالا۔ ٹارڈ کو اُٹھاتے وقت برگ کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ کسی سانپ کو چھو رہا ہو! اس کے منہ سے اس کو ایسی بو آئی جیسے اُس نے گوشت کا گوشت کھایا ہو! ایک ذلیل و حقیر جوہر کے بدن کو مس کرتے ہوئے وہ کیسا متنفر و بیزار ہو رہا تھا!

برگ نے دریچہ کی کھال ٹارڈ پر ڈال دی اور اُس کو پانی لا کر دیا۔ یہی کل تیمارداری تھی جو اُس نے اُس کی کی۔ لیکن خوش قسمتی سے بیماری خطرناک نہ تھی اور ٹارڈ کی صحت و طاقت بہت جلد عود کر آئی۔ اس بیماری کے ایام میں چونکہ برگ نے بھی ٹارڈ کی تھوڑی خدمت و خبرگیری کی اس لیے دونوں ایک دوسرے سے اور بھی مانوس ہو گئے۔ برگ کی نگاہ لطف نے ٹارڈ کی کچھ ہمت افزائی کی، اور وہ کبھی اپنے آقا سے ہم کلام ہو لیتا تھا

ایک دن شام کو جبکہ دونوں آگ تاپ رہے تھے اور تیر بناتے جاتے تھے، اُنکے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

"آپ بہت عالی خاندان شخص ہیں" ٹارڈ نے برگ سے کہا " آپ کے رشتہ دار اس گاؤں کے سب سے زیادہ دولتمند لوگ ہیں، آپ کے ہم نام و لقب اور ہم خاندان لوگوں نے بادشاہوں کی خدمتیں کی ہیں، اور اُن کے قلعوں میں لڑکر داد وفاداری دی ہے۔"

"لیکن اکثر اوقات انہوں نے بادشاہوں کے خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا ہے اور شاہی املاک وجائداد کو نقصان پہنچایا ہے" برگ نے جواب میں کہا۔

"آپ کے بزرگ میلاد مسیحؑ کی تقریب پر بڑی بڑی شاندار دعوتیں دیا کرتے تھے اور جبتک آپ کی یہ جلا وطنی شروع نہ ہوئی تھی تو ضیافتوں کی ان خاندانی روایات کو آپ نے بھی برابر اُن کے ساتھ قائم رکھا۔ آپ کے دارالضیافت کے پُرشوکت ایوان میں سینکڑوں مردوں اور عورتوں کی کرسیوں کی گنجائش ہوتی تھی۔ یہ ہال ایک قدیم عہد کی تہذیب اور ایک مشہور رسم کی یادگار میں بنایا گیا تھا۔ بڑے بڑے نقرئی ظروف ان دعوتوں میں استعمال کئے جاتے تھے اور پُرتکلف کھانوں سے مہمانوں کی مدارات کیجاتی تھی۔"

ان نیاز کیشانہ قصیدہ خوانیوں پر برگ نے ٹارڈ کی طرف دیکھا۔ ٹارڈ اپنے بیان سے خود متاثر ہو رہا تھا۔ جس وقت برگ کے خاندان کی عظمت وحشمت کے ذکر و اذکار میں وہ محو استغراق تھا، تاریخ گزشتہ کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا، چشم تخیل نے اُن پُرشوکت ضیافتوں کی تصویر کھینچدی جن میں زرق برق لباس پہنے ہوئے مہمانوں کا ہجوم ہوتا تھا اور برگ صاحب خانہ کی حیثیت سے ساری محفل کا سرتاج نظر آتا تھا۔ برگ نے دیکھا کہ اُس کی عظمت و اقبال کے زمانے میں بھی کوئی خادم اُس کے لئے اس قدر طاعت و اطاعت کا مجسمہ نہ تھا، نہ اُس کا ایسا مداح اور وفادار! وہ اس سے بہت متاثر ہوا لیکن

ساتھ ہی اس نے ایک طرح کی کبیدگی بھی محسوس کی ۔ لارڈ پھر ایک حقیر آدمی ہے جس کے منہ کی تعریف و توصیف ہی کیا ! ایک ذلیل چور اس کی مدح و ستائش کرکے سوئے ادب کا موجب ہو رہا ہے !

"کیوں کیا تمہارے گھر میں دعوتیں نہیں ہوا کرتی تھیں ؟" برگ نے سوال کیا

"وہ دور چٹانی جزیروں پر والد و والدہ کا دولت خانہ ہے ! باپ کا یہ پیشہ ہے کہ طوفان شکستہ کشتیوں کو لوٹ لیا کرتا ہے ، اور ماں ایک جادوگرنی ہے ۔ جب سمندر متلاطم ہوتا ہے اور بحری مسافروں کی کوئی جماعت مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو وہ ایک آبی جانور کی پیٹھ پر سوار ہو کر موقع واردات پر پہنچ کر منتظر کھڑی ہو جاتی ہے ، اور موجیں جتنی لاشوں کو اچھال کر خشکی پر پھینکتی ہیں وہ سب اس کا مال ہوتی ہیں !"

"مگر وہ لاشوں کو لے کر کیا کرتی ہے ؟" برگ نے پوچھا ۔

"ابھی آپ کو معلوم نہیں ؟ جادوگرنیوں کو ہمیشہ لاشوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ میری ماں اُن سے دوا بناتی ہے ، اور شاید ان کو کھاتی بھی ہے ۔ چاندنی راتوں میں وہ ان لاشوں کو لے کر بیٹھتی ہے اور رات بھر عملیات و حاضرات کیا کرتی ہے" لارڈ نے جواب دیا ۔

"کتنی ہولناک باتیں ہیں !" برگ بولا ۔

"اس میں شک نہیں ہے ، لیکن یہ محض دوسروں کے نقطۂ نظر سے ہے کہ ایک جادوگرنی کے خیال میں اسکو بغیر اس کے چارہ نہیں" لارڈ نے متانت اور سکون سے کہا ۔

برگ کے لئے یہ ایک بالکل ہی نیا نادر نکتہ تھا جس سے اُس نے ایک عورت کی زندگی پر تبصرہ کیا ۔

"تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پھر چوروں کو چوری کرنا چاہئے جس طرح کہ جادوگرنیوں کے لئے جادو منتر کرنا لازمی ہے !" برگ نے جھلا کر سوال کیا ۔

"جی ہاں ، کیوں نہیں" لڑکے نے جواب دیا ۔ "ہر شخص کو لامحالہ وہ کام کرنا

[illegible] کے لئے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے۔" لیکن انکسار اور ادعا سے مخلوط ایک مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ظاہر ہوئی جس کے ساتھ اُس نے کہا:

"بعض ایسے چور بھی ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی ہے۔"

"اس بے معنی بات کے معنی؟" برگ نے پوچھا۔

[illegible] کے چہرے پر اب بھی وہی پُر اسرار مسکراہٹ تھی، برگ کے سامنے اس نے [illegible] رکھی تھی اور برگ اُس کی بوالعجبی سے جس طرح کشمکش و پیچ میں تھا اُس سے [illegible] لے رہا تھا۔

"ہاں بعض ایسی چڑیاں ہیں جو اڑتی نہیں، اور بعض ایسے چور ہیں جنہوں نے کبھی چوری نہیں کی ہے!" ٹارڈ نے پھر کہا۔

برگ نے ارادۃً اپنے کو مبہوت بنا لیا تاکہ ٹارڈ جو رمز کہہ رہا تھا اس کی تشریح [illegible] اس نے کہا:

"یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس نے چوری کا ارتکاب نہ کیا ہو جس پر چور کا لقب [illegible] کیے!"

[illegible] نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے، گویا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اُس کو زبان پر [illegible] ہے۔

"لیکن فرض کیجئے کہ اس کا باپ چور رہا ہو؟" بالآخر اس کے منہ سے نکلا۔

"ایک لڑکا ورثہ میں اپنے باپ کا گھر اور مال پا سکتا ہے، لیکن "چور" کا خطاب [illegible] خود اپنی کمائی کی صورت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔

ٹارڈ آہستہ سے ہنسا "لیکن اگر کسی کی خوش قسمتی سے اُس کی ایک ماں ہو جو جس کے پاس آئے، داد و ویلا مچائے اور منت و زاری سے کہے کہ باپ کے جرم کا ترکہ بھی [illegible] پھر اگر وہ اس مصیبت میں مبتلا ہو جائے، اور ایک موقع پر جبکہ وہ

بالکل ناکردہ گناہ ہو سرکاری دارو گیر سے اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں بھاگ آئے تب ؟ ممکن ہے کہ اس کو باغی بنا کر قانون کے سارے حق حقوق سے محروم کر دیا جائے لیکن وہ غریب کیا کرے جب کہ اُس کے اوپر ایک ایسے مچھلی کے جال کی چوری کا الزام ہو جس کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہو!

برگ نے غصے میں اپنا گھونسہ پتھر کے تختے والی میز پر مارا! "اُف اس نوجوان خوبصورت لڑکے نے اپنی جوانی میرے لئے وقف کر دی! اس کو اپنے ماں باپ کی کوئی محبت نہیں، اپنی برادری کی وابستگی کا کوئی خیال نہیں، چوری کے پیشہ کے دمن دولت کا کوئی لالچ نہیں صرف میرے لئے گویا" امور خانہ داری کا کل انصرام اس نے اپنے اوپر لے رکھا ہے، اور پھر کمبخت نے مجھکو اپنی حقیقت سے بالکل بے خبر رکھا اور میری بدسلوکی سے اپنی معصومیت کی توہین کرائی!"

الغرض برگ نے نارڈ سے بہت شکوہ شکایت کیا، لیکن نوجوان نے مطلق اُس کی پرواہ نہ کی، اور اُس کو صرف ایک دلسوز ماں کی ملامت سمجھا!

کوہستان کی بلندی پر ایک مسطح قطعہ پر جس پر گھنی جھاڑی تھی، ایک دلدلی جھیل واقع تھی۔ اُسکا دور مربع شکل کا تھا، اور اُس کے کنارے بھی ایک مربع کے ضلعوں کی طرح خط مستقیم میں چلے گئے تھے۔ جھیل کے گوشے بھی ایسے ہی صاف تھے گویا کہ وہ اقلیدی شکل کے باضابطہ زاوئے ہوں اور انسانی ہاتھوں کی کاریگری ہو۔ جھیل کے تین طرف اونچی پہاڑیاں تھیں جن کی سنگین سطح پر سخت جان کوہستانی صنوبر اُگے ہوئے تھے، اور جن کی جڑوں کی دبازت ایسی تھی جیسی کہ انسانی بازوؤں کی موٹائی ہوتی ہے۔ یہ جڑیں پانی میں بھی چلی گئی تھیں اور اکثر موقعوں پر جھیل کی سطح کے اوپر نکل آئی تھیں۔ آپس میں پیچ در پیچ ہو کر انھوں نے ایک خاص منظر اختیار کر لیا تھا، اور ایسا نظر آتا تھا کہ گویا یہ کوئی عجیب و غریب قسم کے سانپ ہوں جو پانی سے نکلکر بھاگ رہے ہوں لیکن جھیل سے

کسی جادو کے اثر سے پتھر بن گئے ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان دیووں کے ڈھانچے ہیں جو کبھی جھیل میں ڈوب گئے ہیں اور اب ان کی مردہ ہڈیوں کو جھیل نکال کر پھینک دینا چاہتی ہے۔ سکرات موت کے عالم میں ان دیووں کے ہاتھ پاؤں بری طرح آپس میں الجھ کر ایسے ہی رہ گئے اور انگلیاں سخت ہو کر پتھروں میں غرق ہو گئی ہیں۔ اُنکی پسلیوں نے محرابیں بنائی ہیں جو ان عظیم الجثت درختوں کو اپنے اوپر سہارا دیے ہوئے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً ان آہنی شکنجوں اور سنگین پنجوں کی ساری گرفتیں اور بندشیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور تیز و تند شمالی آندھیوں نے ان درختوں کو اکھاڑ پھینکا ہے جو اپنے موقع سے بہت دور جھیل کی دلدل میں جا گرے ہیں، جہاں اُنکی چوٹیاں کیچڑ ملے پانی میں گھس گئی ہیں۔ درختوں کی شاخوں اور ٹہنیوں نے مچھلیوں کو چھپنے کے لیے محفوظ کنج بہم پہنچائے ہیں۔ گرے ہوئے درختوں کا سارا نقشہ ایسا ہے کہ گویا وہ دیووں اور بھوتوں کے خوفناک پنجر ہوں جنہوں نے جھیل کو پرمنظر کر کے اس کو ایک مکروہ صورت دیدی ہے۔

جھیل کے چاروں طرف سنگین کنارے سلامی بنتے چلے گئے ہیں۔ ایکطرف سے ایک چھوٹا سا دریا جھیل سے نکلا تھا، لیکن قبل اس کے کہ اس کو ایک ہموار راستہ ملے اُسکو بہت سے پیچیدہ اور تنگ ناؤں، نالیوں میں ہو کر گزرنا پڑا، جابجا مٹی اور پتھر کے تودوں کی بلندیاں ہیں جنہوں نے بیشمار جزیروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس مجمع الجزائر میں بعض ٹاپو اتنے چھوٹے ہیں کہ بمشکل اُن پر قدم رکھا جا سکتا ہے اور بعض کا طول وعرض اور رقبہ ایسا ہے کہ وہ اپنی پشت پر بیسیوں درختوں کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔

یہاں چونکہ چٹانیں زیادہ بلند نہیں ہیں اور سورج کی روشنی کے لئے کھلا رستہ ہے اس لئے تھوڑے تھوڑے پتوں والے درخت اُگ آئے ہیں، مزید براں مختلف قسم کی کوہستانی نباتات کا اس جگہ ہجوم ہے اور ان کی سبزی اور پھولوں کی عطر بیزی سے یہ خطہ معطر اور گلزار ہو رہا ہے۔

جھیل کے دہانے پر چھوٹی چھوٹی قد آدم جھاڑی کا ایک جنگل ہے جس میں سے
سورج کی دھوپ ایسی نرم اور سبز گوں ہو کر پڑتی ہے جیسے کہ ہری مخمل کے فرش پر لیمپ کی
روشنی میں ہو۔ لاکھوں برس پر پانی تھا وہاں جھاڑیوں روزنوں نے پیدا ہو کر چھوٹے چھوٹے تالاب
بنا دئے ہیں جن میں کنول چمک رہے ہیں! فطرت کی یہ نازک اندام اور گلبدن نازنینیں
طلوع آفتاب کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولتی ہیں اور سورج کی شعاع واپسیں کے ساتھ اپنے
ننھے ننھے سینوں کو بند کر لیتی ہیں۔

(باقی)

غزل

از حضرت جگر مراد آبادی

ہاں نگاہِ شوق وہ اٹھی نقاب / آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
شوق بے پایاں و جوشِ بے حساب / عشق کیا ہے ایک مسلسل اضطراب
دستِ رنگین و جمالِ بے حجاب / اے خوش آں وقتے و خوش جامِ شراب
میری ہستی، ہے غبارِ کوئے دوست / مجھ سے پیدا ہر سکوں ہر اضطراب
ہوش ہے پھر مائلِ فرزانگی / لاشراب، اے دوست ساقی لاشراب
آج کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں / میں کہاں ہوں لے نگاہِ باریاب
ہاں سراپا کچھ ہے راحت کچھ خلش / دل مجسم کچھ سکوں کچھ اضطراب
عشق کیا ہے پرتوِ حسنِ تمام / شوق کیا ہے حسن کا عکسِ شباب
ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا / منہ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب

مختصر ہے شرحِ ہستی اے جگر
زندگی ہے خواب، اجل تعبیرِ خواب

ولہ

ستم کامیاب نے مارا / کرم لاجواب نے مارا
ایک رنگیں نقاب نے مارا / حسن بن کر حجاب نے مارا
جلوۂ آفتاب کیا کہئے / سایۂ آفتاب نے مارا
نگہِ شوق و دعویٔ دیدار / اس حجاب الحجاب نے مارا

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا — اس ادائے حجاب نے مارا
اب نظر کو کہیں قرار نہیں — کاوش انتخاب نے مارا
مرتے ترے تغافل — پرسش بے حساب نے مارا
خود نظر بن گئی حجاب نظر — ہائے! اس بے حجاب نے مارا
میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا — اس سوال و جواب نے مارا
حشر تک ہم نہ مرنے والوں کو — مرگ ناکامیاب نے
بچ رہا جو تری تجلی سے — اُس کو تیرے حجاب نے مارا
اپنے سینہ ہی پر پڑا اکثر — تیر جو اضطراب نے مارا

دل کہ تھا جان زیست آہ جگر
اسی خانہ خراب نے مارا

ولہ

غافل ز دم تیشیں جانان ز سرمستی — صد نغمہ برانگیز و سازے کہ تو بشکستی
صد حسن دراں پنہاں صد جلوہ ازاں پیدا — قربان نگاہ تو، نازیم بہ ایں مستی،
از دل گام عشق، کردیم نثار حسن — دنیا و غم دنیا، ہستی و غم ہستی
گہ تا فلک اندیشم گہ بیخبر از خویشم — گاہے بہ چناں ہوشے گاہے بہ چنیں مستی

آں رند خراباتم ناشم کہ جگر خوانند
صد ہوش بہ جاں دارد با اینہمہ صد مستی

تنقید و تبصرہ

رسائل :-

نظام المشائخ (رسول نمبر) پیشوا (رسول نمبر)

نظام المشائخ (رسول نمبر) سائز ۲۲×۳۰ ضخامت علاوہ اشتہاری صفحوں کے ۲۳۲ صفحات سالانہ چندہ باتفسیر ۳ے/ بے تفسیر ۲ے فی پرچہ ۴ر اس نمبر کی قیمت عمر پتہ:- دفتر نظام المشائخ، کوچہ چیلان - دہلی -

خواجہ حسن نظامی صاحب، خاص ادبی میں، سادہ اور چٹکیلی اردو لکھنے میں جتنی صحیح اور جائز شہرت رکھتے ہیں اسی قدر انکا یہ رسالہ پسندیدہ شہرت کا مالک ہے۔ رسالہ کی ۳۲ ویں جلد ہے اور عام رواج کے مطابق جبلی نمبر کے لئے گویا اب ۱۸ ہی جلدوں ... عرصے سے اب اس کی ترتیب و اشاعت کے ذمہ دار خواجہ صاحب کے ... معقول، سنجیدہ و متین حواری جناب واحدی ہیں اور خوشی کی بات ہے رسالہ انکی ادارت ... اور ترقی کر رہا ہے -

رسول نمبر ما شاء اللہ بہت خوب ہے اور مرتب کی خوش مذاقی اور سلیقہ کا شاہد ... مضمون نگاروں میں بعض مشاہیر علماء اور معروف ادیبوں کے نام ہیں اور اول سے آخر تک جو کچھ ہے معقول و دلچسپ ہے۔ سیرۃ مقدسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریباً جملہ مضامین عمیق ... کاوش اور بعض خاصی کاوش و تلاش کے نتائج ہیں۔ چند نظمیں بھی اچھی خاصی ہیں حضرت ... حیدرآبادی کی نظم ہجرت خواجہ حالی مرحوم کے مشہور مسدس کے انداز میں سب نظموں پر بھاری ہے، لیکن اگر نظموں کی مزید تلاش و ترتیب میں ذرا اور کاوش کیجاتی تو اچھا تھا۔

بہرحال رسول نمبر محاسن صوری و معنوی سے آراستہ اور رواج کے خلاف گندے

اشتہاروں سے بھی الحمد للہ پاک وصاف ہے۔ سرورق کا ڈیزائن بھی مرغوب سادگی کے ساتھ
بہت دلکش ہے۔

پیشوا (رسول نمبر) | سائز [illegible] حجم ۱۸۴ صفحات، سالانہ چندہ [illegible] فی پرچہ ۳ ر اس نمبر کی قیمت [illegible]
[illegible] دفتر پیشوا دہلی [illegible]

[illegible] شروع ہوا در خوشی کی بات ہے۔ اس مختصر عرصے میں اس رسالے نے
باعتبار روش اور [illegible] محاسن صوری و معنوی امید افزا ترقی کی ہے۔ اس سال اس نے پھر
ایک موٹا سا بھاری بھرکم رسول نمبر نکالا ہے جو پچھلے سال سے بہتر ہے۔ کاغذ نفیس
کتابت بھی زیقانی صاحب [illegible] رسالے کی بڑی بھلا کیونکر ہو سکتی ہے [illegible]
[illegible] اڈیٹر کا نام کافی ضمانت ہے۔ پورے ڈھائی درجن بلاک کے مطبوعہ فوٹو ہیں گویا
[illegible] تسکین و تسلی کے ساتھ ساتھ مقامات مقدسہ کا ایک البم بھی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے
موجود ہے۔

پوری ۲۹ نعتیہ نظمیں اور تقریباً ۸۰ مضامین نثر کے ہیں جو اکثر مشہور علماء اور ادیبوں
کے نتائج افکار و قلم ہیں۔ مختصراً یہ کہ رسالہ [illegible] ماشاء اللہ بہت اچھا [illegible]
مستفیض ہونا چاہیے۔

[illegible] صاحب بقائی کی خدمت میں بخلوص و شماتت [illegible] عرض کئے
نہ رہ سکے کہ "رسول نمبر" کا ڈیڈیکیشن دنیا کے کسی بڑے سے بڑے رئیس یا "شہریار کے نام"
دیکھ کر راقم الحروف ایسے عامی مسلمان کو تو تکلیف ہی ہوئی۔ خواہ وہ [illegible]
کیسے ہی پسندیدہ صفات و خصائل محمودہ کے مالک ہوں۔ اس کے علاوہ [illegible] نمبر میں
"شب عروسی" کا اشتہار وہ بھی بہت نمایاں کر ٹھیک سرورق کے صفحہ ۴ پر خاصی زیب
زینت کے ساتھ دیا گیا ہے، کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔

شذرات

وسط اگست سے دہلی کے [illegible] شروع ہوئی ہے لیکن [illegible]
ہے اور محکمہ حفظان صحت [illegible] ہالت اب تک زیادہ پھیلنے نہیں پائی اور امید ہے
کہ آخر ستمبر تک موسم بدل [illegible] بعد بالکل معدوم ہو جائے گی۔ جا[illegible] تم
کی پوری کوشش کی جا رہی ہے سب طلبہ کے ٹیکے لگائے گئے ہیں [illegible] نے پینے میں ہر طرح
کی احتیاط کی جا رہی ہے۔ حفظان صحت کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر سینا [illegible]
[illegible]

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے معائنے کے سلسلے میں یہ رائے ظاہر کی کہ جامعہ
کے طلبہ کی صحت کا عام معیار دوسرے مدرسوں کے مقابلے میں بہت اچھا ہے۔ اسمیں
شک نہیں کہ جناب شیخ الجامعہ صاحب اور بورڈنگ ہاؤسوں کے نگراں طلبہ کی تندرستی
کے لئے نہایت دلسوزی اور توجہ سے ہر ممکن تدبیر اختیار کرتے ہیں یوں تو محافظ حقیقی خداوند
تعالیٰ کی ذات ہے اور ہر شخص کو اپنی صحت اور سلامتی کے لئے اسی کا شکر کرنا چاہیے لیکن منتظمین
جامعہ اس لحاظ سے تعریف کے قابل ہیں کہ وہ اس معاملے میں اپنے فرائض کا پورا احساس
رکھتے ہیں اور انہیں بہت خوبی سے انجام دیتے ہیں۔

امیر جامعہ جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ ۷ ستمبر کو بھوپال اور
حیدر آباد کے قصد سے روانہ ہو رہے ہیں کہ اپنے احباب خاص کے حلقہ میں جامعہ ملیہ کے
مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کریں۔ شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر

ذاکر حسین خانصاحب بھی ممدوح کے ہمراہ تشریف لیجائیں گے۔

پچھلے مہینے جناب مولانا محمد علی صاحب کو وہ جانکاہ صدمہ پیش آیا جسے انسان کا قلب بغیر خدا وند تعالیٰ کی مدد کے ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ ممدوح کی صاحبزادی نے جن کا عقد جناب ماجد علی صاحب انجنیر سے ہوا تھا دیرہ دون میں وفات پائی۔ انا للہ وانا [illegible] جناب مولانا و بیگم محمد علی صاحبہ اور ماجد علی صاحب سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں کہ انکو صبر جمیل عطا کرے۔

[illegible] فارغ التحصیل طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے عموماً [illegible] ان ممالک میں تمام یونیورسٹیاں جامعہ کی سند کو تسلیم کرتی ہیں اور یورپ [illegible] ممالک میں ہندوستانی طلبہ کے ساتھ وہ تعصب نہیں برتا جاتا جس سے [illegible] بدنام ہے۔ براعظم یورپ کی تعلیمگاہوں میں عموماً اور جرمنی کی یونیورسٹیوں میں خصوصاً [illegible] علمی فیاضی پائی جاتی ہے کہ ایشیائی طالب علموں کو تحصیل وتحقیق کا موقع اسی طرح [illegible] جیسے یورپ کے طالبعلموں کو بلکہ کبھی کبھی ان غریب الوطنوں کے ساتھ خاص ہمدردی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

اس سال بھی جامعہ کے دو طالب علم جرمنی جارہے ہیں جن میں سے ایک ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنا چاہتے ہیں اور دوسرے برلن اور لائپزگ میں رہ کر عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں کا لسانیات تقابلی کے اصول پر مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔

[illegible] کے ایک فارغ التحصیل طالب علم مصر جانے کا عزم رکھتے ہیں کہ جامعہ ازہر اور جامعہ مصریہ [illegible] علوم کی تکمیل کریں۔

ہم ان تینوں صاحبوں کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ تحصیل علم کے مبارک ارادے سے اتنے دور دراز سفر اختیار کر رہے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالے انہیں توفیق دے کہ نہایت محنت اور جفاکشی سے تحصیل علوم میں مصروف رہیں اپنے قول و عمل سے لوگوں کے دلوں میں اپنے ملک و قوم کی محبت پیدا کریں اور ہندوستان واپس آکر ایمانداری اور خلوص سے مفید علمی اور عملی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر سر سی وی رامن صاحب نے مائیسور یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اگرچہ مختصر ہے لیکن خیالات کی گہرائی اور نظر کی وسعت کے اعتبار سے ان طول طویل خطبات سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے جو سامعین کو گھنٹوں تک خواب اور بیداری کی سرحد پر اس حالت میں رکھتے ہیں کہ ازیں سو راندہ و ازاں سو ماندہ۔ موصوف نے ابتدا میں ریاست میسور کی علمی خدمات کا مناسب الفاظ میں اعتراف کیا اس کے بعد بتایا کہ دنیا میں امن قائم رکھنے اور مختلف قوموں کو ایک رشتہ اتحاد میں مربوط کرنے کے لئے علم کس حد تک مفید ہے اور یونیورسٹیاں جو علم کا مرکز کہلاتی ہیں اس فرض کو کیونکر ادا کر سکتی ہیں۔ مثلاً جرمنی نے اپنے علمی فضل و کمال کی بدولت جنگ عظیم کے بعد کتنی جلدی پہلے انگلستان سے اور پھر دوسری قوموں سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے بلکہ ان پر دوبارہ ذہنی اور تمدنی اقتدار حاصل کر لیا۔ یونیورسٹی کے فرائض کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ اسکا کام محض عام تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ ہر نوجوان کی مخصوص ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنا اور نشو و نما دینا۔ تاکہ وہ اپنے ملک کی اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اصلاح و ترقی کا بوجھ اٹھا سکیں اور اسے دنیا کے دوسرے مہذب ملکوں کا ہمرتبہ بنا سکیں۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ جہاں ڈاکٹر صاحب نے ملک کی سیاسی حالت پر تبصرہ کیا

ہے اور نوجوان طالب علموں کا تعلق سیاست سے دکھایا ہے وہاں یہ بات صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ موصوف بھی اور اہل علم کی طرح اپنے علمی افکار و مشاغل میں اسقدر ڈوبے رہتے ہیں کہ علمی زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے سے بالکل معذور ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ نوجوانوں میں سیاسی بے چینی پیدا ہونے کی وجہ محض بیکاری ہے اور اگر انکے لئے مفید کاموں کا انتظام کردیا جائے تو یہ بات جاتی رہے گی۔ گویا آپ کے نزدیک قوموں کا سیاسی اور اقتصادی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا محض ایک بے فکری کا مشغلہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ابتدا میں برطانوی حکومت کا بھی یہی خیال تھا اور وہ ہندوستان کے "بچوں" کو کھلونے دیکر بہلانے کی کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ مگر اسے یہ محسوس ہوگیا ہے (اور ڈاکٹر صاحب اگر چاہیں تو اس سے پوچھ کر تصدیق کر سکتے ہیں) کہ ان کھلونوں سے "بچے" تھوڑی دیر تو بہلتے ہیں لیکن پھر انکی "شرارت" چوگنی ہو جاتی ہے۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب انہیں یہ نصیحت کرتے ہیں جس میں ہم بھی موصوف کے ہمزبان ہیں کہ وہ انتہائی محنت اور ... سے کام لے کر علمی میدان میں آگے قدم بڑھائیں اور اپنی قوم کی ذہانت اور قابلیت کا سکہ دوسری قوموں کے دل پر جما دیں۔

نوجوانوں میں جو سیاسی ہیجان و طوفان اٹھ رہا ہے اسے روکنا نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس سیلاب کو بے قید نہ رہنے دیا جائے بلکہ نہروں میں پابند کرکے اسکا رُخ اس طرح پھیرا جائے کہ ملک کی آزادی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ اس کے دھارے میں بہہ جائیں۔



[redacted]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد [illegible]	بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء	نمبر [illegible]

فہرست مضامین

آزادی کی راہیں

باب

باکونین اور زراج

(گذشتہ سے پیوستہ)

فرانکولاس کی موت کے بعد بہت سے سیاسی قیدیوں کو معافی دی گئی لیکن اسکندر ثانی نے خود اپنے ہاتھ سے اس فہرست سے باکونین کا نام کاٹ دیا۔ باکونین کی ماں جب زار کی خدمت میں باریابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تو زار نے اس سے کہا "خاتون، اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارا بیٹا جب تک زندہ ہے آزاد نہیں ہو سکتا" لیکن بہر حال ۱۸۵۷ء میں آٹھ سال کی قید کے بعد اسے مقابلتہً آزاد کر کے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ یہاں سے ۱۸۶۱ء میں جاپان بھاگ گیا اور وہاں سے امریکہ ہوتا ہوا لندن پہنچا۔ اسے حکومتوں کی مخالفت کی وجہ سے قید کیا گیا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی مصیبتوں نے اس پر وہ اثر نہ ڈالا جو لوگ چاہتے تھے یعنی ان سے محبت پیدا کرنا جنہوں نے اس پر یہ مصیبتیں ڈالی تھیں۔ اس زمانے سے اس نے اپنے کو تمام تر زراجی بغاوت کی روح پھیلانے کے لئے وقف کر دیا اور اسے کوئی مزید قید نہیں کاٹنی پڑی۔ کچھ سال یہ اٹلی میں رہا۔ یہاں ۱۸۶۴ء میں اس نے ایک "بین الاقوامی برادری" یا "اشتراکی انقلابیوں کا اتحاد" قائم کیا۔ اس میں بہت سے ممالک کے لوگ تھے لیکن بظاہر کوئی جرمن نہ تھا۔ اس نے اپنے کو زیادہ تر جرمنی کی قوم پرستی کی مخالفت کے لئے وقف کیا۔ ۱۸۶۷ء میں یہ سوئزرلینڈ میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اگلے سال اس نے "اشتراکی جمہوریت کے بین الاقوامی اتحاد" کے قیام میں مدد دی [illegible]

[...]س پروگرام میں اس کے خیالات کا ایک اچھا مختصر سا خلاصہ ملتا ہے: ۔

"یہ اتحاد اپنے مادہ پرست ہونے کا اعلان کرتا ہے ۔ یہ طبقات (معاشی) کو قطعی اور کامل مٹا دینا چاہتا ہے اور مردوں، عورتوں کی سیاسی اور معاشی مساوات کا خواہشمند ہے۔ چاہتا ہے کہ زمین، آلات محنت، نیز ہر قسم کا سرمایہ کل جماعت کی مشترکہ املاک ہو جائے اور سوائے کام کرنے والوں (مزدوروں) کے کوئی انہیں استعمال نہ کرسکے ۔ یعنی صرف زرعی اور صنعتی انجمنیں ۔ یہ اقرار کرتا ہے کہ تمام موجودہ سیاسی اور با اختیار ریاستوں کو چاہئے کہ اپنے عملوں کو انتظامی معاملات تک محدود رکھیں اور رفتہ رفتہ زرعی و صنعتی انجمنوں کے ایک عالمگیر اتحاد میں گم ہو جائیں"۔ جمہوریت اشتراکی کے اس بین الاقوامی اتحاد نے "بین الاقوامی انجمن مزدوران" کی شاخ بننے کی خواہش کی لیکن اس سے اس بنیاد پر انکار کر دیا گیا کہ شاخیں مقامی ہونی چاہئیں، یہ خود بین الاقوامی نہیں ہوسکتیں ۔ لیکن اس اتحاد کی جنیوا والی شاخ جولائی ۱۸۶۹ء میں داخل کر لی گئی تھی ۔

بین الاقوامی انجمن مزدوران ۱۸۶۴ء میں لندن میں قائم ہوئی تھی اور اس کے پروگرام مارکس نے بنائے تھے ۔ پہلے پہل باکونین کو توقع نہ تھی کہ یہ کامیاب ہوگی اور اس نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا ۔ لیکن یہ بہت سے ملکوں میں غیر معمولی تیزی سے پھیلی اور بہت جلد اشتراکی خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک موثر قوت ہوگئی ۔ شروع شروع میں یہ کسی طرح بالکل اشتراکی نہ تھی، لیکن یکے بعد دیگرے اجلاسوں میں مارکس نے اسے روز بروز اپنے خیالات کا حامی بنا لیا اور تیسری کانگریس منعقدہ بروسلز ستمبر ۱۸۶۸ء تک یہ اشتراکی ہوگئی ۔ اب باکونین نے بھی اپنی سابقہ علیحدگی پر افسوس کرکے فیصلہ کیا کہ اس میں شامل ہو جائے اور اپنے ساتھ فرانسیسی سوئزرلینڈ، فرانس، ہسپانیہ اور اطالیہ سے بہت سے حامی تعداد میں ساتھ لایا ۔ چوتھی کانگریس منعقدہ بیل (Bale) ستمبر ۱۸۶۹ء میں دو مختلف لہریں بالکل جدا جدا معلوم ہوتی تھیں ۔ جرمن اور انگریز ریاست کی اس

[illegible] باکونین کے خیال تھے جو یہ ملکیت شخصی کے خاتمے کے بعد اختیار کر لیگی [illegible] معاش
[illegible] تھے کہ مختلف ممالک میں مزدوروں کی پارٹیاں قائم کیا [illegible]
[illegible] کو اس نے استعمال کیا جائے کہ پارلیمنٹ کے لئے مزدوروں کے نائب منتخب
ہوں [illegible] اس کے لاطینی قومیں ریاست کی مخالفت اور حکومت نمائندگان کے نظام
سے بجا [illegible] کے معاملہ میں باکونین کی متبع تھیں۔ ان دونوں گروہوں کی مخالفت روز
بروز تیز ہوتی گئی اور ایک نے دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگائے۔ یہ بیان پھیلایا
گیا کہ باکونین جاسوس ہے اور تحقیق کے بعد واپس لیا گیا۔ مارکس نے اپنے جرمن دوستوں
کے نام ایک خفیہ تحریر میں لکھا کہ باکونین اتحاد سلافی پارٹی کا کارندہ ہے اور وہاں سے [illegible]
فرانک سالانہ پاتا ہے۔ اسی زمانے میں باکونین کو روس میں کسانوں کی ایک بغاوت کے
اکسانے میں دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس وجہ سے اس نے "بین الملل" کے مقابلہ کی طرف
سے نہایت نازک موقع پر غفلت برتی۔ فرانسیسی پروشیائی جنگ میں باکونین نے نہایت
شدت سے فرانس کی طرفداری کی خصوصاً نپولین سوم کے تخت سے اتارے جانے کے بعد
اس کی کوشش تھی کہ لوگوں کو ۱۷۹۳ء کی سے انقلابی مقاومت پر ابھارے، چنانچہ لیان
میں بغاوت کی ایک ناکام کوشش سے اسکا تعلق پایا گیا۔ فرانسیسی حکومت نے اس پر پروشیا
کا کارندہ ہونے کا الزام لگایا اور یہ بڑی مشکل سے بچکر سوئزرلینڈ بھاگا۔ مارکس اور اس
کے متبعین سے اس کی جو مخالفت تھی وہ اس قومی تنازعہ کے باعث اور بھی شدید ہو گئی۔
باکونین (جیسے اس کے بعد کروپاٹکن) جرمنی کی نئی قوت کو دنیا میں حریت کے لئے سب سے
بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ یہ جرمنوں سے نہایت سخت نفرت رکھتا تھا کچھ تو بلا شبہ بسمارک کی وجہ
سے لیکن غالباً اس سے زیادہ مارکس کی وجہ سے۔ آج تک نراج تقریباً کلیتہً لاطینی ممالک
تک محدود ہے اور جرمنی کے خلاف نفرت سے وابستہ ہے۔ جو "بین الملل" میں مارکس اور
باکونین کے مناقشہ سے پیدا ہوئی تھی۔

[illegible] مقام کانگریس منعقدہ ہیگ ۱۸۷۲ء میں باکونین کے فرقہ کو قطعی طور [illegible] کا مقام جنرل کونسل نے طے کیا تھا جس میں مارکس کا کوئی مخالف تھا [illegible] اس خیال سے یہ جگہ منتخب کی گئی تھی کہ فرانسیسی اور جرمن [illegible] کے باعث باکونین کا وہاں آنا ناممکن اور اس کے دوستوں کا [illegible] [illegible]۔ باکونین کو بین الملل سے خارج کر دیا گیا، اور یہ ایک اطلاع کی بنا پر [illegible] علاوہ اور باتوں کے ذرا دھمکا کر سرقہ کا الزام لگایا گیا تھا۔

[illegible] بین الملل کی ادھوری سی تو بچ گئی لیکن اس کی قوت حیات جاتی رہی۔ اس زمانے [illegible] میں کوئی قوت باقی نہ رہی، لیکن دونوں فرقے اپنے اپنے گروہوں میں برابر [illegible] رہے اور بالخصوص اشتراکی گروہ نہایت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگے۔ بالآخر ۱۸۸۹ء میں ایک نیا "بین الملل" قائم کیا گیا جو موجودہ جنگ کے شروع ہونے تک باقی رہا۔ اشتراکی بین الملل کے متعلق پیش گوئی کرنا خلاف احتیاط ہے، اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ بین الاقوامی خیال نے اتنی کافی قوت اختیار کر لی ہے کہ جنگ کے بعد اسے پھر ایک ایسے ذریعۂ اظہار [illegible] کی ضرورت پڑے گی جیسی کہ پہلے اشتراکی کانگریسوں میں موجود تھی۔

اس وقت باکونین کی تندرستی بالکل بگڑ چکی تھی اور چند چھوٹے چھوٹے وقفوں سے [illegible] اپنی موت تک کنارہ کشی کی زندگی گذارتا رہا۔

[illegible] بر خلاف مارکس کے باکونین کی زندگی بہت طوفانی ہے۔ ارباب اختیار کے خلاف ہر بغاوت سے اسے ہمدردی تھی اور جب ساتھ دیتا تھا تو ذاتی خطرہ کی ذرا بھی پروا نہ کرتا [illegible] بہت گہرا ہے زیادہ تر اہم افراد پر اس کی شخصیت سے پیدا ہوا۔ اس کی [illegible] مارکس کی تصانیف سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنی انکی زندگی۔ یہ منتشر ہیں، زیادہ [illegible] کے لئے لکھی گئی ہیں، نہایت تجریدی ہیں اور فلسفیانہ، سوائے اس صورت [illegible] یہ سیاست حاضرہ سے بحث کرتی ہوں نہ معاشی واقعات سے دوچار نہیں ہوتا

ہوتا ایک نظری و مابعد الطبیعی دنیا میں رہتا ہے اور جب کبھی اس دنیا سے نیچے اترتا ہے تو کہیں زیادہ موجودہ سیاست بین الاقوامی کے زیر اثر ہوتا ہے اور اپنے اس [illegible] کے نتائج کا بہت کم اثر رکھتا ہے کہ اصلی چیز معاشی اسباب ہیں۔ وہ مارکس کی تعریف کرتا ہے اس نے اس مسئلہ کی تلقین کی لیکن قومی سیاست ہی کے اعتبار سے سوچتا اور فکر کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف "سلطنت اور انقلاب جماعتی" میں زیادہ تر فرانسیسی پروشی جنگ کی آخری منازل میں فرانس کی حالت سے بحث ہے اور جرمن شہنشاہیت کا مقابلہ کرنے کے ذرائع سے۔ اس کی تصانیف کا زیادہ تر حصہ بڑی عجلت سے دو بغاوتوں کے درمیانی وقفہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ادبی ترتیب کے فقدان میں بھی مزاج کی شان ہے۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف ایک ناتمام تحریر ہے جسے شائع کرنے والوں نے "خدا اور ریاست"[1] کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کتاب میں یہ خدا اور ریاست پر عقیدے کو انسانی آزادی کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں بتاتا ہے۔ ایک نمونے کی عبارت سے اس کا طرز ظاہر ہو جائیگا۔

"ریاست جماعت نہیں، یہ تو صرف اس کی ایک تاریخی شکل ہے، جیسی مجرد ویسی ہی بہیمی۔ تاریخی طور پر یہ ہر ملک میں تشدد اور تاخت و تاراج یعنی جنگ اور فتح کے دیوی دیوتا کے باہمی ازدواج کا نتیجہ ہے جنہیں قوموں کے دینی تخیل نے کامیابی سے پیدا کیا۔ ابتدا سے ریاست یہی تھی اور اب بھی یہی ہے یعنی وحشیانہ قوت اور فاتحانہ عدم مساوات کا [illegible] جواز۔

ریاست اختیار ہے، جبر ہے، جبر کی نمائش اور جبر کا فریب، یہ تالیف قلوب نہیں کرتی یہ کسی کو اپنا ہم خیال بنانا نہیں چاہتی۔ یہ اچھی بات کا حکم بھی دیتی ہے تو اس کی راہ میں کانٹے پیدا کرتی اور اسے خراب کرتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اسکا حکم دیتی ہے۔ علاوہ بریں یہ حکم حریت کی جائز بغاوتوں کو اکساتا اور تحریک دیتا ہے۔ اور اس وجہ سے کہ خیر بھی جہاں اسکا

[1] نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۵)

حکم دیا گیا ہے جس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ حقیقی اخلاق، انسانی اخلاق (یقینی الہی اخلاق نہیں) [illegible] کے نقطہ نظر سے حریت، اخلاق، اور آدمی کی انسانی [illegible] پر کاربند ہو اس وجہ سے نہیں کہ اسکا حکم دیا جاتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خود سے خیر جانتا ہے، اس کی آئندہ [illegible] سے [illegible]

ہمیں باکونین کی تصانیف میں اس جماعت کی کوئی صاف تصویر نہیں ملتی جو اس کا صحیح [illegible] اس بات کا کوئی ثبوت کہ ایسی جماعت پائدار بھی ہو سکتی ہو۔ ہم اگر نراج کو سمجھنا چاہیں تو ہمیں اس کے متبعین کیطرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً کروپاٹکن کی طرف جو [illegible] کی طرح یورپ کے قدیم خانوں سے آشنا روسی امیر تھا اور اسی کی طرح ایک نراجی [illegible] دائمی بین الاقوامیت کے برستوں سے نہایت شدید نفرت رکھتا تھا۔

کروپاٹکن نے اپنی تحریر کا بڑا حصہ پیدائش دولت کے صنعتی مسائل پر صرف کیا ہے۔ "کھیت اور چھوٹے بڑے کارخانے" اور "روٹی کی فتح" میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر پیدائش دولت زیادہ علمی اصول پر ہو اور بہتر منظم تو تھوڑا سا خوشگوار کام آبادی کو آرام سے قائم رکھنے کے لئے کافی ہو گا۔ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں، اور غالباً ہمیں تسلیم کرنا چاہئے، کہ اس نے ہمارے موجودہ علوم حکمیہ کے امکانات میں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہے تب بھی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے بیان میں بہت کچھ سچائی ہے۔ اور پیدائش دولت کے مضمون پر توجہ کر کے اس نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اصلی سوال کیا ہے۔ اگر تہذیب و ترقی مساوات کے ہمرکاب ہوں تو اس مساوات کے معنی یہ نہ ہونا چاہئے کہ ضروریات زندگی سے تھوڑا سا زیادہ حاصل کرنے کے لئے تکلیف دہ مشقت کی

(نوٹ مترجم [illegible]) یہ نام باکونین کا دیا ہوا نہیں بلکہ کافیر داولیلنری ریکس کی اختراع ہے۔ جنہوں نے اسے شائع کیا۔ [illegible] معلوم تھا کہ یہ "سلطنت" کی نظر ثانی کے بعد دوسری اشاعت کا ایک ناتمام جزو تھا

طویل ساعات برداشت کرنی پڑیں، کیونکہ جہاں فرصت و آرام نہیں وہاں علوم و فنون مٹ جائیں گے اور ساری ترقی ناممکن ہوجائے گی۔ بعض لوگوں کو اشتراکی ادرزاج کے خلاف اس بنیاد پر جو اعتراض ہے وہ محنت کی اضافی پیدا آوری کا لحاظ کر کے باقی نہیں رہتا۔

کرو پاٹکن کی نظر میں جو نظام ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ ضرور ہے کہ آجکل کے مروجہ طریقہ پیدائش دولت میں بہت بڑی ترقی کا طالب ہے۔ یہ مزدوری کے نظام کو مطلقاً مٹا دینا چاہتا ہے اور یہ بھی اکثر اشتراکیوں کی طرح اس معنی میں نہیں کہ ایک شخص کام کرنے کی آمادگی کے لئے اجرت دینی چاہئے نہ کہ واقعی اس کام کے لئے جو اس سے مطلوب ہو، بلکہ اس سے زیادہ اصولی اور گہرے معنی میں۔ یعنی کام کرنے پر کوئی مجبور نہ ہو اور ساری اشیاء کل آبادی میں مساوی تقسیم ہوں۔ کرو پاٹکن کو بھروسہ اس پر ہے کہ محنت کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اسکا خیال ہے کہ جو جمعیت اس کے پیش نظر ہے اس میں عملاً ہر شخص کاہلی پر کام کو ترجیح دیگا۔ کیونکہ کام کے معنی ضرورت سے زیادہ مشقت اور غلامی نہ ہونگے۔ نہ اس میں [illegible] انتہائی تخصیص کار ہوگی جو موجودہ نظام صنعتی کا نتیجہ ہے، بلکہ دن کے چند گھنٹوں کے لئے ایک خوشگوار مشغلہ ہوگا جس میں آدمی کو اپنے فطری محرکات تخلیقی کے اظہار کے مواقع ملیں گے۔ کوئی جبر نہ ہوگا، نہ کوئی قانون حکومت جو جبر کا استعمال کرے۔ اعمال جمعیت اب بھی باقی رہیں گے، لیکن یہ سب کی رضامندی کا نتیجہ ہونگے۔ اور چھوٹی سے چھوٹی اقلیت بھی بہ جبر نہ دبائی جائے گی۔ ہم ایک اگلے باب میں یہ تحقیق کریں گے کہ یہ نصب العین کہانتک قابل حصول ہے، لیکن اس میں کلام نہیں کہ کرو پاٹکن نے اسے نہایت خوبی کے ساتھ اسے پیش کیا ہے کہ آدمی قائل ہوجائے۔

یہ نراج کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ بیجا طرفداری ہوگی اگر ہم اس کے تاریک پہلو کے متعلق کچھ نہ کہیں۔ یعنی وہ پہلو جس نے اسے پولیس سے ٹکرایا اور معمولی شہریوں کے

[illegible] بنا دیا۔ اس کے عام مسلک میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تشدد [illegible] کی شدید ضرورت کو کوئی لازمی تعلق ہو اور اس عام مسلک کے اکثر ماننے والے [illegible] نرم دل اور طبعاً تشدد سے بیزار ہوتے ہیں۔ لیکن نراجی جمعیت کے اخبارات [illegible] اور جو تلخ ہے کہ اسے بمشکل عاقلانہ کہہ سکتے ہیں اور خصوصاً لاطینی ممالک میں معلوم ہوتا ہے کہ خوش نصیبوں کے خلاف کینہ کو اکسایا جاتا ہے تاکہ بدنصیبوں کے [illegible] تعداد سے اس کا بالکل قابل اعتماد تو نہیں مگر واضح اور دلچسپ بیان [illegible] کی کتاب "نراجی خطرہ" میں ملتا ہے جہاں ضمناً نراجی رسائل سے بعض کارٹون بھی نقل کئے گئے ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جنہیں محبت انسانیت کا حقیقی جذبہ قابو میں رکھے اور دل میں قانون کے خلاف بغاوت کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام معمولاً قبول کئے ہوئے اخلاقی قاعدے بھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور انتقامی بیرحمی کی وہ تلخ روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے [illegible] کی غیر مستحسن پیدا ہو سکتی ہے۔

عام نراج کی سب سے عجیب خصوصیت اس کی شہید پرستی ہے جو مسیحی سکولوں کی نقل [illegible] اور جس میں (مثلاً فرانس میں) صلیب کے بجائے پھانسی ہوتی ہے۔ ارباب [illegible] کے ہاتھوں جن لوگوں نے تشدد دیکھ [illegible] کا منہ دیکھا ان میں سے بہت سے بلاشبہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے سچے دل سے ایک مقصد میں اپنے عقیدہ کی خاطر یہ تکلیف اٹھائی لیکن دوسرے ایسے بھی ہیں کہ جن کی عزت اتنی ہی کیجاتی ہے۔ لیکن انکا معاملہ مشتبہ [illegible] وضع ہوئے مذہبی ہیجان کی نکاسی کی سب سے عجیب مثال راواسول کی پوجا ہے [illegible] کے جرموں کی بنا پر ۱۸۹۲ء میں پھانسی دیگئی تھی۔ اسکا ماضی مشتبہ تھا لیکن اس نے جان دی بہادری سے اور اس کے آخری الفاظ ایک مشہور نراجی گیت Chant du Père [illegible] (بابا دوشین کا گیت) کے تین مصرعے تھے۔

قدرتی بات تھی کہ سرکردہ نراجیوں نے اس کی یاد کی تقدیس میں حصہ نہ لیا لیکن

پھر بھی یہ رسم حیرت انگیز بے اعتدالیوں کے ساتھ بڑھی۔

مسلک نراج یا اس کے سربرآوردہ حامیین کے خیالات پر ایسے مظاہر کو دیکھکر حکم لگانا بالکل بے انصافی ہے، لیکن یہ امر واقعہ اپنی جگہ باقی ہے کہ نراج اپنی طرف بہت سے ایسے عناصر کو کھینچتا ہے جو جنون اور جرم کی سرحد پر ہے۔[1] اس واقعہ کا یاد رکھنا ارباب اختیار اور فیصلہ کرنے والے عوام کی صفائی کے لئے ضروری ہے کہ اس تحریک کے نکھٹوؤں کو اور ان بے بہادر، دماغی خیال لوگوں کو یکساں نفرت میں گڈمڈ کر دیتے ہیں جنہوں نے اس تحریک کو ترتیب دیا اور اس کی اشاعت و تبلیغ کی خاطر اپنا آرام اور اپنی کامیابی قربان کر دی۔

یہ تشدد کی تحریک جس میں راواشول جیسے لوگ کام کر رہے تھے عملاً ۱۸۹۴ء میں ختم ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد بہتر قسم کے نراجیوں نے پیلوتیر کے زیر اثر ایک کم نقصان دہ راہ

---

(۱) تمام بہتر قسم کے نراجیوں کا رویہ وہ ہے جو ل۔س۔ بیوگشن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے: "بیشک معلوم ہے کہ اپنے کو نراجی کہنے والوں میں غیر متوازن جوشیلے دیوانوں کی ایک چھوٹی سی تعداد ہے جو ہر غیر قانونی اور سنسنی خیز تشدد کے فعل کو بڑی مسرت اور جشن کے قابل تصور کرتے ہیں یہ لوگ جو پولیس اور اخبارات کے لئے نہایت کارآمد ہیں کے ڈانواں ڈول اصول اخلاق میں کمزور ہوتے ہیں بارہا ثابت کر چکے ہیں کہ وہ مالی (رشوت) اثرات سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ انکا تشدد اور انکا نراج خریدے جا سکتے ہیں، اور آخر کار اس بے دردی کی جنگ میں جو بورژوا طبقہ قوم کے آزادی خواہوں کے خلاف کر رہا ہے یہ اس کے نہایت کارآمد ساتھی بن جاتے ہیں اور انکی بڑی آؤبھگت ہوتی ہے۔ انکا نتیجہ نہایت عاقلانہ ہے: "بلا اتنیاز قتل و غارت کے کام کو ہم حکومت کے لئے چھوڑ دیں۔ اس کے مدبروں کے لئے، اس کے دلالوں کے لئے، اس کے عہدیداروں اور اس کے قانون کے لئے۔" (نراج اور تشدد صفحہ ۱۰-۹)

نکالا کہ تجارہائے صنعتی اور "مبادلات محنت" میں انقلابی سنڈیکلیت کی حمایت کریں۔

نراجی اشتراکیوں نے جماعت کی معاشی تنظیم کا جو تصور قایم کیا ہے وہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں جو اشتراکی چاہتے ہیں، اشتراکیوں سے انکا اختلاف حکومت کے معاملے میں ہے۔ انکا مطالبہ ہے کہ حکومت کے لئے سب محکوموں کی رضامندی کی ضرورت ہے نہ کہ صرف ایک اکثریت کی۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثریت کی حکومت آزادی کے تقریباً اتنی ہی منافی ہو جتنی کہ اقلیت کی حکومت اکثریت کے حق الہی کا بے قیل و قال عقیدہ اپنے اندر اتنی ہی سچائی رکھتا ہے جتنا کہ کوئی اور ایسا عقیدہ۔ ایک مضبوط جمہوری ریاست آسانی سے اپنے بہترین شہریوں پر ظلم شروع کر سکتی ہے یعنی انپر جن کی دماغی بے تعلقی انہیں ترقی کی ایک قوت بناتی ہے۔ جمہوری پارلیمنٹی حکومت کے تجربہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ پہلے کے اشتراکیوں نے اس سے جو توقع قائم کر لی تھی یہ بہت کم پوری ہوئی چنانچہ اس کے خلاف نراجی بغاوت کچھ تعجب خیز نہیں۔ لیکن خالص نراج کی شکل میں یہ بغاوت کمزور اور ہنگامی رہی ہے۔ یہ در اصل سنڈیکلیت ہے اور وہ دوسری تحریکیں جو اس سے پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے پارلیمنٹی حکومت اور مزدوروں کی رہائی کے لئے خالص سیاسی ذرائع کے خلاف بغاوت کو بہت پھیلایا۔ لیکن اس تحریک سے ایک علحدہ باب میں بحث کرنی چاہئے۔

ادبیاتِ ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(۳)

سلطان محمود غزنوی | قبل اس کے کہ محمود غزنوی کی علمی سرپرستیوں کا ذکر چھیڑا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے

غزنوی خاندان کے سلسلہ کی کڑی بھی دراصل سامانی خاندان سے ملتی ہے اس لئے کہ عبدالملک نوح سامانی کے عہد میں ایک شخص نصر حاجی تاجر نے سبکتگیں کو خرید لیا اور بخارا لیجا کر امیر البتگین امیر حاجب کے ہاتھ فروخت کر دیا اسی سبکتگین نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی اور اس قدر کارہائے نمایاں انجام دے کہ آخر کار غزنین کا تخت حاصل کر لیا نہ صرف یہ بلکہ غور و طخارستان وغیرہ بھی مفتوحہ ممالک میں داخل کر لئے۔ ہندوستان پر بھی دو تین نہایت سخت حملے کئے۔ غرضکہ ایک ادنیٰ سے غلام نے محض اپنے بل بوتہ پر ایسی حیرت انگیز ترقی کر لی اور وہی ذلیل ہستی جو ادھر اُدھر بکتی پھرتی تھی بڑے بڑے رؤسا امرا سلاطین کی گردنیں اس کے سامنے خم ہونے لگیں

محمود[1] غزنوی ۳۶۰ھ میں پیدا ہو ۳۸۷ھ میں باپ کے انتقال پر بادشاہی تخت

---

(۱) نام و نسب محمود بن سبکتگین، سلطنت غزنین کا دوسرا بادشاہ - دادا کا نام قرا بجکم اصل نام جوق ترکی میں بجکم بمعنی شور و غوغا اور قرا رسیاہ کو کہتے ہیں۔ یہ نام اس کے رعب و ہیبت کی وجہ سے پڑ گیا سلسلۂ نسب یہ ہے محمود بن سبکتگیں بن جوق قرا بجکم بن قرا ارسلان بن قرابات بن قرالقمان بن فیروز بن یزدجرد

پہنچا۔ خلیفۂ وقت قادر باللہ نے یمین الدولہ امین الملۃ محب امیر المومنین کا خطاب عطا فرمایا محمود کے حوصلے اور ارادے اپنے باپ سے بھی بلند تر تھے، زمانہ مابعد اسلام میں یہ پہلا بادشاہ ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، تھوڑے سے عرصے میں اس نے اس قدر طاقت و اقتدار حاصل کر لیا کہ خود دربار خلافت میں اس کے نام سے ہیبت طاری ہوجاتی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہر سال جہاد کریگا چنانچہ ہندوستان پر اس نے کم و بیش سترہ حملے کئے۔ خود تمام ایران اور وسط ایشیا اس کے زیر نگیں تھا۔ ہندوستان میں شمالی ہند کے مشرقی علاقے تک اس کے حملوں سے محفوظ نہ رہے چنانچہ بنارس بھی اس کے مقبوضات میں شامل تھا۔

محمود کے جہاد کی حقیقت پر بہت کچھ بحث کی گئی ہے عام طور پر یہ خیال ہے کہ محض مذہبی جوش اور اشاعت حق کا خیال ان حملوں کا موجب تھا۔ ایک جدید خیال یہ ہے کہ محمود کے ان حملوں کو ہرگز کوئی مذہبی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ جہاد کے پردے میں ہندوستان کی بے اندازہ دولت کی طمع تھی جو اسے بار بار حملے کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس لئے کہ ہندوستان میں آکر اس نے کوئی بھی ایسی بات نہیں کی جس سے اشاعت دین و مذہب کا ثبوت ملتا یا خود اس کا رویہ کچھ ایسی جاذبیت رکھتا تھا جو ہندوؤں کو قبول اسلام کی جانب مائل کرتا برخلاف اس کے وہ ہر بار ہندوستان سے بیشمار مال و دولت گھسیٹ کر لیجاتا اور بجائے اس کے کہ اس روپیہ کو مذہبی کاموں میں خرچ کرتا یا ہندوستانیوں کے فائدے کے لئے خود ہندوستان پر خرچ کرتا۔ اس نے اس بے شمار دولت سے ایران کی ترقی و تعمیر کا کام لیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے ہندوستان کی بعض مشہور عبادتگاہوں کو تباہ کیا جو مرکزی حیثیت رکھتی تھیں لیکن اس میں کسی مذہبی جذبہ کو دخل بہت کم تھا اس زمانہ میں مذہبی عبادتگاہیں زر و جواہر سے پر ہوتی تھیں سومناتھ کے مندر کی بربادی اس لئے نہیں ہوئی کہ محمود کا جذبہ ایمان اسے اس بربادی پر مجبور کر رہا تھا بلکہ اس کو منہدم کر کے اس نے لاکھوں اور کروڑوں

کی دولت حاصل کی ۔

بعض مورخین کا یہ بھی خیال ہے کہ چونکہ وہ غلام در غلام تھا اس لئے اس عیب کو چھپانے کے لئے اس نے جہاد کی پالیسی اختیار کی تاکہ اس کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے اوصاف اس کی بد نسلی کے عیوب پر پردہ ڈالدیں ، اور لوگوں کی نظریں اس کی ذات پر پڑنے کی بجائے اس کے افعال پر پڑیں ۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس کی ان فتوحات کا موجب در اصل ایران کی تمدنی نشوونما کا تخیل تھا وہ خود ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا علمبردار تھا ، ایران کی ترقی اور نشوونما کے لئے جس قدر کامیاب جدوجہد اسکے زمانے میں ہوئی اس سے پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی ، فردوسی کا "شاہنامہ" جو فارسی دنیا کی ادبیات میں ایک عظیم الشان اور عدیم النظیر کارنامہ ہے اسی کے زمانہ میں اور اسی کے حکم سے تصنیف ہوا علاوہ اس کے ایرانی شاعروں کی اس نے حیرت انگیز طریقہ پر حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے فارسی شاعری انتہائے عروج پر پہنچ گئی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمود نے اپنی طاقت کے بل پر تمام ایران اور وسط ایشیا کو زیر اثر اور زیرنگیں کرلیا تھا ، ہندوستان پر اس کے بعض حملے نہایت کامیاب ہوئے ، اس نے نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بڑی بڑی بہادر قوموں کو نیچا دکھایا بلکہ بے اندازہ مال و دولت بھی حاصل کی لیکن باوجود اس کے ہمیں اس کو ایک کامیاب فرماں روا تسلیم کرنے میں تامل سے کام لینا چاہئے یہ سچ ہے کہ اس نے ہندوستان کی بڑی بڑی قوتوں کو شکست دی بڑے بڑے ، اہم معرکوں میں کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہا ہندوستان کی مرکزی عبادتگاہوں کو مسمار کیا ، لیکن انتظامی صلاحیت کے فقدان کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ باوجود اس قدر زبردست اور پیہم فتوحات کے ہندوستان پر کبھی مستقل قبضہ نہ کر سکا ۔ درحقیقت ہندوستان میں اس کی فتوحات

ایک [illegible] اور بہت سے قلعوں کو مسمار، بہت سی عمارتوں کو منہدم اور بہت سے [illegible] کر کے گزر گیا۔ خود ایران اور غزنین میں اس کی حکومت مستقل [illegible] ایران کی چھوٹی چھوٹی خاندانی حکومتوں کے استیصال میں اسے [illegible] میابی نہیں ہوئی تھی یہ محض محمود کی ہیبت تھی کہ اس کے زمانے میں ایران میں [illegible] چھوٹی حکومتوں نے سر نہیں اٹھایا۔

[illegible] سینوں نے اور بھی قابلیت کا ثبوت دیا سوئے جنگ کچھ مدت تک کامیابی کی حکومت کی لیکن ابو الحسن میمندی کے بل پر چلی۔ احمد بن حسن میمندی اس کا وزیر تھا اور تمام انتظامی امور انکے ہاتھ میں تھے حکومت کا کام بھی ایک ڈھرے پر چلتا رہا اور اسکے مرنے کے بعد حکومت میں بھی ایک ابتری پیدا ہو گئی خود محمود کا دربار جنرلوں اور مدبروں سے خالی تھا، ور اگر مستثنیات تھی تو وہ علماء اور شعرا کی حسن میمندی بیشک ایک اچھا عالم اور مدبر تھا (اگرچہ اسکو بھی نظام الملک طوسی اور تاریخ کے دوسرے مشہور سیاسی مدبرو کے مقابلے میں نہیں لایا جا سکتا) لیکن اسے بھی کسی بات پر ناراض ہو کر ہندوستان کے جیلخانوں میں ڈلوا دیا۔

جنگی معرکوں میں محمود کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود ایک اچھا دلیر اور بہادر سپاہی تھا۔ معرکہ کارزار میں وہ پیش پیش رہتا اس کے سپاہیوں میں اس قدر غلط مذہبی جوش بھرا ہوا تھا کہ وہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے ان میں شجاعت تھی مگر تھوڑے سے ابریز، یہی وجہ تھی کہ مخالفین کے دلوں میں محمود اور اس کی فوج کا خوف اور ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اور وہ جہاں پہنچتا تھا فتح و نصرت اس کے قدم چومتی تھی۔ تاہم یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اپنے عہد حکومت کے طویل عرصہ میں وہ ایک جنرل بھی پیدا نہ کر سکا۔

محمود کی جنگی و انتظامی قابلیتوں پر تنقید و تبصرہ ایک طویل بحث کا محتاج ہے جس کو ہم کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کریں گے کہ محمود کو ایک کامیاب حکمراں یا کامیاب جنرل کی حیثیت کسی طرح نہیں دی جا سکتی بے شک وہ ایک اچھا سپاہی تھا اور اسی سپاہیانہ سرگرمی اور جوش عمل نے اس کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا۔ لیکن

بھی اور انتظامی نقائص اور خامیوں کے ساتھ ساتھ اُس میں چند لائق رشک خوبیاں بھی تھیں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ وہ ایرانی تہذیب و تمدن کا بہت بڑا علمبردار تھا اس نے ایرانی ادبیات اور ایرانی شعرا اور علما کی جیسی سرپرستی کی ہے ایران کے کسی دوسرے حکمران کو اس کے مقابلے میں بمشکل لایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محمود کو جس زمانہ میں عروج ہوا وہ عربی اثرات کے خلاف ردعمل اور ایرانیت کے نشو و نما کا زمانہ تھا ایرانیوں میں رفتہ رفتہ زندگی و بیداری کا احساس پیدا ہو رہا تھا وہ عربوں کی غلامی کے جوے کو اتار پھینکنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے دولت عباسیہ کے ضعف و انحطاط نے انہیں اور بھی اس کا موقع دیدیا تھا ایران میں آئے دن نئی حکومتیں قائم ہو رہی تھیں ایران کے ذہی امرا جو پہلے وفادار خلافت کے حلقہ بگوش تھے اب خود مختاری کے خواب دیکھنے لگے تھے وہ نہ صرف ظاہری غلامی سے بیزار تھے بلکہ ذہنی غلامی سے بھی آزادی کی کوشش کر رہے تھے۔ عربوں کی شاگردی کو وہ اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے حالانکہ یہ انکی کھلی ہوئی ناسپاسی اور ناشکر گذاری تھی عربوں نے انہیں وحشت و جہالت کی تاریکیوں سے نکالا انہیں ایک شائستہ اور متمدن قوم بنایا وہ صدیوں سے نکبت و ادبار پستی کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے تھے اور گویا اُن پر سکرات کا عالم طاری تھا عربوں نے ایسے وقت میں انکی مسیحائی کی اور انہیں ایک زندہ قوم بنا دیا علوم و فنون اور ادب غرضکہ سب کچھ انہوں نے عربوں سے حاصل کیا۔ حتی کہ انکی شاعری پر عربوں کے زبردست احسانات ہیں فارسی شاعری میں عربی شاعری کی حرف بحرف تقلید کی گئی بلکہ شروع شروع میں تو ایرانی شاعر عربی شاعری کے مضامین کا کھلا ہوا سرقہ کرتے تھے شعرالعجم میں آپ کو اس کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ غرضکہ باوجود اس قدر زبردست احسانات کے جب ایرانیوں کے قومی احساسات بیدار ہوئے تو انہیں عربوں سے انتہائی نفرت ہو گئی اور قومیت کے جذبے نے آخر کار تعصب کی شکل اختیار کر لی فردوسی نے "شاہنامہ" میں ایک سے زائد موقعوں پر اپنی اس نفرت کا اظہار کیا ہے چنانچہ ایک موقعہ پر وہ کہتا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار

کہ تاج کیاں را کند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

"شاہنامہ" کی تصنیف کا خیال صرف اسی غرض سے نہ تھا کہ اسلاف کے کارناموں کو زندہ کیا جائے بلکہ ایک مقصد یہ بھی پیش نظر تھا کہ رستم و سہراب فریدون اور کیخسرو کو عربی ابطال کے مقابلے میں پیش کیا جائے اور ان کو ترجیح دیجائے۔ انکے دلوں میں رستم و سہراب کی جو وقعت تھی وہ خالد بن ولید اور سعد بن وقاص کی ہرگز نہ تھی وہ اپنے کلام میں دلیری و بہادری کی تشبیہ خالد سے یا جود و سخا کی حاتم سے دینا باعث ننگ و عار سمجھتے تھے غرضکہ اس وقت ایرانی قومیت کی نشو و نما کی رفتار بہت سرعت کے ساتھ ترقی پذیر تھی۔ محمود نے بھی اس میں پیش از بیش حصہ لیا اس کی جنگی فتوحات بھی اسی ملکی نشو و نما کے زیر اثر تھیں، ہندوستان میں سال بہ سال حملے کا مقصد اسلام کی ترویج و اشاعت تو بہرحال ہرگز نہ تھا بلکہ غالباً اس مذہبی جہاد کے پردہ میں اصلی غرض یہ تھی کہ ایرانیت کی توسیع اور ایرانی تہذیب و تمدن کی اشاعت ہو۔

وہ خود بھی اچھا خاصہ عالم اور شاعر تھا مذہبی علوم میں بھی خاصی دسترس تھی مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"محمود جس طرح فاتح اور کشورستاں تھا اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا جواہر مضیئہ جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہے اس میں اس کو فقہا میں شمار کیا ہے فقہ میں خود اس کی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے"

اس کی شاعری کے متعلق ایک ایرانی تذکرہ نویس لکھتا ہے:

شاعری کا نہ صرف ذوق تھا بلکہ خود شاعر تھا ایک کنیزک سے اسے خاص محبت تھی

---

(۱) [illegible]

اس کے انتقال کی جب اُسے یک بیک خبر پہنچائی گئی تو اسے دلی اذیت ہوئی اور

اس کے مرثیہ میں یہ اشعار کہے

دردا کہ اے ماہ زیر خاک شدی — خاک [illegible] آمد

دل جزع کرد گفتم اے دل صبر — ایں قضا از خدائے عزوجل آمد

آدم از خاک بود خاکی شد — ہرکہ زو زاد باز اصل آمد

جب سلطان کا باطل آخری وقت آن لگا اور اُسے اپنی موت کا یقین ہوگیا تو

اس وقت اس نے مندرجہ ذیل اشعار میں خود اپنی نوحہ گری کی ہے

زبیم تیغ جہانگیر و گرز قلعہ کشائے — جہاں مسخر من شد چو تن مسخر رائے

گہے بعز و بدولت ہمی نشستم شاد — گہے ز حرص ہمی رفتمے ز جائے بجائے

بہ تفاخر کردم کہ من کسے ہستم — کنون برابر بینم ہمی امیر و گدائے

اگر دو کلۂ بوسیدہ در کشی زد و گور — سر امیر کہ داند ز کلۂ گدائے

ہزار قلعہ کشادم بیک اشارت دست — [illegible] مصاف شکستم بیک فشردن پائے

چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نکرد — بقا بقائے خدائیست و ملک ملک خدائے(1)

علم و ادب کی سرپرستی میں اُس نے جنگی فتوحات سے کم انہماک سے کام نہیں لیا شہر غزنین کو تھوڑی مدت میں علم و فن کا شاندار مرکز بنادیا۔ شہر میں ایک عظیم الشان جامعہ یا کالج قائم کیا۔ اس جامعہ کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کی نادر چیزیں فراہم کی گئی تھیں۔ خود اس کے دربار میں وقت کے بہترین شاعر، عالم و فاضل موجود تھے، علما اور شعرا کی سچے دل سے قدردانی کرتا تھا اور اُنکا یہاں تک احترام کرتا تھا کہ بعض اوقات ابوالخیر الحسن بن سوار البابا المعروف با بن الخمار کے سامنے زمیں بوس ہوجاتا تھا(1)

---

(1) البیرونی

ایک [illegible] دوریں [illegible] ہے۔

[illegible] جنگی مشاغل کے باوجود علماء کی تربیت سے غافل نہیں تھا انکی [illegible] [illegible] کرتا۔ اسے علماء کی صحبت کی بھی خواہش تھی اور ان پر گرانقدر [illegible] [illegible] کرتا اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے مقدور بھر اس کے [illegible] کو عمرۂ ثانی بنادیا عتبی نے تاریخ یمینی کے نام [illegible] ایک تاریخ لکھی ہے غرضکہ اس کی علم دوستی میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

[illegible] سے فیض صحبت حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن جدوجہد سے کام لیتا تھا یہاں تک کہ جنگ [illegible] پر بھی آمادہ ہو جاتا تھا۔ خوارزم شاہیوں سے اس نے محض اس وجہ سے جنگ کی کہ بو علی سینا اور البیرونی کو حاصل کرے چنانچہ خوارزم فتح کرکے البیرونی کو وہ اپنے دربار میں لے آیا۔

سب سے زیادہ توجہ اُس نے شاعری پر کی اُس کا ایک علٰحدہ اور مستقل محکمہ قائم کیا اس محکمہ کا [illegible] الشعرا عنصری کو بنایا گیا دربار کے دوسرے شعرا کو حکم تھا کہ اپنے اشعار عنصری کو دکھا کر پھر دربار میں پیش کریں، شاعروں کے کلام کو وہ ہاتھوں ہاتھ لیتا ایک ایک قصیدے کے [illegible] ایک ایک شعر پر بیش قرار انعامات دیتا، ایک مرتبہ شہزادہ مسعود کی خراسان سے غزنین [illegible] پر دربار عام منعقد ہوا، شعرا نے اپنے اپنے قصائد پیش کئے۔ اس موقع پر ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور عنصری اور زینتی کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا ہوئے، عنصری کو ایک رباعی پر حکم دیا کہ منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ غضائری کو صرف دو شعروں پر [illegible] کہتا ہے۔

[illegible] مود شہریار جہاں ۔۔۔ بہ آن صنوبر عنبر عذار مشکیں خال

[illegible] ہزار درہم ۔۔۔ برغم حاسد و تیار بد سگال نکال

[illegible] کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا کہ چار سو زریں کمر غلام

اس کی رکاب میں چلتے سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان چار سو اونٹوں پر بار ہوتا ... شان میں قصیدہ خوانی کرتے تھے محمود کا لقب نے نام بھی اسی کے نام ... نظامی عروضی کہتے ہیں :-

بسا کاخا کہ محمودش بنا کرد — کہ از رفعت ہمی با مہ مِرا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت برپائے — مدیح عنصری ماندہ است برجائے

غزنی کی دولت وجاہ کی یہ نوبت پہنچی تھی کہ بیس زریں کمر غلام رکاب میں چلتے۔ غضائری جب تک وطن میں رہا اس کے ہر قصیدہ پر بیس ہزار اشرفی مقرر تھی فردوسی کو جب شاہنامہ نظم کرنے کی خدمت تفویض ہوئی تو ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی کا صلہ مقرر ہوا محمود کی اس علم پرستی اور قدر افزائی کو دیکھکر تمام شعرا اس کی طرف جھک پڑے حتی کہ اس کے دربار کے شعرا کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی۔ علاوہ شعرا کے دربار میں ہر فن ہر ملت کے اہل کمال موجود تھے۔

محمود غزنوی پر الزامات | محمود غزنوی کے خلاف دو ایک نہایت سنگین الزامات بھی لگائے گئے ہیں جن میں سب سے اہم فردوسی کو موعودہ صلہ نہ دینے کا واقعہ ہے[1] اس واقعہ کی تفصیل میں اربابِ تذکرہ نویسوں کا اس قدر اختلاف ہے کہ ہمیں اصل واقعہ کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا ہے، اگر واقعہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ہمارے خیال میں محمود کا اتنا تصور نہیں جتنا ظاہر کیا جاتا ہے، بلکہ واقعات سے جہاں تک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اہل دربار کی دراندازیوں کو اس میں زیادہ دخل ہے ورنہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا فراخ حوصلہ فرمانروا جس کی علمی قدر دانیاں اور فیاضیاں عدیم النظیر ہیں وہ بلا وجہ اس طرح اپنے وعدے سے پھر جائے اور بجائے "سونے کے پھولوں" کے "چاندی کے پھول" پیش کرے لیکن اگر بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ روپیہ کا لالچ اس کی علمی قدر دانی پر غالب آگیا تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ علمی قدر دانی کا جذبہ اس عارضی جذبہ سے دب نہ سکا اور آخر کار اس نے موعودہ رقم

---

[1] تفصیلی نوٹ آئندہ نمبر میں

دوبارہ بحالی [illegible] وسی تک نہ پہنچی

[illegible] پر دوسرا الزام وہ ہے کہ اس نے البیرونی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا بلکہ [illegible] کے قلعہ میں چھ ماہ کے لئے قید کر دیا[1]۔ اور پھر ہندوستان میں

---

(1) [illegible] کا ایک واقعہ چہار مقالہ میں درج ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آوردہ اند سلطان محمود [illegible] شہر غزنین بر بالاے کوشکے در چہار درے نشستہ بود باغ ہزار درخت روے بابوریحان کرد و گفت من ازیں چہار در از کدام در بیروں خواہم رفت، حکم کن و اختیار آں بر پارہ کاغذ بنویس و در زیر نہالی من نہ و ایں ہر چہار در راہ گذر داشت، ابوریحان اصطرلاب خواست و ارتفاع بگرفت و طالع درست کرد و ساعتے اندیشہ نمود و بر پارۂ کاغذ بنوشت و در زیر نہالی نہاد، محمود گفت حکم کردی؟ گفت کردم، محمود بفرمود تا کلند و تیشہ و بیل آوردند و بر دیوارے کہ بجانب مشرق است درے بکندند و ازاں در بیروں رفت و گفت آں کاغذ پارہ بیاورید بیاوردند بوریحان بر وے نوشتہ بود کہ ازیں چہار در ہیچ بیروں نشود و بر دیوار شرق درے بکنند و ازاں در بیروں شود محمود چوں بخواند طیرہ گشت، گفت او را بمیان سراے فرو اندازند چناں کردند مگر بر بام میانگیں دامے بستہ بود بوریحان بر آن دام آمد و دام بدرید و آہستہ بزمین فرود آمد چنانکہ بروے افکار نشد محمود گفت او را برآرید، برآوردند گفت یا بوریحان ازیں حال بارے ندانستہ بودی؟ گفت اے خداوند دانستہ بودم، گفت دلیل کو؟ غلام را آواز داد و تقویم از وے بستد، و تحویل خویش از میان تقویم بیروں کرد در احکام آں روز نوشتہ بود کہ از جاے بلند بیندازند ولیکن بسلامت بزمین آیم و تندرست برخیزم، ایں سخن نیز موافق راے محمود نیامد طیرہ تر گشت، گفت کہ او را بقلعہ برید و باز دارید او را بقلعۂ غزنین باز داشتند و شش ماہ در آن حبس بماند

چہار مقالہ طبع لیڈن صفحہ ۵۰

جلا وطن کر دیا۔ غرضکہ البیرونی کے ساتھ اسکا رویہ کسی طرح بھی قابل تعریف نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم یقین رکھتے ہیں کہ البیرونی کے ساتھ محمود نے جو کچھ رویہ اختیار کیا وہ خاص حالات کے ماتحت تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ محمود کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام مسعود تھا چھوٹے کا محمد۔ محمود کی خواہش تھی کہ محمد کو اپنا جانشین بنائے لیکن اس کے لئے خلیفہ کی تصدیق سب سے اہم امر یہ چیز بھی تھی تاکہ اگر بعد کو مسعود کی جانب سے ادعاے حکومت ہو تو محمد کو دربار خلافت سے ہر قسم کی تائید حاصل ہو۔ اس زمانے میں مذہب قرامطہ کا بہت زور شور تھا یہ چونکہ ایرانی دماغ کی پیداوار ہے اس لئے اسکا مرکز بھی قدرتی طور پر دہیں ہونا چاہئے تھا چنانچہ ایران کے بڑے بڑے علما پر قرمطی ہونیکا شبہ کیا جاتا تھا محمود کے پاس متعدد بار دربار خلافت سے احکام پہنچے کہ اس فتنہ کو دبایا جائے اور جن لوگوں کے متعلق شبہ ہو ان کو سزا دیجائے۔ محمود کچھ تو خلافت کے احکام سے مجبور ہو کر اور کچھ خلیفہ کی خوشنودی اور تائید حاصل کرنے کے لئے اس قسم کی حرکات کر بیٹھتا تھا۔ البیرونی چونکہ فلسفی تھا اور اس وقت یہ چیزیں اکثر علما کی نظروں میں ایک شخص کو مشتبہ بنانے کے لئے کافی تھیں اس لئے البیرونی خاص طور سے محمود کی ان حرکات کا نشانہ بنا لیکن یہ عرض کرنیکی ہم پھر جرأت کریں گے کہ محمود کا یہ طرز عمل اختیاری نہ ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ البیرونی محمود کے بعد اسی خاندان کے دامن دولت سے وابستہ رہا اور اپنی ساری عمر اسی حکومت کے زیر سایہ گزاری۔

مضمون بہت طویل ہوتا جاتا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ محمودی دربار کے شعرا اور علما کے مختصر حالات اور انکے علمی و ادبی کارناموں پر ایک نگاہ ڈال لیں۔

فردوسی | ترتیب کے لحاظ سے مناسب تو یہ تھا کہ پہلے عنصری کے حالات لکھے جاتے اس لئے کہ عنصری محمود کے دربار کا ملک الشعرا ہے اور فردوسی کی رسائی محمود کے یہاں بہت بعد میں ہوئی ہے لیکن چونکہ فردوسی محمود کے دربار کا ہمارے نزدیک سب سے بڑا شاعر ہے اسلئے اس اہمیت کی وجہ سے ہم اس کے ذکر کو سب پر مقدم رکھتے ہیں۔

[illegible] ... اق بن شرف نام فردوسی تخلص طبرستان کے نواحی میں باژ [illegible]
نام ایک گاؤں [illegible] والا تھا۔ گھر سے خوشحال تھا اس لئے اطمینان کے ساتھ علمی [illegible]
[illegible] رہتا تذکرہ نویسوں نے فردوسی کی جانب تمام شاعروں سے زیادہ توجہ
[illegible] باوجود اس قدر توجہ کے اُس کے حالات میں سخت اختلاف ہے
[illegible] کی [illegible] اور ان پر جرح و تنقید کا یہ موقع نہیں بہرحال اتنا ثابت ہے کہ
[illegible] نے محمود کے دربار میں آنے سے پیشتر شاہنامہ کی بنیاد ڈالدی تھی اور [illegible]
[illegible] بھی کر لیا تھا دوسری طرف محمود کو شاہنامہ نظم کرانے کی فکر تھی۔ چنانچہ یہ اہم خدمت اس نے
دربار کے چند مشہور شعرا عنصری وغیرہ کے سپرد کی تھی، لیکن بعد کو فردوسی کی رسائی دربار میں
ہو گئی۔ اُس نے کچھ نظمیں لکھکر بطور نمونہ کے محمود کی خدمت میں پیش کیں محمود نے فردوسی کو اس
کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں پایا۔ اور یہ خدمت اسی کو تفویض ہوئی۔

شاہی محل کے قریب ایک مکان بھی دیا گیا جو تمام ضروری ساز و سامان
[illegible] حرب، شاہان عجم اور بہادروں اور پہلوانوں کی تصاویر سے آراستہ تھا۔ فردوسی
نے [illegible] سال کی مسلسل محنتوں کے بعد اس اہم کام کو انجام دیا۔

لیکن باوجود اس شدید محنت کے فردوسی کی حسب دلخواہ ہمت افزائی نہ ہوئی بلکہ
جیسا کہ اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے محمود کی جانب سے وعدہ خلافی کی گئی اور بجائے ۳۰ ہزار
سرخ دینار کے ۳۰ ہزار سفید درہم پیش کئے گئے، اس واقعہ کا ہم محمود کے بیان میں تذکرہ کر چکے
ہیں اس لئے یہاں اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق بھی ایسا ہی اختلاف ہے۔ علامہ شبلی نے یہ ثابت کرنیکی کوشش
کی ہے کہ فردوسی کے وقت تک ایرانی تاریخ کا بہت کافی ذخیرہ عربی میں منتقل ہو گیا تھا ابن
مقفع نے متعدد فارسی تاریخوں کا ترجمہ کیا تھا۔ عربی زبان کے مصنفین نے ایران کی جو تاریخیں
لکھیں [illegible] کتابوں سے مدد لیکر لکھیں، دقیقی کے زمانے میں ایرانی تاریخ کا متعدبہ

[illegible] ہم ہوچکا تھا، دقیقی نے سامانی خاندان کی فرمائش سے شاہنامہ [illegible] [illegible]انیوں کا
[illegible] خانہ اس وقت عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا بوعلی سینا نے جب [illegible]
[illegible] حیرت چھاگئی اور اعتراف کیا کہ ایسا عظیم الشان کتب خانہ اس سے پہلے [illegible]
سے نہیں گزرا اور نہ آئندہ امید ہے اس کتاب خانہ میں یقیناً دقیقی کے لئے بھی پورا مسالہ فراہم
کیا ہوگا۔ اور دقیقی نے اسی کو سامنے رکھکر شاہنامہ کی بنیاد ڈالی ہوگی۔ محمود غزنوی
سامانیوں کو مٹا کر انکا جانشین بنا تھا اس لئے اغلباً یہ تمام سامان اس کے قبضہ میں آیا ہوگا
اور فردوسی کو بھی اس سے فائدہ اٹھانیکا موقعہ ملا ہوگا لیکن خود فردوسی کو اس سے انکار
ہے اس کا قومی غرور عرب کا اس قدر احسان اٹھانا بھی گوارا نہیں کرتا، چنانچہ فردوسی
نے دعوے کیا ہے کہ قدیم زمانے کی ایک مبسوط تاریخ موجود تھی لیکن مرتب نہ تھی مذہبی
پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزا تھے

(باقی)

ہندوستان میں فن کا دورِ جدید

(۳)

ابنندرا اور ٹیگور کے شاگرد و خوشہ چیں

ہم کیا کریں؟ کہاں جائیں اور کس سے کہیں؟ پرانے اب بہت پرانے ہو چلے اور ہم کافی دور ہو چکے ہیں۔ ہماری ان تک اور انکی ہم تک رسائی دشوار۔ ہم کو چاہیے کہ ہم جو کچھ ہو چکا ہے اس کو دیکھیں اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھیں۔ اچھا، برا، سب لیکن کچھ کہیں تو جب کہیں کہ ہم سیکھ لیں۔ اور اپنے انداز سے اپنی آواز میں کہیں، ہم کو چاہئے کہ اس طرح چلنا سیکھیں جس طرح بچہ چلنا سیکھتا ہے گریں پڑیں لیکن چلیں تو اپنے پاؤں چلیں۔ تقلید؟ یہ ایک بڑا ننگ ہے۔ جیسے الفاظ جس قدر کم استعمال ہوں اتنا ہی اچھا۔ یہ تو آنے والوں کا حق ہوگا کہ وہ ہمارے کئے ہوتے کو دیکھیں اور پرکھیں کہ ہم نے کیا کیا ہے اور ہم اپنے اسلاف کے فنی ورثہ اور اپنے موجودہ ماحول سے کہاں تک مستفید ہوئے ہیں۔ آیا ہم نے ایک بے بہرہ اسکول کے لڑکے کی طرح محض کتاب یا ہمسائے کی کاپی سے نقل کر دیا ہے یا یہ کہ اسمیں کچھ ہماری جان اور ہماری روح کا بھی افشردہ ہے جو انکے لئے فخر کا باعث ہو سکے۔ آج دنیا تمام دوسری قوموں سے ہمارے لئے کہیں زیادہ فنی عروج کے امکانات سے پر ہے۔ بشرطیکہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔

اور ہم میں ایک شخص ایسا بھی موجود ہے جس نے ہم کو راستہ دکھلا دیا ہے۔

کچھ بہت سے لوگ جو ابنندر ناتھ ٹیگور کی فنی عظمت کی صحیح انتہا سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ وہ ابتدائی لڑی ہے جنہوں نے ایک ایسے طرز کی بنیاد ڈالی جو نوکھا اور

انکا اپنا ہے اور جس میں سراسر انکی شخصیت جلوہ گر ہے۔ انہوں نے اجنتا جاکر پرانوں کی روٹیاں نہیں توڑی ہیں بنفس ہو جاتی ہے طبیعت [illegible] کل کے فنی قلانچوں کو اجنتا کی بے حجابانہ و بے ہنگام گداگری کرتے دیکھ کر۔ ٹیگور نے جو چین اور ہندوستان کے فنی کارناموں کے مبصر اور مغل قلم کے دلدادہ ہیں جب رجوع کیا تو اپنی طرف رجوع کیا۔ اپنے اندر کی طرف لوٹے اپنا خون جگر دنیا کے سامنے پیش کیا، بنایا تو اپنا بنایا اور روح ڈالی تو اپنی روح ڈالی جب یہ سب کچھ ہو جائے تب تصویر تصویر کہلائے اور بنانے والا مصور۔

اس سے یہ مطلب نہیں کہ ٹیگور کے یہاں ہم کو اجنتا کے آب و رنگ اور مغل اسکول کی پرکاریوں کی جھلک۔ یا راجپوت اسکول کی رومی پابندیوں اور چین کی آزادہ روی کے پرتو نظر نہیں آتے یا انکے فن میں یوروپ کے طرز نو کی دیوانگی اظہار اور اس کے بڑوں کے وقار کے عنصر نہیں ملتے ٹیگور کی آنکھوں نے سب کچھ دیکھا ہے اور ٹیگور کے ہاتھوں نے سب سے لیا ہے لیکن یہ سب کچھ لے دے کے وہ پھر اپنے اندر کی طرف لوٹے ہیں۔ بنایا ہو تو اپنے اندر سے بنایا ہے اور رنگ و نقش کے مجسموں میں جان ڈالی ہے تو اپنی جان ڈالی ہے۔ اور جو کامیابی ٹیگور کو اس طرز نو میں ہوئی ہے وہ دنیا کے سامنے موجود ہے۔ جس کو خدا نے آنکھیں دی ہیں وہ دیکھے اور لطف اندوز ہو۔ ٹیگور آج دنیا میں اگر سب سے بڑا مصور نہیں تو بڑوں کا ایک بڑا ضرور ہے۔ اور ٹیگور نئوں[1] میں کا ایک نیا ہے جس طرح کہ فرانس کا مایہ ناز مصور رنوار[2]، جو چند سال ہوئے اسی برس سے کچھ اوپر ہو کر مرا نئوں کی صف میں شمار ہوتا تھا۔ ٹیگور کے مقابل انسان یوروپ کے نئوں میں سے اور کس کس

---

(۱) نئوں سے مراد ہے یوروپ کے فنی انقلاب کے بعد جو جدید روشیں قائم ہوئی ہیں انکے برتنے والے آرٹسٹ جن کو "ماڈرنزم" کہتے ہیں۔ (۲) رنوار کے نام پر یوروپ کی اصطلاحات میں "امپرشنسٹ" (حکمت) چسپاں ہیں لیکن وہ فن کی ان بڑی ہستیوں میں ہے جو اسکولوں کی قیود سے بالاتر ہے۔ [illegible] ہے اور بس۔

[illegible] گوغ اگوگاں: ان بیچاروں کی روحیں طوفان خیز کشمکشوں کا جولانگاہ

(۱) [illegible] ہی فرانس کا وہ آرٹسٹ ہے جس نے "امپرشنزم" یعنی "اظہاریت"
کا [illegible] نئی تحریک فن کی راہ میں طرح طرح کی صعوبتیں جھیلیں۔

(۲) [illegible] ہالینڈ کا وہ سریع الحس اور پر جذبات آرٹسٹ تھا جس کو "امپرشنزم"
[illegible] درمیانی منازل کا راہی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کو شروع سے مصوری کی طرف
[illegible] تھا چنانچہ تعلیم کے ختم ہونے کے بعد کچھ عرصے تک پادری کی حیثیت سے کام کرتا رہا
[illegible] پہلے پہل نقاشی اور مصوری کی طرف یک بیک رخ بدلا اور انتہائی سرعت کے ساتھ
فن میں ترقی اور پختہ کاری حاصل کی۔ مصور گوگاں سے اس کی دوستی پہلے بہت بڑھی اور عرصے تک
گو وہ دونوں دور رہے لیکن ایک جان دو قالب کی سی صورت رہی۔ بعد میں جب کچھ دنوں ایک ساتھ
رہے تو کچھ ایسی غلط فہمیاں آپس میں حائل ہوگئیں جو ان میں نزاع کا باعث اور طرفین میں محرک یاس
ہوگئیں۔ لیکن وان گوغ پر اس کا خاص طور سے نہایت گہرا اثر پڑا۔ چالیس کے لگ بھگ اس کے
حواس مختل ہوگئے اس کے کام کرنے کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ ایک تصویر کے خیال کو دن رات
با عذاب صعوبت کی طرح سر میں لئے پھرتا اور بے چین رہتا یہاں تک کہ یہ سودا رنگوں کی صورت میں
سر پھوٹ نکلتا اور وہ درندانہ عجلت اور انہماک سے تصویر بنانے پر ٹوٹ پڑتا۔۔۔ پھر یہی سودا
اتنا بڑھا کہ جنون ہوگیا اور جنون بھی اس زور کا کہ اس میں اس کے رنگوں کے زور کا اندازہ لگتا تھا
[illegible] اس کی کششوں اور نموں کی قوت دیدیا کی نمایاں تھی۔ ایک دن عالم دیوانگی میں
اپنا کان کاٹ کر پھینکدیا۔ بعد میں جب حواس آئے تو خود ہی بیٹھ کر اپنی تصویر بنائی اور اس کا نام
رکھا [illegible]۔ پھر بعد میں ایک دن تپنچے سے پیٹ میں گولی مار لی۔ یوروپ والے آج
اس [illegible] خدا کے طور مانتے ہیں۔

(۳) [illegible] پیرس میں نہ صرف بلکہ ہسپانوی اور جنوبی امریکہ کے ایک شریف خاندان سے

ہیں اور انکی قسمت نہایت درد انگیز قسمت تھی۔ ان میں سے ایک پر اسکے فن کے انوکھے پن اور شاہراہ عام سے بعد قطبین رکھنے کی بنا پر پیرس کے جاہل عوام نے پتھر تک برسائے دوسرے نے کم عمری ہی میں پاگل ہوکر موت پائی۔ تیسرا انتہائی افلاس اور کس مپرسی کی حالت میں دور جزیرہ ہائے بحرالجنوب میں تڑپ تڑپ کر جاں بحق ہوا، جس کی دیوانگی کی داد ان کے سیاہ رنگ، وحشی، نوکرنے اس کی موت پر یوں بین کرکے دی کہ "اب دنیا میں انسان نہ رہا" یہ لوگ پیمبر تھے اور جو پیغام وہ لائے اس کے لئے انہوں نے اپنی جانیں دیں۔ وہ ہستیوں میں بڑی ہستی اور فن والوں میں بڑے فن والے تھے لیکن انکے فن کی نوعیت تہدیبی اور انکاری تھی۔ انکے سر انیسویں صدی کے فنی جمود سے منحرف تھے اور انکا خون انقلاب کی امنگوں سے مشتعل۔ انکو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایک

۱۔ گوگین۔ وہ پیدا پیرس میں ہوا (۱۸۴۸ء) اور فرانس ہی میں نشو ونما پائی۔ کم عمری میں ایک عرصہ تک جہاز رانی کی تعلیم میں لگا رہا ۱۸۷۱ء کی جنگ کے بعد جہاز رانی کا سلسلہ چھوڑ کر بینک کی ملازمت میں ہوگیا اور سات برس تک نہایت خوشحالی سے زندگی بسر کی ۳۵ سال کی عمر تک تصویر کے نام ایک لکیر بھی نہ کھینچی تھی۔ بالکل اتفاقیہ ایک دن اتوار کی چھٹی میں سیر کو جاتے جاتے رہ گیا۔ بیٹھ کر کسی بچے کے رنگوں کے بکس سے دفع الوقتی کے لئے تصویر بنانے لگا۔ یہی ابتدا تھی۔ مصور پسارو نے اس کی تھوڑی بہت رہبری کی۔ پانچ برس بعد اس کی ایک تصویر کے متعلق نقادانِ فن کی رائے ہوئی کہ پسارو کی تصویروں کی نقل ہے اور یہ زندگی نصیب نہ تھی۔ تین برس اور گزرے اور اس نے ایک دن یہ طے کیا کہ اب آٹھوں پہر رنگ چھنے گی اور روز تصویر بنے گی۔ اپنی خوشحالی کی زندگی کو خیرباد کہا اور اس کے بدلے عسرت کے کانٹے مول لے۔ نوکری چھوڑی اور شکستہ کے پوسٹ کارڈ بیچ کر زندگی بسر کی۔ ایک عرصہ بعد کچھ سستی کے خیال سے کچھ نئی اور گرم آب وہوا، نئی اور گرم رنگتوں، نئے اور گرم حسن کی تلاش میں فرانس کی دور دراز، بحرالجنوب کے جزائر کی (ملاحظہ ہو)

[illegible] حسب دلخواہ طرز کی تلاش میں کوہ کنی کرنی پڑی اور انھوں نے [illegible] آزادی پائی انھوں نے
فطرت پرستی کی رسم رائج کی ساری قیود کو نہایت بیباکی اور دلیری کے ساتھ توڑ ڈالا اور انیسویں
صدی والوں کی طرح جیسے بادِ کرم نے بھاپ سے انجن چلائے ہوں، بجلی سے سڑکیں روشن کر دی ہوں
اور تم ہوا میں گرہیں لگانے لگے تم آسمان کے تارے تک توڑنے میں کامیاب ہو گئے ہو لیکن
[illegible] فن سے تعلق ہے جو انسانی تمدن کا اصلی جوہر اور اس کا انتہائی مقصد ہے اس میں
[illegible] اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے کہ ان کو زمین سے برابر کر کے ان پر نئی
بنیادیں ڈالی جائیں، اور ایک نئی عمارت تیار کی جائے۔ پکاسو[1] اور ماتس[2] بھی ان سے زیادہ مختلف
نہ تھے گو اب بالخصوص اول الذکر " نو معروضیت " کی طرف رجوع ہو کر ایک اثباتی طرز کو اپنانے
میں کوشاں ہیں۔ اور ٹیگور بھی فن کا پیمبر ہے لیکن اس کا فن شروع ہی سے رگ رگ اور ریشہ
ریشہ میں اثباتی ہے انکاری نہیں اس کا فن بناتا ہے بگاڑتا نہیں، تعمیر کرتا ہے مسمار نہیں کرتا بیشک
بگاڑنے اور مسمار کرنے کے لئے تھا ہی کیا جو مسمار کیا جاتا۔ پرانوں کے لئے کون جان دینے
لینے پر تیار ہوتا اور مغلوں کے بعد فن کی کوئی زندہ رسم موجود نہ تھی جس کے لئے لوگ آمادہ
بہ پیکار ہوتے اور جس کو ڈھانے بغیر آگے چلنا دشوار ہوتا۔ اس لحاظ سے ٹیگور کا کام سہل تر
تھا۔ لیکن جتنا سہل تھا اتنا ہی مشکل بھی تھا۔ کسی زندہ رسمی طرز کے نہ ہونے اور نقادانِ فن کے
عدم وجود نے انکو اس درجہ آزادی دیدی تھی کہ اس کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے کے
لئے ایک پیمبرِ فن ہی کی ضرورت تھی اور وہ بھی ٹیگور جیسے پیمبرِ فن کی۔

کالونی کا سفر کیا پہلے برما گیا پھر ہیٹی میں رہا پھر سنہ ۱۹ء میں وہیں موت پائی۔ گوگاں بھی امپریشنزم کے
اولین نمائندوں میں تھا لیکن اس کا رنگ عام رنگ سے جدا تھا۔

(1) پکاسو قوم کا ہسپانوی ہے لیکن اس کی نشو و نما پیرس میں ہوئی۔ یہ بھی فن معروضی کی طرف عمر کا
کافی حصہ گزر جانے کے بعد رجوع ہوا ہے (2) ماتس فرانسیسی ہے اور طرز اظہاریہ میں اس کے یہاں شدت جمال کہ
کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے خاص رنگ میں لوگ اسکو پکاسو پر ترجیح دیتے ہیں۔

دنیا کے فنوں میں ٹیگور کا پکاسو سے موازنہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ ان دونوں نے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ٹیگور نے اپنے ابہام سے موہوم طرز فن کی اور پکاسو نے مثلثی طرز یعنی کیوبزم کی۔ [illegible] فن کی حیثیت سے ٹیگور سے بڑا ہے۔ اس کے اثر سے چارہ محال ہے اور اس کا اثر باریک تر ہوتا ہے۔ دونوں مشاق ہیں یعنی فن کو طرح طرح سے برتتے ہیں۔ نت نئے انداز ڈھونڈھتے ہیں اور نئے طرز نکالتے ہیں، لیکن مشاقی فن کے لحاظ سے بھی پکاسو ہی کا پلہ چڑھا ہے ذہین دونو نہایت درجہ ہیں لیکن پکاسو ذہن کو فن میں زیادہ استعمال کرتا ہے اور ٹیگور ذہن کی لگام اپنے جذبات کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اپنے دماغ کو دل کی سرزمین تاراج کرنے سے عاری رکھتا ہے دونوں کے عمل میں سینٹمنٹلزم یعنی با طفلیت کا رنگ حاوی ہے لیکن اس رنگ میں اگر ہندی بیانی سے معمور تر ہے تو جائے تعجب نہیں ان دونوں میں جو سب سے بڑا فرق ہے وہ یہ ہے کہ ٹیگور اپنی قوم کے اس دور میں پیدا ہوا ہے جبکہ وہ اپنی غلامی اور اپنے افلاس اور انحطاط کے ہاتھوں فن سے بالکل بے واسطہ اور بے بہرہ ہے اور پکاسو اقوام یورپ کے اس دور میں جبکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب کوش ہیں، قومی آزادی سے انفرادی آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور روحی کشمکشوں میں مبتلا ہیں لیکن خوشحال ہیں اور فن کی قدر انکے یہاں تمام دوسری قدروں پر حاوی ہے مگر، ع۔ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے جو جہاں ہے وہیں کے لئے بنا تھا اور وہیں اچھا ہے۔ وہ وہاں اور یہ یہاں۔

ابتک تو میں نے دنیا کی ایک بڑی شخصیت کا دوسری بڑی شخصیتوں سے موازنہ کیا تاکہ ہندوستان کے مایہ ناز مصور کی خصوصیات ہم پر وسیع ترین نقطہ نظر سے ظاہر ہو جائیں اور ہم کچھ سمجھیں کہ ہمارے پاس اس وقت کیا ہے۔

اب رہیں ہندوستان کی دوسری فنی ہستیاں اور ان میں سب سے پہلے خود ٹیگور کے پیرو تو پیرو ہمیشہ کم بساط ہوتے ہیں۔ اگر مضامین نو کے انبار انکے یہاں ہونے بھی تو انکی نے اور لے دونوں ملتے گی۔ اور ملنگے کی نے اور لے سے کوئی کہاں تک پہنچ سکتا ہے بلکہ بیشتر تو ایسے ہوتے

ہیں کہ بس استاد کے اعمال کی جگالی کیا کرتے ہیں اور اسی میں زندگی کے دن گذار دیتے ہیں۔ البتہ ٹیگور کے شاگردان خاص میں سے چند افضل شخصیتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

نندلال بوس ایک ممتاز اور پر زور شخصیت رکھتے ہیں انکی تصویریں شلاً "درشن" انسان کی بلندی جاتی ہیں۔ ان کی معرفت واقعی معرفت ہوتی ہے اور وہ اس ارزان "ہو" سے ایک بالکل جداگانہ شے ہوتی ہے جو ہندوستان کی خود فریب قل اعوذیت پر چھائی ہوئی ہے اور جس کی ہندوستان کے بازاروں میں اس قدر مانگ ہے۔ ایک وقت تھا کہ نندلال اب سے زیادہ کہتے تھے اور اب سے کہیں زیادہ کہتے تھے۔ میرا مطلب بسیار گوئی اور بسیار کاری سے نہیں بلکہ زور کلام اور زور عمل سے۔ اب وہ اجنتا کے ضرورت سے زیادہ پیچھے پڑ گئے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ انکی ندرت و دلنشینی اور انکی اثر آفرینی کم ہوتی جاتی ہے۔ اب بھی ان کے ماہر کے "میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا اور آگے چلکر شاید وہ اب سے اور زیادہ "کر سکیں" لیکن ... کا جوہر "کر سکنا" یعنی کاریگری نہیں بلکہ "ہو سکنا" یعنی زور ہستی ہے اور یہی ایک بڑے ... کو ممتاز ہوتا ہے بہت کچھ امید ہے کہ انکے اندر خودی کی دبی ہوئی آگ ایک دن پھر بھڑکے اور وہ اجنتا کی مریدی سے پھر کر اپنی ہی طرف رجوع کریں۔

ٹیگور کے شاگردوں میں سے ایک نہایت مسرت آگیں ہستی ہے وینکٹ ٹپا۔ ٹپا کا اجنبی پہلو انکی تصویروں کی لذت فروشی ہے ان کی تصویریں ایک صریح جسمانی سرور کا باعث ہوتی ہیں ہوتی ہیں یا ہوتی تھیں کیونکہ جب سے ٹپا ریاست میسور کے درباری ہو گئے ہیں تب سے ان کے یہاں بے رس مذہبیت کی سخت بھرمار نظر آتی ہے۔ انکا طرز مغل اور ٹیگور اسکول کا ایک نہایت یگانہ و بے کار امتزاج ہے گو یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ انکے اس طرز خاص میں مغل اسکول کی جھلک نمایاں تر ہے ٹپا دور حاضرہ کے ہند و اہل فن کی شاید تنہا مثال ہے جس نے مغل اسکول کی نمایاں خوشہ چینی کی ہے اور کس خوبی سے کی ہے بڑی حد تک اس کی وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ ٹپا اور بدیع الزمان جو مغل اسکول کے ہمیشہ سے فدائی رہے ہیں، دو تو ایک ہی زمانے میں

کی وحشی اقوام کے تراشے ہوئے بت دوسری طرف اس قول کی تائید کے لئے موجود ہیں۔ انسانی تخیل نے ذات ایزدی کو ہندوستان میں اگر چہار دست شیوا یا تری مورتی کی صورت میں پیش کیا تو یونان میں انسانی حسن کے انتہائی امکانات کی صورت میں جس کی مثالیں اپالو زہرہ [illegible] وسرے مجسمے ہیں۔ آج دیکھنے اور غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ شوق سجود میں جس درجہ بیتابی اور جبیں سائی میں جس درجہ انہماک ایک قوم میں پایا جاتا تھا اسی درجہ اس کے [illegible] کمال واقعی مظہر ہوتی تھیں ذات خداوندی کی، اس کے جلال، اس کی ہیبت اس کی عظمت کی۔ انسان کی صورت میں اوتار چونے ہوں یا نہ ہوئے ہوں لیکن ان پتھروں کی صورت میں اوتار ضرور ہوجاتے تھے اور سجدوں کا جو تلاطم ہندوستان کی پیشانی میں مضمر تھا وہ نہ یونان کو نصیب تھا نہ مصر کو اور یہی وجہ ہے کہ جس پایے کی شکلیں ہندوستان نے تراشی ہیں کسی دوسرے ملک سے ممکن نہ ہوئیں اور تخیل کی جو جسارت اس میں پیدا ہو کہیں اور پیدا نہیں۔ ملحوظ رہے کہ "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں" لیکن شوق سجدہ سے جو تخلیق صورت وابستہ ہو اس کی علت رہنما انسان کے مذہبی ولولے ہوتے ہیں اور اس میں ذہنی عنصر کی رہبری سے حصول حسن اور جمال آفرینی کا دانستہ (conscious) دخل معدوم یا کالعدم ہوتا ہے۔ انکا مسلک حسن آفرینی نہ تھا اور وہ حسن کی لذت حسن کی خاطر متلاشی نہ تھے۔ [illegible] کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہم کو انکے کارناموں میں اکثر انتہائی حسن کے نمونے نہیں ملتے بلکہ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دانستہ اس عنصر کے متلاشی نہ تھے برخلاف ان اقوام کے جب ہم مسلمانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ الست کے متوالے اپنی دلبستگی توحید میں بتان آذر سے دست و گریباں ہوئے اور یہ نہ سمجھے کہ "مانو تو بت نہیں تو پتھر" یا نہ مانے تو پتھر نہیں تو بت۔ اسلام میں ندیشا یہی بحکم قرآن یا بحکم حدیث تصویر کشی یا شکل تراشی ممنوع ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ولولۂ توحید کا اقتضا شروع شروع لازمی طور پر یہ تھا کہ انسان اپنی شبیہ بنانے سے کنارہ کش رہے۔ چنانچہ ان کی حسن آفرینی کی امنگ جو فطرت انسانی کا ایک

لازمی منصر ہے، ایک عرصہ تک فن نقاشی، خوشنویسی، خطاطی اور اسی قسم کی دوسری صنعتوں میں ظہور پذیر ہوئی جن میں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے [illegible] قلمی کتابیں [illegible] فارس و ترکی قالینوں کے ذوق [illegible] مثال کے طور پر اس قول کے شاہد ہیں مزید براں یہی وجہ ہے کہ جو کامیابی فن تعمیر میں مسلمانوں نے حاصل کی وہ شاذ کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں ہوئی کیونکہ بڑے پیمانے پر چکر اکی حس [illegible] کی امنگ کا بھی ایک جولانگاہ تھا۔ اکثر نادان غیر مسلم مسلمانوں کی بت شکنی پر الزامات کے طومار باندھتے ہیں اور اکثر نادان نو مسلم اپنے اسلاف کی اس دیوانگی پر اس طرح نادم ہوتے ہیں جس طرح انگلستان سے واپس آئے ہوئے ہندوستانی اپنے غیر انگریزی ماں باپ کی ہستی پر نادم ہوتے ہیں۔ ہر شخص اور ہر قوم کا ایک خاص منصب اور مشن ہوتا ہے جس کے حصول میں اکثر ہولناک واقعے پیش آتے ہیں۔ ہر شخص یا ہر تمدن کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھنا ایک ہی کانٹے پر تولنا اور پرکھنا انسان کی جہالت اور تنگ نظری کی دلیل ہوگی۔ اگر سومنات ٹوٹا اور تاج بنا تو اہل نظر اس کو بنی نوع انسان کے فنی و اشکالی تمول میں ایک بڑا اضافہ تصور کرینگے اہل نظر بہر حال دیوانگی کے ساتھ ہونگے خواہ وہ بت گری آذر کی صورت میں جلوہ پیرا ہو یا بت شکنی خلیل میں۔ اہل نظر تو اس کے قائل ہیں کہ وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔ البتہ واضح بر حال ماکہ: بت گر رہے نہ بت شکن کعبہ رہا نہ بت خانے۔ بہر حال تحفہ بت شکنی کی چند صدیوں بعد ہی سے مسلمانوں نے خوشنویسی نقاشی کے ساتھ ہی ساتھ کتابوں میں السٹریشن کے طور پر تصاویر کو جگہ دینی شروع کی اور آٹھویں صدی عیسوی میں ہم کو عراق کے قلمی نسخوں میں سے مصوری کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کی پرکاری ہمارا اور تمدد قلم پر انسان کو تعجب آئے لیکن خاندان عباسیہ کے انحطاط کے بعد مصوری کی رونق [illegible] گئی۔ دوسری طرف فارس میں بھی کتابوں کے السٹریشن نے رفتہ رفتہ رواج پکڑا لیکن میدان خوشنویسوں کے ہاتھ میں تھا اور مصور بیچارہ ایک ایسی گمنام ہستی رہا جس کا اب تک کسی [illegible] ذکر نہ ہوتا۔ ترکی میں بھی باتصویر کتابوں کا رواج ہوا لیکن

ہرکی اسکول بہت ہی کمتر پایہ پر رہکر ختم ہوگیا۔ [illegible] میں اس شعبہ مصوری نے روز افزوں ترقی کی جس کی سب سے بڑی وجہ چین کا اثر تھا۔ چین! جس کا فن نقش و تصویر میں آج تک مقابل نہ نکلا چونکہ مصوری کا مقصد بنور یہ تھا کہ کتابوں کے قصوں کو انہیں کی جلدوں کے اندر نقش و رنگ میں پیش کریں اس لئے یہ تصویریں لازمی طور پر مختصر ہوتی ہیں اور ان میں مصوروں کو باریکی قلم کی صنعت گری کا خاص طور پر موقع ملا۔ انکی دوسری خصوصیت انکی جو تسانی تھی اور انکے رنگوں کی گوناگونی ۔ لیکن قلب مضطرب کے ولولوں سے ابھی انکو کوئی واسطہ نہ تھا۔ بہزاد، جس کا نام میدان مصوری میں زبان زد خاص و عام ہے پہلا شخص تھا جس نے تصویر کو کتاب کی تنگ چار دیواری سے آزاد کیا اور جس نے اس جذباتی عنصر کو وہ جگہ دی جس کے بغیر تصویر ایک جسم بیجان سے زیادہ درجہ حاصل نہیں کر سکتی خواہ اس جسم میں ہزاروں بناؤ ہوں یہی راز ہے بہزاد کی مجددیت فن کا، نہ کہ اس کی باریکی قلم، جس میں بہزاد سے بڑھ چڑھ کر دوسرے استاد موجود ہیں۔ فارس کے اس اسکول نے شاہان مغلیہ کے سایہ عاطفت میں آکر بہت کچھ دوسرے خط و خال اختیار کئے ۔ ایک طرف تصوف اور دوسری طرف شاہانہ اور درباری زندگی کے نہایت پرزور اور نہایت درجہ باریک قلم مرقع اس زمانے کی قتی سطوت اور شان و شکوہ کے لازوال شاہد ہیں۔ سراج کا طرز تصویر کی شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں ہوئی جو فن مصوری کا اپنے زمانے میں سب سے بڑا مبصر تھا مابہ الامتیاز مسلمانوں کی مصوری اور دوسری اقوام کی مصوری میں یہ رہا ہے کہ مسلمان پہلی وہ قوم تھے جس نے جمالیات کو آرٹ میں معیار اول اور معیار آخر قرار دیا اور نہایت دانستہ، اور پورے احساس کے ساتھ حسن آفرینی میں سرگرداں ہوئے۔ تصویر میں خدا پرستی چونکہ مذہباً ناممکن تھی اس لئے انہوں نے حسن پرستی اپنا مسلک ٹھہرایا مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے فنی نقاط نظر میں سے خالص جمالیاتی نقطہ نظر کے بانی ہیں یہی انکا تمغہ امتیاز ہے اور یہی فن کی رو سے انکے وجود کا کفارہ ہے لیکن اس کی

اس بات کو خود ہندوستان کے اکثر تنگ نظر نقاد زبان پر لانے سے گریز کرتے ہیں اور آج وہ دنیا کے لئے ایک بھولا ہوا خواب ہیں اور اس سے زیادہ نہیں۔ [illegible] مگر نیک عبدالرحمن چغتائی کو تھا نہ کہ ان بھولے ہوئے نقوش کا لیکن چغتائی بلکہ [illegible] کے بھی سمجھنے کے لئے اس داستان کی تھوڑی سی ورق گردانی لازم تھی چغتائی آخرالذکر کی طرح مغل طرز کے مقلد نہیں۔ نہ انکے اندر وہ باریکی قلم ہے نہ انکی تصویروں کی تیاری میں وہ دیدہ ریزی، نہ وہ ناک نقشے نہ قدوقامت۔ انکے فن میں تین عنصر پائے جاتے ہیں ہندی فارسی اور انگریزی۔ انگریزی سے میری مراد انگریزی ہے نہ کہ یوروپی۔ اور انگریزی عنصر میں بھی شاید کاتیشیل کا اثر نہیں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو انکا کمزور ترین پہلو ہے۔ اور انکا زوردار پہلو انکا فارسی یعنی جمالی پہلو ہے۔ جو داستان میں اوپر بیان کر آیا ہوں اس کی ان کی تصویر کے ذرے ذرے میں جھلکتی ہے انکی حسین کلاہ کی حسین نوک سے لیکر انکے حسین جوتے کی حسین نوک تک اور انکی حسین ناک کی نکیلی نوک سے لیکر انکی نکیلی آنکھ کی حسین نوک تک حسن ہی حسن جلوہ گر ہے۔ مگر بدن میں خون چاہو تو خون ناپید۔ ہندی عنصر انکی کوشش ہو۔ انگریزی عنصر ان کی بدنمائی اور فارسی عنصر انکی سرشت شاید یہ انکے نہ دیکھے پن کی باتیں ہوں کہ ان میں اکثر ڈملاک[1] جیسے روی دبستنل تصویر ساز کے اسٹرتیتوں سے ساز باز کی ہوس کا احتمال ہوتا ہے۔ جس سے انکا پایہ کہیں بلند تر ہے۔ چغتائی کی سدا نیم باز آنکھیں اور انکے نقشوں کی نوکداری انکی مصوری کا ایسا اٹل ضابطہ ہو کر رہ گیا ہے کہ ان سے انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ سدا انکے یہاں موضوع بدلتے رہیں لیکن شکلیں نہیں بدلتیں۔ یہ انکی بڑی کم مائیگی ہے۔ ایک نہ ایک ضابطہ تو چھوٹے سے بڑے آرٹسٹ اکثر قائم کر لیتے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر وہ خاکے یا تصویر تیار کر دیا کرتے ہیں لیکن درآں حالیکہ ان کی بڑی ہستیاں اپنے زوردار پہلوؤں کو دہراتی ہیں اور انپر مصر ہوتی ہیں، کم درجے کے آرٹسٹ اپنی کمزوریوں ہی کو اپنی قوت سمجھتے ہیں اور ان چیزوں کو جو واقعی ٹھکر پر کیف ہونے کی صلاحیت رکھتی

(۱) Edmund du Lac کے عمر خیام کی رباعیات کے مرقعے مشہور عام ہیں

ہوں، نا قابل توجہ خیال کرتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر چغتائی اپنی بے چشم، افسردہ دل نازنینوں کو چھوڑ کر منصور کی طرح پرندیا فرانز مارک[1] کی طرح چوپائے بنانے میں اپنا وقت صرف کرتے جن میں انکو خاص ملکہ نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ چغتائی اپنا ایک نرالا طرز رکھتے ہیں اور انکے ہمعصروں میں سے ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں، جس پر انکا یا جس کا ان پر گمان جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود زور اور قوت سے خالی ہونیکے وہ اس درجہ اہمیت کے مستحق ہیں۔ کاش کہ انہوں نے غالب کو اندرسن کی کہانیوں کے جیسے مرقعوں کے بغیر چھاپا ہوتا۔ غالب کے یہاں جذبات کا تلاطم اور انکی سبز سپید بادشاہ زادیاں خون سے خالی۔ لیکن زبان اردو بیچاری جس میں اس حسن و خوبی کی کوئی دوسری کتاب نہیں ہمیشہ کیلئے ان کا احسان مانے گی۔ اور غالب خاک نشیں بھی چاہے تہ خاک تیوریوں پر بل لا کے کہیں کہ "ارے یہ کیا کیا تو نے" لیکن جی میں خوش ضرور ہوں گے۔ غالب مصور کی طباعت کے دلکش خط و خال اور طرز چغتائی کی جمال آرائیاں احساس سلیم اور احتساب تنقید کے لئے "رہزن تمکین و ہوش" ہیں اور انکے سامنے اپنی انتہائی رشوت پیش کرتے ہیں۔

اب رہے اور تو اوروں کی تعداد بہت ہے اور سب کے سروں پر تھوڑی یا بہت بڑائی کا پشتارہ بھی ہے۔ ٹیگور کے خاندان سے کئی ایک۔ ہلدار۔ ایل۔ دکیل۔ چودھری اور بنگال کے فنی ٹھیکیداروں میں سے کئی اور۔ سنگھ اور پنجاب سے دو ایک اور حکیم محمد خاں لکھنؤ سے۔ لیکن انپر کسی مفصل تنقید کی اس مختصر سے مضمون میں گنجایش نہیں۔ ان سب میں کچھ نہ کچھ ہے اور ان میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی بڑے کار نمایاں کر جاتا ہے لیکن سب کے

---

[1] Franz Marc جرمنی کا طرز فشتی میں مشہور ترین مصور تھا جس نے جنگ عظیم میں نہایت کم عمری کی حالت میں موت پائی اس طرز میں اسکے موجد پکاسو کے بعد اسکا ہمسر شاید کوئی دوسرا نہ ہو۔ وہ جانوروں اور جانوروں میں بھی بیشتر چوپاؤں کے سوا انسانوں کے مرقع کبھی نہیں بناتا تھا۔

سب ذمرۂ مقلدین میں آتے ہیں، اساتذہ میں نہیں۔ سنگ پوچ احساسات اور ابتذال کی طرف مائل ہیں۔ سامنے موقعوں کے لحاظ سے بھی اور اپنے رنگوں اور ڈھنگوں کی پسند میں بھی۔ حکیم محمد خاں ان پیدائشی صورت نگاروں میں سے ہیں جو باوجود کمال قوت و بصارت کے زمانے کی ناقدری کے ہاتھوں بک جاتے ہیں اور جو وہ مانگتا ہے بنانے لگتے ہیں اور رنگینی ابتذال کی۔ گنگا جمنی چھتر۔ سلمے ستارے کے جوڑ بند داستوں کے بجائے انار دانے اور آنکھوں کے بجائے سرمئی ڈچور۔ سبز سرخ پریاں۔ ناٹک۔ نوٹنکی اردو۔ میں ہونگا خسکا بادشاہ میں سب کھانے پکاتا ہوں۔ میرے قبضے میں ہے سب کچھ جو چاہوں سو کہلاتا ہوں یا بہت بڑھے تو "یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی" خود حکیم کی ابتدا بتلا رہی ہے کہ وہ موقلم کا مالک تھا۔ اور بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مسرت اکسیر اور دنیا کی بدمذاقی کا مقابلہ آسان نہیں ہوتا

ایک نام ہر فری حق سنتا دیوی۔ اس نام سے کم لوگ واقف ہونگے لیکن انکی تصویر "میلے کے بعد" ایسی ہے کہ ایک مرتبہ دیکھ کر انسان پھر نہ بھولے۔ ہندوستان کے اس دور کی بہترین تصویروں میں سے ایک تصویر۔ اور بالکل نیا طرز خیال اور طرز ادا اس تصویر کے رنگ اور جسموں کی حرکت و جنبش نہایت خوب اور صد درجہ مسرور کن ہیں۔ یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ ہندوستان کی ان عورتوں میں سے جنکا مصوروں میں شمار مسلم ہے ہم شاید ایک کو بھی بدمذاق باطنیت، جذبہ فروشی یا نوٹنکی کی طرف مائل نہ پائینگے، جس کے "مردوات مصور" اتنے گھائل نظر آتے ہیں۔

وہ دن شاید اب لد گئے جب راوی ورما بہزاد وقت سمجھے جاتے لیکن یہ قابل ذکر ہے کہ راوی ورما کا اثر ہندوستان کے مصوروں اور ہندوستان کی مخلوق پر ایک زمانے میں ٹیگور سے کہیں زیادہ عام رہا ہے راوی ورما میدان مصوری میں وہ کچھ تھے جو داغ میدان شاعری میں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ داغ کا دائرہ شعر تغزل تھا اور راوی ورما کا دائرہ

مل بد جیسی روایات۔ لیکن تھے دونوں چپ چپے، شیر مغروش۔ راوی ورما کے گورے گورے حسین، مس کھدرو تا کھ ہوں دیوتا نہیں معلوم ہو [illegible] نہ حسن و فن کے معیار کا ابتذال پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈراپ سین کی مورتوں سے معلوم ہوتی ہے۔ اور جب استاد کا یہ حال ہے تو شاگردوں کا کیا ذکر و بیان ہو۔

ایک حضرت ہیں مسٹر فیضی رحمن ساکن بمبئی۔ انھوں نے اپنے سر یہ قومی خدمت لے لی ہے کہ قدمائے ہندوستان کے فنی کارناموں کے گیت گایا کریں اور اپنے موقلم کی ترشحات سے اوراق حال کو اپنا ممنون احسان کرتے رہیں انکا ذکر اگر اس سے زیادہ کیا گیا تو انشاءاللہ بمبئی کے آرٹ اسکول کے ذکر کے ضمن میں ایک الگ مضمون کی صورت میں کیا جائے گا۔ ہم میدان فن میں آزادی اظہار کا شدت سے قائل ہوں لیکن بعض اوقات اسی شدت سے جی چاہتا ہے کہ فنی احتساب کی رسم قائم ہوتی۔ اس بے پروائی کس کے سر جائے گی۔ ان جیسوں بلکہ فن کے سچے پیمبروں کے۔

اسلامی اور مسیحی اخلاق

۱۔ سوال کی وسعت اور اہمیت | آنحضرتؐ اور حضرت عیسیٰ میں اخلاق کے لحاظ سے کس کو ترجیح دیجئے؟ یہاں سوال پر بحث کرنے سے پہلے قرآن اور انجیل کی اخلاقی تعلیم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دونوں بزرگوں کے اقوال و افعال پر ایک گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور جن حالات میں انہوں نے تبلیغ دین کا کام شروع کیا تھا ان کو بھی پیش نظر رکھنا لازم ہے تاکہ اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ کونسی تعلیم مختص الوقت، مختص بالقوم اور مختص المقام ہے اور کونسی تعلیم دائمی اور عام ہے۔

یہ سوال جیسا اہم ہے ویسا ہی وسیع بھی ہے اگر فرصت ملے تو اس بحث پر ایک مکمل کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر میں کوشش کروں گا کہ حتی الامکان اختصار کے ساتھ ان سوالوں کا جواب بھی ایسے عنوان سے پیش کیا جائے کہ طالب حق کی تسلی کے لئے کافی ہو۔

۲۔ اخلاق کی حقیقت | سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ اخلاق ہے کیا چیز؟ میں نے رسالہ معیار الاخلاق میں اس پر بحث کی ہے۔ یہاں چند موٹی موٹی باتیں مختصر الفاظ میں بیان کیجاتی ہیں۔

(الف) اخلاق جمع ہے خلق کی اور خلق نفس انسان کی وہ حالت ہے جس کی بدولت افعال بآسانی صادر ہوتے ہیں۔ اگر وہ افعال عقلاً اور شرعاً پسندیدہ ہوں تو حسن خلق یا اچھے اخلاق سمجھے جائیں گے اور اگر ناپسندیدہ ہوں تو بد خلقی یا برے اخلاق کہلائیں گے۔

(ب) اخلاق ایک متوسط حالت کا نام ہے یعنی جو کام حد اعتدال پر قائم ہو وہ قابل تعریف اور داخل حسن خلق ہے اور اگر اس میں کمی یا زیادتی ہو جائے اور اعتدال قائم نہ رہے تو وہی کام قابل مذمت اور بد خلقی میں شامل ہو جاتا ہے۔

(ج) اخلاقی فضیلت کو خط مستقیم سے اور اخلاقی رذائل کو خطوط منحنی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دو

نقطوں کے درمیان ایک ہی خط مستقیم ہوسکتا ہے مگر خطوط منحنی بے شمار کھینچے جا سکتے ہیں یعنی سیدھا راستہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر ٹیڑھے راستے بے شمار ہوسکتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے ہر ایک نیکی یعنی اخلاقی خوبی کو صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ کہا ہے (دیکھو قرآن مجید کی پہلی سورۃ یعنی سورۃ فاتحہ)

(۷) عدالت تمام اخلاقی فضائل کا سرچشمہ بلکہ کل اخلاق کا مجموعہ ہے اور ظلم (جو اس کے برخلاف ہے) تمام رذائل کا سرچشمہ بلکہ کل بداخلاقیوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ عدالت کے معنی ہیں تمام انسانی قوتوں کو اعتدال پر رکھنا اور یہ عین اخلاق ہے اور ظلم سے مراد ہے کسی شے کو بے موقع رکھنا یعنی بے اعتدالی اور اسی کو بداخلاقی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں جابجا عدل و اعتدال کی مدح اور تاکید اور بے اعتدالی و ظلم کی مذمت اور مخالفت کی گئی ہے بلکہ کل اسلامی احکام صوم و صلوٰۃ۔ حج و زکوٰۃ۔ خمس و جہاد وغیرہ کی بنیاد ہی عدل و اعتدال پر قائم کی گئی ہے۔

اب میں دو اخلاقی فضائل یعنی شجاعت اور عفت کی مختصر سی حقیقت بیان کرتا ہوں تاکہ یہ مطلب واضح ہوجائے۔

۱۔ شجاعت کیا چیز ہے؟ قوت غضبی کے اعتدال سے شجاعت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے غصہ کو قابو میں رکھیں اور بوقت مناسب۔ بطریق مناسب بمقتضائے عقل اس سے کام لیں تو یہ شجاعت ہے جس کو دلیری اور بہادری بھی کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف عمل کرنا شجاعت نہیں ہے مثلاً اگر کوئی شخص خونخوار درندوں کی طرح قتل و غارت پر مستعد اور خواہ مخواہ آمادہ جنگ و جدال رہے۔ بے موقع اور بے عقلی سے غصہ کو استعمال کرے تو یہ قوت غضبی کی افراط ہے۔ ایسا فعل قابل تعریف نہیں ہوسکتا اور نہ اس کو شجاعت کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قوت غضبی کو جڑ بنیاد سے مٹا دے کبھی غصہ سے کام ہی نہ لے اپنے نفس کی حفاظت اور شریر کی شرارت کو دفع کرنے کے لئے کبھی کوئی تدبیر عمل میں نہ لائے

ظالم سے کبھی انتقام نہ لے ہمیشہ معافی اور درگذر سے کام لے تو یہ قوت غضبی کی تفریط ... فعل بھی اخلاقی حیثیت سے قابل تعریف نہیں ہوا اور نہ اس کو شجاعت سے کوئی نسبت ہے کیونکہ اس سے ظلم اور شرارت کو زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور نیکوں کی عافیت ... جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت۔ ضعیفوں کی اعانت۔ مظلوموں کی حمایت ... دفع فتنہ و فساد اور تائید دین وغیرہ نیک مقاصد کے لئے قوت غضبی سے باعتدال کام لینا اور اپنے نفس پر قابو رکھنا اخلاقی خوبی ہے۔ اور اسی کو شجاعت کہتے ... اسلامی جہاد کا فلسفہ ہے کیونکہ آنحضرتؐ کی کل جنگیں دفاعی تھیں اور ... یہی مقاصد پیش نظر تھے۔ کتاب تحقیق الجہاد میں جس کو میں نے بزبان اردو شائع کیا ہے قرآن۔ حدیث اور تاریخی واقعات سے اس امر کو ثابت کیا ہے۔

۴۔ عفت کیا چیز ہے؟ | قوت شہوی کے اعتدال سے عفت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اپنی تمام خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور باعتدال ان سے کام لینا عفت ہے جس کو پارسائی بھی کہتے ہیں اس کے برخلاف عمل کرنا عفت نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی خواہشوں کو پورا کرنے میں آزاد ہو یعنی ہر خواہش کو بغیر اس خیال کے کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ حرام ہے یا حلال۔ پورا کر لے۔ تو یہ قوت شہوی کی افراط اور عفت کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص قوت شہوی کو مٹا دے اپنی جائز خواہشوں کو بھی پورا نہ کرے جوگیوں کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں بیٹھ کر عبادت کرے۔ جڑی بوٹیاں کھا کر زندگی بسر کرے۔ زن و فرزند کو چھوڑ بیٹھے۔ یا سرے ہی سے ان تعلقات سے منہ موڑ بیٹھے۔ عمر بھر مجرد رہے۔ تو یہ قوت شہوی کی تفریط ہے ... بھی اخلاق سے خارج سمجھا جائے گا۔

۵۔ اصل الاصول اخلاق | قصہ کوتاہ۔ اخلاق ایک ایسے درمیانی طریق عمل کا نام ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک فطری قوت کو اعتدال پر قائم

رکھیں۔ تمام خداداد قوتوں سے بمقتضائے عمل کام لیں اور کسی قوت کو معطل نہ چھوڑیں۔ اگر ایسا کریں تو ہم خلیق۔ صاحب خلق یا با اخلاق کہلائیں گے۔ ورنہ اخلاق سے گر جائیں گے یہ اخلاق کا اصل الاصول جس کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اب میں انجیل اور قرآن کے اخلاق کا ایک مختصر سا موازنہ پیش کرتا ہوں۔

۶۔ مسئلہ انتقام اور انجیل | عیسائیوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کل اخلاق کا لب لباب اپنے پہاڑی والے وعظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس وعظ کی ہدایات یہ ہیں:۔

۱: لیکن میں تجھ سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔ (انجیل متی باب ۵ آیات ۳۹-۴۲)

۲: جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے اور جو کوئی تیرا چوغہ لے اس کو کرتا لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اُسے دے اور جو کوئی تیرا مال لے لے اُس سے طلب نہ کر۔ (انجیل لوقا باب ۶ آیات ۲۹-۳۰)

آج دنیا میں اصلی انجیل کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ کیا تھے اور آیا اُنکا یہی مطلب تھا جو اس عبارت میں ظاہر کیا گیا ہے یا کچھ اور مطلب تھا۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعلیم فطرت انسانی کے خلاف اور یہ اخلاق بالعموم ناممکن العمل ہیں اگر ظلم اور شرارت کے دفعیہ کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہ کیجائے اور ظالموں اور شریروں کو آزادانہ اپنے منصوبے پورے کرنے دئے جائیں تو نیکوں اور پارساؤں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور آخر کار نظم تمدن باطل اور دنیا کا بہت بڑا خاتمہ ہو جائے گا۔

۴۔ انتقام بابت قرآنی تعلیم | اب اس [illegible] مقابلہ میں اسلامی اخلاق کو دیکھئے جو قرآن مجید نے ہم کو سکھایا ہے۔

وجزآؤ سیئة سیئة مثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ۔ انہ لا یحب الظلمین۔

"اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے (یعنی جرم کے موافق انتقام لینا) پھر جو شخص معاف کر دے اور صلح کر لے اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے۔ بے شک خدا ظلم کرنیوالے کو دوست نہیں رکھتا۔"

[illegible]ہدایت بتاتی ہے کہ موقع اور محل کے موافق انتقام اور معافی سے کام لو۔ اور انتقام لینا لازمی نہیں ہے اگر مجرم کو مصلحتاً معافی دیدی جائے تو معاف کرنیوالے کو اللہ تعالیٰ اجر دے گا۔ اکثر آیات اور احادیث سے معاف کر دینے کی فضیلت ثابت ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اس کی حیرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔ آپ نے بدترین دشمنوں کے قصور بھی معاف کئے ہیں۔ مگر انتقام کو یکقلم ترک کر دیا جائے تو دنیا میں فتنہ و فساد پھیل جائے بلکہ دنیا تباہ اور برباد ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بقدر واجب انتقام لینے کی اجازت دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عفو اور درگذر کی خوبی بھی جتادی یہ نہیں فرمایا کہ کبھی شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ انتقام کا نام نہ لینا۔ ہمیشہ حلم اور نرمی سے کام لینا۔ یہانتک کہ اگر کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دینا۔ ظالم کی فریاد اور ظلم کی داد خواہی نہ کرنا۔ بلکہ اگر کوئی شخص نالش کر کے تمہارا کرتہ جبراً لینا چاہے تو اپنا چوغہ بھی خوشی سے اس کے حوالے کر دینا۔ وغیرہ وغیرہ کیونکہ ایسے احکام فطرت انسانی کے خلاف اور تکلیف مالا یطاق ہیں

۵۔ قرآنی تعلیم کی فوقیت | بہرحال مسئلہ انتقام کی بابت انجیل کی تعلیم جو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب ہے اعتدال سے گری ہوئی اور تفریط کی حد انتہائی کو پہنچی ہوئی ہے۔ فطرت انسانی بھی اس کو قبول نہیں کرتی اور عام طور پر اس کی تعمیل بھی نہیں ہو سکتی۔ مگر قرآنی تعلیم جو آنحضرت نے پیش کی ہے بالکل معتدل۔ فطرت انسانی کے مطابق اور ہر حالت میں قابل عمل ہے۔ جس

پر تمام دنیا عمل کر رہی ہے۔ مگر مسیحی تعلیم کو خود مسیحی قوموں نے بالائے طاق رکھدیا ہے حقیقت الامر یہ ہے کہ یہ دلفریب اور شاندار مسیحی اخلاق۔ زینت اوراق کتاب مقدس بنائے جانے کے سوا اور کسی مطلب کا نہیں اور ایک مسیحی مشنری کے لب شیریں سے اُس کی شیرینی میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے مگر عملی دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اسی سے اسلامی تعلیم اور اخلاق محمدی کی عظمت وقعت اور فوقیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے

۹۔ معاشرت زوجین کے متعلق قرآنی احکام | اخلاق کا ایک شعبہ تدبیر منزل ہے یعنی انتظام خانہ داری جو زن و شوہر کے خوشگوار تعلقات پر منحصر ہے۔ اس باب میں بھی اسلام نے نہایت حکیمانہ اصول اور بہترین ہدایات پیش کی ہیں۔ مثال کے طور پر آیات ذیل قابل ملاحظہ ہیں:۔

(۱) وعاشروهن بالمعروف فان كرهتموهن فعسىٰ ان تكرهوا شيئا ويجعل الله فيه خيرا كثيرا ه (نساء، پ۴)

اور اُنکے ساتھ (یعنی اپنی بیبیوں کے ساتھ) حسن سلوک سے رہو۔ پھر اگر (کسی وجہ سے) تم انکو ناپسند کرو تو عجب نہیں کہ تم کو ایک چیز ناپسند ہو۔ اور اللہ اس میں بہت سی خیر (برکت) عطا کرے۔

(۲) وان تصلحوا وتتقوا فان الله كان غفورا رحيما (نساء، پ۵)

اور اگر تم کو (یعنی میاں بیوی آپس میں) صلح کر لو اور (ایک دوسرے کی حق تلفی سے) بچو تو خدا بخشنے والا اور رحیم ہے۔

(۳) وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من اهلها ان يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما ان الله كان عليما خبيرا ه (نساء، پ۵)

اور اگر تم کو انکے درمیان (یعنی میاں بیوی میں) جدائی کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے کنبے سے اور ایک عورت کے کنبے سے مقرر کرو اگر دونوں پنچ اصلاح کا ارادہ کریں گے تو خدا (انکے سمجھانے سے) اُن دونوں میں (یعنی میاں بیوی میں) موافقت کر دیگا۔ بیشک خدا (سبکے دلی ارادوں سے) واقف اور باخبر ہے۔

(۴) ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف وللرجال علیہن درجۃ واللہ عزیز حکیم ۔ (بقرہ ع ۲۸)

اور جیسے (مردوں کے حقوق) عورتوں پر ہیں ایسے ہی دستور کے مطابق (عورتوں کے حقوق) مردوں پر ہیں اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فوقیت ہے"

"یہ آیات صاف طور پر ہدایت کرتی ہیں کہ زن وشوہر کو سلوک اور محبت سے رہنا چاہئے اور اگر ان میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو اس کو رفع کر لیا جائے۔ حسب ضرورت پنچ مقرر کر کے باہم صلح وصفائی کرا دینی چاہئے تاکہ فریقین کے خوشگوار تعلقات دوبارہ قائم ہو جائیں جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر ہیں جن کی تفصیل کتب احادیث میں موجود ہے۔

۱۰۔ طلاق بابت قرآن کا فیصلہ | شریعت اسلام نے طلاق یا خلع کے ذریعہ سے زن وشوہر کی جدائی کو بہت ہی ناپسند کیا ہے اور ایسے قواعد وضوابط مقرر کر دیے ہیں کہ حتی الامکان جدائی کی نوبت نہ آئے (دیکھو سورہ طلاق وغیرہ) اور اگر کبھی ایسی نوبت آ جائے اور مصالحت کی کوششیں کارگر ثابت نہ ہوں اور علیحدگی کے سوا چارہ نہ ہو تو ایسی حالت میں فریقین کو عقد ثانی کی اجازت دی گئی ہے تاکہ اُن کی زندگی برباد اور اُن کا اخلاق تباہ نہ ہو۔

۱۱۔ طلاق کے متعلق انجیل کا حکم | اب اس کے مقابلہ میں انجیل کو دیکھا جائے تو وہ بالکل ہی مختلف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ سے انکے شاگردوں نے اس مسئلہ کی بابت سوال کیا تو یہ جواب ملا تھا۔

"اُس نے اُن سے کہا جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ اُس پہلی کے برخلاف زنا کرتا ہے اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے (انجیل مرقس باب ۱۰ آیات ۱۱-۱۲)

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات زن وشوہر کی ناموافقت کا دفعیہ ممکن نہیں ہوتا اور اُن کا مل کر رہنا فتنہ وفساد کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس کا بہترین علاج یہی ہو سکتا ہے

کہ اُن کو جدا کر دیا جائے اور انکے لئے عقد ثانی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کیجائے جیسا کہ قرآن مجید کا حکم ہے مگر انجیل مقدس کہتی ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے۔ فریقین کی ناموافقت سے معاشرت میں خواہ کیسی ہی خرابیاں پڑ جائیں انکا اخلاق کیسا ہی برباد ہو جائے۔ سوسائٹی کی حالت کیسی ہی ابتر ہو جائے مگر انکا اکٹھا رہنا لازم۔ اگر جدائی کے بعد کہیں کسی زوج نے عقد ثانی کر لیا تو وہ مرتکب فعل حرام سمجھا جائے گا!

۳۔ اس حکم کی دلیل اور حضرت مسیح کی زبانی اور اس کے نتائج

حکم کی سختی تو ظاہر ہے مگر اس کی دلیل جو حضرت عیسیٰ کی زبانی بیان کیجاتی ہے وہ بھی عجیب و غریب ہو۔ جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"اور وہ اور اس کی بیوی دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جدا نہ کرے" انجیل مرقس باب ۱۰

اس عبارت سے مفصلہ ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) عقد کے بعد زن و شوہر حقیقۃً ایک ہو جاتے ہیں دو نہیں رہتے۔

(۲) اگر ان میں جدائی ہوئی تو ایک جسم کٹ جائے گا۔ اور دونوں ٹکڑے (زن و مرد) بیکار ہو جائیں گے۔

(۳) یہ خصوصیت صرف عقد اول میں ہے۔

(۴) عقد اول میں زن و مرد کا جوڑا خدا خود ملاتا ہے اور وہ اپنے اختیار سے عقد نہیں کر سکتے۔

(۵) جدائی کے بعد اگر کوئی فریق عقد ثانی کرے تو یہ خدائی عقد نہ ہوگا بلکہ انسانی فعل سمجھا جائے گا۔

(۶) پہلا عقد خدا کا باندھا ہوا ہے اس لئے صحیح ہے۔

(۷) دوسرا عقد انسان کا فعل ہے اس لئے باطل ہے

(۸) پہلے عقد سے تنزلی اخلاق میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۹) اگر اس عقد سے تکلیفیں پیش آئیں تو بھی دم [illegible] چاہئیے۔ کیونکہ وہ [illegible]
کے ہاتھ کی باندھی ہوئی [illegible]

(۱۰) دوسرے عقد میں فریقین کے لئے کوئی خوبی نہیں کیونکہ وہ انسانی فعل اور
خلاف حکم خدا ہے [illegible]

مگر معاشرت خانہ داری کا روزانہ تجربہ ان نتائج کو صحیح تسلیم نہیں کرسکتا۔ لہذا یہ دلیل
ناقابل تسلیم ہے۔

مسیحی اقوام کا قرآن کیطرف میلان | یہی وجہ ہے کہ جب انجیلی حکم تعیل سے معاشرت میں طرح طرح کی خرابیاں محسوس ہونے لگیں تو مسیحی قوموں کو اس کو خیر باد کہکر طلاق اور عقد ثانی کے لئے تعلیم انجیل کے برخلاف قانون بنانا اور قرآنی حکم کے آگے سر جھکانا یعنی آنحضرت کی حکیمانہ تعلیم کو قولاً نہ سہی عملاً تسلیم کرنا پڑا بات یہ ہے کہ انسان فطرت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور جس نے ایسا کیا ہے اس کو کبھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا

مسیحی اقوام دین خدا (فطرت) کی مخالفت پر ایک مدت تک قائم رہیں۔ آخر سخت نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔ ع بادین خدا ہر کہ درافتاد برافتاد

صاحبان بصیرت دیکھیں کہ قرآن کیسی حکمت سے دنیا کو دعوت اسلام دے رہا ہے۔ اپنی صداقت اور افضلیت کا سکہ دلوں پر بٹھا رہا ہے اور اقوام عالم کو سرکار محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے در دولت کیطرف بلا رہا ہے۔ اسلام اپنی روحانی قوت سے دنیا میں پھیل رہا ہے۔ اور ایک دن آئے گا کہ اسلام ہی تمام دنیا کا مذہب ہو جائے گا اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله و لو کره المشرکون ۞

وہی (خدا) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرے اگرچہ مشرکین کو برا لگے۔ [illegible]

اخلاق محمدی کی جامعیت اور اخلاق عیسوی کے ساتھ اسکا موازنہ

میں نے آنحضرتؐ کی تعلیم اور اخلاق کی عظمت و فوقیت کو چند خاص مثالوں کے ذریعے ثابت کر دیا ہے جس کو کوئی صاحب فہم انکار نہیں کر سکتا۔ اب میں اس مطلب کو عمومی حیثیت سے ثابت کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ نبی عربیؐ کا اخلاق ہر پہلو سے افضل و اعلیٰ ہے۔

(الف) اخلاق کی بنیاد انسانی تعلقات پر ہے اور یہ تعلقات تین طرح کے ہوتے ہیں ہمارا ایک تعلق خالق کیساتھ۔ دوسرا تعلق اپنے نفس کے ساتھ اور تیسرا تعلق مخلوقات کیساتھ ہے۔ لہذا ہر انسان کے اخلاقی فرائض تین قسموں میں محدود ہو سکتے ہیں۔

(۱) وہ فرائض جن کا تعلق خدا سے ہے۔
(۲) وہ فرائض جن کا تعلق خود نفس انسان سے ہو
(۳) وہ فرائض جن کا تعلق دیگر مخلوقات سے ہے۔

(ب) اس مطلب کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کے ذمے تین قسم کے حقوق ہیں حقوق اللہ، حقوق النفس، حقوق المخلوقات۔ ان حقوق و فرائض کی بے شمار شاخیں ہیں جن کا باقاعدہ ادا کرنا ہی حسن اخلاق ہے۔ مختلف درجوں اور مختلف طبقوں کے لوگوں کے ساتھ جس قدر ہمارے تعلقات زیادہ ہونگے اُسی قدر زیادہ ہم کو وسعت اخلاق کی ضرورت ہوگی چونکہ ہمارے پیغمبر (صلعم) کے تعلقات نہایت وسیع تھے۔ اسی واسطے آپ کا آپؐ کا اخلاق بھی نہایت وسیع تھا۔ قرآن۔ حدیث اور سیرہ نبوی کے مطالعے سے یہ امر صاف ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ نے مختلف حالات میں مختلف موقعوں پر مختلف قسم کے اخلاقی فرائض کو ایسی خوبی سے ادا کیا ہے۔ جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

(ج) آنحضرتؐ کل انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے (دیکھو قرآن مجید سورہ سبا پ ۲۲) اور آپ کی کتاب تمام دنیا جہان کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی (دیکھو قرآن مجید سورہ

فرقان ۴۶) اور آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں (دیکھو قرآن مجید سورہ احزاب ۴۰)
ان حالات کے لحاظ سے یہ امر ضروری تھا کہ آپ کی تعلیم عام اور آپ کی کتاب جامع ہو
اور آپ کا اخلاق (جو در اصل قرآنی تعلیم کی عملی صورت ہے) اس قدر وسیع ہو کہ ہر قوم
ہر ملک، ہر حالت، ہر حیثیت، ہر درجہ، ہر طبقہ اور ہر زمانے کے لوگوں کی ہدایت کے
لئے عمدہ نمونہ ہو۔

(۴) اب ہم حضرت مسیحؑ کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ آپ تو
صرف ایک ہی قوم کے نبی تھے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا ہے کہ "میں اسرائیل کے گھرانے
کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا" (دیکھو انجیل متی باب ۱۵ آیۃ ۲۴)
اور جب آپ نے اپنے شاگردوں کو منادی کے لئے بھیجا۔ اس وقت بھی یہی ہدایت کی تھی
کہ صرف بنی اسرائیل کو ہدایت کرنا (دیکھو انجیل متی باب ۱۰ آیات ۵-۶) لہذا ضروری تھا کہ
آپ کی تعلیم اور ہدایات بھی مختص القوم۔ مختص الوقت اور مختص المقام ہوں۔ اور آپ کا
اخلاقی نمونہ بھی اسی قوم کی ضروریات اور حالات کے موافق ہو۔ جس کی ہدایت کے لئے
آپ ایک وقت خاص تک مامور تھے۔

۵۔ آنحضرتؐ کی زندگی کے چار دور اور ہر دور کی جداگانہ خصوصیات

ہم آنحضرتؐ کی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہر حصہ کی اخلاقی خصوصیتیں جداگانہ ہیں۔

(الف) ایک زمانہ وہ ہے کہ آنحضرتؐ فعلاً تبلیغ اسلام کرتے ہیں یعنی اپنے پسندیدہ عادات و اطوار
اور آداب و اخلاق کا بہت عمدہ نمونہ قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مگر زبان سے نہیں
کہتے کہ میں پیغمبر ہوں اور تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اس زمانے میں ہر فرد بشر
آپ کا مداح پایا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ اخلاق مجسم اور ہمہ صفت موصوف ہیں۔ اور تمام
ملک آپ کو صادق اور امین کے معزز اور ممتاز لقب سے مخاطب کرتا ہے۔ چالیس سال
کی عمر تک یہی کیفیت رہتی ہے۔

(ب) اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے اور آنحضرتؐ قولاً اور فعلاً دونوں طرح دعوت اسلام

دیتے ہیں۔ یعنی زبان سے بھی فرماتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہوں۔ اور آپ کا فعل بھی آپ

کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ قوم کی دینی و اخلاقی اصلاح میں ہمہ تن مشغول ہیں

اس لئے قوم آپ کی دشمن ہو جاتی ہے جو لوگ آپ کو ہمیشہ صادق اور امین سمجھتے رہے

وہی اب آپ کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو بڑی

بڑی تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ مگر آپ صبر وشکر کرتے۔ حلم، عفو درگذر اور رحم وکرم سے کام

لیتے ہیں۔ تبلیغ دین میں سعی بلیغ فرماتے ہیں۔ وعظ ونصیحت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے

یہ سخت آزمائش کا زمانہ ہے جو متواتر تیرہ سال تک قائم رہتا ہے۔ اور اسی زمانے

میں دشمن آپ کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔

(ج) اب تیسرا دور آتا ہے اور آنحضرتؐ ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مکہ معظمہ جیسے پیارے

وطن کو مجبوراً چھوڑتے ہیں اور مدینہ منورہ تشریف لیجاتے ہیں مگر دشمن اب بھی آرام

نہیں لینے دیتے۔ مدینہ منورہ پر فوج کشی کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کو حفاظت اسلام

کی غرض سے تلوار کے جواب میں تلوار اٹھانی پڑتی ہے اور بہت سی لڑائیاں

پیش آتی ہیں مگر ایسے سخت دشمنوں کے ساتھ بھی جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے

اور اسلام کو مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ آنحضرتؐ کا برتاؤ نہایت شریفانہ ہے اور

آپ کا اخلاقی نمونہ ایسا عمدہ ہے جس سے بہتر ایسے حالات میں کوئی شخص اور کوئی قوم

پیش نہیں کرسکتی ان مصائب کا سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک برابر جاری رہتا ہے۔

(د) اب آپؐ کی زندگی کا چوتھا اور آخری دور آتا ہے۔ مکہ فتح ہو جاتا ہے۔ دشمن جو متواتر

اکیس سال تک سخت سے سخت جسمانی اور روحانی تکالیف آپ کو اور تمام مسلمانوں

کو پہنچاتے رہے ہیں۔ سب کے سب مغلوب ہو چکے ہیں۔ اور معافی کے طالب اور

رحم کے ملتجی ہو کر آپ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ بجز چند آدمیوں کے جن کے جرائم

کبھی بھی ... معاف نہیں ہو سکتے تھے۔ سب کے ... محمد (جنکا مبارک لقب رحمۃ للعالمین ہے) رحمدلی کی ایسی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ جس کو دیکھ کر دنیا ... جاتی ہے۔ الغرض آخری حج سے فارغ ہونے کے بعد جبکہ اسلام کی تکمیل ہو گئی۔ آنحضرت اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف تشریف لیجاتے ہیں۔

مذکور کا نتیجہ اور آنحضرت کی فضیلت بہ نسبت ...

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا۔ آنحضرت کی روحانی زندگی کا نہایت ہی مختصر سا خاکہ ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے اپنی مبارک زندگی کے ہر ایک دور میں اس دور کے مناسب حال بہترین اخلاقی مثالیں دنیا کے سامنے پیش کیں مگر حضرت عیسیٰؑ کو ایسے مواقع پیش نہیں آئے۔ مثلاً

(۱) نہ کبھی یہودیوں سے آپ کا مقابلہ ہوا۔

(۲) نہ کبھی جنگ و جدال کی نوبت آئی۔

(۳) نہ کبھی آپ کے شاگردوں پر ایسے شدید ظلم ہوئے۔

(۴) نہ کبھی اتنی طولانی مدت (۲۱ سال) تک آپ نے دکھ پر دکھ اٹھائے۔

(۵) نہ آپ کے دشمن کبھی مغلوب ہوئے۔

(۶) نہ کبھی ہتھیار ڈال کر آپ سے رحم کے ملتجی ہوئے۔

لہذا ایسے مواقع کے مناسب حال آپ نے کوئی تعلیم نہیں دی اور نہ کوئی ایسا عملی اخلاق پیش کر سکے جس سے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف افراد اور مختلف اقوام کو ہدایت حاصل ہو سکے۔ آپ کے اس قسم کے اقوال کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا" محض وقتی اور عارضی ہدایات ہیں۔ جو ہر موقع پر اور ہر حالت میں مفید نہیں ہو سکتیں مگر خواجہ عالم فخر بنی آدم محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) نے اپنے قول اور فعل سے خلق کی دائمی ہدایت کا سامان مہیا کر دیا۔ فی الحقیقت قدرت نے یہ ذمہ داری ایسے ذی مرتبہ انسان کے لئے رکھی تھی جو تمام پیغمبروں کا سردار بن کر تمام عالم کی ہدایت کے لئے آنے والا تھا جس کی نسبت خود

حضرت عیسیٰ نے خبر دی تھی کہ "دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں" (انجیل یوحنا باب ۱۴ آیات ۳۰) اور وہ پیغمبر عربی و مکی و مدنی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

جواب اعتراضات | عیسائی اس باب میں طرح طرح کی بحثیں پیش کیا کرتے ہیں۔ مثلاً

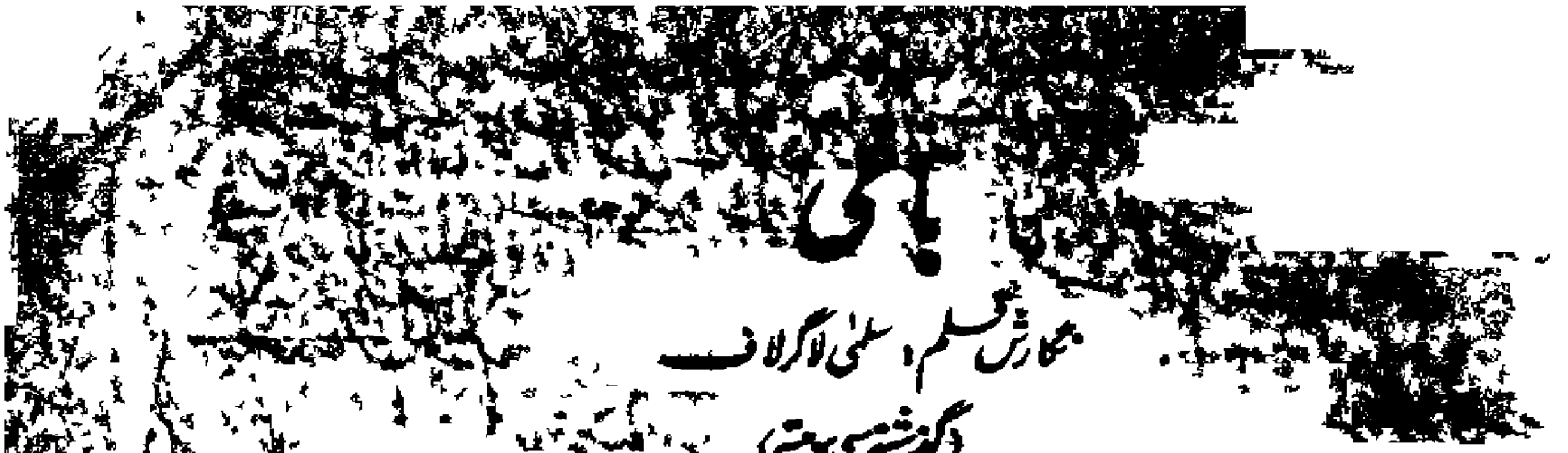
(۱) آنحضرت نے بہت سے نکاح کئے اور حضرت عیسیٰ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

(۲) آنحضرت نے مرد کو ایک وقت میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی [illegible] نے کبھی ایسی اجازت نہیں دی۔

(۳) آنحضرت نے اپنا دین جبر و تعدی سے پھیلایا اور حضرت عیسیٰ نے نرمی و اخلاق کر

(۴) آنحضرتؐ نے خونریزی کی مثال قائم کی اور حضرت عیسیٰ نے صلح و امن کی۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس مقالہ میں اخلاق کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اصولاً اور ضمناً اس قسم کے اعتراضات کا جواب بھی آگیا ہے۔ اگر مفصل دیکھنا ہو تو بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔



باغی

نگارشِ قلم، سلمیٰ لاگراف

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایکدن جبکہ دھوپ نکلی ہوئی تھی، دونوں باغی انہیں تالابوں میں سے ایک کے کنارے مچھلی کا شکار کھیلنے آئے۔ جھاڑیوں میں سے گزر کر وہ ایک اونچی چٹان پر بیٹھ گئے اور وہاں انہوں نے اپنے جال پھینکے۔ وہ اُن بڑی بڑی مچھلیوں کو پکڑنا چاہتے تھے جن کی آجکل ان جھیلوں میں بہت کثرت تھی اور جو پانی کے اوپر نیچے تیرتی اور کھیلتی پھر رہی تھیں۔ دونوں باغی دشت وجبل میں عرصہ دراز تک رہنے سے بالکل "فرزندانِ فطرت" بن گئے تھے۔ "تہا آلی سلطنت" کے ماحول سے اُنکی روحوں نے پوری وابستگی اور ہم آہنگی پیدا کرلی تھی۔ شمس وقمر کے طلوع وغروب کے ساتھ اُن میں انبساط اور انقباض پیدا ہوتا تھا، اور موسم کے تغیرات کے اشاروں پر انکے قلوب حرکت کرتے تھے! جس کنج میں وہ اسوقت بیٹھے ہوئے تھے وہ ایک ایسی دلکش اور نظر فریب جگہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی نے اس کو "سحر بند" کردیا ہے! اس وقت وہ بیرونی دنیا میں بالکل منقطع تھے۔ جھاڑیوں اور پودوں میں نرم ہوا کی جنبش سے ایک ترنم ریز موسیقی پیدا تھی۔ "پتوں کی تالیوں" اور "پھولوں کے جھولا جھولنے" کا عجیب سماں تھا! وہ دونوں اپنے پوستینوں میں ملبوس کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی صحرائی پوشش اردگرد کے پتھروں میں اپنی ہم رنگی کی وجہ سے بالکل وصل ہوئی جاتی تھی! دو سنگین مجسموں کی طرح وہ مقابل کناروں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے! سامنے تالاب کے پانی میں قوس قزح کی ہفت الوانی کے مشابہ رنگا رنگ مچھلیاں تیرتی پھرتی تھیں شکاریوں کی شستیں پانی پر پڑی ہوئی تھیں کہ اُن میں یکبارگی ایک جنبش پیدا ہوئی۔ یہ بہت معنی

نیز اور امید افزا علامت تھی لیکن آخرکار وہ انکا ایک فریب نظر ثابت ہوئی۔ ایک بڑا آبی جانور پاس ہی پڑا ہوا تھا۔ جس کو انہوں نے نظر انداز کر دیا تھا، چنانچہ کانٹوں کی یہ حرکت اس تموج کا نتیجہ تھی جو یہ جانور اپنے بدن کی نقل و حرکت سے پیدا کر رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ ہٹ گیا تو کشتیں بدستور ساکن ہوگئیں۔

موقع بڑا ہی دلفریب اور روح پرور تھا اور وہ دونوں اس منظر کی باصرہ نوازی سے مسحور و محظوظ ہو رہے تھے۔ انکو اس بہشتی کنج میں طرح طرح کی صورتیں نظر آتی تھیں۔ جن کی تشریح و تعبیر وہ خود بھی ایک دوسرے سے کرنے سے قاصر تھے مچھلی کا شکار تو برائے نام ہی ہوا، کچھ سارا وقت اس خیالستان کی تصاویر کے دیکھنے میں گزر گیا

اسی اثنا میں یکبارگی کسی کشتی کے پتوار کی آواز جھاڑی کے پیچھے سے سنائی دی دونوں شکاری اپنی بیداری کی نیند سے چونک اٹھے۔ چند لمحوں میں کشتی نظر آئی یہ ایک درخت کے تنے میں کا ٹکر بنائی گئی تھی۔ اس کو ایسے پتواروں سے حرکت دیا رہی تھی جو چمچوں سے زیادہ موٹے نہ تھے۔ کشتی کی راکب ایک نوخیز لڑکی تھی جو پانی میں ادھر ادھر کنول توڑ توڑ کر جمع کر رہی تھی۔ اس کے بال گھونگر والے سیاہ رنگ کے تھے۔ آنکھیں بھی سرگیں تھیں، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس لڑکی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ رخساروں پر خون کی سرخی کا برائے نام شائبہ تھا۔ لبہائے لعلین بھی سفید ہو رہے تھے۔ وہ سفید پوشاک زیب تن کئے ہوئے تھی۔ کمر میں ایک چرمی پیٹی لگی ہوئی تھی جس کا قفل سونے کا تھا۔ اس کا سایا آسمانی تھا جس میں چوڑی سرخ رنگ کی گوٹ لگی ہوئی تھی وہ کشتی چلاتی ہوئی پاس سے گذر گئی اور ان باغیوں پر مطلق اس کی نظر نہ پڑی۔ یہ لوگ بھی بالکل دم بخود بیٹھے رہتے انکو اپنے دیکھ لئے جانے کا اتنا خوف نہ تھا جتنی یہ بات موجب قلق تھی کہ نوجوان لڑکی ان عجیب الخلقت آدمیوں کو اس بیت کذائی سے یہاں بیٹھا دیکھکر ڈر جائے گی۔ جب کشتی چلی گئی تو یہ پتھر کے بت پھر آدمی بن گئے اور ایک دوسرے سے یوں ہمکلام ہونے

"ایسی سفید تھی جیسے کہ یہ [illegible] کنول کے پھول ! " ایک [illegible] میں ایسی کالی کالی تھیں جیسا صنوبر کی جڑوں میں ٹھہرا ہوا وہ پانی ! "

[illegible] کی کشتی رانی ۔ شغل گل چینی، خصوصی [illegible] ہیئت، اُس کی بیخودی و خود فراموشی سے دونوں صحرائی ایسے محظوظ ہوئے کہ خوب قہقہہ مار کر ہنسے ۔ ایسا بلند جناتی قہقہہ جس سے [illegible] گونج اٹھے اور ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پر زور ہوائی تموج سے دیو ہیکل صنوبر کے درخت اکھڑ کر گر پڑیں گے ۔

"[illegible] خیال میں کیا یہ کوئی حسین لڑکی تھی ؟ " برگ نے کہا ۔

"میں [illegible] کے ساتھ کہہ نہیں سکتا ، وہ گذر بھی جلدی سے گئی ، غالباً تھی تو خوبصورت" تارو نے جواب دیا ۔

"شاید تم اُس کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے " برگ نے کہا ، "کہیں یہ وہ عجیب الخلقت مخلوق تو نہ تھی جس کا نصف بدن مچھلی کا اور نصف انسان کا سا ہوتا ہے ؟ ! "

[illegible] کے ایک ناقابل فہم احساس نے انہیں پھر گدگدایا اور وہ دوبارہ ہنس پڑے !

... .

تارو نے اپنے بچپن کے زمانے میں ایک آدمی کی لاش کو دیکھا تھا جو سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھی ۔ یہ شخص ڈوب کر مرا تھا ۔ یہ منظر کچھ ایسا ہیبت ناک تھا کہ اُس کا خوف ہمیشہ کے لئے تارو کے دل میں جاگزیں ہو گیا ۔ خاصکر راتوں میں وہ بلا ناغہ کابوسی خواب دیکھا کرتا تھا جن میں ہزار ہا مردے اس کو سمندر کی لہروں سے نکلتے ہوئے نظر آتے تھے جن سے ایک ایک جزیرہ اور ایک ایک چٹان پٹ جاتی تھی ، لاشوں کا یہ انبار خود اس کے قدموں میں بھی جبکہ وہ ساحل بحر پر کھڑا ہوتا تھا ، جمع ہو جاتا تھا ، اور عالم خواب کے یہ دہشت ناک تماشے اس کو شب کی طرح خوفزدہ کرتے تھے ۔

تارو کے یہی تصورات و توہمات اس وقت بحالت بیداری عود کر آئے ! اور آئندہ سے اُس

کے خوابوں کے ... اس پُراسرار صحرائی لڑکی کی سیر دریا کی تصویر کا اور اضافہ ہو گیا! کوہستانی جنوں کی مختلف خوابگاہوں میں اس کی اس لڑکی سے ملاقاتیں ہوئیں جہاں اس کو بغور دیکھنے ... سے فیصلہ کیا کہ واقعی وہ حسین ہے! وہ یہ خواب بھی دیکھا کرتا تھا کہ عین جھیل کے ... کھڑے ہوئے ایک صنوبر کی جڑوں پر وہ بیٹھا ہوا ہے جہاں پانی کی لہر اس کو جھولا جھلا رہی ہے اور اسی حالت میں اس کو یہ لڑکی بھی نظر آتی ہے جو ایک ننھے سے جزیرے پر ایستادہ ہے اور ٹارڈ کو دیکھ کر مسکرا رہی ہے! ایک رات کی خواب میں تو بالکل "معراج" ہی ہو گئی یعنی اُس نے دیکھا کہ لڑکی نے اُسکا بوسہ لے لیا! مگر "رویائے صادقہ" یعنی صبح بھی ہو گئی تھی اور برگ پُرشور و کرخت آوازوں میں ٹارڈ کو جگا رہا تھا۔ فریب خوردہ خواب نے اپنی آنکھیں غنودگی کے عالم میں ارادۃً خوب ہی بند کر لیں تاکہ اس لذت انگیز خواب میں جہاں تک ممکن ہو طوالت پیدا کرے! مگر صد حیف کہ آخر کار زندگی اس سعی بے حاصل یہ کو اُسے ترک ہی کرنا پڑا۔

یہ عین لطف میں ہم کو جگا دیا کس نے   ابھی تو خواب میں اُنکو گلے لگائے تھے!

ٹارڈ اُٹھ بیٹھا مگر دن بھر اُس پر ایک سرشاری اور وارفتگی کا عالم رہا لڑکی کے تصور میں وہ عملاً اب بھی محو خواب تھا! شام کے قریب اُس کے دل میں ایک خاص خیال آیا اور اُس نے برگ سے پوچھا:

"آپ اُس کا نام جانتے ہیں؟"

برگ نے تیز نگاہوں سے ٹارڈ کی طرف دیکھا۔ اور پھر فوراً بولا: "ہاں بہتر ہے کہ تم کو اُسکا نام جلد بتا دیا جائے، اُسکا نام آن ہے، یہ ہماری رشتہ دار ہوتی ہے!"

معاً ٹارڈ کو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی لڑکی ہے جو بالواسطہ برگ کی جلاوطنی اور مہاجرت کی ذمہ دار ہے! پھر اس نے فوراً اپنے حافظے کے ذخیرہ کا جائزہ لینا شروع کیا اور جو کچھ چرچے اس لڑکی آن کے متعلق وہ سنتا رہا تھا یک وقت سامنے آ گئے۔

آن ایک شریف کسان کی چہیتی لڑکی تھی اُس کی ماں مر چکی تھی اور والدہ کی وفات کے بعد وہ اپنے باپ کے گھر کی حکمرانِ مطلق تھی۔ آزادی و خود مختاری کی یہ زندگی اُس کے مذاق کا عین مطابق تھا۔ چنانچہ اس نے عہد کر لیا تھا کہ کبھی شادی کرے گی برگ اور آن رشتے کے بھائی بہن ہوتے تھے اور تمام آبادی میں معاملہ "افسانہ دزم و انجمن" تھا کہ برگ کو آن اور اس کی سہیلیوں سے ملنے جلنے میں خاص دلچسپی ہے اور بمشکل وہ اپنے مکان پر موجود رہتا ہے آخر میلاد مسیح کی سالانہ ضیافت کا موقع آیا جس میں منجملہ دیگر مہمانوں کے برگ کی بیوی نے ایک راہب کو بھی مدعو کیا جس کے بلانے کی خاص غرض یہ تھی کہ اپنے خاوند سے اس کی زبانی اپنی سفارش کرائے اور اس کو جتائے کہ یہ کس قدر نازیبا بات ہے کہ برگ اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک دوسری دوشیزہ پر نظر رکھتا ہے!

برگ اس راہب سے بہت نفرت کرتا تھا، برگ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے احساسات کا بھی اس شخص کے بارے میں یہی حال تھا۔ وہ ایک کریہہ المنظر آدمی تھا اگرچہ بلند بالا اور تنومند تھا، اُسکا قریباً گنجا سر، کھوپڑی کے گرداگرد کا بالوں کا حلقہ، ابرو، بدن کے بال، ساری جلد، بدن یہانتک کہ اُس کا لباس بھی سب سفید ہی سفید تھے۔ ان سب چیزوں نے اسے بہت بدہیئت بنا دیا تھا۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ راہب ایک بیباک اور بے لاگ آدمی تھا اُس نے برگ کو نصیحت کرنی چاہی اور بہت پر زور قسم کی سرزنش۔ یہ سمجھکر کہ اگر علانیہ اس فعل پر تنبیہہ کیجائے تو زیادہ موثر ہو گی۔ اُس نے وہیں کھڑے ہوکر سارے جلسہ سے اس موضوع پر خطاب کرنا شروع کر دیا۔

"حضرات! لوگ کوئل کو سب سے شریر پرندہ" کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے بچوں کو دوسری چڑیوں کے آشیانوں میں فریب کاری سے پرورش کراتی ہے، لیکن اس مجمع میں اسی طور طریق کا ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس نے اپنے اہل و عیال کو اسی طرح توکل پر چھوڑ دیا

ہے اور خود اپنی ضیافت طبع کا سامان، ایک غیر محرم عورت کی ہم نشینی سے حاصل کرتا ہے! میں اس کو سب سے زیادہ شریر انسان کے خطاب سے پکارنا چاہتا ہوں!"

برگ ساکت و صامت بیٹھا رہا لیکن آن لملاکرا ٹھ کھڑی ہوئی! اس نے کہا: "برگ! اس تقریر کے اشارات الیہ تم ہو اور میں! لیکن خیر میں تو یہاں بے یار و مددگار رہوں، میرا باپ حاضر نہیں ہے جو اس وقت میرے نام و ناموس کی حمایت کرتا، مگر سچ یہ ہے کہ میری ایسی ذلت آج تک نہیں کی گئی تھی" یہ کہکر وہ چل کھڑی ہوئی! برگ اس کے پیچھے دوڑا!

"تم وہیں رہو اور میرے درپے نہ ہو، میں نے طے کر لیا ہے کہ آئندہ سے تم کو نہ دیکھونگی"

لیکن بہرحال برگ نے لڑکی کو برآمدہ میں جا پکڑا اور اس سے کہا:

تم ذرا ٹھہرو تو، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہاری عزت و حرمت کو قائم رکھنے کے لئے مجھکو کیا کرنا چاہئے؟"

"یہ تم خود بھی سمجھ سکتے ہو کہ اس وقت تمہارا کیا فرض ہے!" ان نے قہر آلود نظروں اور خون آشام آنکھوں کے ساتھ جواب دیا۔

برگ وہیں سے پلٹا اور ہال میں آکر راہب کو قتل کر دیا!!

... .

یہ ساری گذشتہ داستان ایک لمعہ برق کی طرح ہارڈ کے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ برگ اور ہارڈ دونوں کے دماغ تھوڑی دیر کے لئے ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہوگئے۔ اس کے بعد برگ نے کہا:۔

"غالباً جس وقت وہ راہب میرا چاقو کھا کر گرا ہے تم وہاں موجود تھے اور اس واردات کے وقت اُن کو بھی تم نے دیکھا ہوگا۔ میری بیوی نے اپنے بچوں کو اپنے گرد سمیٹ لیا تھا اور ان کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے ایک ایک بچے سے اُن کو پہنچوایا تھا، گویا وہ چاہتی تھی کہ جس عورت کی بدولت اس کا باپ قاتل بنا اس کی صورت سے آشنا ہو جائیں! اور ہمیشہ

کر یاد رکھیں! مگر آن کمال بے پروائی اور وقار کے ساتھ وہاں کھڑی رہی اور [illegible]
کے سراپا سے وہ شان جمال و جلال ہویدا تھی کہ لوگ دیکھ کر مرعوب ہو گئے! اس نے مجھ سے
التجا کی کہ میں فوراً جنگل کو بھاگ جاؤں، لیکن اس آوارہ گردی کی زندگی میں قزاقی کے پیشہ
پر نہ اتر آؤں، البتہ اپنا دہ چاقو اپنے پاس ضرور رکھوں اور اگر کبھی اسی قسم کے جائز انتقام کا
موقع آئے تو اس کے استعمال کرنے سے کبھی نہ چوکوں! [illegible]

[illegible] کے اس بہادرانہ اور وفاکیشانہ عمل نے اس کی فطرت میں غالباً ایک رفعت پیدا
کر دی! [illegible] مارڈ نے کہا:

مگر برگ نے "صدیق ولیز" کو مارڈ ایسی حقیر ہستی کے سامنے دہرانے کے بعد پھر ایک
بکلی اور بدمزگی محسوس کی! مارڈ ایک لامذہب وحشی تھا بلکہ اس کے دل و دماغ کی حالت اس
دور سے بھی فروتر تھی! وہ جائز و ناجائز اور حلال و حرام میں کوئی تمیز نہ جانتا تھا، وہ اس کے
[illegible] کے لئے کسی اخلاقی ذمہ داری کا احساس نہ رکھتا تھا، جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کے لئے
گذشتہ افعال پر کسی ندامت کا خیال ایک بے معنی سی بات تھی! اگرچہ وہ خدا سے واقف تھا،
[illegible] سے بھی بے خبر نہ تھا، اولیا و بزرگان دین سے بھی قدرے آشنا تھا لیکن محض یہ نام ہی اس کے
گوش زد ہوئے تھے اور اس کے آگے وہ کورا تھا۔ دراصل اپنے وطن یعنی جزائر شیرن کے بھوت
[illegible] کے خدا تھے اس کی ماں ایک پکی جادوگرنی تھی اور اس نے مارڈ کو مردوں کی ارواح ہی
پر ایمان لانے کی تلقین کی تھی۔

برگ سے ایک ناپسندیدہ حرکت سرزد ہوئی تھی لیکن مارڈ اس کے عیب و صواب کو
[illegible] نا اہل تھا برگ نے اس کندۂ ناتراش کی آنکھیں کھولیں اور خدا کے قہر و جلال
[illegible] اس کے دماغ کو آشنا کرنا چاہا۔ اس نے بتایا کہ خدا ایک قادر مطلق ہستی، ایک احکم الحاکمین ذات
[illegible] اعمال کے مرتکبین اور سیاہ کار گنہگاروں کو وہ جہنم کے دائمی عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔
پھر برگ نے اس کو حضرت مسیح اور ان کی مقدس والدہ کنواری مریم کی محبت اور عظمت کی تبلیغ

کی، اور اُن تمام اولیا انبیا کا ذکر کیا جو خدائے ذوالجلال کے تخت کبریائی کے سامنے [illegible] کی بخشش کے لئے شفاعت کرتے رہتے ہیں۔ اس نے تمام آداب و مناسک بتائے جو نوع بشر کو خدا کی آتش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تعلیم کئے گئے ہیں اس نے مقامات مقدسہ کو جوق جوق جانیوالے اُن حجاج کا ذکر کیا جو ہمیشہ وہاں کی زیارت سے مشرف ہوتے رہتے ہیں۔ اُس نے اُن استغفار کرنیوالوں کے بھی تذکرے سنائے جو اشک ندامت سے اپنے دامن کو تر کرتے رہتے ہیں اور اُن پاکباز اور خدا پرست بزرگوں کا بھی ذکر خیر کیا جنہوں نے اپنے تقوے کے سلسلے میں ساری لذائذ دنیوی کو خیرباد کہدیا ہے۔

ثارڈ کا چہرہ ان تنبیہوں اور وعیدوں سے زرد ہوا جاتا تھا۔ خوف و خشیت کی اس حالت میں اس کو اُسکی خیالی تصویروں کے مناظر پھر نظر آنے لگے۔ برگ اپنے وعظ کو اب ختم کر دیتا لیکن وہ اپنے خیالات کی رو میں بے اختیار بہا چلا جارہا تھا۔ اسی ذکر و فکر میں رات کا سیاہ پردہ پڑ گیا اور وہ اس تغیر وقت سے قریبًا بے خبر رہے۔ جنگل کی کالی رات تھی جس کے ہولناک سکوت کو اُلو کی عفریتی بولی وقتًا فوقتًا توڑتی رہتی تھی! اس پرہیبت فضا میں اُنکو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ خدا بالکل اُنکے قریب آگیا ہے، اُس کے تخت جلال نے ستاروں کو ماند کر دیا ہے، اور آسمان کے انتقامی فرشتے کوہستان کی بلندیوں پر نازل ہورہے ہیں! پہاڑ کے میدانی دامن میں بھی نشیب کے رہنے والوں کی آتشکاہوں کے شعلے اوپر کی طرف لپکتے ہیں اور مجرموں کی اس تنہا جائے پناہ کو بھی جلا ڈالنا چاہتے ہیں!!

... .

خزاں آئی اور اس کے ساتھ طوفان۔ ثارڈ تنہا جنگل میں گیا تاکہ شکار کے جالوں کو ٹھیک کرکے پھیلا دے۔ برگ گھر ہی پر رہا اور اپنے لباس وغیرہ کی مرمت کرتا رہا۔ ثارڈ کا راستہ ایک سلامی دار پہاڑی پر سے تھا جس پر خزاں زدہ درختوں کی پتیوں کا فرش تھا جو ہوا کی گردش سے ایک مدور حلقے میں چکر کھا رہی تھیں۔ بار بار ثارڈ کو یہ واہمہ گزرتا تھا کہ کوئی اُس کے پیچھے آرہا ہے

وہ کئی دفعہ مڑا لیکن جب دیکھا کہ طرف ہوا ہے اور کچھ نہیں، تو پھر آگے بڑھا۔ جب پتے در پتے کھٹکا ہوتا تو بعض دفعہ وہ اکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور ڈرانے والے خس و خاشاک کو گھونسہ تاکر ڈالتا! لیکن اس کی وہمی صورتوں نے اسکا تعاقب نہ چھوڑا۔ چنانچہ اُس نے دیکھا کہ ایک اژدہا اُس کے پیچھے جھپٹتا ہوا آرہا ہے، اور اُسی کے پہلو میں ایک بلند قد خونخوار بھیڑیا ہے جو اس موقع کا منتظر ہے کہ ذرا ٹارڈ کی آنکھ جھپکے اور وہ تڑپ کر اُسکی گردن دبائے! ٹارڈ نے جلدی جلدی قدم اٹھانا شروع کیا لیکن ساتھ ہی ان موذیوں نے بھی اپنی رفتار تیز کی! جب اُس نے دیکھا کہ وہ بالکل اُس کے سر پر آگئے ہیں۔ تو وہ کھڑا ہو گیا اور پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا، لیکن وہاں [illegible] خواب و خیال کے اور کیا تھا؟ آخر وہ سراپا ایک تیر پر بیٹھ گیا اور اس مسلسل دہشت اور تھکاوٹ سے تھوڑا آرام لینا چاہا۔ درختوں کی پتیاں ہوا کی جنبش سے اب بھی اُسی [illegible] میں مصروفِ رقص تھیں۔ سارے جنگل پر خزاں کی ہمہ گیری سے ایک عالم طاری تھا۔ سوکھے پتوں اور خشک گھاس کی جڑوں کے انبار در انبار تھے۔

"تم سب گناہگار ہو بھی تنہا!" ٹارڈ نے خزاں کی تاراج شدہ اس ساری مخلوق کو خطاب کر کے کہا "اور ہم انسان بھی سب گناہگار ہیں! کوئی شے خدا کی نظر میں معصوم نہیں کوئی وجود اتنی پاکی نہیں رکھتا جو آسمانی معیار کو پورا کر سکے! تم بھی خدا کے غصے کی آگ میں جلا دی گئی ہو!"

ٹارڈ آگے بڑھا۔ اگرچہ بظاہر کچھ معلوم نہ ہوتا تھا لیکن سارا جنگل اس کے سامعہ کو ایک طوفانی سمندر کی طرح موجیں مارتا سنائی دیتا تھا۔ اس نے اب کچھ ایسی آوازیں سنیں جن سے اس سے قبل اس کے کان کبھی آشنا نہ ہوئے تھے! تمام جنگل آوازوں سے پرشور تھا! کبھی کچھ سرگوشیاں سی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی ایک خفیف دردخیز نالہ سنائی دیتا تھا، کبھی ایک زبردست کھڑکھڑاہٹ ہوتی تھی اور کبھی ایک قہر آلود گرج! کبھی قہقہے تھے اور کبھی کراہنے کی آوازیں! سینکڑوں ہزاروں گلے آوازیں پیدا کرتے معلوم ہوتے تھے! یہ تھا سب [illegible]

ناقابلِ فہم شور و شر ٹارڈ کو دیوانہ بنائے دیتا تھا! اس کا ہر بن مو کانپنے لگا! غیر مرئی تعاقب کرنے والے
کی ہنگامہ خیزی سے سارے جنگل میں ایک غوغا بپا تھا! شاخوں کا ٹوٹنا، آدمیوں کے قدموں
کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکار اور انکی وحشیانہ اور خونخوارانہ چیخ پکار سے ٹارڈ کی روح
[illegible] جاتی تھی!

صرف ایک طوفان ہی نہ تھا جو ٹارڈ کے گرد قیامت برپا کر رہا تھا بلکہ ایک شے اور بھی تھی
یعنی ایسی عجیب و غریب آوازیں اس کے گوش زد ہو رہی تھیں جن کی تعبیر اس کے لئے بالکل
ناممکن تھی اور یہ بات اس کی دہشت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اس نے اس سے قبل بڑے
بڑے محشر ساماں طوفان دیکھے تھے، لیکن اس نے کبھی باد صرصر کو اس طرح سینکڑوں تاروں
اور پردوں پر ساز نوازی کرتے نہ سنا تھا! ہر شجر اپنے برگ و بار میں ایک زبان تکلم رکھتا تھا۔
ہر وادی ایک خاص نغمہ سے ترنم ریز تھی۔ اور مختلف آوازیں اور شور، پہاڑ کی سنگین دیواروں سے
ٹکرا ٹکرا کر اپنی صدائے بازگشت الگ پیدا کر رہے تھے! بیرونی دنیا کے اس شورستان نے ٹارڈ
کے دماغ کے اندر بھی ایک سخت تلاطم پیدا کر دیا تھا!

صحرا کی تاریکی اور تنہائی میں اس کو ہمیشہ ڈر لگا کرتا تھا۔ وہ صاف و شفاف سطح بحر اور
کوہستان کی برہنہ چوٹیوں سے ایک محبت اور عقیدت رکھتا تھا۔ ایسی فضا میں اس کو بھوتوں
اور روحوں کے سائے ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اس وقت اس کے تخیل نے محسوس کیا کہ شورش آواز اور طوفان تلاطم کی اس تمام
ہنگامہ آرائی میں خود خدا اپنی جلالی گفتگو کر رہا ہے۔ وہی خدائے منتقم اور مالک یوم الحساب
جس کی ذات و صفات کا تھوڑے دن پیشتر رگ نے اس کے دل و دماغ کو تعارف کرایا
تھا یقیناً خدا ہی اس کے تعاقب میں ہے اور گناہ اس کا یہ ہے کہ وہ [illegible] مکار
کا ہمدم و دمساز ہے۔ شاید خدائے قہار کی مرضی اس امر کی تقاضا کر رہی ہے کہ وہ ایک
مقدس راہب کے قاتل کی رفاقت کو ترک کر دے بلکہ تنہا اصلی ملزم ہی اس کے عتاب کا

چنانچہ ٹارڈ بلند آواز سے اس معنی خیز طوفان سے خطاب کرکے گفتگو کرنے لگا۔ اُس نے خداسے عرض کی کہ وہ اس کے منشا کی تعمیل کرنے کے لئے تیار ہے لیکن مَیں کے میدان میں وہ اپنے کو بہت معذور پا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ "میں نے بارہا یہ جرات کرنی چاہی کہ کابرگ کو تنبیہ کروں کہ وہ اپنے خدا سے اپنا معاملہ صاف کرے۔ لیکن مناسب الفاظ کی تلاش میں میری زبان پیچ و تاب کھا کے رہ گئی اور مجھ پر ایک اضطراب و انتشار نے غلبہ کرلیا۔ جب سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ دنیا پر ایک خدائے عادل کی حکومت ہے اُس وقت سے میں سمجھ چکا ہوں کہ اس برگ کی خیر نہیں۔ میں نے اپنے اس محبوب دوست کے بُرے حشر کو یاد کرکرکے ساری ساری راتیں نالہ و فریاد کرنے میں گزار دی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہیں جاکر چھپے خدائے علیم و خبیر کی نظر سے کوئی جائے پناہ اُس کو پناہ نہیں دے سکتی۔ لیکن مجھ میں اُس کے سامنے تاب گفتگو نہیں۔ اس کی محبت میری زبان کو گونگ کردیتی ہے۔ پس اے خدائے رحیم مجھکو اس فریضہ سے بری کردے کہ اس معاملہ میں میں اپنی زبان کو اُس کی اصلاح حال کی دعوت کے لئے کھولوں۔ اس حقیر و ناچیز سے یہ عزم و ہمت قطعاً ناممکن ہے۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ میدان کی پست سطح بلند ہوکر کوہستان کی چوٹی تک پہنچ سکے؟!"

ٹارڈ اتنا کہکر خاموش ہوگیا، ساتھ ہی طوفان پر بھی جس میں خدا کی زبان گویا تھی ایک عالم خموشی طاری ہوگیا۔ ہوا ایکبارگی ساکن ہوگئی اور فی الفور آفتاب نکل آیا! ادھر کشتی کے تپواروں کی آواز آنے لگی، اور جھاڑیوں میں سے ایک ملائم سرسراہٹ سنائی دی؛ لطیف و شیریں آوازوں نے پیدا ہوکر بیاری اُن کی یاد کو تازہ کردیا!

اب طوفان پھر شروع ہوا اور اب کی دفعہ تازہ شدت سے ٹارڈ نے قدموں کی آوازیں اپنے عقب میں سنیں۔ اُسکا دل سینہ میں تڑپنے لگا! اس مرتبہ اس کو قطعاً ہمت نہ ہوئی

کو پیچھے مڑکر دیکھے کیونکہ اس کو از روئے یقین محسوس ہونے لگا کہ خود وہ شہید یعنی سفید پوش راہب ہی اُس کے تعاقب میں ہے! وہ برگ کے پاس کے ایوان ضیافت سے آرہا ہے، پیشانی پر تبر کا زخم ہے اور سارا بدن خون میں چور رنگ ہے! اور ٹارڈ کو یہ آواز سنائی دی کہ "قاتل کا پتہ بتا دو، اس کو حوالہ کر دو، اور اپنی روح کو بچا لو!"

ٹارڈ بھاگ کھڑا ہوا! اب دہشت وہیبت کی انتہا نہ رہی تھی۔ لیکن اُس نے اپنے پیچھے ایک خوفناک تعاقب دیکھا خدائے ذوالجلال کی آواز مصروف تنبیہہ تھی، اور مجرم کی حوالگی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ ٹارڈ کو اپنی اعانتِ مجرمانہ کی سنگین حقیقت بڑی شدت وحشت سے محسوس ہونے لگی۔ کیوں نہ ہو! ایک معصوم بندۂ خدا قتل کیا گیا تھا۔ کلیسا کے ایک مقدس خادم کے فولادسے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے! اور پھر غضب یہ کہ یہ جانستان قاتل زندہ سلامت پھر رہا تھا اور ہنوز اپنے گناہ کی پاداش کو نہ پہنچا تھا۔ وہ آفتاب کی روشنی، کرۂ باد کی ہوا، رہین کے باغوں کے پھلوں، ان ساری نعمتوں سے برابر متمتع ہو رہا تھا حالانکہ ناکردہ گناہ راہب خاک و خون میں تڑپا دیا گیا تھا! آخر ٹارڈ کے قدم رُک گئے، اس کی مٹھیاں سختی سے بند ہو گئیں، اور وہ ایک ایسی آواز سے چیخ اٹھا جس میں خوف اور دھمکی کا لہجہ ملا ہوا تھا۔ اور ایک لمحہ ٹھہر کر وہ پھر سر پر پاؤں رکھکر فرار ہوا اور آخر کار خوفناک جنگل کی اُس وادی ہلاکت سے نکل گیا!

جب ٹارڈ اپنے غار میں واپس پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ برگ پتھر کی میز پر بیٹھا ہوا اپنا کپڑا سی رہا ہے۔ آگ کی روشنی دھندلی ہو رہی تھی اور برگ کو سوئی کے اس کام میں دقت محسوس رہی تھی۔ برگ کو دیکھکر ٹارڈ کا سینہ رحم سے لبریز ہو گیا۔ یہ دیو ہیکل اب اس کو ایک حقیر، ناشاد، اور بدانجام ہستی معلوم ہوتا تھا!

"کیوں، کیسے حال ہیں؟ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں؟ یا کہیں ڈر گئے ہو؟" برگ نے پوچھا۔

پہلی دفعہ مارڈ نے اپنے روحانی دغدغہ کا اظہار کیا، اُس نے کہا :-
"آج جنگل میں میں نے عجیب ماجرے دیکھے ہیں، روحیں دیکھیں، اُنکے آوازیں سنے اور اُس سفید راہب کو دیکھا!"

"کیا کہہ رہا ہے؟ لڑکے!"

"جی نہیں! انہوں نے سارے راستے میرا تعاقب کیا ہے، اور شوروغوغا تکلم ونغمہ سے قدم قدم پر مجھکو پریشان کیا ہے۔ میں بار بار اپنی جان لیکر بھاگا لیکن وہ ایک بلائے مبرم کی طرح ہر دم میرے سر پر سوار رہیں، میرے پاس کیا چارہ تھا؟"

"کچھ پاگل ہوگئے ہو آج؟!" برگ بولا۔

مارڈ اب بے دھڑک ہوکر بولا، اور اُس نے مطلق اس بات کی پروا نہ کی کہ کیا لفظ اُس کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ اسکا تکلف وحجاب سب جاتا رہا اور اس کی تقریر میں خود بخود روانی آگئی۔ اس نے کہا:

"سنئے! مجھکو کوئی فریب حواس نہیں ہوا ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا کچھ خواب اور افسانہ نہیں تھا روحیں فی الواقع موجود تھیں اور وہ سب اُس راہب کی ہم رنگ وہم لباس تھیں! ان سب کے کپڑے بھی خون سے داغدار تھے۔ اور اگرچہ انہوں نے اپنے سروں کے ساتھ گھونگھٹ سے کر رکھے تھے لیکن پھر بھی ہر ایک کی پیشانی پر سرخ زخم نمایاں تھا! تبر کا یہ زخم ایسا ہویدا اور کھلا ایسا فراخ منہ رکھتا تھا کہ کسی پردے کے پیچھے چھپائے چھپتا نظر نہ آتا تھا۔

برگ زرد پڑگیا، اور کچھ سوچنے لگا!

مارڈ - اُس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا "مقدس اولیاسی اس بات کو بہتر جانتے ہیں کہ تم کو یہ زخم تبر کے زخم کیوں نظر آئے! میں نے تو راہب کو چاقو سے مارا تھا!"

مارڈ ڈرا ہوا ہے اور اپنے تخیلات سے خود ہی کانپ رہا ہے۔ آخر وہ کہتا ہے:

"آپ سنتے ہیں! وہ مجھ سے آپ کو طلب کرتے ہیں! اور غالباً وہ مجھکو مجبور کردیں گے

کہ میں آپ کا راز فاش کردوں!"

"کون؟ راہب لوگ؟"

"جی ہاں راہب۔ وہ مجھکو طرح طرح کی صورتیں دکھاتے ہیں، انہوں نے مجھکو کئی بار ان کی صورت بھی دکھائی ہے۔ وہ مجھکو وسیع سمندر کا نظارہ دکھاتے ہیں، وہ مجھکو ماہی گیروں کی قیامگاہیں دکھلاتے ہیں جہاں ناچ کود اور جشن وخوشی ہوتا نظر آتا ہے۔ میں ان مناظر کی دہشت انگیزی سے اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں لیکن وہ برابر میری چشم تخیل کے سامنے رہتے ہیں۔ میں ان سے التجا کرتا ہوں کہ للہ مجھے معاف کردو! بیشک میرا دوست قتل کا مرتکب ہوا ہے لیکن وہ آدمی برا نہیں ہے، اگر آپ مجھے اس تعاقب سے آزاد چھوڑ دیں گے تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے قصور پر نادم ہو اور اپنے گناہ کا کوئی کفارہ کرے۔ وہ اپنے جرم کا ضرور معترف ہو جائے گا اور اپنا نامہ اعمال دھونے کے لئے بیت المقدس کی زیارت کرآئیگا"

"اچھا پھر اس پر راہبوں نے کیا جواب دیا؟" برگ نے پوچھا "غالبًا وہ مجھے معاف کرنا نہیں چاہتے، وہ مجھکو بہت عذاب انگیز سزا دینا چاہتے ہیں اور مجھکو زندہ آگ میں جھونکدینے کی نیت رکھتے ہیں!"

مارڈ بطور خود اس موقع پر یہ گفتگو شروع کرتا ہے:

"ایں! کیا میں اپنے دوست کیساتھ غداری کروں گا؟ اوہ روئے زمین پر میری تنہا دولت ہے! اس نے مجھکو ریچھ کے حملے سے اُس وقت بچایا ہے جبکہ اُس خونخوار درندے نے اپنے پنجے میرے گلے پر رکھدئے تھے! ہم دونوں نے اس صحرائی زندگی کی سرد وگرم کو ساتھ ساتھ چکھا ہے۔ جب میں بیمار ہوا تھا تو اس نے خاص اپنے کپڑوں سے میرے لئے بستر تیار کیا تھا! ہاں میں نے بھی کس محبت اور خلوص سے اُس کی خدمتیں کی ہیں! میں اُس کے لئے ایندھن اور پانی لایا ہوں، میں نے راتوں اُس کے بستر خواب پر پہرہ دیا ہے! اُس کے دشمنوں نے جب اسکا تجسس اور تعاقب کرنا چاہا ہے تو میں نے انکو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے، اور

اُس کا سراغ لگانے سے اُنکو باز رکھا ہے۔ اُن کو کیونکر یہ گمان ہو سکا کہ مجھسے اپنے ایسے محبوب اور محبت کے خلاف خیانت کرنا ممکن ہے؟! ہاں میرا دوست خود ہی پادری کے پاس چلا نہ جائے گا، اپنے گناہ کا اُس کے سامنے اعتراف کرے گا، اور پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ نجات و مغفرت حاصل کر لیں گے!"۔

برگ نے غور و تامل سے ٹارڈ کی تقریر کو سنا، وہ اُس کے چہرے کا بڑی تجسانہ نظروں سے جائزہ لے رہا تھا!

"بہتر یہ ہوگا کہ تم خود پادری کے پاس چلے جاؤ اور اُس سے سارا واقعہ سچ سچ بیان کر دو ہاں اچھا ہے کہ نوع بشری میں تم واپس چلے جاؤ"

"اکیلے میرے جانے سے بھلا کیا ہوگا؟ میں یہاں سے تنہا کہیں نکلتا ہوں تو مردوں کی روحیں محض آپ کی رفاقت و حمایت کی وجہ سے بُری طرح میرا تعاقب کرتی ہیں، اور کچھ اس طرح میرے در پے اور مجھ سے دست و گریباں ہوتی ہیں کہ جب میں انکے نرغے سے چھوٹ کر یہاں آپ کے سامنے آتا ہوں تو میرے سارے بدن پر رعشہ ہوتا ہے! تم نے بھی تو غضب کیا ہے! تم نے گویا خود خدا پر ہاتھ اُٹھایا ہے! تمہارے گناہ سے بڑھ کر کون گناہ کبیرہ ہوگا؟! میں جو تم سے اس وقت یہ مواخذہ کر رہا ہوں یہ تمہاری ہی تعلیم و تلقین کا نتیجہ ہے۔ تم نے خدا کے عدل و انصاف اور اُس کے انتقام و سزا کا حال مجھ سے کیوں بیان کیا؟ آج تم ہی ہو کہ مجھکو اپنے سے بیوفائی اور بے مروتی کرنے پر مجبور کر رہے ہو! مجھے معاف کرنا اگر میں ایسا کام کر گزروں! تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ تم خود پادری کے پاس چلے جاؤ!" ٹارڈ یہ تقریر ختم کر کے برگ کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

مجرم قاتل نے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا اور بغور اس کی طرف دیکھا! وہ اپنے اس رفیق کے جوش و خروش اور خوف و خشیت کو اپنے جرم کی سنگینی کا معیار و میزان سمجھ رہا تھا اور اب ٹارڈ پر اس قسم کے آثار بہت ہی شدید و عمیق ہو گئے تھے! برگ نے محسوس کیا کہ وہ ابھی

خدا کا باغی ہے۔ وہ غم و حسرت سے لبریز ہو گیا!

"حیف ہے مجھ پر کہ میرے ہاتھ سے یہ فعل صادر ہوا! اور یہ کس قدر کوفت اور کلفت کی زندگی ہے جو میں یہاں ان پہاڑوں اور جنگلوں میں شب و روز کی دہشت اور دو غدغہ میں بسر کر رہا ہوں! کیا اس وحشی زندگی کی یہ ساری مصیبتیں اور بے سرو سامانیاں میری طرف سے کافی کفارہ گناہ نہیں ہیں؟! کیا میرے ہاتھ سے اپنا گھر بار اور ساری دولت نہ گئی؟ کیا میں اپنے دوستوں کی صحبت سے ہمیشہ کے لئے منقطع نہیں ہو گیا؟ کیا زندگی کی ان ساری مسرتوں کا دروازہ مجھ پر بند نہیں ہو گیا جن کی وجہ سے زندگی زندگی ہوتی ہے؟! مجھ سے اب اور کیا چاہا جاتا ہے؟!"

ٹارڈ یکبارگی اچھل کھڑا ہوا "اچھا! تم کو بھی ندامت ہونے لگی! میرے لفظوں نے آخر کار تمہارے دل میں بھی رقت پیدا کی! اچھا، آؤ میرے ساتھ چلو۔ ہاں چلو کہ ابھی وقت ہے!"

برگ دہشت زدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا! "اس یہ لوگ کیسے؟! ٹارڈ! یہ کام۔ تم نے کیا؟"

"ہاں، ہاں میں نے! یہ میں نے ہی تمہارے ساتھ دغا کی ہے! لیکن اب بھاگ چلو! تمہاری گرفتاری اور سزایابی کی اب ضرورت نہیں ہے جبکہ تم کو اپنے کام پر نادم ہونے کی توفیق پیدا ہو گئی ہے! ہاں ہم کو ضرور بھاگ جانا چاہئے اور ہم نکل بھی سکتے ہیں۔"

قاتل برگ زمین پر اس جگہ جھکا جہاں اسکا آبائی تبر پڑا ہوا تھا۔ "چور کے بچے!" اس نے زیر لب آواز میں کہا، "میں نے تجھ پر اعتبار کیا! تجھ سے محبت کی!"

ٹارڈ نے برگ کی مخدوش حرکت کو بھانپا! اس نے سمجھ لیا کہ پہلا وار میرے ہی اوپر ہے! چنانچہ جلدی سے اس نے بھی اپنا خنجر کمر سے کھینچ لیا اور قبل اس کے کہ برگ کھڑا ہو اس کو اس کے جسم میں پیوست کر دیا! دیو ہیکل برگ فوراً زمین پر آ رہا اور غار کے دہانے سے خون کا ایک چشمہ بہہ نکلا! برگ کی گردن پر اُلجھے ہوئے بالوں کے پیچھے ٹارڈ کو ایک گہرا زخم منہ کھولے نظر آنے لگا!

اتنے میں دیہاتیوں نے نرغہ کرکے انکا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے ٹارڈ کی اُس کی کارگذاری پر بہت تعریف کی اور اس سے کہا کہ اُس نے اپنے قصور کی معافی کا حق حاصل کر لیا ہے۔

ٹارڈ کو اپنی قید و بند کے دہشت ناک خواب آنے لگے۔ اُس کے قدیم توہمات اس وقت پھر تازہ ہو گئے، اور جنگل کے پُر اسرار طوفان میں اس نے جو جو عجائب و غرائب دیکھے تھے جو جو نا قابلِ فہم آوازیں اور سُنے سے تھے اس ساری واردات کی طرف اُس کا دماغ منتقل ہو گیا۔ سارے شجر و حجر پھر اس سے گفتگو کرتے نظر آنے لگے اور وہ کل سرت خیز داستان اپنے کو پھر دُہرانے لگی۔

ٹارڈ برگ کی لاش کے سامنے بیٹھکر زار و قطار رونے لگا وہ اس سے بیتابانہ ہو کر التجائیں کرنے لگا کہ وہ اپنی موت کی نیند سے اُٹھ کھڑا ہو۔ دیہاتیوں نے اپنے نیزوں سے ایک کھٹری سی بنائی اور اس پر ڈالکر مقتول قاتل کو لیجانا چاہا۔ خوفناک برگ کی لاش کو اٹھاتے ہوئے انکے دل مرعوب ہو گئے اور انکے واہمہ نے اُس کے اعضا میں زندگی کی حرکت دیکھی! جب جنازہ اٹھایا گیا، ٹارڈ کے منہ سے نکلا:

"خدا بہت بڑا ہے!"

رخصتی کے وقت ٹارڈ نے لرزتی ہوئی آواز میں مجمع کو یہ پیام دیا:

"ان سے کہدینا، اُس اُن سے جس نے برگ کو قاتل بناکر دیس نکالا دلوایا تھا، کہ برگ کو ٹارڈ نے، اُس ٹارڈ نے جس کا باپ طوفان زدہ جہازوں کے مسافروں کو لوٹنے کا پیشہ کرتا تھا اور جس کی ماں ایک جادوگرنی ہے قتل کر دیا۔ کیونکہ برگ ہی نے ٹارڈ کو یہ بتایا تھا کہ عدل و انتقامِ خدائے ذوالجلال کے زمین و آسمان کا سنگِ بنیاد ہے!"

غزل

از حضرت دردؔ کاکوروی

آہ کہ دل ہو تو کس طرح ضبطِ فغاں سے کام ہو
عشق کی اصطلاح میں صبر اسی کا نام ہے

یہ تو دلِ حزیں ترا عشق پر اتہام ہے
دید ہو کس طرح تجھے شوق ہی ناتمام ہے

مردمِ چشمِ حق ہے جو جلوہ نما ہے ہم میں وہ
ہے یہ وہی کرشمہ ساز، روح اسی کا نام ہے

شوق جو ہو صفات کا دہر پہ ہو فریفتہ
ذات کا ہو جو شیفتہ اس کو طلب حرام ہے

خلوتِ دل میں میری جاں میرے سوا کوئی نہیں
تا نفس پہ آیا آج، یار کا یہ پیام ہے

یا رب ہے تیرے جلوہ کی جب نہیں کوئی انتہا
حسنِ وصال بھی ترا جلوۂ ناتمام ہے

مستوں میں تیرے آجکل بیخودی اس بلا کی ہے
ہوش نثارِ شیشہ ہے، عقل فدائے جام ہے

حسنِ ازل کے ناز اٹھا قیدِ مجاز سے نکل
عشق کی یہ تو بوالہوس منزلِ ناتمام ہے

عاشقِ خستہ قلب کا حسن کی بارگاہ میں
جذبۂ دل سلام ہے، آہِ رسا پیام ہے

مے کی کسے ہے جستجو، جام کی کس کو ہے ہوس
ساقی کی ہر نگاہ خود گردشِ دورِ جام ہے

دردؔ جگر کی ہر کھٹک جاذبۂ وصال ہو
جلوۂ حسنِ یار سے عشق کا یہ پیام ہے

غزل

از حضرت جلیل قدوائی بی اے

متاعِ حسن عیش جاوداں معلوم ہوتی ہے
تری رونق بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

زبانِ عشق چپ ہے رازِ الفت آشکارا ہے
خموشی ترجمانِ بے زباں معلوم ہوتی ہے

خوشی کے چند دن تھے جو خوشی میں کٹ گئے لیکن
حیاتِ غم، حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

کبھی جو آرزو نقشِ نگار و صفحۂ دل تھی
وہی سینہ پہ اب سنگِ گراں معلوم ہوتی ہے

[illegible] رازِ دل افشا نہ ہو جائیں کہیں یارب
نگاہِ دوست اب کچھ مہرباں معلوم ہوتی ہے

ابھی سے دورِ سرمد لذتِ دردِ نہانی کی
ابھی تو لذتِ دردِ نہاں معلوم ہوتی ہے

[illegible] ہیں آنسو کسی کے حالِ گریۂ بلبل پر
ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

خدا معلوم کتنے اور کیسے غم اٹھائے ہیں
ہنسی بھی دردمندوں کی فغاں معلوم ہوتی ہے

ہجومِ غم کی دل پر آج کس ایسی کشاکش ہے
متاعِ زندگی بارِ گراں معلوم ہوتی ہے (۱)

غمِ دنیا و دیں سے دل کو اس نے کر دیا فارغ
تری الفت نہیں یکساں معلوم ہوتی ہے

زباں پر حالِ دل آئے جلیل اس کی ضرورت کیا
مری ہستی مجسم داستاں معلوم ہوتی ہے

---

(۱) کیٹس [illegible] مصرعہ

A thing of beauty is a joy for [illegible]
____________________ *; it will never*
Pass into nothingness __________

کو ذہن میں رکھئے (قدوائی)

تنقید و تبصرہ

کتب: سیرۃ الرسول - مترجمات - نذر گل

سیرۃ الرسول (تاریخ الامت حصہ اول) | جامعہ کی کتابوں میں سے جو سب سے زیادہ مقبول ہوئیں تاریخ الامت کا پہلا حصہ سیرۃ الرسول بھی ہے۔ یہ کتاب دراصل طلبہ کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھی لیکن ملک میں اس قدر مشہور ہوئی کہ عام مسلمانوں نے طلبہ سے زیادہ اس کا مطالعہ کیا اور اسی لئے اس کے کئی ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ گذشتہ سال یہ کتاب بہت سے اسلامی مدارس اور گورنمنٹ کالجوں کے نصاب میں داخل ہو گئی تھی اس لئے اب اس کا سائز چھوٹا کر کے نیا ایڈیشن طبع کرانا پڑا ہے۔ قیمت بھی بجائے عہ کے ۱۲ر کر دی گئی ہے۔ نیا ایڈیشن بعد ترمیم اور تصحیح شائع ہوا ہے۔ ہم یہ بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سیرۃ الرسول طلبہ اور عام مسلمانوں کے کام کی کتاب ہے۔ اور اب جب کہ مکتبہ جامعہ نے قیمت میں بھی تخفیف کر دی ہے یہ بہت آسان ہو گیا ہے کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے۔ مکتبہ جامعہ نے سیرۃ الرسول پر بچوں کے لئے جو مفید سلسلہ شائع کیا ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ تمام مدارس کے نصاب میں داخل ہو کہ طلبہ کا بھی اس میں فائدہ اور مکتبہ کی بھی ہمت افزائی ہے۔

مترجمات | جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے اپنے مختلف مضامین کو جو ملک کے علمی و ادبی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں مرتب صورت میں شائع کرنے کی توجہ فرمائی ہے مترجمات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں انہوں نے اپنے تمام مختصر علمی تراجم کو جمع کر دیا ہے ان میں سے اکثر مضامین مرحوم رسالہ زبان منگلور میں مترجمات کے زیر عنوان شائع ہو چکے ہیں مضامین اکثر دلچسپ علمی ہیں اور ان کا مطالعہ اردو داں حضرات کے لئے ہر نہج مفید ہے۔ قاضی صاحب کو ترجمہ

…اچھا سلیقہ ہے اس کتاب سے آپکی یہ مہارت آشکارا ہے، البتہ بعض مقامات پر کچھ فروگذاشتیں ہوگئیں جو چنداں قابل لحاظ نہیں مثلاً صفحہ ۹۰ پر … کے پہلے صفحہ ۵۰ بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے مطالبہ کا اسقدر انکار کیا کہ … ایک جگہ پیداوار کی جگہ پیداوار روئی لکھدی ہے۔ اسی طرح کے دو چار تسامحات اور بھی ہیں ہمیں توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان تمام خرابیوں کو دور کردیا جائے گا۔ سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ حجم ۲، صفحے قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی

… قاضی احمد میاں صاحب کے ان ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر آگرہ کے … ماہوار رسالہ … میں شائع ہوچکے ہیں، قاضی صاحب کا ادبی مذاق بہت ستھرا ہے ان مضامین میں انہوں نے سلیم المذاقی کا پورا ثبوت دیا ہے یوں تو اس رسالہ کا ہر مضمون مطالعہ … ہے مگر "افسانہ" … "جہاں ہے ہندوستان" "دبستان" … "حالات کالیداس" یہ مضامین خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ ضخامت ۸۴ کتابت … معمولی۔ قیمت غالباً ۸؍

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی

شذرات

پچھلے مہینے کے پرچے میں ہم یہ ذکر کرچکے ہیں کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ امیر جامعہ بھوپال حیدرآباد اور میسور کے دورے پر تشریف لے گئے ہیں تاکہ ان مقامات پر اپنے احباب کے حلقے میں جامعہ ملیہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد فراہم کریں۔ پرچہ چھپنے کے لئے کاتب میں جاچکا تھا اس کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ممدوح کیساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کے علاوہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب سابق شیخ الجامعہ بھی تشریف لے گئے ہیں۔ ہم جس طرح ڈاکٹر انصاری صاحب کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے بہت مالی نقصان برداشت کرکے اور بڑی زحمت اٹھاکر جامعہ ملیہ کی خدمت کے لئے ایک مہینے کا وقت نکالا ہے اسی طرح خواجہ صاحب کے بھی ممنون احسان ہیں کہ وہ سال بھر کی محنت کے بعد تعطیل کے زمانے میں آرام کرنیکے بجائے جنوبی ہند میں جامعہ کا پیام پہنچانے تشریف لے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کو جامعہ ملیہ سے جتنی محبت ہے اور اس کے مقاصد کی جتنی قدر انکے دل میں ہے اسکا اندازہ ناواقف لوگ مشکل سے کرسکتے ہیں۔ موصوف نے کئی سال سے اپنے پیشے کی مصروفیتوں کے سبب سے سیاسی جدوجہد سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی ہے لیکن ملک وقوم کی تعلیمی ترقی سے انکی دلچسپی بدستور باقی ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گی۔

وسط ستمبر میں وہ المناک سانحہ پیش آیا جس کا مدت سے خوف تھا یعنی جتندرناتھ داس نے لاہور کی جیل میں مسلسل فاقہ کشی کے صدمے سے جان دے دی۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس جواں مرگ کا ماتم سارے ملک میں کیا گیا۔ تقریباً ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں نے اس حسرتناک موت پر آنسو بہائے۔ اکثر شہروں میں دن بھر دکانیں بند رہیں، ماتمی جلوس نکالے گئے تعزیتی جلسے کیے گئے۔ غرض جن طریقوں سے مجروح دل کے دردِ نہاں کا تھوڑا بہت اظہار ہو سکتا ہے وہ سب اختیار کیے گئے [illegible]

[illegible]

[illegible] ملک کے تمام ذمہ دار رہنماؤں نے سوائے معدودے چند شعلہ مزاجوں کے ایسے شدید صدمے کی حالت میں بھی اپنا فرض سمجھا کہ تشدد آمیز انقلابی تحریک سے جس کی بدولت وطن پرست بنگالی نوجوان کی جان گئی بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کر دیں۔ اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ جتندر ناتھ داس [illegible] کی محبت میں موت کے گھاٹ اتر گیا اور اس کے ساتھی ابھی تک نیم جانی کے منجدھار [illegible] وطن، خلوص اور ایثار کے مجسمے ہیں لیکن افسوس ہے کہ جوانی کے جوش نے ان لوگوں [illegible] راہ پر ڈال دیا جس میں انکے ملک کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔

ان لوگوں کا خیال ہے اور بالکل بجا ہے کہ شہیدوں کے خون سے قوموں کی آزادی کا قصر تعمیر ہوتا ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ شہادت کے شرائط کتنے سخت ہیں۔ سیاسی شہادت کیلئے یہ کافی نہیں کہ انسان عارضی جوش، ضد یا غصے میں جان دیدے خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقصد کے لئے کیوں نہ ہو بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ پہلے وہ اس کا اطمینان کر لے کہ اسکی قربانی واقعی ملک کے لئے مفید ہوگی اور پھر خالص نیت، پاک ارادے اور بے لوث دامن کے ساتھ ہلاکت کے دریا میں کود پڑے۔ محبت کی دیوانگی میں بے سوچے سمجھے جان دیدینا بیشک بڑی ہمت کا کام ہے لیکن جب انسانوں کے اعمال اعلیٰ اخلاقی اصول کی میزان پر تولے جاتے ہیں تو اسکا پلہ کچھ بہت بھاری نہیں رہتا۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ واس جیسے پچلے ہونہار نوجوانوں کے یوں مفت میں جان کھونیکا ذمہ دار کون ہے؟ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کی فضا آج کل سیاسی بے چینی سے معمور ہے۔ ہندوستانیوں کے دل میں غلامی کی شرم اور آزادی کی آرزو نے ایک شور برپا کردیا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ نوجوانوں اور خصوصاً طالب علموں میں جن کی طبیعت میں یوں ہی ہیجان و تلاطم رہتا ہے یہ شورش ہنگامہ محشر بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اب اگر ان نوجوانوں کے نگران یعنی مدرسوں کے منتظمین ملک و قوم کے خیرخواہ ہوں اور تھوڑی سی عقل بھی رکھتے ہوں تو وہ نوجوانوں کے اس جائز اور مبارک جوش کو سیدھی راہ پر لگانے کی تدبیریں کریں انہیں قومی رہنماؤں سے خلوص و عقیدت کا اظہار کرنے قومی گیت گانے قومی جشن منانے کی اجازت دیں تاکہ انکا حب وطن کا طوفان دریا کے کناروں سے گذر کر آس پاس کی زمین تباہ نہ کرے بلکہ قعر دریا کو اور گہرا کاٹ کر آگے بہتا چلا جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ حب وطن کے جذبے کو سودا سمجھ کر دبانیکی کوشش کیجاتی ہے، طالب علموں کو قومی مباحث پر گفتگو کرنے بلکہ کہیں کہیں کھدر پہننے تک کی ممانعت کیجاتی ہے ظاہر ہے کہ انہیں ضد پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی جاتی ہے جن کی قوت ارادی کمزور ہے وہ قہر درویش بر جان درویش دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہیں مگر جن میں ولولہ حوصلہ اور قوت عمل ہے وہ انقلابی تحریکوں میں شریک ہوکر واس کی طرح جنون الفت کی بدولت دنیا سے ناکام و نامراد گذر جاتے ہیں۔

نوجوانوں میں اس قدر تلخی اور ضد پیدا ہونیکا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انہیں ملک و قوم کی حالت دیکھ کر مایوسی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ انکے خون میں گرمی ہوتی ہے اس لئے یہ مایوسی غصے کی شکل اختیار کرتی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان، ہندو اور ہندو، مسلمان اور مسلمان بے شرمی سے ادنیٰ اغراض پر لڑتے ہیں، قومی رہنما بے حیثیتی سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر دست و گریباں ہوئے جاتے ہیں تو انکے دل میں امید مرجھا جاتی ہے اور ناامیدی جو خودکشی

[illegible] خیبر پختونخوا [illegible] اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

اس تاریکی میں ایک روشنی نوجوانوں کی کانفرنس کی بدولت نظر آتی ہے۔ یہ ایک [illegible] مرکز قائم ہو رہا ہے جہاں نوجوان اپنے جوش کو مفید قومی کام میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے بڑوں کے باہمی جھگڑوں سے الگ رہ کر اتحاد و محبت کے جذبے کی پرورش کرنا چاہتے [illegible] اور ضبط و انضباط کی [illegible] کامل آزادی کی جنگ کے لئے تیار ہونے میں مصروف [illegible]

[illegible] لوگوں کی راہ میں ایک بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر انہوں نے اپنے مقاصد میں کسی [illegible] عقیدہ کو خواہ وہ اشتراکی حکومت ہو یا نراجی مکمل آزادی ہو یا مشروط، داخل کر لیا تو ان میں بھی [illegible] میں پھوٹ پیدا ہو جائے گی اور انکی ساری ترقیوں کو روک دیگی۔ عملی سیاست اس قدر ہیجان انگیز [illegible] انسان کے دل و دماغ میں انتہائی پختگی پیدا نہ ہو جائے، اُسے اُس کے قریب نہ جانا چاہیے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ اپنی پیشروؤں کی خام کاریوں سے سبق لیں اور [illegible] سے پہلے پختہ مغز جوان بننے کی کوشش کریں۔

اعلان

کچھ عرصہ ہوا ہم نے اعلان کیا تھا کہ "جرمنی سے دیوان غالب کے پانچ ہزار نسخے آ رہے ہیں۔ یہ نسخے جیسے ہی بمبئی پہنچیں کچھ عرصے کے لئے قسم اول کی مقررہ قیمت پر ۲۰ فیصدی اور قسم دوم کی مقررہ قیمت پر ۳۳ فیصدی رعایت کا عام اعلان کر دیا جائیگا" چنانچہ خدا کا شکر ہے

پورے پانچ ہزار نسخے بمبئی پہنچ گئے ہیں

جو صاحب یکم جنوری سنہ تک طلب فرمائینگے ان سے قسم اول کی قیمت صرف ۸ روپے اور قسم دوم کی قیمت ۲ روپے لی جائے گی۔ اور ۸

تاجران کتب

پانچ یا پانچ سے زیادہ نسخے منگائیں گے ان سے پچاس فیصدی کی رعایت کی جائے گی۔

یہ دیوان غالب وہی مشہور معروف، خوبصورت جلد، سرخ کیس اور پاکٹ سائز والا شرکا وباقی (برلین) کا دیوان غالب ہے جو اس سے پہلے بھی دو بار ہم جرمنی سے منگا کر ہزاروں کی تعداد میں فروخت کر چکے ہیں قسم اول اور قسم دوم میں صرف یہ فرق ہے کہ قسم اول کا کنارہ سونے کا ہے اور [illegible] رنگ کا۔

یقین رہے

کہ یہ اعلان ہم عام بازاری کتب فروشوں کی طرح نہیں کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اردو کے زندہ جاوید شاعر کی یاد ایک بار پھر تازہ کریں اور دلدادگان غالب کو موقع دیں کہ وہ اس نادر رعایتی اعلان سے فائدہ اٹھا کر اردو کا بہترین چھپا ہوا دیوان خرید سکیں اور ہماری محنت کی داد دیں۔

یقیناً

(۱) یکم جنوری سنہ کے بعد دیوان غالب قسم اول کی قیمت پھر للعہ اور قسم دوم کی ۳ ہو جائے گی۔

(۲) یکم جنوری سنہ کے بعد تاجروں کو حسب سابق ۱۲½ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔

اسلئے ابھی موقع ہے کہ ہر تاجر کتب اور ہر شخص فائدہ اٹھائے۔ کیا پانچ نسخے بیچ کر دس روپیہ کمانا مشکل ہوگا؟

منیجر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

[redacted]

The Cultural Side Of Islam

Madras Lecture on Islam

(NO. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1929.

CONTENTS

Price 1/8/-
Bound 2/-

To be had of—

National Muslim Univesity Book Depot

KAROL BAGH,

DELHI

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء

جلد ۱۲

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

[redacted]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۲	بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

عرب شمالی و وسطی کی حکومتیں

عہد نبوی سے پیشتر

۱۹۱۰ء میں قاہرہ کی سرکاری یونیورسٹی میں مشہور اطالوی مستشرق گویدی (Ignazio Guidi) نے عرب قبل اسلام پر چار بیش بہا لکچر دئے تھے جو ۱۹۲۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں L'Arabie Antéislamique ہم جامعہ ملیہ کی اُردو اکادمی کے لئے ان لکچروں کا ترجمہ کر رہے ہیں جو انشاءاللہ عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ فی الحال ناظرین "جامعہ" کی خدمت میں اُس کتاب کے باب اول کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ نظر پسندیدگی و دلچسپی دیکھا جائیگا۔

(سید حسن برنی)

جب اہل عرب کا تذکرہ ہوتا ہے، تو ہمارا خیال خود بخود بانی اسلام، عہد خلافت کی ابتدائی فتوحات، اور خود خلافت کی طرف جاتا ہے، جو اہل مشرق و اہل مغرب دونوں کے نزدیک عروج و شوکت کا ایک خواب پیش کرتے ہیں۔ ہم عرب قبل اسلام کو بآسانی فراموش کر جاتے ہیں، اور یہ ہماری غلطی ہے۔ جنوبی عرب کے تمدن کا جس کا زمانہ کتبات کے رو سے مسیح سے آٹھ سو برس پہلے تک پہنچتا ہے، ذکر چھوڑ کر، وہ حکومتیں جو صحرا کے کناروں پر قائم ہوئی تھیں، اور شمال و مشرق اور جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں واقع تھیں، اور جہاں عرب کی قوم کو استقلال و نشو و نما حاصل ہوا، اسلام کی شاندار تاریخ میں حقیر تصور کئے جانے کے لائق نہیں ہیں۔ سیپٹی میوس اودیناتوس (Septimus Odenatus) جس نے ۲۶۰ء میں شاپور اول کو مغلوب کیا تھا، اور جو کہ شہنشاہ گالین (Gallion) کا شریک سلطنت تھا، رومۃ الکبریٰ کے قیاصرہ میں شمار ہوتا اور کسی نہ کسی طریق پر رومۃ الکبریٰ کی تاریخ

میں مصر رکھا ہے لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ وہ ایک بہادر عرب سردار تھا جو کہ خالد بن ولید قرشی اور عمرو بن العاص کا پیش رو تھا جنہوں نے چشم زدن میں جرار لشکروں کو شکستیں دیکر سلطنتہائے ساسانی و بائزنطینی کے ایک بڑے حصے کو فتح کر ڈالا۔ اسکا اصلی عربی نام اُذینہ تھا، اور اُس کی بیوی مشہور زینوبیا "کا نام عربی اسم زینب کی مسخ شدہ شکل ہے۔ عرب کی روایت میں اُس عورت کا نام زباء ہے لیکن وہ دراصل اذینہ کے ایک سپہ سالار کا نام ہے۔ اذینہ اور زینب کے لڑکے وارث کا نام اتھینوڈور (Othenodore) یعنی عطائے اتھینیا (دیبی) تھا، جو کہ فی الواقع اس کے اصلی عربی نام وہب علات یعنی عطائے علات (وہب بمعنی ہبہ) کا ترجمہ ہے۔ اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس لڑکے کو علات نے اُس کے والدین کو بخشا تھا۔ علات کی پرستش بطور ایک معبود کے عرب میں بکثرت متداول تھی۔

قدیم عرب کی تاریخ پر، جیسا کہ عام طور پر تمام دیگر ممالک کی تواریخ کا حال ہے۔ اُس کی جغرافیائی حیثیت کا بہت اثر پڑا ہے۔ عظیم صحراؤں نے جو کہ شمال و جنوب میں اس جزیرہ نما کو شام و بابل سے علٰحدہ کرتے ہیں اُس کے باشندوں کو دشمنوں کے حملوں اور اُن کی زبان اور قومی خصائل کو تبدیلیوں سے محفوظ رکھا۔ کلدانیہ کی زبان، جیسا کہ ہم اُسے اُن تحریرات کے ذریعے سے جو شاید مسیح سے چار ہزار برس پہلے ہیں، جانتے ہیں، باوجود اس قدر قدامت کے سامی زبان کی قدیم شکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے، بعض اہم تبدیلیاں اختیار کر چکی ہے، حالانکہ عربی زبان نے چھٹی صدی عیسوی میں بھی اپنی نحوی ہیئت کے بعض حصوں مثلاً فعل میں قدیم زبان سے بہت کم بُعد حاصل کیا ہے اسکا باعث عربوں کی علٰحدگی اور آزادی ہے جب سے اسلام کے بعد عربوں کا دوسری قوموں سے واسطہ پڑا، اُن کی زبان میں بھی کم وبیش بعض اہم تبدیلیاں وقوع میں آئیں۔ یہ صحیح ہے کہ آشوریا کے تاریخی کتبات میں سناخریب، اسرحدان، اسر بنی پال اور بختنصر کی فتوحات کا ذکر ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان آشوری اور کلدانی سرکاری بیانات کو پورے طور پر اعتبار کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بہرحال یہ فتوحات محض حملوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان حملہ آوروں کی حکومت محض

زبان نہ ہو، لیکن بول چال کی زبان ضرور تھی۔ یہ تحریرات بجائے کتبات ہونے کے محض چند کندہ الفاظ کہلائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں جنہیں بعض چرواہوں نے نقش کر دیا تھا۔ ایسے ہی کندہ شدہ الفاظ سینا کے وادی مکتب میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان نقوش سے تاریخی نقطۂ نظر سے بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہے، لیکن وہ زبان کے نقطۂ نظر سے قیمتی ہیں۔ یہ زبان شمال کی اصلی عربی معلوم ہوتی ہے، یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ چند قسم کی زبانیں مروج تھیں، جو ایک طرف تو نبطی بولتے تھے اور دوسری طرف اہل عرب۔ ان زبانوں کی تین قسمیں ہیں صفائی لحیانی، اور ثمودی۔ سب سے اخیر قسم اس مشہور جماعت میں متداول تھی جنہیں اہل عرب آل ثمود کہتے ہیں۔ ایک مختصر کتبہ جو ثمودی زبان میں لکھا ہوا ہے، اور حال ہی میں دستیاب ہوا ہے سب سے پہلا کتبہ ہے جس میں تاریخ دی گئی ہے۔ یونانی و رومی مصنفوں کے ذریعہ سے بھی ہم آل ثمود کے متعلق کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ رومیوں کی عربی فوج میں ثمودیوں کا ایک خاص دستہ ملازم تھا، جسے رومی Equites Saraceni Thamudeni یعنی "لشکر سرتی ثمودی" کہتے تھے۔

اس شمالی قسم زبان کی ایک خاص خصوصیت حرف "آل" کی شکل ہے۔ عبرانی زبان میں "ال" کی جگہ "ھا" آتا ہے۔ "فرس" (گھوڑا) حرف معرفہ شامل کرکے "ہافرس" ہوگا۔ ان کتبات میں سے ایک کتبہ جو صفائی زبان میں ہے بتاتا ہے کہ حال بن سلام نامی ایک شخص نے ایک گھوڑا ایک دوسرے شخص حنّائی نامی سے پانچ بیٹا میں خریدا

"أغذم حَنّائی ہفرس بمئة امنی (امانی ؟)" ایک اور شخص نعم بن قاحش اس مال غنیمت کا تذکرہ کرتا ہے جو اس نے جنگ نبط کے سنہ میں حاصل کیا تھا۔

"وغنم سنت حرب نبط"

یہ کتبہ اس سنہ کی وجہ سے جو اس میں پایا جاتا ہے اہم ہے۔ یہ تاریخ اغسطا (شہنشاہ) تراجن کے عہد میں [illegible] سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتبے اکثر ان الفاظ پر ختم ہوتے ہیں۔ ۔

برائے نام تھی، اور بہت تھوڑے دنوں تک رہی، برخلاف اس کے رومیوں نے جنہوں نے [illegible] کی ساری دنیا کو جو انہیں معلوم تھی منظم کرنے کی کوشش کی، عرب کو فتح کرنے کی صرف ایک کوشش قیصر اغسطس کے زمانے میں کی اور اس میں بھی وہ سراسر ناکام رہے۔ آئی لیوس گالوس (Aelius Gallus) نے جو کہ عرب کے جنوبی حصوں تک پہنچ گیا تھا، "مریابا" (مارب) کا محاصرہ کر لیا لیکن بالآخر اسے اس محاصرہ کو چھوڑ دینا پڑا، اور ایک لشکر جرار میں سے جس کا پورا اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ صرف معدودے چند افراد کو مصر واپس لے کر پہنچ سکا۔

جس چیز کا شمال کے عربوں پر اثر پڑا وہ ایک آہستہ لیکن واقعی حملہ تھا۔ یہ حملہ مذہبی خیالات اور ہمسایہ ممالک یعنی مغرب میں بازنطینی سلطنت اور مشرق میں ساسانی سلطنت کے بہتر تمدن کا تھا۔ ایک زمانے میں جسے گزرے ہوئے مدتیں ہو چکی تھیں، اُن حکومتوں پر بھی جو کہ یمن میں قائم تھیں، ان سلطنتوں کے ایسے اثرات پڑے تھے۔ اپنی حکومتوں کی بنیاد پڑ جانے پر شمال و جنوب کے عربوں نے ایک نظم و نسق قائم کر لیا تھا لیکن اس سے انہیں اپنی آئندہ ترقی میں بڑی مدد ملی۔ یہ حکومتیں حیرہ اور غسان اور وسط جزیرہ نما میں کندہ کی تھیں ہم مختصر طور پر ان حکومتوں کی تاریخ کے اہم واقعات ان روایتوں سے اخذ کر کے جو ششم صدی مسیحی کی ابتدا سے شعرا و مورخین عرب کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں پیش کرینگے۔ عربی زبان کے قدیم ترین تحریری اسناد اس صدی کے آغاز سے پیشتر کی نہیں ملتیں۔ اور یہ زمانہ بقول رینان (Renan) ہنوز عربوں کا "عہد رزمیہ" ہے

یہیں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم اب ایسی عربی زبان سے بھی واقف ہیں جو اشعار جاہلیت سے زیادہ قدیم کہی جا سکتی ہے۔ حوران میں جو دمشق کے جنوب و مشرق میں واقع ہے، ونیز حجاز کے شمالی اقطاع تک اخیر صدی عیسوی کے نصف دوم میں بعض ایسے کتبات دستیاب ہوئے ہیں جو اس قدیم عربی میں لکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عربی زبان ادبی

"لو ہا (خا) علات سلام"

ان الفاظ کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے "علات کے روبرو سلام" ان الفاظ میں علات نامی معبود کبیر کا ذکر ہے۔ لیکن جو چیز توجہ کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتبات ایک ایسے رسم الخط میں کندہ کیے گئے ہیں، جو کہ جنوبی عرب کے حروف سے وابستہ ہے نہ کہ آرامی حروف سے جو کہ پنجم صدی قبل مسیح سے دریائے فرات کے تمام اقطاع میں مروج تھے یہ معمولی واقعہ ہیں یہ نتیجہ نکالنے کی اجازت دیتا ہے کہ ہمارے سنہ مسیحی کے ابتدائی زمانے میں عرب کے تمدن کا خاص گہوارہ جنوب یعنی یمن میں تھا اور اسکا اثر عرب کی شمالی آبادی تک پہنچا ہوا تھا۔

اب ہم ان حکومتوں کیطرف متوجہ ہوتے ہیں جو عرب کے شمال میں قائم ہوئی تھیں، بالخصوص حیسرہ

حیرہ دراصل ایک سریانی لفظ ہے، جس کے معنی "محدود قطعۂ زمین" یا "فوجی کیمپ" کے ہیں۔ اسکا تلفظ بجائے حِیرہ (بالکسرہ) حَیرہ (بالفتح) تھا۔ وہ محل وقوع کے لحاظ سے اچھے مقامات میں سمجھا جاتا تھا اور اس کی ہوا اتنی عمدہ تصور کیجاتی تھی، کہ ایک مثل مشہور تھی کہ حیرہ میں ایک دن گذارنا، سال بھر دوائیں کھانے سے بہتر ہے۔ ان عمدہ حالات کیوجہ سے حیرہ میں کثیر اور مرفۃ الحال آبادی جمع ہوگئی تھی، جس میں سب سے زیادہ قبیلہ تنوخ کے عرب تھے جو خیموں میں رہتے تھے۔ انکے بعد عباد تھے جو مختلف عیسائی قبائل سے تعلق رکھتے اور زیادہ تر شہر کی اصلی آبادی میں رہتے تھے۔ انکے علاوہ اور بعض قبائل تھے جو ان سے اتحاد رکھتے تھے عباد کے معنی "بندگان" ہیں۔ پورا نام شاید عباد اللہ یا ممکن ہے "عباد المسیح" یعنی غلامان مسیح ہوگا۔ یہ نام غالباً انہوں نے خود ہی اختیار کیا تھا، تاکہ اس کے ذریعے سے وہ بددین اور بت پرست آبادی پر جو انکے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اپنا تفوق جتائیں۔

ہم حکومت حیرہ کے عہد اولیٰ کے متعلق کوئی یقینی بات نہیں جانتے۔ حسب معمول اس کی ابتدا کے متعلق بھی دیگر حکومتوں اور شہروں کی طرح بجائے تاریخ کے افسانہ سے سابقہ پڑتا ہے

...بن ربیعہ کا عشق رقاش اسکے ساتھ جو کہ شاہ جذیمۃ الابرش کی بہن تھی، جذیمہ کی اس سے ناراضگی اور بعدازاں اُس کی اپنے بھتیجے عمرو بن رقاش سے محبت اور ماہ وش زبہ سے جسے متقدمین ... کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہ سب افسانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ازاں جملہ اُن تاریخی واقعات کو جو اُن میں مخلوط ہو کر رہ گئے ہیں، علیحدہ کرنا نہایت دشوار ہے۔ پھر بھی بجز خاندان لخمیہ یا بنو نصر کے ہم حیرہ کی تاریخ سے بہتر طور پر واقف ہیں۔ حیرہ کے شاہی خاندان کی ابتدا تیسری صدی عیسوی کے نصف دوم میں قرار دیجا سکتی ہے۔ لیکن پہلا بادشاہ جو ہمارے زمانے تک کسی قدر شہرت رکھتا ہے، امرا القیس اول ہے۔ اس لئے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس کی جانب ... منسوب کیا جا سکتا ہے جو کہ علاقہ صنعاء (واقع وسط شام) میں موسیو دی سور (M. Dissaud) کو تھوڑا عرصہ ہوا دستیاب ہوا ہے۔ یہ کتبہ جو کہ عجائب خانہ لوور (Louvre) واقع پیرس (فرانس) کے عظیم الشان ذخیرہ میں شامل ہو چکا ہے، دو قسم کی اہمیت رکھتا ہے تاریخی و لسانی۔ یہ کتبہ ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:-

"تی نفس مَر لقیس بَر عَمرُ مَلک العرب کلہا"

یعنی "یہ مَرلقیس (امرالقیس) پسر عمر بادشاہ جملہ عرب کی قبر ہے"۔ یہ عبارت قدیم عربی زبان میں ہے لیکن اس میں باہر کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مثلاً نفس بمعنی سنگ مزار (یا لوح) بر (بجائے بن) بمعنی پسر۔ لیکن یہ الفاظ اس عہد اور اس ملک کی بول چال کی زبان کی بجائے ادبی اور نیز تحریری زبان کو پیش کرتے ہیں جو کہ ہمیشہ آرامی زبان کے زیر اثر رہی۔ ایک ہی قوم کے لکھنے اور بولنے کی زبان میں اس قسم کا فرق پایا جانا تعجب انگیز نہیں ہے۔ یہی کیفیت بطیوں کی ہے، جو کہ عرب قوم سے تھے چونکہ اُن کی مادری زبان اُس وقت لکھی نہیں جاتی تھی اس وجہ سے اُنکے کتبات ایک طرح کی آرامی زبان میں پائے جاتے ہیں، لیکن اُس میں جا بجا عربی زبان مخلوط ہے۔

شاہ امرالقیس یا مر القیس جس کے مزار پر یہ کتبہ لگا ہوا تھا، اپنے آپ کو تمام عرب کا بادشاہ ... بالخصوص قبائل اسد نزار اور انکے امرا و نیز قبیلہ مذحج کا بادشاہ تھا۔ اس نے تامرٹ کے

شہر نجران کا محاصرہ کیا تھا محققین کی مطابقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شامر سے مراد "سبا" کا بادشاہ شامر یہرعش ہے جس نے اپنے باپ کے ساتھ سنہ [illegible] سے اور تنہا [illegible] سے حکومت کی تھی۔ نجران عرب جنوبی کا ایک مشہور شہر تھا۔ اس کتبہ کی تحریر نبطی خط میں ہے، لیکن اس میں بعض قابل غور خصوصیتیں پائی جاتی ہیں مثلاً لام الف جو کہ عربی کے لام الف (لا) سے قطعاً مطابق ہے جس چیز سے اس کتبہ کی قیمت بہت بڑھ جاتی ہے وہ اُس کی تاریخ ہے جو اس میں درج ہے اس کتبہ کے دستیاب ہونے سے قبل بعض فضلا مثلاً آئش ہورن (E. Chhorn) اور کوسین دے پرسیوال نے امرالقیس اول کا عہد حکومت چوتھی صدی عیسوی کے ابتدائی زمانے میں قرار دیا تھا، اور عربی روایتوں میں متفقہ طور پر اُسے عمرو کا بیٹا بیان کیا گیا ہے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے تاریخ حیرہ کے متعلق یہ امور مسلم سمجھنے چاہئیں کہ نارہ (Namara) کے کتبہ میں جس امرالقیس کا ذکر ہے وہ عربی روایات کا بادشاہ امرالقیس ہے، اور اُس کی وفات کی یقینی تاریخ ۷ دسمبر ۳۲۸ء شاہان حیرہ کے سنین کو متعین کرنے کے لئے ایک نہایت اہم نقطۂ آغاز ہے۔

امرالقیس اول کے پرپوتے نعمان اول نے بہت زیادہ شہرت پائی۔ یہاں تک کہ عرب کی شاعری اور کم وبیش افسانہ آمیز نوعیت کی تاریخ میں اسکا نام بہت کچھ زندہ اور رائج رہا اُس کے ماتحت سواروں کے دو دستے تھے جن میں سے ایک "دوسر" اور دوسرا "الشہبا" کہلاتا تھا نعمان کے لئے ان منتخب دستوں کی اہمیت اُن لڑائیوں میں جو ہمسایہ قبائل عرب سے ہوئیں اور جن میں سواروں کا ممتاز حصہ ہوتا تھا محتاج بیان نہیں ہے۔ حیرہ کی بادشاہی یقینی طور پر ساسانیوں کے زیر اقتدار تھی، حتیٰ کہ یزدجرد اول (۳۹۹ء تا ۴۲۰ء) نے اپنے بیٹے بہرام (گور) کو تربیت کے لئے نعمان کے سپرد کیا تھا قصر "خورنق" و "قصر سدیر" کی تعمیر سے جو نعمان نے بنوائے تھے، اُس کی حکومت کو اور بھی عز امتیاز حاصل ہوگیا خورنق یقینی طور پر ایرانی زبان کا لفظ ہے اور اُس لفظ کی اصلی صورت "ہورنق" ہے جس کے معنی

ہیں" وہ چیز جو اچھی طرح ڈھکی یا محفوظ رکھی ہو"۔ یہ محل فن تعمیر کے عجائبات میں سے تھا جسے ایک رومی (یونانی) معمار "سنمار" نامی نے بنایا تھا۔ روایت ہے کہ اس محل کے بالائی بام پر جہاں نعمان اپنے اقبال وعیش کے خواب دیکھ رہا تھا، یکایک اس کے دل میں ایک اندوہناک خیال پیدا ہوا اور وہ یہ تھا کہ "یہ جو کچھ بھی ہے آج تو سب میرا ہے، لیکن کل یہ سب دوسرے کا ہوگا" اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے دنیا کو ترک کر دینے کا تہیہ کر لیا، اور اپنی بقیہ زندگی خلوت وعبادت میں گزاری۔ نامور بادشاہوں کے قصے، جن میں معاً دنیا چھوڑ دیتے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور بھی بکثرت مشہور ہیں، مثلاً نعمان کی طرح حبش کے بادشاہ "کالب" سے متعلق کہا جاتا ہے کہ یمن کے بادشاہ کو مغلوب کرنے اور کمال عروج کو پہنچ جانے کے بعد وہ راہب بن گیا۔ علاوہ ازیں عرب مصنفین تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ سقراط و افلاطون بھی اخیر عمر میں زاہدانہ گوشہ نشین بن گئے تھے۔

نعمان بت پرست تھا، اس نے مذہب عیسوی کے خلاف جبر و تشدد سے کام لیا۔ اور عربوں کو شمعون نامی ولی (S. Simeon) کے پاس جانے اور اس کا وعظ سننے کی ممانعت کر دی۔ لیکن وہ ولی اسے خواب میں نظر آیا، اور اس کو سخت کلمات سے یاد کیا، اور کئی بار عصا سے مارا۔ نعمان نے بالآخر حیرہ میں عیسائیوں کو اپنے مراسم مذہبی ادا کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کی تائید عرب مصنفوں کی شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ اس واقعہ کی ایک اور بھی اہمیت ہے، وہ یہ کہ مذہب عیسوی کا استحکام اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عبادے جو کہ حیرہ کی مسیحی آبادی تھے، منتخب اور سربرآوردہ عربوں پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

نعمان کا جانشین   تقریباً ۴۱۸ء میں منذر اول اس کا بیٹا ہوا، جو کہ تقریباً ۴۶۲ء تک حکمران رہا۔ یونانی (رومی) و سریانی مصنفین اسے الاموندارس (Alamounaetos.) منذر (بفتح ذال) لکھتے ہیں، لیکن عرب ہمیشہ سے اس کے نام کو اسم فاعل المنذر کی شکل میں [illegible] رہے ہیں۔ نعمان میں بعض غیر معمولی قابلیتیں پائی جاتی ہیں اور اس کے عہد میں حیرہ کی حکومت

نے اس وقت کے واقعات میں نمایاں حصہ لیا۔ اس نے موبدان ایران کو بہرام گور متذکرہ بالا

... تاج شاہی پہنانے پر مجبور کیا حالانکہ انہوں نے بہرام گور کو نظر انداز کر کے

اور ساسانی شاہزادہ کو تخت نشین کر دیا تھا۔ بعض عرب مصنفوں نے لکھا ہے کہ بہرام گور کے

تخت شاہی حاصل کرنے میں منذر کے باپ نعمان نے مدد دی تھی۔ اس طرح اس واقعہ کی دو

مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن تواریخ کی مطابقت کی رو سے دوسری روایت صحیح نہیں ہے

منذر نے بہرام گور کی مدد اس کامیاب جنگ میں بھی کی تھی جو کہ بازنطینی سلطنت کے مقابلہ

میں ہوئی تھی۔ لیکن منذر کی فوج پر مغاہراس غالب آگیا۔ اور انہیں یہ خوف ہوا کہ وہ گھر گئے

ہیں۔ اس خوف سے وہ دریا میں جا گھسے، اور ان میں سے اکثر دریائے فرات میں ڈوب کے

مر گئے۔ یہ واقعہ ۴۲۱ء میں پیش آیا۔

حیرہ کے بادشاہ اُس کے بعد سے ساسانیوں اور بازنطینیوں (رومیوں) کی لڑائیوں

میں برابر حصہ لیتے رہے نعمان ثانی منذر کا پوتا، ۵۰۳ء میں جنگ خبور (Khabur)

میں جو کہ بمقام سرسیوم (Carcesium) ہوئی تھی مارا گیا۔ حیرہ کے بادشاہوں

میں بلاشبہ سب سے زیادہ ممتاز منذر ثالث تھا، جو ۵۵۴ء میں پچاس برس حکومت کرنیکے بعد مرا۔

پروکوپ (Procope) نے لکھا ہے کہ وہ نہایت ذہین اور بڑا زبردست

سپہ سالار تھا۔ جسٹن (Justin) (۵۱۸ء) کے عہد کو چھوڑ کر ساسانیوں اور بازنطینیوں

میں صلح بہت کم رہی، اور منذر سوم جنگ میں ہمیشہ نمایاں حصہ لیتا رہا۔ اُس نے دو سرداروں

کو گرفتار کر لیا۔ تو جسٹن نے حیرہ کے چھوٹے سے بادشاہ کے پاس اپنے سفیر بھیجنے میں اپنی

بے عزتی نہ سمجھی، اور اس سے بلاشبہ اس کا منشا یہی تھا کہ اس کے دونوں سپہ سالار رہا ہو جائیں

اسی زمانے میں منذر کے پاس یمن کی سفارت بھی آئی تھی قباد کے زمانہ میں بھی منذر نے جنگ

میں خاص طور پر نمایاں حصہ لیا، رومیوں کی سلطنت میں کئی بار لشکر کشی کی۔ لیکن ہمیشہ ان کے

تعاقب سے بچ کر نکل آیا۔

اُسی زمانے میں سلطنت بازنطینی کی سرحد پر ایک دوسری عرب حکومت نے اتنی قوت حاصل کرلی تھی کہ وہ حیرہ کی حکومت کی حریف بن سکے، اور ساسانیوں اور اُنکے زبردست لخمیوں کے مقابلہ میں سلطنت بازنطینی کی مدد کرے۔ یہ غسان کی حکومت تھی۔ اس حکومت کے ابتدائی زمانے کی تاریخ حیرہ کے ابتدائی تاریخ کی طرح افسانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غسانی جنوبی عرب سے آکر بصریٰ کے علاقہ میں مقیم ہوئے تھے۔ وہاں انہیں دیگر عرب قبائل پہلے سے آباد ملے اور ایک مدت تک وہ اُن قبائل کے مطیع و منقاد رہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے اواسط میں ثعلبہ بن عمرو کو سلطنت بازنطینی کی طرف سے اس علاقہ کی امارت سپرد ہوئی، جو آگے چلکر غسان کی جانشین ہو گئی۔ یہ اختیارات بعد میں خاندان جفنہ کے امراء کے ہاتھ میں منتقل ہو گئے لیکن یہ بات چہارم صدی عیسوی کے نصف اخیر میں حاصل ہوئی کہ تاریخ میں غسانی بطور سلطنت بازنطینی کے معاونین کے نظر آتے ہیں۔ ۳۷۳ء میں غالباً شاہ حارث دوم کی وفات کے بعد اُس کی بیوی ماریہ یا ماویہ نے غسان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ایک روایت کی رو سے اُس جنگجو اور فتحمند ملکہ نے سلطنت بازنطینی کو مجبور کر دیا کہ وہ اُس ملکہ سے صلح کی جویا ہو ملکہ اُس شرط پر صلح کے لئے راضی ہوئی کہ موسیٰ نامی ایک مسیحی ولی بطور بڑے پادری کے اُس کے ملک میں بھیجدیا جائے گا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب عیسوی نے اس ملک کے عربوں میں کتنی ترقی پیدا کرلی تھی۔ نیز عرب کس حد تک رفتہ رفتہ بت پرستی سے ہٹ کر برتر مذہب قبول کرنے کی طرف مائل ہو رہے تھے۔

بعض شاہان حیرہ و غسان، بالخصوص "جفنۂ ثانی" کا ایک انوکھا لقب "محرّق" تھا۔ اس نام کے معنی وہی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان کی رو سے ہوتے ہیں، یعنی "ایک ایسا شخص جو کہ تیر آگ میں جلاتا ہے"۔ بعض شاہان حیرہ کے متعلق جن کا یہ لقب ہے، ایسی حکایت بھی بیان کیجاتی ہے جس سے اس اسم کی توجیہہ ہو جائے۔ لیکن ان حکایات کا مانند فی الواقع لفظ محرّق اور اس کے معنی ہیں۔ اسی طرح "معلقات" کے لفظ سے جو کہ سات مشہور نظموں

کے مخصوص ہیں۔ یہ روایتیں ماخوذ ہیں، جن کی رو سے بیان کیا جاتا ہے کہ نیلیں کعبہ میں آویزاں
... ال"، کی عدم موجودگی سے واضح ہوتا ہے کہ محرق اسم علم ہے اور غالباً
... کسی دینی پیشوا یا کسی افسانے کے سورما (ہیرو) کا نام ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کی مدت میں غسان کی حکومت نے سب سے زیادہ شوکت حاصل کرلی۔ یہی زمانہ حکومت حیرہ کے اقبال کا بھی تھا۔ اس کے بعد سے دونوں حکومتوں میں تصادم ہونا ناگزیر ہوگیا۔ دو حریف سلطنتوں یعنی ایران اور روما لصغریٰ کے ماتحت ہونے کی وجہ سے وہ اس پر مجبور تھیں کہ وہ بعض اوقات باوجود چند روزہ ظاہری صلح کے ایک دوسرے سے اظہار نفرت کریں۔ جبلہ ثالث یا حارث الاکبر کی منذر ثالث سے جنگ ہوتی رہی جس میں جبلہ مغلوب ہوا۔ اسی جبلہ کی بیوی مریم تھی، جس کے کان کے بندوں میں دو اتنے بڑے موتی جڑے تھے کہ ہر ایک کبوتر کے انڈے کی برابر تھا۔ لیکن غسان کا سب سے بڑا بادشاہ اور حیرہ کا سب سے بیدرد دشمن حارث پنجم تھا، جو کہ حارث الاکبر اور مریم کا بیٹا تھا۔ قیصر جسٹینین (Justinien.) نے اُسے بطریق بنا دیا تھا جس کی وجہ سے اُسے بلند ترین مرتبہ حاصل ہوگیا تھا اور معاصرین اُسے بادشاہ (Basileos) کے لقب سے ملقب کرتے تھے۔ یہ لقب کبھی کبھی ماتحت امراء کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ جسٹینین نے سرحد کے پاس کے عربوں کی قیادت بھی حارث کے ہاتھوں میں دیدی تھی، اور اس طرح حیرہ کے بادشاہوں کے جو کہ سلطنت ایران کے رعایا تھے مقابلہ میں ایک قوت قائم کردی تھی۔

حارث خامس، اور منذر ثالث دو ایسی شخصیتیں ہیں، جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کی تاریخ میں خاص طور پر ممتاز نظر آتی ہیں۔ منذر اپنے حریف (حارث) پر اکثر فتحیاب رہا ۵۴۴ء میں اس نے حارث کے بیٹے کو جنگ میں گرفتار کرکے عزیٰ پر قربانی چڑھا دیا۔ ایسے معاملات میں وہ بالکل وحشی تھا۔ لیکن دس برس بعد وہ مغلوب ہوگیا۔ عربوں کی روایت میں اس جنگ کے دوران میں تین سخت لڑائیاں پیش آئیں، یعنی جنگہائے عین اُباغ وحیار، وحلیمہ ان میں سے پہلی لڑائی بہت عرصہ بعد وقوع میں آئی۔ منذر (جون ۵۵۴ء میں) عین اُباغ میں نہیں بلکہ

حیار میں جو کہ قیسرین (Kinserin) کے قریب حلب سے دو دن کے فاصلہ پر ہے فوت ہوگیا۔ جنگ حلیمہ وہی جنگ معلوم ہوتی ہے جو حیار کی لڑائی بتائی جاتی ہے۔ حلیمہ حارث کی بیٹی کا نام معلوم ہوتا ہے جسے اُس کے باپ نے حکم دیا تھا کہ وہ عطر "خلوق" سو چیدہ بہادروں کے جسموں پر مل دے۔ "وادی حلیمہ" یا "مرج حلیمہ" کا ذکر قدیم شعرا کے کلام میں، جو اکثر اس کے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ ہیں" آتا ہے۔ "الشعر دیوان العرب" "اشعار اہل عرب کا ... میں ایک شاعر ابن ابی الرعلاء (؟) غسان کے بادشاہوں اور دیگر بہادر مقتولان جنگ کی اس طرح مدح کرتا ہے :-

"جو مرگئے اور خاموش ہیں وہ مرے ہوئے نہیں، بلکہ اصلی مرے ہوئے وہ لوگ ہیں جو باوجود زندہ ہونے کے مردہ ہیں :-

ليس من مات فاستراح بميت   انما الميت ميت الاحياء

[illegible]ء میں اپنے حریف کی موت سے بارہ برس بعد حارث قسطنطنیہ گیا، اور اس عرب سردار کا نظارہ رومیوں پر اثر ڈالنے والا ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رومی نے جسٹینین کو ڈرانے کے لئے کہا "ہوشیار ہوجا! حارث آتا ہے!"

چھٹی صدی عیسوی کے اختتام پر حکومت ہائے حیرہ و غسان کا زوال شروع ہوا۔ عمرو بن منذر ثالث اپنے باپ کی جگہ ۵۵۴ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ مستعد لیکن وحشی تھا۔ شعرا نے بھی اُسے برا کہا ہے جیسی ہوئی ہجو میں اکثر انہوں نے اسے "محرق" یعنی تیز آگ میں جلنے والے کا لقب دیا ہے۔ مشہور شاعر طرفہ اس کے ظلم کا شکار ہوا۔ ایک متداول روایت کی رو سے بادشاہ نے اُسے اور اُس کے چچا متلمس کو عمان بھیجا، اور وہاں کے عامل کو ایک خط لکھا، جو ہومر Homer کے اشعار کے دو کلموں سے شروع ہوتا تھا، اور اُس میں اُن دونوں کے قتل کر ڈالنے کا حکم درج تھا۔ متلمس نے اُس خط کا مضمون پڑھ لیا اور اپنی جان بچا لے گیا، لیکن طرفہ مارا گیا۔ عمرو بن منذر نے اپنی مستعدی کا ثبوت قیصر روم کے مقابلہ میں دیا۔ یہ امر شبہ سے خالی ہے کہ قیاصرہ روم نے الصغر

شاہان حیرہ کو باضابطہ ایک رقم ادا کرتے تھے اور اُس کے بدلے میں شاہان حیرہ کی دوستی، یا وقتاً فوقتاً ساسانیوں کے مقابلے میں لڑائیوں کے موقعوں پر خیر خواہانہ جانبداری مطلوب تھی جسٹن Justin) اس ندامت بخش طریقہ کو دور کر دینا چاہتا تھا لیکن عمرو نے فوراً بازنطینی ماتحت رعایا، غسانیاں، کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ بالآخر عمرو کی کوتاہ نظری اُس کی موت کا باعث ہوئی۔ اُس نے ایک معلقہ کے مشہور مصنف عمرو بن کلثوم کی توہین کی تھی۔ اس نے عمرو کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔ مشہور تغلبی شاعر اخطل اپنے چچاؤں کی اس طرح تعریف کرتا ہے

"یہ وہ ہیں جنہوں نے بادشاہوں کو قتل کیا، اور اپنی بیڑیوں کو توڑ ڈالا"

عمرو کا جانشین قابوس یا قابوسیس Combus. or -Combrgze ہوا، جو باوجود اپنی بہادری کے جس کا بلاشبہ بعض عرب مصنفوں نے انکار کیا ہے غسانیوں کے خلاف جنگجوئی میں ناکام رہا۔ سنہ ۵۸۰ء میں نعمان ثالث ابو قابوس تخت نشین ہوا۔ اکثر شعرائے عرب نے اُس کا ذکر کیا ہے، اور وہ حیرہ کا سب سے مشہور بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن فی الواقع وہ سب سے بہتر نہیں ہے۔ وہ اپنے بھائی اسود کے مقابلہ میں عدی بن زید کی مدد سے جو کہ خسرو پرویز کے دربار میں نہایت ذی اقتدار شخص تھا تخت نشین ہوا۔ نعمان کے بعد اپنے محسن کے خلاف اُسے شبہات پیدا ہو گئے اور اُس نے اُسے قتل کر ڈالا۔ لیکن فوراً ہی خسرو کا اعتماد اُس پر سے اُٹھ گیا، اور خسرو نعمان کو ایک دشمن نہ کہ رعایا کی نظر سے دیکھنے لگا۔ خسرو نے نعمان کو گرفتار کر لیا اور سبت (Sabat) میں مرنے تک مقید رہا۔ اُس کی موت کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ طاعون میں مرا اور دوسری روایت یہ ہے کہ اُسے زہر دیا گیا، تیسری روایت ہے کہ ہاتھی کے پیروں میں کچلوا دیا گیا۔ خسرو اپنے دشمنوں کو اکثر یہ سزا دیتا تھا۔ شاعر سلمہ بن جندل کہتا ہے:- نعمان نے عرصہ تک خوشنما قبوں کے نیچے پناہ پائی، لیکن اپنی زندگی ایک ایسی چھت کے نیچے گزاری جو ہاتھیوں کے لئے بنی تھی۔ اس طرح خاندان کا خاتمہ ہوا۔ اُس کا جانشین ایاس بن قبیصہ قبیلہ لخم سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ وہ طے کے

قبیلے سے وابستہ تھا۔ یا یہ کہئے کہ اس حکومت ہی کا خاتمہ تھا اس لئے کہ اب اس کے ساتھ ایک اعلیٰ ایرانی عہدہ دار مقرر ہوا، جو اُس کی حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ بہرحال منذر ثالث کا [illegible] ختم ہو گیا اور حیرہ صرف ایک ساسانی صوبہ بن کر رہ گیا۔

نعمان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد ۶۱۰ء میں ذوقار کی جنگ ہوئی جس میں عربوں [illegible] ایرانی فوج کو شکست ہوئی۔ اس لڑائی نے عربوں کے لئے گویا اُن عظیم الشان فتوحات کا جو انہیں ایرانیوں کے مقابلہ میں بعد میں حاصل ہوئیں دروازہ کھول دیا۔

غسانیوں کا زوال حیرہ کی طرح جلد ہی شروع ہو گیا۔ حارث ششم نے جو کہ حارث اعظم (حارث پنجم) کا جانشین تھا، ۵۸۰ء کے قریب زمانہ میں عین اباغ کی جنگ میں منذر چہارم کے مقابلے میں چند بار کامیابی حاصل کی، لیکن غسانیوں کی یہ چھوٹی سی حکومت خود بھی تباہ ہو گئی۔ عمرو چہارم اُن بڑے شاعروں کی بدولت جو کہ اُس کے دربار میں باریاب ہوتے تھے اور جنہوں نے بادشاہ عمرو کے جانشینوں کی مدح سرائی بھی کی ہے، زیادہ مشہور ہے۔ عمرو چہارم کے جانشینوں کے نام اس قدر زیادہ تعداد میں ملتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض معاصر ہیں، اور ایسے حکمراں نہیں ہیں جن کے تحت سارا رقبہ ملک تھا۔ ان بادشاہوں کا لقب "خیر الفتیان" یعنی "بہترین مردمان" ہے۔ جلد ہی وہ ایسے لوگوں سے جو بظاہر اُن سے زیادہ حقیر لیکن فی الواقع زیادہ قوی تھے مغلوب ہو جاتے ہیں، اور اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں غسانیوں کی بادشاہت ختم ہو جاتی ہے۔

اب ہم چند کلمات اُس تیسری حکومت کے متعلق اور کہنا چاہتے ہیں جس کا تذکرہ ہم نے اوپر حیرہ اور غسانیوں کے ساتھ کیا ہے۔ یہ کندہ ہے، جو پانچویں صدی عیسوی کے اخیر اور چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں قائم ہوئی، اور جس کے بادشاہوں میں مشہور شاعر امرؤ القیس شامل ہے۔

حجر آکل المرار اس حکومت کا بانی بتایا جاتا ہے۔ وہ جنوب کے رہنے والے حمیریوں

کے قریب ہوچکی وجہ سے اس کے اثر سے نہیں بچ سکتا تھا۔ کندہ کا محل وقوع حمیر کے روبرو بالکل ایسا ہی سمجھنا چاہئے جیسا کہ لخمیوں کا ساسانیوں کے اور غسانیوں کا روم‌ۃ الصغریٰ کے روبرو تھا لیکن کندہ کا ایک زبردست حریف حیرہ تھا۔ کندہ کے ایک بادشاہ حارث بن عمرو نے جو کہ نہایت بہادر تھا حیرہ کے ایک حصہ پر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ وہ گاہے گاہے حیرہ اور گاہے انبار میں رہا کرتا تھا۔ لیکن منذر نے جلد بالادستی حاصل کر لی۔ ۵۲۹ء میں اس نے حارث پر حملہ کر کے اسے بھگا دیا۔ اور محض فتح پر اکتفا نہیں کی، بلکہ کندہ کے بعض امرا اور سرداروں کو جو کہ جنگ میں قید ہوگئے تھے ذبح کرا دیا۔ یہ وحشیانہ فعل امرالقیس کے حسب ذیل اشعار جمیلہ کا محرک ہوا۔ امرالقیس اپنے باپ کی کامیابی وناکامی کو کبھی نہیں بھولا۔

الا یا عین بکی لی شنینا — وبکی لی الملوک الذاہبینا

اے میری آنکھ جلتے ہوئے آنسو بہا — اور شاہان رفتہ کے لئے رو

ملوکا من بنی حجر بن عمرو — یساقون العشیۃ یقتلونا

وہ بادشاہ جو کہ حجر بن عمر کی اولاد سے تھے — اور جو قتل ہو کر رات کے آغوش میں پہنچ گئے ہیں

فلو فی یوم معرکۃ اصیبوا — ولکن فی دیار بنی مرینا

یہ صحیح ہو کہ وہ میدان جنگ میں مارے گئے — لیکن (ہائے کہاں؟) دیار بنو مرینا میں (جو کہ دشمن تھا)

تظل الطیر عاکفۃ علیہم — وتنتزع الحواجب والعیونا

پرندے اُن (کی نعشوں پر) ہر وقت سایہ کر رہے ہیں۔ اور ان کے ابرو اور آنکھوں کو ان سے علیحدہ کر رہے ہیں (یعنی کھائے جاتے ہیں)

کندہ کی بادشاہت بھی جلد ہی تباہ ہوگئی۔ حارث کے لڑکوں سلام اور شراحبیل میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ شراحبیل کلاب میں مارا گیا۔ اس کے پس پردہ متعدد قبائل کی عداوت پوشیدہ تھی۔ ان قبائل نے اسلام سے پیشتر ایام جاہلیت کی مشہور ترین جنگیں اور لڑائیاں چھیڑ دیں۔ امرالقیس نے اپنے اجداد کا انتقام لینے اور کندہ کی بادشاہت کو واپس لینے کی کوشش کی۔ وہ قیصر قسطنطین

(Justinian) کی مدد حاصل کرنے کے لئے قسطنطنیہ بھی گیا۔ اُسے امید تھی کہ حیرہ کا حریف [illegible] رومۃ الصغریٰ کا قیصر اُسے مہربانی کی نظر سے دیکھے گا۔ لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا کندہ کی بادشاہت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی

باوجود اپنی چندروزہ میعاد حیات کے یہ بادشاہت عربوں کے مستقبل کے لئے غیر اہم [illegible] نہیں ہوئی۔ آکل المرار کے عصائے حکومت کے نیچے اتنے قبائل عرب کا مجتمع ہوجانا ہمارے خیال میں جزیرہ نما کے وسطی قبائل کے ایک ہی سردار کے ماتحت مجتمع ہونے کی پہلی مثال ہے یہ اُس تحریک کی تمہید نظر آتی ہے جو کہ ایک صدی بعد بانی اسلام کے زیر اثر مختلف قبائل کے مجتمع ہونے کا باعث ہوئی۔ البتہ ہنوز وہ مذہبی پہلو مفقود تھا جس نے اسلام کو ایسی عظیم الشان قوت بخشی۔ کندہ کی حکومت محمد صلعم کی وفات کے بعد قبائل عرب کی "ردت" کے زمانہ میں ختم ہوگئی۔ کندہ کی تباہی تو بہرحال ہو رہی لیکن اُس کے حالات پر غور کرنے سے یہ ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک صدی میں عربوں نے حکومت کا نظام قائم کرنے میں کس حد تک ترقی کرلی تھی۔

حیرہ کے شمال میں اس طرح تین حکومتیں تھیں جنہوں نے عرب کی حکمرانی بانٹ رکھی تھی جن قبائل نے کہ ان حکومتوں کے قائم کرنے میں حصہ لیا وہ اکثر جنوبی عرب سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُنکے خروج کی وجہ سے اُنکے ہمراہ تمدن کے اصول جن سے کہ شمال کے بادیہ گرد قطعاً بیگانہ تھے اشاعت پذیر ہوگئے۔ عرب بالخصوص حیرہ و غسان کے عرب ایران و رومۃ الصغریٰ کی جنگوں میں شریک رہتے تھے۔ اُنہوں نے قریب رہ کر ان دونوں سلطنتوں کے تمدنوں کو دیکھا۔ انہوں نے جنگی تجارب حاصل کئے اور اپنے زمانے کے فن حرب کے بہترین اساتذہ سے جنگی تعلیم حاصل کی۔ اس کی عربوں کے لئے جو اہمیت آگے چل کر ثابت ہوئی۔ اُس کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ایک طرح کی بیداری تھی، جو کہ آغاز اسلام کی

فتوحات کا موجب ثابت ہوئی۔ یہ خیال کہ خالد اور مثنیٰ جاہل یا نیم وحشی تھے یا اُنکے لشکر نیم زدن میں اور ریگ روز بادیہ گردوں کی حالت سے باقاعدہ سپاہیوں کی جماعت میں بدل گئے بالکل غلط ہے۔ عربوں کی ترقی اُن کی مادی اور ادبی تمدن میں بھی، جیسا کہ ہم اگلے لکچر میں دکھلائیں گے، یکساں نمایاں تھی۔



مَن کی موج

(۱)

کل میرے ایک دوست نے کہا "دیکھو یہ پھول کتنا خوبصورت ہے" میں نے سنا اور نفرت سے منہ پھیر لیا، پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک آدمی دکھایا اور کہا "یہ بڑا نیک ہے" میں پھر اُدھر سے پلٹ گیا۔ لوگ خوبصورت، نیک، اچھا، بُرا اور اسی قسم کے لفظ بولتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں۔ میں انھیں سنتا ہوں تو رنجیدہ ہوتا ہوں۔ جیسے ہی میرے کانوں میں "خوبصورت" کی آواز آتی ہے، ویسے ہی اندر والا کہتا ہے کہ "پھر بدصورت بھی ہوگا!" جیسے ہی میں "نیک" سنتا ہوں، اندر والا پوچھتا ہے "پھر تو بدی کہیں ضرور ہوگا" اگر میں پرندہ ہوتا تو نیک، بد، حسین، کریہہ غرضکہ سب اسماء صفات کی سطح سے اوپر اُڑ جاتا۔۔ ۔ ۔۔۔۔ ۔۔

میرے ایک دوست نے کہا "پاک اور عقلمند ہو، تو دنیا کو دس گنا زیادہ فائدہ پہونچے" میں نے کہا "تو پاکی کو دور کر دے اور عقل مندی کو ہٹا دے تو دنیا کو بیس گنا زیادہ فائدہ پہونچے" وہ خفا ہو گیا۔ وہی اسمائے صفات! کل میں ایک دکان پر گیا، وہاں دیکھا کہ ہر چیز پر رنگ برنگ کی چٹھیاں لگی ہوئی ہیں، جن پر قیمتیں لکھی ہیں۔ کیا انسانوں پر بھی چٹھیاں لگانے کی ضرورت ہے! پھر اسمائے صفات کیوں؟ اچھا کیوں؟ برا کیوں؟ نیکی کیوں؟ بدی کیوں؟ ایمانداری، بے ایمانی، فیاضی، کنجوسی، یہ سب کس لیے؟

میں نے ایک فقیر سے کہا "لوگ فیاض ہوتے تو اچھا تھا!" اس نے مجھے بہت بُرا بھلا کہا۔ پھر میں نے ایک امیر سے کہا "لوگ فیاضی کی تعریف نہ کرتے تو اچھا تھا" اُس نے

مجھے اپنے مکان سے نکلوا دیا۔ وہی اسمائے صفات! نیکی چلے کی گئی، پھر نیکی کہلائی! بہادری پہلے دکھائی گئی، پھر صفت بنی! فیاضی، ہمدردی، احسان، ظلم، کنجوسی، سب پہلے پیدا ہوئے پھر انہیں نام دیئے گئے۔ دریا سیدھا بہتا ہو، دیواریں کھڑی کر دو تو بہاؤ بدل جائے گا۔ اسی طرح دیواریں کھڑی کرتے جاؤ، تو دریا پانی کی بھول بھلیاں بن جائے گا۔ وہی نام کا پھیرا صفت بندی، درجہ بندی، اسم بندی، سب دراصل دیوار بندیاں ہیں۔ سیدھے راستے سے بہت کم لوگ بھٹکتے ہیں۔ کسی کو نیک مت کہو، کوئی برا نہ ہوگا۔ کسی کو سخی مت کہو، کوئی کنجوس نہ ہوگا۔ نفع کی خواہش چھوڑ دو، مکانوں سے پہرا اٹھالو، چور ڈاکو غائب ہو جائیں گے۔ بہادری مٹا دو، بزدلی بھی مٹ جائے گی۔ حکم اٹھالو، عدول حکمی نہ ہوگی، اچھی صفتیں اٹھالو، بری صفتیں آپ جاتی رہیں گی۔ دنیا ان دیواروں کو کیوں پسند کرتی ہے؟

من کی روشنی! یہ بڑی چیز ہے۔ میں اندھیری رات بھی ہو تو من کی روشنی میں سیدھا اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ میرے دوست کے گھوڑے کا بھی یہی حال ہے۔ کل میں نے گلی میں رنگ برنگ کی قندیلیں روشن کیں، اور پرچھائیں پڑنے لگی، اور گھوڑا بدکنے لگا۔ رنگین روشنیاں نہ ہوتیں تو رنگین پرچھائیاں بھی نہ ہوتیں۔ دوست نے پوچھا "یہ کیا کرتے ہو؟" میں نے کہا، "اسمائے صفات پیدا کرتا ہوں، نتیجہ تم دیکھ لو۔" رنگین قندیلیں اچھی صفتیں ہیں، پرچھائیاں بری صفتیں۔ اُس کا نام مٹا دو تو اس کا نام بھی نہ رہے۔ من کی صاف، سفید روشنی سنسار کے ہیر پھیر کے لئے کافی ہے۔ دیکھیں اس پہیلی کو کون بوجھتا ہے؟

---

(۳)

"دنیا بدل رہی ہے"

کل اچانک یہ الفاظ مجھے سنائی دیئے۔ میں حسب دستور اپنے مکان کے دروازے پر

بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے ایک نئی عمارت بن رہی ہے۔ مزدوروں نے لکڑی اور بانس کا ایک بڑا اونچا مچان بنایا ہے۔ دو دو تین تین بھاری بھاری پتھر سر پر رکھے ہوئے اس مچان پر چڑھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس مکان کے مزدوروں کی طرح ہم سب اس سنسار میں اپنی بلندی دوسروں کی بلندی کے لئے بنائے رہیں؟...... کیا آتش بازی کی ہوائی کی طرح ہم سب محض اس لئے اوپر اڑتے ہیں کہ دوسرے ہمیں دیکھ کر خوش ہوں؟ ۔ " اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے:

"دنیا بدل رہی ہے"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرا دوست ہاتھ میں ایک اخبار لئے ہوئے کھڑا تھا۔ آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر ویسی ہی ہنسی جیسی مالک پیسے میں ہنستے ہیں ــــ کہنے لگا "جانتے ہو یہ کیا بن رہا ہے؟ یہاں بے تار کی خبر رسانی کا اسٹیشن ہوگا۔ ولایت کے گانے، امریکہ کی تقریریں یہاں سنائی دیں گی ــــ دنیا بدل رہی ہے:"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں جب کبھی "بیسویں صدی" "نیا زمانہ" "نئی دنیا" "نئے خیالات" اور اسی سانچے کے ڈھالے ہوئے دوسرے الفاظ سنتا ہوں، تو بے اختیار ہنس دیتا ہوں، میں نے جواب دیا "ہاں! پرانی آتما نیا روپ لے رہی ہے، پرانے چھلکے پر نیا پیلا غل رہا ہے، لیکن گودا وہی ہے جو ویدوں کے زمانے سے پہلے تھا:" میرے دوست نے اپنی عادت کے موافق بڑے زور سے قہقہہ لگایا کہنے لگا "تم نے تو دنیا تج دی ہے، جگ نے الٹ پھیر تم کیا جانو؟ کل صبح زبردستی تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا، تب تم کو معلوم ہوگا کہ ہماری مرنی کروٹ لے رہی ہے یا نہیں" یہ کہا اور ہنستا ہوا چلا گیا ــــ

میں دور تک اسے دیکھتا رہا کیسے بے فکر اور بھولے لوگ ہیں، ایک جیب میں ولایتی تانبا، دوسرے میں دیسی کسوٹی۔ اُسے اس پر کستے ہیں، زرد لکیر دیکھ کر اسے کندن سمجھتے ہیں

اصل بدلنا تو کسوٹی کا ہے! میں پھر مکان، مچان اور مزدوروں کی دھن میں لگ گیا یہ دو ہاتھ دو [illegible] تھے، اسی طرح اپنی ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ نیچے سے اوپر لے جا رہے تھے [illegible]

آج میرا دوست مجھے دن بھر شہر میں ادھر اُدھر پھراتا رہا۔ اس نے مجھے نئی نئی عمارتیں دکھائیں، پرانے اینٹ پتھر کے نئے استھان! پرانی آتما کے نئے چولے!! "یہ نئی سڑک ہے" "اس پر ٹریم چلے گی"۔ "یہ نیا بنک گھر ہے" "یہ نئی دوکان ہے" "یہ نئے قسم کا مدرسہ ہے"...... خدا معلوم کیا کیا بتاتا رہا، اور باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا، جیسے لڑکیاں ہنس ہنس کر اپنی سہیلیوں سکھیوں کو پرانی گڑیوں کے نئے زیور دکھاتی ہیں۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا آنکھیں نئے نئے روپ دیکھ رہی تھیں، کانوں میں اس کی آواز آرہی تھی لیکن اندر والا گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح یہ کہہ رہا تھا "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے" جب تھک گیا تو کہنے لگا "اب بھی قائل ہوئے کہ نہیں! شانتی پور بدل رہا ہے، دنیا بدل رہی ہے" میں ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا۔۔۔!

سامنے ایک حلوائی کی دکان تھی، ترازو ہاتھ میں لئے ہوئے کچھ تول رہا تھا۔ میں اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں لے گیا حلوائی سے کہا:

"لالہ! دنیا بدل رہی ہے، تم اپنے باٹ بدل دو" ہنسنے لگا کہا "ہمارے یہاں اسی کا چلن ہے، گاہک نہیں مانتے" پھر ایک بزاز کے یہاں گئے، کپڑا ناپ رہا تھا میں نے کہا "اپنا گز نہیں بدل دیتے" اس نے منہ پھیر لیا۔ . .

راستے میں ایک سپاہی ملا، اُس کے ساتھ ایک بھلا مانس تھا، ہاتھ میں ہتکڑی، آنکھ میں شرافت! میں نے کہا "جمعدار صاحب! اسے کیوں پکڑا ہے؟" کہنے لگا "اس نے اپنے بھوکے بچوں کے لئے آٹا چرایا ہے" میں نے کہا "کیا کوتوال صاحب نے چوری کا معیار ابھی نہیں بدلا؟" وہ مجھے بُری نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا ـــــ سچا پھل اندرائن کا پھل ہوتا ہے!

[illegible] چل کر ایک مکان میں پہونچے، ایک لکڑی کے تختے پر بڑے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "سیٹھ اشرفی مل کا پُن خانہ" ہزاروں اپاہج اور نکمے جمع تھے۔ زبردستی کے اپاہج! کام کے نکمے!! میں نے دارو غہ سے پوچھا "بھائی! انہیں خیرات کیوں دیتے ہو؟" کہنے لگا "نیک کام ہے سیٹھ کی دیا معلوم ہوتی ہے، فیاضی ہے!" نیک کام! دیا!! فیاضی..!! سب وہی پرانے سانچے، کیا واقعی دنیا بدل رہی ہے۔

پرانے باٹ، پرانا گز، پرانا قانونی معیار، پرانا اخلاقی معیار، دنیا میں ہر طرف وہی پرانی کسوٹی: اور اندر سے آتما کی وہی پرانی گھڑی کی سی ٹک ٹک "اصلی بدلنا تو کسوٹی کا ہے"

سوامی [illegible] نے دوست کی طرف غور سے دیکھا، اُس نے آہستہ سے کہا "معلوم ہو گیا، اب لوٹ چلو"

دھرتی نئے دن یا سوما اُگلتی ہے، سسار اپنا روپ ست یا بدلتا ہے، پُرانے باٹ گھس گئے، پُرانے گز چھوٹے ہو گئے، بہت سے پُرانے حرم ہلکے ہو گئے، پُرانی نیکیاں، بدیاں نہیں، پُرانی بدیاں نئے سانچوں میں ڈھلیں، پھر دنیا انہیں کیوں نہیں بدلتی؟ بالکوں کی طرح ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو کلیجے سے کیوں لگائے ہوئے ہے؟ ست جگ کے ست کو کلجگ میں بھی ست یوں جانتی ہے، ایک پُن خانہ بنا کر دس کی میاد کیوں رکھتی ہے، آج سانپ کی رکھشا کر کے [illegible]ل ہو لاکھوں پاتی ہے؟... ... .نئے کندن کے لئے نئی کسوٹی کیوں نہیں ڈھونڈھتی؟ وہی [illegible]لوائی کی بات۔

"گاہک نہیں مانتے"

[illegible] دوست دھرتی کی کروٹ کا قائل نہیں رہا، میں اُس سے کبھی کبھی ہنسی سے [illegible]چھتا ہوں "دنیا کب بدلے گی؟" اس سوال کو سن کر اس کی حالت بدل جاتی ہے۔ آنکھیں [illegible]ل کر ایسی ہو جاتی ہیں جیسے کوئی شام کے دھندلکے میں دور کی چیز دیکھ رہا ہو، وہ بہت دھیمی

آواز سے جواب دیتا ہے۔

جب لوگ آئیں گے:

(باقی آئندہ)

غزل

جناب دل شاہجہانپوری

جویائے حقیقت ہوں عالم سے جداگانہ — دل مائل کعبہ ہے نہ رخ جانب بتخانہ

تاثیر بیاں بھر دے اسے گردش پیمانہ — ساقی کو سنانا ہے افسانۂ دردانہ

ہر ذرے میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے — اے اہل نظر دیکھو جاکستر پروانہ

ہر شے سے عیاں ہو کر پردے میں نہاں ہو جا — چھا جائیگی خود حیرت اے جلوۂ جانانہ

ہے مشرب رنداں میں انداز طلب یہ بھی — ہر گردش ساغر پر اک نعرۂ مستانہ

جب صاعقہ لہرائے حد جانا منزل کی — چل وادیٔ ایمن تک سن طور کا افسانہ

یوں جل کے سر محفل تصویر وفا کھینچی — پھرتی ہے نگاہوں میں جانبازیٔ پروانہ

حالات الم کہکر بیمار نے دم توڑا — آخر کا یہی ٹکڑا تھا حاصل افسانہ

کیا جانے کہاں موجیں کھینچے لیے جاتی ہیں — پہنچا ہیں ساحل تک اے ہمت مردانہ

دنیا رحقیقت میں آزاد تعین ہیں — ہم نے کبھی جھگڑا یا کعبہ سے نہ بتخانہ

اک مست ابھی اے دل کہتا ہوا گذرا ہے
صد زہد بیک جرعہ نذر مے و میخانہ

ڈراما کیا چیز ہے؟

میں ہندوستانی اکاڈمی کی فرمائش سے رینارڈستاکے ناٹک سینٹے حوں کا ترجمہ کر رہا ہوں اور اس پر مقدمہ بھی لکھ رہا ہوں۔ یہ اس مقدمہ کا پہلا حصہ ہے جو مکرمی جناب ڈاکٹر [illegible] صاحب سکرٹری ہندوستانی اکاڈمی کی اجازت سے جامعہ میں شائع کیا

(۱)

آرٹ کی تعریف قبل اس کے کہ ہم ڈراما کی ماہیت سے بحث کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آرٹ کی مختصر سی تعریف کر دی جائے۔ آرٹ کا لفظ اب اردو زبان میں کثرت سے استعمال ہونے لگا ہے لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں ہے۔ اصل میں یہ دو مختلف معانی پر حاوی ہے

(۱) وہ تخلیقی قوت جس کے ذریعے سے انسان مادی اشیا اور ذہنی تصورات کی تشکیل اس طرح کرتا ہے کہ وہ حسین بن جاتی ہیں یعنی ان میں ایک خاص ترتیب، تناسب یا توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ مشاہدۂ جمال کے ذوق کو جو ہماری طبیعت کا فطری خاصہ ہے تسکین دیتی ہیں۔ مثلاً مصوری یعنی وہ قوت جس کے ذریعے سے سطح کاغذ پر دلکش اور خوشنما نقوش بنائے جاتے ہیں۔

(۲) حسین چیزیں جو اس قوت تخلیق کے محسوس مظاہر ہیں تصویر، نغمہ، شعر وغیرہ

دوسرے الفاظ میں آرٹ صناع کے کمال کو بھی کہتے ہیں اور ان مصنوعات کو بھی جن میں یہ کمال ظاہر ہوتا ہو۔

غرض آرٹ ایک طرح کی صنعت ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد افادی یا اقتصادی نہیں ہوتا بلکہ جمالیاتی ہوتا ہے یعنی وہی ذوق جمال کو تسکین دینا۔ اس کے لیے

یہ ضروری نہیں ہے کہ موضوع صنعت خود حسین ہو بلکہ حسن طرز ادا کی خوبی اور دلکشی سے پیدا ہوتا ہے البتہ یہ شرط ہے کہ موضوع میں تناسب اور ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل پانے کی صلاحیت موجود ہو اب چاہے صناع اس کی عکسی تصویر پیش کرے یا اس میں اپنے تخیل سے رنگ آمیزی کرے۔

آرٹ زندگی کی دوسری قدروں یعنی مذہب اخلاق یا علم و حکمت وغیرہ کے مقابلے میں اپنا ایک مستقل وجود رکھتا ہے لیکن ان سے بے تعلق نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے شعر کو لیجے اس کے ناقص یا کامل ہونے کا معیار مذہب اخلاق اور علم سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ شعر میں ہم جو چیز ڈھونڈھتے ہیں اور جس سے شاعری کی جان سمجھتے ہیں وہ روحانی معرفت یا اخلاقی بصیرت یا علمی حقیقت نہیں بلکہ خیالات اور الفاظ کی خوشنمائی ترتیب، ہم آہنگی، روانی اور دلکشی ہے جس کے ذریعے سے شاعر کا تخلیق حسن کا شوق اور شعر فہم کا شاہدۂ جمال کا ذوق پورا ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ شعر کا موضوع انسانی زندگی اور عالم فطرت کا ہر جلوہ ہے اس لئے اس میں کبھی کبھی مذہبی عقیدت کا اظہار یا نیکی کی تلقین یا علمی حقائق کی تعلیم بھی ہوتی ہے لیکن مخصوص شاعرانہ رنگ میں جس میں خیالات کا وزن اتنا نہیں ہونے پاتا کہ طرز ادا کی سبک روی میں خلل پڑے۔

آرٹ سب سے زیادہ موثر اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موضوع انسان کی زندگی اس کے جذبات، اس کے خیالات، اس کی آرزوئیں اور اس کے کام ہوتے ہیں بعض فنون لطیفہ مثلاً موسیقی، نقاشی، سنگتراشی وغیرہ میں ہمیں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے لیکن ادب کے بعض شعبوں مثلاً شعر، ناول، ڈراما وغیرہ میں کبھی کبھی زندگی کا مجموعی مرقع نظر آتا ہے۔ جو ہمارے لئے نہایت دلچسپ ہے اور جس کا اثر ہمارے دل پر بہت گہرا اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ یہ مرقع بظاہر ایک شخص یا چند اشخاص کی زندگی کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسی قوت محرکہ نہاں ہوتی ہے کہ انسان کا تصور ساری نوع انسانی کی زندگی پر پھیل کر اس میں یوں جذب ہو جاتا ہے جیسے سمندر میں کنکری پھینکنے سے

[illegible]ں کا ایک دائرہ بنے اور بڑھتے بڑھتے اُس کی بے پایاں وسعت میں محو ہو جائے۔ یہ قطرے میں دریا [illegible] جزو میں کل نظر آنا آرٹ کے اکثر شعبوں میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا اظہار پوری طرح ڈراما میں ہوتا ہے۔

(۲)

[illegible] آرٹ کے ایک شعبے کے | ڈراما یونانی زبان کا لفظ ہے اس کا مصدر δραω ہے جس کے معنی ہیں کرکے دکھانا۔ یہ ادب کی اس صنف کا نام ہے جس کے ذریعے سے انسانی زندگی کے واقعات محض بیان کئے جانے کے بجائے کرکے دکھائے جاسکیں ڈراما میں شاعر کو جو تصویریں کرنا ہوتا ہے اسے چند اشخاص کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان اشخاص کا بھیس بدل کر انکی گفتگو اور انکے کاموں کو دہرائیں تاکہ دیکھنے والوں کو سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گزرتا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ بہت دلپذیر اور موثر ہے اور ادب کے کسی اور شعبے کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔

پہلے ڈراما شاعری کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل ادبی صنف کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اب اس کے لئے نظم کی شرط نہیں رہی بلکہ نظم میں ڈراما لکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

ڈراما اور ناول میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں انسانی زندگی کے مختلف جلوے دکھاتے ہیں۔ لیکن ناول کا اثر صرف تخیلی مشاہدے پر پڑتا ہے اور ڈراما کا حسی مشاہدے پر بھی۔ ناول میں مصنف دوسروں کی سرگذشت بیان کرتا ہے مگر ڈراما میں وہ خود اشخاص کو گفتگو کرنے دیتا ہے اور اسی گفتگو میں ان کی جذبات، انکے خیالات، ان کی سیرت ان کا عمل غرض ان کی ساری زندگی دکھاتا ہے۔ ناول لکھنے والا آزاد ہے کہ اپنی کہانی کو سو صفحے میں لکھے یا ہزار صفحے میں کیونکہ ناول پڑھنے والے کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں مگر ڈراما لکھنے والے کو یہ اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ قصہ ٹھیک اتنا بڑا ہو کہ تین یا ساڑھے تین گھنٹے میں دکھایا جاسکے۔ اس سے زیادہ یا اس سے کم نہ ہو۔

ناول میں واقعات چاہے جتنے زمانے پر پھیلا دئے جائیں اُس کے اثر میں کوئی خلل نہیں پڑتا کیونکہ وقت کے طول کو صرف تخیل کے سامنے پیش کرتا ہے مگر ڈراما میں قصے کا زمانۂ وقوع کم سے کم رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں وقت کے طول کا مشاہدہ کرانا ہے۔ ناول میں ایک شخص کے پیدا ہونے سے لیکر اس کے مرنے تک کے حالات تفصیل سے بیان کیے جا سکتے ہیں مگر ڈراما میں چند دنوں یا چند ساعتوں کے واقعات میں اس کی زندگی کی مکمل تصویر دکھانی پڑتی ہے غرض بمقابلہ ناول کے ڈراما میں کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں ہیں۔ یہاں بہت محدود ذرائع سے کام لیکر بہت گہرا اثر پیدا کرنا ہے اس لئے نہایت واضح مشاہدے، صحیح قوت انتخاب اور موثر طرز ادا کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کوئی شخص اکبر اعظم پر ایک ڈراما لکھتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اکبر کے سوانح حیات پر اتنا عبور رکھتا ہو اور اس کا تصور اتنا واضح ہو کہ قصہ لکھتے وقت اس بادشاہ کی ساری زندگی متحرک تصویروں کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گذر جائے اب اس کی قوت انتخاب کا کام ہے کہ ان میں سے چند تصویریں چھانٹ لے جو اتنی موثر اور اتنی معنی خیز ہوں کہ دیکھنے والا ان کے بیچ کے خلا کو آسانی سے پر کر سکے اور اسے پورا سلسلہ نظر آ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان تصویروں کو دکھانے کے لئے اس کے پاس صرف دو ذریعے ہیں گفتگو اور عمل، انہیں دونوں چیزوں کے ذریعے سے اُسے اکبر اور اُس کے زمانے کے لوگوں کی سیرت، انکے جذبات وخیالات انکے اغراض و مقاصد، اُن کے آپس کے تعلقات، اُن کی باہمی کشمکش، ان کی کامیابی اور ناکامی کا نقشہ کھینچنا ہے۔ اس لئے وہ ایسے الفاظ اور ایسے اعمال اختیار کرے گا جو چشم و گوش کو فوراً متوجہ کرلیں، ادراک میں سما جائیں دل میں بیٹھ جائیں، وہ اس کا بھی خیال رکھے گا کہ گفتگو اور عمل میں صحیح تناسب قائم رہے۔ جہاں تک اسٹیج کے ذرائع اور اثر آفرینی کے اصول اجازت دیتے ہیں وہ واقعات کو عمل کے ذریعے سے دکھائے گا لیکن جب ان کا دکھانا ناممکن یا نامناسب ہو تو ان کا ذکر گفتگو میں سے آنے پر اکتفا کرے گا غرض اُس کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے ناٹک کا پڑھنے والا دو گھنٹے کے مطالعے میں اور اس کا تماشا دیکھنے والا تین چار گھنٹے کے مشاہدے میں اکبر اور اُس کے

عہد کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ لے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ڈراما کو آرٹ کے معیار پر پہنچانے کے لیے ایک شرط باقی ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قطرے میں دریا اور جزو میں کل دکھانا یعنی انفرادیت میں عمومیت پیدا کرنا ڈراما کا اہم ترین مقصد ہے اس لیے جس ناٹک کا ذکر اوپر کی مثال میں ہے وہ کامیاب اس وقت کہلائے گا جب اس میں اکبر اور اس کے ساتھیوں کے حالات اس طرح دکھائے جائیں کہ دیکھنے والے پر زندگی کے وہ راز جو اکبر میں اور نوع انسانی کے ہر فرد میں مشترک ہیں کھل جائیں۔

ابھی تک ہم نے ڈراما پر حیثیت آرٹ کے ایک شعبے نظر ڈالی ہے اور یہی اس کی اصلیت ہے جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے ذوق مشاہدہ کو انسانی زندگی کا دلکش جلوہ دکھا کر تسکین دے۔ اس سے ضمنی طور پر کسی خاص اخلاقی، سیاسی، معاشی نظریے کی تبلیغ، یا عام اصلاح اور تعلیم کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس ضمنی مقصد کے لیے کھلی ہوئی کوشش نہ کی جائے بلکہ وہ تماشے کے لطف کے ساتھ پردے پردے میں حاصل ہو جائے۔ اگر اصلاحی یا تعلیمی رنگ غالب آگیا تو پھر ڈراما ڈراما نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی قصہ بن جاتا ہے اور خالص آرٹ کے دائرے سے باہر ہو جاتا ہے۔

(۳)

ڈراما کے بنیادی عناصر | ڈراما دو بنیادی عناصر سے مرکب ہے جو مساوی اہمیت رکھتے ہیں (۱) قصہ (۲) اشخاص۔

ڈراما کے قصے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کے واقعات بہت موثر اور جاذب نظر ہوں، ہر چیز کر کے دکھائی جا سکے، کوئی جزو ایسا نہ ہو کہ مصنف کو الفاظ میں سمجھانے یا بیان کرنے کی ضرورت ہو۔ قصے کے کچھ اجزا خصوصاً ایسے حصے جن کے دیکھنے سے کراہت ہو اگر عمل کے ذریعے سے نہ دکھائے جائیں بلکہ اشخاص کی گفتگو میں انکا ذکر آئے تو کوئی حرج نہیں لیکن ایسے حصے ڈراما میں جتنے کم ہوں اچھا ہے، کیونکہ جب کوئی ناٹک تھیٹر میں دکھلایا

جاتا ہے تو دیکھنے والے سارے قصے کو آنکھ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس کا بیان کانوں سے سن کر انہیں اطمینان نہیں ہوتا۔

قصے کو زیادہ دلچسپ اور دلنشیں بنانے کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کا رخ بالکل سیدھا اور یک رنگ نہ ہو بلکہ اُن کا رجحان کم سے کم دو مختلف سمتوں میں ہو، تاکہ دیکھنے والے آخری سین تک یہ اشتیاق رہے کہ انجام کیا ہوگا۔ اس اثر کو گہرا کرنے کے لئے ڈراما میں دو یا زیادہ قوتوں کی باہمی نزاع اور کشمکش دکھائی جاتی ہے خواہ یہ مجرد قوتیں مثلاً تقدیر، تدبیر نیکی اور بدی وغیرہ ہوں یا اشخاص اور جماعتیں ہوں۔

سب سے اہم بات جو ہم پہلے کہہ چکے ہیں یہ ہے کہ قصے کے واقعات سے عمومیت ظاہر ہو یعنی دیکھنے والے پر یہ اثر پڑے کہ زندگی کے جو نشیب و فراز، قصے کے اشخاص کو پیش آتے ہیں وہ دنیا میں سب کو پیش آیا کرتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ڈراما محض تھوڑی دیر کے لئے ہمیں متوجہ کر سکے گا اور ہمارے دل پر اس کا کوئی گہرا نقش نہ بیٹھنے پائے گا۔

اشخاص کی اہمیت ڈراما میں ناول سے اور افسانے کی دوسری اصناف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں مرقع کی مرکزی تصویر انسان کی ذات ہے اور خارجی دنیا محض پس منظر کا کام دیتی ہے۔ عالم فطرت کے جلوے دکھائے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے آئینے کے لئے زنگار کا کام دیں اور چونکہ ڈراما کو فوری اور قوی اثر پیدا کرنے کے لئے ہر نقش میں گہرا رنگ بھرنے کی ضرورت ہے اس لئے اشخاص کی سیرت میں بھی تازگی اور زندگی پیدا کرنے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

ڈراما نگار کے لئے اشخاص کی اندرونی زندگی کی واضح اور جاذب نظر تصویر کھینچنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اُسے اس کی اجازت نہیں کہ ناول لکھنے والوں کی طرح کسی شخص کی نفسی کیفیات کی تحلیل اپنی طرف سے کر سکے۔ اس کے اشخاص خود اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے اپنی سیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار کے لئے مناسب موقعے پیدا کرنا ایک دوسرے شخص

مشابہ اور متضاد اشخاص کو اس طرح جمع کرنا کہ ان کی گفتگو سے ہر ایک کے دل کی گہرائی پر روشنی [illegible] باہمی کشمکش پیدا کرنا تاکہ ان کی خصوصیات اچھی طرح ابھر آئیں یہی ڈراما نگاری کا کمال ہے۔

مگر اس سے بھی زیادہ کمال یہ ہے کہ اشخاص میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ جو اُن کی بدولت ہے ایک طرح کی عمومیت پیدا کیجائے۔ شخص یا کیرکٹر کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سیرت میں جداگانہ اور مخصوص صفات رکھتا ہو جو اُسے دوسروں سے ممتاز کریں۔ ڈراما نویس مجبور ہے کہ اکثر صورتوں میں اس شان کو قائم رکھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اُس سے یہ بھی توقع کیجاتی ہے کہ وہ اپنے قصے کے اہم اشخاص کو کسی طبقے، کسی جماعت یا پوری نوعِ انسانی کے نمائندوں کی حیثیت سے پیش کرے تاکہ اُس کی مثال دوسروں پر بھی صادق آسکے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

اوپر کے صفحوں میں ڈراما کے بنیادی عناصر کا عام حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ڈراما کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور ہر قسم میں یہ عناصر ایک خاص صورت اختیار کرتے ہیں اس لئے اس سے کسی قدر تفصیلی بحث کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقسام ڈراما کے ذکر کے سلسلے میں ان پر جدا جدا نظر ڈالی جائے۔

(۴)

ڈراما کی قسمیں ڈراما کے قصے کا پڑھنے والوں اور دیکھنے والوں کے احساس و جذبات پر جو عام اثر پڑتا ہے اُس کے لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) المیہ (۲) فرحیہ۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ ڈراما میں جذبات پر بہت گہرا اثر ڈالنا ہوتا ہے تاکہ تھوڑی سی دیر میں دیکھنے والے کا احساس و مشاہدہ کافی لطف اندوز ہو سکے۔ جس طرح انسان کے سارے جذبات میں احساس کی دو بنیادی کیفیتوں راحت و الم میں سے کوئی کیفیت ضرور موجود ہوتی ہے اسی طرح ڈراما کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی راحت یا الم کا

رنگ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی ڈراما زندگی کا المناک پہلو دکھاتا ہے اور دیکھنے والے کے دل پر لطف مشاہدہ کے ساتھ حسرت والم کی کیفیت طاری کر دیتا ہے، کبھی فرحناک پہلو کا منظر دکھاتا ہے اور انسان کو محظوظ ہی نہیں بلکہ مسرور بھی کرتا ہے۔ یوں تو ہر ڈرامے میں یہ دونوں رنگ موجود ہوتے ہیں لیکن کسی میں ایک غالب ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔ جس ڈرامے میں الم کا رنگ زیادہ گہرا ہو وہ المیہ کہلاتا ہے جس میں راحت کا ہو اُسے فرحیہ کہتے ہیں۔ بعض وقت المناک اور فرحناک عناصر کا پلہ برابر ہوتا ہے۔ ایسے ڈراما کو ہم المفرحیہ کہہ سکتے ہیں اور اسے ایک تیسری قسم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ رواج ڈراما کی دو ہی قسموں نے پایا ہے۔ اس لئے ہم صرف انہیں ذکر کرینگے۔

المیہ | جو شخص مشاہدۂ نفس سے کام لیتا ہے وہ جانتا ہے کہ الم کا جذبہ راحت سے زیادہ قوی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ راحت و مسرت سے انسان کے جسم و روح پر ایک مستی سے چھا جاتی ہے ایک نشہ سا مسلط ہو جاتا ہے اس لئے اس کا احساس کسی قدر کند ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انتہائی خوشی کے عالم میں انسان کو اپنی کچھ خبر نہیں رہتی اور جب یہ کیفیت گذر جاتی ہے تو اسے ہوش آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنا خوش تھا۔ بخلاف اس کے الم حس اور ادراک کو اس قدر تیز کر دیتا ہے کہ انسان کو اس کی ہر خلش، ہر کسک، صاف محسوس ہوتی ہے۔ جب تک ہم کسی جسمانی یا روحانی کرب میں مبتلا رہتے ہیں اس کا احساس ہمارے دل پر چھایا رہتا ہے۔ کسی دوسرے احساس کو ابھرنے نہیں دیتا۔ اس لئے ڈراما کی دو خاص قسموں میں سے المیہ اثر کے لحاظ سے فرحیے سے بہت بڑھا ہوا ہے چنانچہ پہلے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ڈراما کا اصل آرٹ المیئے میں ظاہر ہوتا ہے اور فرحیہ محض ایک دل بہلانے کا کھلونا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال مبالغے پر مبنی تھا اور جدید زمانے میں غالباً شیکسپیر کے فرحیوں کے دیکھنے کے بعد اہل نظر سے بدلنے پر مجبور ہوئے لیکن اس میں اب بھی اسی کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ہر زبان میں بہترین ناٹک تقریباً سب کے سب المیئے ہیں۔

المیے کے پڑھنے یا دیکھنے سے جو کیفیت لوگوں کے قلب میں پیدا ہوتی ہے اس میں

بے نمایاں حسرت والم کے جذبات ہیں لیکن انکے ساتھ خوف وعبرت ، ہمدردی اور تعریف بھی پیدا ہوتی ہے ۔ جو ڈراما محض رنج ومصیبت کی تصویر ہو جس کے دیکھنے سے سوائے غم اور اندوہ افسوس اور رقت کے اور کوئی اثر دل پر نہ ہو وہ المیہ نہیں بلکہ میلوڈراما (رقت انگیز ڈراما) کہلاتا ہے ۔ کسی شرابی کا شراب خوری کی بدولت تباہ ہو جانا ، کسی جواری کا قمار بازی کے پیچھے گھر بار لٹا دینا ، ایسے واقعات ہیں جنہیں دیکھ کر رنج ہوتا ہے تکلیف پہنچتی ہے لیکن سوائے ان لوگوں کے جن کی طبیعت میں غیر معمولی درد ہو کسی کو ان بدنصیبوں سے ہمدردی نہیں ہوتی اس لئے یہ واقعات میلوڈراما کے موضوع ہو سکتے ہیں مگر المیے کے نہیں ۔ کسی بیمار کے جسمانی یا دماغی آلام ، کسی مفلس کی فاقہ کشی کی مصیبت دیکھنے والوں کے دل میں افسوس کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بھی پیدا کرتی ہے لیکن بجائے خود تعریف کی مستحق نہیں اس لئے جو قصہ محض ان چیزوں کے ذکر پر مبنی ہو اس میں المیے کا رنگ پیدا نہ ہوگا ۔ المیے کی شان یہ ہے کہ اس کا ہیرو بلند ہمت اور بلند سیرت ہو اس پر کوئی ایسی مصیبت پڑے جو دل میں رعب اور دہشت پیدا کرتی ہو ، مگر اس میں خود ہیرو کا قصور نہ ہو یا ہو بھی تو نیک نیتی سے ، وہ ہمت اور شجاعت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرے ۔ مگر آخر میں مغلوب ہو کر ہلاک یا تباہ ہو جائے ۔ مثال کے لئے شیکسپیر کا المیہ آتھیلو لے لیجئے ۔ آتھیلو ایک عرب نسل کا سپاہی ہے جو وینس کی جمہوری ریاست میں سپہ سالاری کی خدمت پر مامور ہے ۔ وینس کے ایک امیر کی لڑکی ڈیسڈیمونا اس پر عاشق ہو جاتی ہے اور آتھیلو بھی اس کی محبت میں وارفتہ ہو جاتا ہے ۔ باوجود ڈیسڈیمونا کے باپ کی مخالفت کے وینس کے فرمانروا ڈیوک کے حکم سے ان دونوں کی شادی ہو جاتی ہے ۔ آتھیلو کا ایک بدنفس ماتحت ایاگو کچھ کینہ پروری سے اور کچھ مقتضائے طبیعت سے اس کے دل میں یہ شبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ڈیسڈیمونا ایک اور فوجی افسر کیسیو سے ناجائز محبت رکھتی ہے ۔ ایاگو کی شیطانی چالوں سے آتھیلو کا یہ شبہ یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے وہ ڈیسڈیمونا کو قتل کر دیتا ہے اور اس کے بعد خود بھی جان دے دیتا ہے ۔

اس ڈراما کو پڑھئے تو آپ دیکھیں گے کہ آتھیلو کی بہادری ، بلند حوصلگی ، عالی ظرفی ، سادگی

اور ڈیسڈیمونا کا حسن، اُسکا بھولاپن اُس کی محبت، عصمت وعفت وفاداری، ہمارے دل کو ابتدا سے موہ لیتی ہیں اور ہم ہیرو اور ہیروئن سے سچی محبت اور انکا سچا احترام کرنے لگتے ہیں۔ پھر رقابت کا جذبہ جو آتھیلو کے سینے میں جہنم کی آگ کی طرح بھڑکتا ہے اور اس کے جسم و روح کو جلائے ڈالتا ہے ہماری طبیعت میں ایسی گہری دہشت پیدا کرتا ہے جو شائد سخت سے سخت جسمانی اذیت کا منظر دیکھ کر بھی پیدا ہوتی۔ آتھیلو جس جوانمردی اور عالی ظرفی سے اس جذبے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہم بے اختیار اس کی تعریف کرتے ہیں، مگر آخر میں جب ہم پر یہ دردناک حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں اتھیلو کا سا ہیرو غصے اور غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے ڈیسڈیمونا کی سی ہیروئن اپنے چہیتے اور چاہنے والے شوہر کے ہاتھوں بیگناہ قتل ہوتی ہے تو ہم رنج والم، افسوس اور ہمدردی کے جوش سے بیتاب ہو جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم پر ایک پراسرار رعب چھا جاتا ہے، ایک گہری عبرت طاری ہو جاتی ہے اور یہی المیے کی جان ہے۔

المیہ لکھنے میں یہ اثر مختلف طریقوں سے پیدا کیا جاتا ہے کبھی اس کا ہیرو باوجود اپنی اعلیٰ سیرت کے کسی خلقی کمزوری یا غلط فہمی کے سبب سے خود اپنی تباہی کا باعث ہوتا ہے، کبھی وہ مافوق الافراد یا مافوق الفطرت قوتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر ہلاک ہوتا ہے اور کبھی اس کے پیش نظر دو متضاد مقاصد یا نصب العین ہوتے ہیں جن میں سے وہ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا اور اسی کشمکش میں مارا جاتا ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ڈراما کا ایک بڑا اہم عنصر عمومیت ہے یعنی قصے کو اس طرح بیان کرنا کہ ایک خاص شخص کی زندگی پر عام انسانی زندگی کا قیاس کیا جا سکے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ڈراما لکھنے والے بہت سے ذرائع اختیار کرتے ہیں، ایک ذریعہ یہ ہے کہ قصے کا ہیرو بادشاہ یا کوئی اور بلند مرتبہ شخص بنایا جائے جس کا انجام ایک پورے ملک یا پوری قوم کی زندگی پر اثر ڈالے اور سارے انسانوں کے لئے سرمایہ عبرت ہو یا پھر اس کی ذات ایک علامت

... ہو جس سے پوری نوع انسانی یا ایک پوری قوم مراد لی جا سکے۔ مثلاً ٹیگور کے ... کا ہیرو امال مشرقی انسان کی روح کی علامت مجسم ہے اور اس کی ... آزادی نوع انسان کی اس ابدی آرزو کی علامت ہے کہ وہ عالم مجاز سے نجات پا کر عالم حقیقت تک پہنچے۔

دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ قصے کے ہیرو پر جو مصیبت آئے اس کا ذمہ دار مافوق الفطرت قوتوں مثلاً تقدیر کو یا دیوتاؤں کو یا شیطانی روحوں کو قرار دیا جائے۔ اس سے قصے کے پڑھنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان قوتوں نے جن کا اثر سب انسانوں پر عام ہے جو ایک شخص کے ساتھ کیا وہی سب کے ساتھ کر سکتی ہیں۔ جدید زمانے میں لوگ ان چیزوں کے قائل نہیں اس لئے ڈراما نویس عموماً ان کی جگہ وراثت سے کام لیتے ہیں یعنی کسی شخص کی مصیبتوں کا ذمہ دار اس کے اسلاف کے موروثی اثر کو قرار دیتے ہیں جیسے ابسن کے ڈراما ”جیسٹ روحیں“ کے ہیرو کا جو افسوسناک انجام ہوا وہ اس روگ کی بدولت ہوا جو اس نے اپنے باپ سے ترکے میں پایا تھا۔

تیسرا ذریعہ یہ ہے کہ ڈراما کے اصل قصے میں ڈراما نویس ایک ضمنی قصہ بھی داخل کر دیتا ہے اس میں وہی افسوسناک واقعات جو اصل قصے میں پیش آئے تھے کسی قدر اختلاف کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں مثلاً شیکسپیر کے کنگ لیر میں جو ناشکر گذاری کا برتاؤ لیر کی بیٹیاں لیر کے ساتھ کرتی ہیں وہی گلوسٹر کے بیٹے گلوسٹر کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس تکرار کا اثر دیکھنے والوں پر یہ پڑتا ہے کہ نیکی کا نتیجہ ہونا اور بدی کا پھل پانا کچھ لیر ہی کے لئے نہ تھا بلکہ دنیا میں سبھی کو یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔

ایسے کے قصے کی یہ عمومیت عبرت کے اثر کو بڑھاتی ہے مگر رنج والم کے اثر کو گھٹا دیتی ہے۔ مصیبت کا کوئی منظر دیکھتے وقت اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ یہ حالت زندگی میں ہر شخص پر گذرتی ہے تو نیش الم کی کھٹک بہت کچھ کم ہو جاتی ہے اور آرٹ کے نقطہ نظر سے ایسے ... میں اس کی بہت ضرورت ہے۔ آرٹ جو کیفیت دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اس کی

گنجائش نہیں کہ کوئی جذبہ خواہ رنج والم ہو یا راحت و مسرت حد سے بڑھ جائے کیونکہ پھر احساس میں جمالیاتی رنگ نہیں رہتا جس کے لئے تناسب اور موزونیت لازمی ہے۔ اگر فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ نالہ پابند نے نہیں ہے تو وہ فریاد اور وہ نالہ چاہے آرٹ سے بڑھ کر ہو مگر آرٹ نہیں کیونکہ وہ سننے والے کے دل کے تاروں کو چھیڑتا تو ہے مگر اس طرح کہ ان سے ہم آہنگ نغموں کی جگہ بے سری صدائیں نکلتی ہیں۔

اسی وجہ سے باکمال المیہ نویس مصیبت اور تکلیف کے مناظر بہت بڑھا کر یا بہت دیر تک نہیں دکھاتے اور جو کچھ دکھاتے بھی ہیں اس کے المناک اثر کو کم کرنے کے لئے یا تو عمومیت سے کام لیتے ہیں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے یا ہیرو کی عظمت اور شجاعت پر زور دے کر ایک تسکین کا پہلو نکالتے ہیں یا طرز بیان میں تشبیہ و استعارے کی لطافت و ندرت اور دوسری شاعرانہ خوبیاں پیدا کرنے میں غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں تاکہ خیال کسی قدر بٹ جائے۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ المیہ لکھنے کے لئے بہ مقابلہ نثر کے نظم زیادہ مناسب ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ عہد قدیم میں المیہ ہمیشہ نظم میں لکھا جاتا تھا۔ جب سے نثر میں لکھنے کا رواج شروع ہوا اسی وقت سے ادب میں المیے کا معیار بھی کم ہونے لگا چنانچہ نثر میں اعلیٰ درجے کے ڈرامے بہت کثرت سے ہیں مگر المیے معدودے چند ہی ہیں ان میں سے غالباً سب سے بلند درجہ گوئٹے کے فاؤسٹ کا ہے۔ گوئٹے نے اپنے زمانے کے مذاق سے متاثر ہو کر فاوسٹ کو نثر میں لکھا لیکن اس میں گیتوں اور سنگتوں کے نام سے نظم کا حصہ بہت کافی ہے اور خصوصاً زیادہ المناک ٹکڑے، سب کے سب نظم میں ہیں اور جتنے اچھے المیے نثر میں ہیں انکا مقصد زیادہ تر اخلاقی اور اصلاحی ہے۔ جمالیاتی عنصر ان میں بہت کم ہے۔ (باقی)

دلی کا انوکھاپن اوپرپن

باقر علی صاحب مرحوم دلی کے آخری داستان گو تھے۔ سات مہینے ہوئے انکا انتقال ہوگیا۔ جن لوگوں نے انکی داستان سنی ہے۔ ان کا دل اب تک دلی کی اصلی زبان کی گھلاوٹ اور حلاوت کے مزے لیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا سارا کمال تقریر میں تھا تحریر میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن تقریر تو مرحوم کے ساتھ گئی اب تو جو کچھ ہے تحریر ہی ہے۔

یہ مضمون میر صاحب مرحوم نے ہمدرد مرحوم میں شائع ہونے کے لئے دیا تھا مگر کسی وجہ سے چھپ نہ سکا ہم اسے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہو کہ بہت پڑھے لکھے حضرات میر صاحب کی زبان میں مین میکھ نکالیں یا ان کے فلسفے پر ناک بھوں چڑھائیں لیکن وہ یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے مرحوم کی زبان پر حرف گیری کی تو انکی روح جنت سے کہے گی "یہ ہماری زبان ہے پیارے" اور اگر انکے فلسفیانہ مسائل پر معترض ہوئے تو جواب ملے گا "شعرم را بہ مدرسہ کہ برد"

میں دلی کا رہنے والا ہوں بچپن سے بڑھاپا آیا لیکن میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ دلی کی مٹک کیا ہو۔ شہر تو سبھی بنتے بھی ہیں بگڑتے بھی ہیں۔ بن گئے بن گئے بگڑ گئے بگڑ گئے مگر واہ ری دلی تیری ادائیں کہ سبھی قوموں نے تیرے چکر کاٹے پتھورا نے پرکما کی مسلمانوں نے طواف کئے اب انگریزوں نے بپ تسما دیا تو ذرا چین سے کونے میں گھونگھٹ نکالکر بیٹھیں لیکن بیٹھنا کیسا اب پھر اپنے بناؤ میں لگی ہوئی ہیں اور کیوں نہ بناؤ کریں کہ دلی کی جوانی بڑھاپا اپنے ہاتھ ہے جب بڑھاپے سے جی گھبرایا اور اکتایا پھر نئے سرے سے جوانی نکالی اور کسی وضع دار کی تلاش شروع کی لیکن دلی کی اب کی دفعہ اس کو خدا نظر بد سے بچائے

جوانی پھبکی ہے اور جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ ہیں کسی عاشق کی چھاتی پر بال جو دلی کی نکیلی چھاتیاں جواب ابھر آئی ہیں انکی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھے۔ دلی ہمیشہ بسکر بنی اور اب کی بار تو بگر بسی ... اس ست خصمی اور ہرجائی نے طرح طرح کے نام اپنے رکھے پتھورا کے زمانے میں کچھ پھر سیری تغلق آباد، عادل آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، پرانا قلعہ، شاہجہاں آباد غرض طرح طرح کے ناموں سے پکاری گئی اور اب کے تو کمال ہی کیا ہے چونکہ نئی نویلی ہیں تو نام بھی نئی دلی رکھا گیا ہے۔ ایک دفعہ دنیا کی تارک ہو کر سو دو سو برس تک ایسی لاپتہ ہوئیں کہ کوئی مورخ بھی پتہ نہ لگا سکا اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے جو مجھ جیسے دلی میں آباد ہیں انہوں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ سو دو سو برس کے واسطے ہم دلی والے بھی ایسی گمنام زندگی بسر کریں کہ کوئی ہمارا نام بھی نہ جانے کہ دلی میں کون کون آباد تھے خیر جو چاہیں سو کریں دلی والے ہیں اپنے افعال کے مختار ہیں لیکن ایسوں کے واسطے دلی نے بھی کہدیا ہے کہ تم جیسا میں چاہتی ہوں ویسے نہ بنو تو میں بھی تمہارا نام نہ بدل دوں تو مجھے دلی نہ کہنا اور نہ دلی نے بادشاہ پیدا کئے عالم بنائے خلیق بہادر سپے ایماندار کاریگر نمک خوار اگر اس زمانے کے واقعات لکھوں تو مضموں کا طومار ہو جائے گا۔ صرف ایک نمکخوار کا تذکرہ پیش کرتا ہوں ناظرین اندازہ فرمالیں گے۔ شاہجہاں نے جب لال قلعہ بنانے کا ارادہ کیا تو اُستاد حامد مستری کو بلا کر نقشہ دیا اور فرمایا کہ جلد یہاں قلعہ بنا دو اُستاد حامد مستری نے عرض کی بہتر۔ اب یہ حال عرض کردوں کہ آج کل علما اور مشاہیر عالم نے تو قلعہ کے واسطے تال کٹورا انتخاب فرمایا اور شاہجہاں کا دماغ تو ماؤف ہوا ہے یہ جمنا کے کنارے کیوں ڈوبا یہ بحث نہایت فلسفیانہ ہے مگر طویل اور نہایت دلچسپ کہ شاہجہاں نے یہی جگہ کیوں پسند کی کیا اس وقت تال کٹورہ نہ تھا؟ بات یہ ہے کہ دلی گرم جگہ ہے اور یہاں کی زمین شور ہے شاہجہاں نے وہ جگہ پسند کی جہاں سے جمنا سیکڑوں برس سے شورہ دھو دھو کر لے گئی گو زمین نمناک ہی لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں کہ شاہجہاں کے قلعہ کو تین سو برس گذرے اور پتھر بھی سنگ سرخ لگا ہے کہ جو جلد لونی لگ کر برباد ہو جاتا ہے لیکن شاہجہاں کا قلعہ جوں کا توں کھڑا ہے۔ ٹس سے مس نہیں ہوا نہ کوئی پتھر چٹخا نہ لونی لگی اور

آج کل کی نئی عمارتیں کہ جن کو بنے ہوئے جا جا آٹھ دن ہوئے ان میں نونی شروع ہوگئی کاس زمانے میں کوئی مشین ایسی نہ تھی کہ پتھر کو ٹھوک بجاکر کان سے لیتی۔ اب سنئے کہ تمام قلعہ کا پتھر آگیا اور استاد حامد غائب۔ دو برس گذر گئے اور استاد حامد کا پتہ نہ لگا تو شاہجہاں نے حکم دیا کہ دوسری بنیادیں کھودو جب بنیادیں کھدنی شروع ہوئیں تو استاد حامد نے حاضر ہوکر آداب بجایا بادشاہ نے فرمایا کہ تم کہاں تھے تو استاد حامد نے دست بستہ عرض کی کہ حضور کا شوق تو مقتضی اس امر کا تھا کہ قلعہ شام تک بن جائے اور نمکخوار بنا دیتا لیکن سو دو سو برس کے بعد دیواریں شق ہوتیں۔ بال پڑتے تو اس وقت کے لوگ کہتے کہ بادشاہوں کے ایسے نمک حرام نوکر تھے کہ اپنے فائدے کے واسطے جلد از جلد ایسی بودی عمارت بنائی اب خادم نے نیو کو چھوڑا برساتیں پڑیں پانی بھرا جہاں سے نیو کو جھونا تھا جھوم دبنا تھا دبی اور یہ پتھر دو برس تک برسات میں بھیگے جاڑے میں سکڑے گرمی میں پھیلے جس کو ٹوٹنا تھا ٹوٹا ٹوٹی لگنی تھی نونی لگی اب نمکخوار شام تک قلعہ بنا دیتا ہے۔ یا تو دلی والے ایسے تھے اور اب جو مجھ جیسے آکر آباد ہوئے تو انہوں نے ایمانداری انصاف خدا ترسی کاریگری وغیرہ کو برا سمجھ کر اور یہ کہکر چھوڑ دیا کہ پرانی باتوں کو کیوں کام میں لائیں وہ اگر معاملے کے صاف تھے تو ہم معاملہ کیوں صاف رکھیں - جو جو واقعات میں دیکھ رہا ہوں اگر دو چار واقعات بھی لکھوں تو طول ہوگا۔ غرض دلی یوں ہی کروٹیں بدلتی رہتی ہے اسی طرح سے دلی کی اللہ بخشے ایک سہیلی تھیں اور انکی بھی تمام عادتیں قریب قریب ایسی ہی تھیں جیسے دلی کی - اب یہ جوان ہوئیں تو انکی شادی ہوئی اللہ نے فرزند نرینہ عطا فرمایا یہ اپنے بچہ کی محبت میں دیوانی تھیں بعض انسان بعض حیوانوں میں اولاد کی محبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے تعلق سے بچہ کا باپ مرگیا اب جو پڑوسی کو آیا اُس نے افسوس کیا کہ افسوس اس سن میں اور یتیمی اس نیک بخت کو بچہ کا یتیم بنا ناگوار گذرا اس نے عدت کے اندر ہی نکاح کرلیا وہ خاوند بھی قضائے الٰہی سے فوت ہوگیا اب کی دفعہ اس نے پھولوں کے دوسرے ہی دن نکاح کیا اور اس خاوند کی موجودگی میں اوروں سے بھی ساز باز رکھا غرض وہ بھی مرا اسی طرح اس نیک بخت نے سات

نکاح کئے جب ساتواں خاوند بھی جاں بحق ہوا تو اس نے رو رو کر کہا کہ واہ اللہ میاں اب کی بری تو بادر ہے گی لیکن میں اپنے بچہ کو یتیم کہواؤں یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ دلی کی اتو کھی ادا اُن کا مشکل ہو۔ دلی نے اردو زبان بنائی اور اس میں بھی تمام زبانوں سے انوکھا پن رکھا وہ کیا دنیا میں جتنی زبانیں نہیں وہ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرنیکے واسطے اصوات بسیطہ سے چلے بنائے انکا نام زبان ہوگیا لیکن دلی نے اردو کے گوہر سخن کے واسطے دو دریائے ذخار اور ناپیدا کنار تلاش کئے اور وہ دونوں دریا کونسے دریا ہیں ایک سنسکرت اور دوسرا عربی اور یہ دونوں دریا وہ دریا ہیں کہ جن سے تمام دنیا کی زبانیں سیراب ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو کسی زبان سے پیچھے رہنے والی نہیں معلوم ہوتی علاوہ اس خوبی کے یہ زبان امانت دار ایسی ہے کہ جس زبان کا جو لفظ لیتی ہے اس کو اپنے گھر میں ایسا جیوتا رکھتی ہے کہ اس کی شکل وصورت میں کوئی خرابی نہیں آنے دیتی۔ جیسا وہ لفظ اپنے گھر میں تھا اسی طرح سے اردو میں رہتا ہے اور لفظوں ہی پر کیا موقوف دلی میں جو آیا اس کو دلی نے ایسا آرام و آسایش سے رکھا کہ دنیا کے کاموں سے اس کو کوئی غرض ہی نہ رہی لیکن ایسا کیوں ہوا آپ غور فرمائیں کہ ہندوستان شلث نکونا ملک ہو اگر بفرض محال آپ ہندوستان کو کاٹ چھانٹ کر گول سمجھ لیں تو دلی قریب قریب مرکز ثابت ہوگی اور دائرہ مرکز کو گویم کسی متحرک جگہ ٹھیکر یہ سمجھ لیں کہ ہم ساکن ہیں مگر کیا سکون ہوگا ہرگز نہیں۔

اور دلی میں تو مرکز ہونے کی وجہ سے حقیقی سکون ہے یہاں جو آیا ایسا ساکن ہوا کہ دنیا نے اُس کے نام کو بھی حرکت نہ دی کہ دلی میں فلاں فلاں آباد تھے۔ دلی نے بہت سے نکاح کئے لیکن اس شرط پر کہ میں یہاں سے کہیں نہ جاؤں گی۔ اگر دلی کے نئے دولہا کو پرانی سیج گوارا نہ ہوئی تو دلی ذرا کھسکیں اور کہا بس چنانچہ اب کی دفعہ بھی بنے بنائے گھر کو چھوڑا ...... لال حویلی ہر طرح کے آرام کا ٹھیا تھی اور کیسی عمارت جو سونے کے پانی سے گندھی ہوئی اور جواہر کے ریزوں سے چنی ہوئی۔ اور ہر نگینہ جواہر کا جہاں جڑا ہوا تھا اُس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ معمار قدرت نے اس نگینہ کو یہیں کے واسطے بنایا ہے مثلاً ایک پتہ کسی بیل یا بوٹے کا بنانا

ہے اور یہ کھانا [illegible] قدرت میں لٹا ہوا ہو گیا ہے تو جہاں سے مڑا ہے کچھ خشک سا ہو گیا ہے
اور بدرنگ ہے اور آدھا تر و تازہ ہے مگر ایک ہی نگینے میں یہ دونوں حالتیں دکھائی ہیں جوڑ نہیں
ہے علاوہ اس خوبی کے ہر بیل ہر بوٹے کا رو ربل نوک پلک کا لطف جاننے والا ہی کہہ سکتا ہے
[illegible] کے منہ سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔ مقب حمام جتنی خوبیاں حمام میں ہونی مناسب
[illegible] موجود حمام کشادہ ہو روشن ہو، معتدل ہو پرانا ہو اور گنبد کے بیچ میں سے کبھی کبھی
ٹھنڈی بوند پانی کی ٹپکے لیکن ایک حمام سب مزاجوں کے موافق نہیں ہوتا ہر شخص کے مزاج
کے موافق بنایا جاتا ہے حمام کا فرش دیواریں نہ ٹھنڈی ہوں۔ گرم حوض کا پانی اتنا گرم ہو جو بدن
پر سیال نہ معلوم ہو چنانچہ اس حمام کا پانی آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی یکساں رہتا تھا دیوان خاص
کی تو ایسی خوبی تھی کہ جس کے بیان سے زبان قاصر۔ کسی شاعر نے مجبور ہو کر لکھ دیا کہ۔ شعر۔

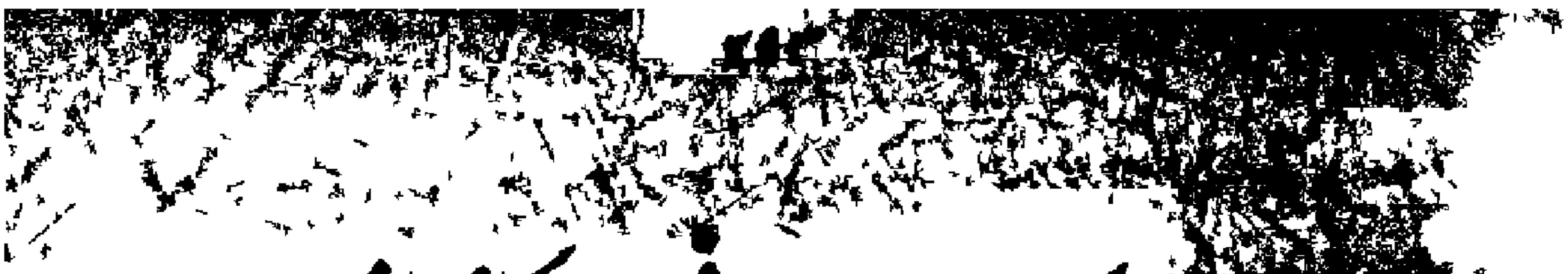
اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

تخت طاؤس اپنی خوبیاں اپنے منہ سے بول رہا تھا ایران میں جو اس کی دردسا ہوئی تخت
[illegible] عزت کو جو دلی میں تھی اس کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہا ہے دونوں آنکھوں سے
ساون کی جھڑی اور بھادوں کی بھرن ہے کہ برس رہی ہیں برسات میں مور کو مستی ہوتی ہے
اور پر نکل آتے ہیں لیکن یہ بیچارہ لنڈ منڈ پر بچا دلی کی طرف ٹڈیاں بھرتا ہے تو چوٹ کھاتا ہے
اس وقت یہ دوہا بصد حسرت و یاس زبان سے نکل جاتا ہے۔ دوہا۔ ناموسے نکھ نہ پاؤں
بل میں اپنکھ پیا دور۔ اڑ نہ سکوں گر گر پڑوں رہوں بسور بسور۔ اور کبھی کہتا ہے اڑ کے پہنچوں
لیکن بے پرو بال اڑا نہیں جاتا۔ میزان عدالت اب بھی یہ کہہ رہی ہے کہ یہاں کسی
زمانے میں عدالت تھی اور نہر سعادت خاں اسی کے نیچے بہہ کر یہ بتا رہی ہے کہ یہ وہ جگہ ہے
جہاں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، جھروکہ جس میں بادشاہ بیٹھ کر جمنا کی موجیں اور
[illegible] میدانوں کا ملاحظہ فرماتا تھا۔ دیوان عام موتی مسجد مہتاب باغ جل محل ساون بھادوں
نقار خانہ، بنجاری کنواں۔ یہ کنواں اس وقت بنا تھا کہ جب دلی یہاں آباد نہ تھی بلکہ اس زمانے

کی دلی کا دروازہ جو دہلی دروازے کے سامنے دہلی جیل کے مشرقی سمت اور [illegible]
دہلی کو آباد اور اپنے کو برباد دیکھ کر شرم سے زمین میں دھنسا جاتا ہے یہاں دلی آباد تھی اس
زمانے میں بنجارے اناج وغیرہ لایا کرتے تھے اور جہاں لال قلعہ اس وقت ہے یہ بنجاروں کا پڑاؤ
تھا یہاں کنواں نہ تھا ایک بنجارے نے کنواں کھدوا دیا اس وجہ سے بجاری کنواں کہتے
ہیں۔ اب کی دفعہ دلی نے نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھے ہیں کیونکہ ہر دفعہ کی بربادی سے
دلی کا بھی دل گھٹتا گیا ہے اور مدت کی پیشین گوئی کا خیال آ گیا۔ کسی نے یہ پیشین گوئی کی ہے کہ۔
نو دلی دس بادلی قلعہ وزیرآباد۔ آٹھ دلیاں تو میں نے گنوائی ہیں اب نویں دلی کی بنیاد
ہمارے شہنشاہ نے رکھی لیکن یہ بنیاد بدلی اور اب دسویں دلی رائے سینا میں آباد ہو رہی
ہے بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے وہ کسی قوم یا مذہب کا ہو لیکن بادشاہ ہے، تاہی بنیاد یہاں
سے بدلی اب کچھ اسباب اس پیشین گوئی کے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ قلعہ وزیرآباد آباد ہو لیکن
یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیرآباد نشیب میں واقع ہوا ہے اور نشیب کی آب و ہوا مرطوب اور دلی
کی عادت شمال کی طرف کھسکنے کی ہے اور دلی ہی بچاری پر کیا موقوف ہے نیصدی بچانوے شہر
شمال کی طرف بڑھ رہے ہیں وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شمال ٹھنڈا روح گرم اس وجہ سے طبیعت
شمال کی طرف جاتی ہے۔ ہونے والی بات کو خدا ہی جانتا ہے لیکن یہ پیشین گوئی یہ خبر دیتی ہے کہ
وزیرآباد آباد ہو اور اس کی آبادی کو قیام و دوام ہو دلی کئی دفعہ بدلی اور آباد ہوئی جو آیا
اس نے دلی کی اکھیڑ پچھاڑ کی اور اب کے تو چین سے بیٹھے بٹھائے دلی نے اپنا گھر چھوڑا اس کی
وجہ میرے خیال میں تو یہ آتی ہے کہ جیسے دلی والوں نے غدر کے بعد دلی کو ایسا لتاڑا کہ
دلی نے تنگ آ کر یہاں کی بود و باش چھوڑ دی۔ پہلے دلی کو دلی والوں پر ناز تھا اور اب تو دلی
والوں نے جمنا کے کنارے وہ الٹی گنگا بہائی کہ دلی پانی پانی ہو کر شرم سے ڈوب گئی بسا بسایا
گھر چھوڑا اور اپنوں سے منہ موڑ پردیسیوں سے دل لگا بیٹھی اب دلی والوں کو مناسب ہے کہ
جیسے آبرودار شہر میں اپنے آپ کو دلی کے رہنے کے قابل بنائیں ورنہ تغلق آباد کے گنوا دینگے

[illegible] نے بچپن میں سنا ہے کہ تغلق آباد کے گنوار ساری دنیا میں اپلے سر پر رکھ کر بیچتے
تھے لیکن یہ آئی آن تھی کہ دلی دروازے کے اندر سر پر بوجھ نہیں رکھتے تھے کسی نے پوچھا کہ یہ
کیا تو تغلق آباد والے جواب دیتے ہیں کہ میاں دلی ہماری تھی اب اگر دلی ہم سے بدل گئی تو بدل گیا
لیکن ہم اس کے آگے کیوں گردن جھکائیں ایسے موقعے کے واسطے کسی نے خوب کہا ہے کہ۔ رسی تو
جل کے خاک ہوئی پر بل نہ گیا۔ اب دلی ایسے دلی والوں کی طرف منہ بھی نہیں کرتی۔ وہ پانی
ملتان گئے۔ ورنہ دلی ایسی مسافر نواز تھی کہ جو دلی میں آیا دلی نے اُسے اپنے میں جذب کرلیا۔
دلی کی خاص بات مرکز ہونے کے لحاظ سے عجیب ہے آپ اجمیری دروازے سے ذرا باہر نکلیں
تو آپ اجمیر کا رنگ دیکھیں گے اور لاہوری دروازے سے پنجاب اپنا پتہ دیتا ہے۔ کشمیری دروازہ
کشمیر کی جھلک دکھاتا ہے ذرا جمنا پار ہوئے تو پورب نظر آتا ہے۔ غرض دلی اپنی وضع کی پابند
ایسی ہے کہ اپنی چال سے باز نہیں آتی۔ انسان تو ذکی الحس ہے۔ آپ پودوں کو ملاحظہ فرمائیں
میں نے لکھنو کے خربزے کا دلی میں بیج بویا تو اُس سال دلی میں جو خربزہ پیدا ہوا ہر خربزے کا رنگ
قریب قریب ویسا ہوا اب دلی کے پیدا ہوئے خربزے کا بیج بویا تو رنگ قدرا کچھ
بدلا اور تیسرے سال کے خربزے کو دلی نے اپنے رنگ میں رنگ لیا وہی چال دار، قد بڑا
دلی موٹا اور پھیکا پیدا ہوا۔ لیکن دلی کے خربزے۔ بیچنے والوں نے آواز پکارا کہ شکر سے میٹھے
یعنی شکر سے کھاؤ تو میٹھے۔ پہلے دلی ہی کے خربزے میں نے کھائے ہیں اچھے میٹھے خوشبودار
ایک خربزہ گھر میں آیا بال بچے چھک گئے اور بیچ رہا۔ دلی میں قدرت نے سلمانوں کو بادشاہ
اور ان داتا بنا کر بھیجا تھا۔ اس وقت دلی نے اپنے مہانوں کی وہ آؤ بھگت کی طرح طرح کی
دلچسپیاں پیدا کیں اچھے اچھے باکمال پیدا کئے بڑے بڑے بہادر بنائے اور خلیق ایسے کہ
چار دانگ عالم میں مشہور کہ دلی والوں کو ہندوستان نے سراہا کاریگر ایسے بنائے گو جاہل
تھے مگر اُنکے دماغ کام کر رہے تھے۔ شہر میں بے دھری بندوقیں چل رہی تھیں اور ان
بندوقوں کا نام بے دھری میرٹھ کے کارتوس کی وجہ سے فوج نے رکھا تھا یہ بندوقیں تانبے کی

ٹوپیوں سے چلتی تھیں اب غدر ہوا تو ٹوپیاں نہ رہیں اب بندوقیں بیکار ہوگئیں تو بادشاہ سے عرض کی بادشاہ نے خانم کے بازار میں جو کاریگر تھے انکو بلایا اور فرمایا کہ بندوقیں بیکار رہیں اب کیا کریں کاریگروں نے دست بستہ عرض کی کہ حضور یہ کیا بات ہے حضور کے اقبال سے اب بندوبست ہوا یہکہکر کاریگروں نے کاغذ کے پٹاخے بنائے جو بچے تیتیوں میں رکھ کر چھوڑتے ہیں۔ اس زمانے میں قدرت کی خاص نظر رحمت دلی پر تھی اب جب دلی والوں نے اپنے آپ کو بھولا اور یہ نہ سمجھا کہ قدرت نے ہم کو کیسا مالامال پیدا کیا ہے لیکن ہم نے اُس کی کسی نعمت سے کام ہی نہیں لیا۔ تو قدرت کی رفتار سست ہے اس وجہ سے کہ کوئی کسر نہ رہجائے پھر جب قدرت ہاتھ ڈالتی ہے تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ یا تو یہ شہر ایسا تھا کہ جس کی تعریف ناممکن تھی یا اب دلی کے پہاڑ بدلے زمین بدلی آخر بدلا کیا کچھ نہیں۔ مجھ جیسے دلی والوں نے تمام خوبیوں سے اپنے آپ کو بال بال بچا رکھا ہے اور لطف یہ ہے کہ آپ دلی میں ایک شے کھانے کی پینے کی برتنے کی چاندی سونے کی ڈھونڈیں تو ملنا مشکل۔ اب چاندی والوں کا کیا قصور ہے چاندی خود تو سفید ہے لیکن جو شے اسے مس کرتی ہے وہ سیاہ ہو جاتی ہے۔ کاریگر تو کاریگر ہیں انہوں نے بی چاندی سے کہا کہ تو ٹہرا اگر تجھ کو کالا کرکے نہ چھوڑا تو نام نہ پایا۔ چاندی بیچاری بھی ہونے کی وجہ سے اتنی شریف ہے کہ تولہ بھر چاندی میں آپ ایک ماشہ تو چاندی لیں اور گیارہ ماشہ میل تو چاندی تیزاب کے اجال پر سفید نظر آئے گی۔ اب کاریگروں نے سونے کو دیکھا کہ یہ ظالم تو ہمارا کہنا مانتا ہی نہیں تولہ بھر سونے میں ایک رتی میل ملاتے ہیں اور وہ میل رتی بھر اپنی جھلک دیتا ہے تو کاریگر بولے اچھا ہم بھی تیرا قائم مقام بناتے ہیں چنانچہ چاندی اور تانبا ملاکر سونے کا ہمشکل بنایا اور ملمع نام رکھا۔ اگر ہم اب بھی نہ سنبھلے اور نہ سمجھے تو ہماری صورتیں بھی بدل جائیں گی کہ شریف اور پاجیوں کے باوا آدم الگ الگ رہتے ہیں بداعمالیوں نے شکلیں بدل دیں اللہ رحم فرمائے۔



ہندوستان، فن طب کا اصل مولد

ہندوستان کے فن طب و جراحت، پر ایک مضمون دو نمبروں میں اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسی رسالہ "جامعہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ آج عنوان بالا سے کیپٹن بی جانسٹن سینتھ نامی ایک انگریز مصنف کے نہایت فاضلانہ اور پُر از معلومات خطبہ کا خلاصہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو انگلستان کی مشہور "رائل سوسائٹی آف آرٹس" کے ہندوستانی شعبہ کے زیر اہتمام ابھی حال میں پڑھا گیا ہے۔ ہندوستان کی گذشتہ قدیم تاریخ کے متعلق ابتک عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ یہ ایک تاریکی وظلمت اور وحشت و جہالت کا دَور رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی علم کا کبھی کوئی چرچا تھا تو وہ فلسفہ والہیات کا تھا۔ مضمون ملا سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان نے ایسے قدیم زمانے میں سائنس میں بھی اسی قدر ترقی کی تھی جس قدر فلسفہ میں۔ فن طب اور اس کی مختلف شاخوں میں اس نے اس قدیم زمانے میں جو کمال پیدا کیا تھا، اس سے آج کی جدید سے جدید تحقیقات و معلومات بھی کچھ بہت آگے نہیں ہیں۔

تمہید

ہندوستان کی تاریخ کا آغاز

ہندوستان کی تہذیب کا آغاز کب سے ہوتا ہے؟ اس کے متعلق بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ باوجود تمام تحقیق و تدقیق کے حقیقت پھر بھی اسی قدر مستور ہی ہے۔ یہ کوئی تقریباً سوا سو سال کی بات ہے کہ بعض اہل مغرب نے سنسکرت زبان کے مطالعہ کی طرف توجہ کرنی شروع کی اور اگرچہ اس وقت سے دفتر کے دفتر آرین قوم کی اصل کے متعلق لکھے جا چکے ہیں، پھر بھی یہ اطمینان کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی صحیح حقیقت تک پہونچ گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آرین قوم وسط ایشیا کے کوہستانی علاقے سے پیدا ہوئی، بعضوں کا خیال ہے کہ انکا مولد جرمنی کا شمالی علاقہ یا ناروے اور سویڈن کا خطہ ہے۔

تاہم ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قدیم ویدوں کی تاریخ تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہے۔ ہوٹنی (Whitney) گراس مان (Grassmann) اور بنفے (Benfey) کا یہ خیال ہے کہ ۲۴۰۰ سال قبل مسیح ہندو لٹریچر کے آغاز کا زمانہ ہے۔ بروں ہوف (Burnouf) اسے ۲۸۰۰ ق م بتاتا ہے۔ پروفیسر جیکوبی اس مدت کو ۴۰۰۰ قبل مسیح قرار دیتا ہے اور ایک گروہ کے خیال کے مطابق یہ زمانہ اس سے بھی قدیم تر ہے جبکہ اس وقت کی دنیا یہ کرۂ زمین نہ تھی جس پر آج ہم لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اوستا میں ایک ایسی آریوں کی بہشت کا ذکر ہے جو صرف قطب شمالی ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔

طب کے متعلق قدیم روایات | بہرحال اصل حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، یہ مسائل ایسے نہیں جن کا تصفیہ گھنٹہ دو گھنٹے کی صحبت میں ہو سکے۔ ہم کو صرف ویدوں کے ان اشلوکوں سے غرض ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں رگ وید یا اس کے ساتھ کی دوسری کتابیں خواہ ۱۵۰۰ ق۔م، ۲۵۰۰ ق۔م، ۴۵۰۰ ق۔م یا اس سے بھی قدیم تر کسی ایسے زمانے سے شروع ہوتی ہوں جبکہ تاریخ کا کوئی پتہ نشان بھی نہ تھا موجودہ اغراض کے لئے اس سے بحث نہیں۔ ہم کو اس واقعہ کو اس طرح تسلیم کر لینا چاہئے جس طرح ایک چھوٹا بچہ راجہ کے قصے کو صحیح سمجھتا ہے بلالحاظ اس کے کہ وہ راجہ کون تھا؟ اور کس زمانے میں وہ حکومت کرتا تھا؟ اس لئے کہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے قصوں اور افسانوں کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔

لسانیات کا ایک عالم ان قدیم قصوں اور افسانوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے تاکہ وہ تخیلات انسانی کے ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو جوڑ سکے۔ مورخ ان افسانوں کو انکے اصل سرچشمے تک لیجاتا ہے اور ایک ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جہاں سے کہ وہ اصل حقیقت کی تلاش شروع کر سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالق اول برہما نے یہ چاروں وید کائنات کی ہدایت کے لئے بنائے اور ان میں سے اتھروید کو دوسرے دیوتاؤں کے پاس بھیجا۔ اور دُواسونیوں یا سورج کے دو بیٹوں کو اس کا حامل قرار دیا اور اس طرح یہ دونوں آسمانی دیوتاؤں سے

نگماں مقصد ...

آیورویدکی ابتدا | اس کے بعد اتھروید پیدا ہوا جو بنی نوع کی اور زیادہ تعلیم کے لئے مزید منتروں کا مجموعہ ہے۔ یہاں منتروں سے برہمائے انسان کی خراب خستہ اور زوال پذیر حالت پر رحم کھاکر آیوروید پیدا کیا جس میں زندگی کے علم سے بحث کی گئی ہے۔

یہ منسر بذات خود نیست و نابود ہوگئے ہیں اور ان کا جو کچھ بھی علم ہکو ہوا ہے، وہ انکے بعض اجزا سے یا ان تبصروں سے جو بعد کے لٹریچر میں ہمیں ملتے ہیں لیکن ان بالواسطہ ماخذوں کی بنا پر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہی آیوروید مدتہائے دراز تک ہندو فن طب کا سنگ بنیاد رہا ہو۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ویدوں کا بھی پتہ نشان باقی نہ رہا اور تمام لوگ پھر ایک بار رنج و مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ بنی نوع کی یہ حالت دیکھکر دیوتاؤں اور راکششوں نے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اکٹھا کیں اور انہیں سمندر میں ڈال دیا اس کے بعد اسے چلانے کے لئے مندرا پہاڑ لیا اور وشنو دیوتا کچھوے کی شکل میں دُمرا بنے جس پر وہ کڑی گھومتی تھی شیش جو سانپ کی شکل کا ہے، ایک رسی بنا جسے ایک طرف سے تمام دیوتا اور دوسری جانب سے راکشش کھینچتے تھے۔ اس طریقہ سے گویا سمندر سے چودہ رتن پیدا ہوئے جن میں سے دھنوتری امرت یا آب حیات لیکر نکلا اور وہی ان دیوتاؤں کا طبیب اول اور فن طب کا سب سے پہلا موجد مانا جاتا ہے۔

دھنونتری، فن طب کا موجد | دھنونتری کا ظہور جو ہندوستان کا ایسکولیپیس مانا جاتا ہے، دنیا میں اس غرض سے ہوا کہ وہ لوگوں کے امراض و تکالیف کا ازالہ کرے اور انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ یونانی ایسکولیپیس کی طرح اس کے ساتھ کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے بلکہ وہ عام طور سے ایک نہایت ضعیف شخص کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب ہے رشیوں نے دھنونتری کے پاس ایک وفد بھیجا اور اُس سے یہ درخواست کی کہ وہ انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ اس وفد میں، سوشرت بھی شریک تھا جو قدیم فن جراحت کا بانی ہے

تاہم ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قدیم ویدوں کی تاریخ تقریباً ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہو۔ ہوٹنی (Whitney) گراس مان (Grassmann) اور بنفے (Benfey) کا یہ خیال ہے کہ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح ہندو لٹریچر کے آغاز کا زمانہ ہے۔ برونی ہوفر (Brunnhofer) ۲۸۰۰ ق-م بتاتا ہے۔ پروفیسر جیکوبی اس مدت کو ۴۰۰۰ قبل مسیح قرار دیتا ہے اور ایک گروہ کے خیال کے مطابق یہ زمانہ اس سے بھی قدیم تر ہے جبکہ اس وقت کی دنیا یہ کرۂ زمین نہ تھی جس پر آج ہم لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ اوستا میں ایک ایسی آریوں کی بہشت کا ذکر ہے جو صرف قطب شمالی ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔

<u>طب کے متعلق قدیم روایات</u> | بہرحال اصل حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، یہ مسائل ایسے نہیں جن کا تصفیہ گھنٹے دو گھنٹے کی صحبت میں ہو سکے۔ ہم کو صرف ویدوں کے ان اشلوکوں سے غرض ہے جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ رگ وید یا اس کے ساتھ کی دوسری کتابیں خواہ ۱۵۰۰ ق-م، ۲۵۰۰ ق-م، ۴۵۰۰ ق-م یا اس سے بھی قدیم تر کسی ایسے زمانے سے شروع ہوئی ہوں جبکہ تاریخ کا کوئی پتہ نشان بھی نہ تھا موجودہ اغراض کے لئے اس سے بحث نہیں۔ ہم کو اس واقعہ کو اس طرح تسلیم کر لینا چاہئے جس طرح ایک چھوٹا بچہ راجہ کے قصے کو صحیح سمجھتا ہے بلالحاظ اس کے کہ وہ راجہ کون تھا اور کس زمانے میں وہ حکومت کرتا تھا؟ اس لئے کہ قدیم تاریخ میں اس قسم کے قصوں اور افسانوں کو بھی کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔

لسانیات کا ایک عالم ان قدیم قصوں اور افسانوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے تاکہ وہ تخیلات انسانی کے ٹوٹے ہوئے سلسلوں کو جوڑیں۔ مورخ ان افسانوں کو انکے اصل سرچشمے تک لیجاتا ہے اور ایک ایسی بنیاد تلاش کرتا ہے جہاں سے کہ وہ اصل حقیقت کی تلاش شروع کر سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خالق اول برہما نے یہ چاروں وید کائنات کی ہدایت کے لئے بنائے اور ان میں سے اتھروید کو دوسرے دیوتاؤں کے پاس بھیجا۔ اور دواسونیوں یا سورج کے دو بیٹوں کو اس کا حامل قرار دیا اور اس طرح یہ دونوں آسمانی دیوتاؤں کے

آیورویدکی ابتدا

اس کے بعد آیوید پیدا ہوا جو بنی نوع کی اور زیادہ تعلیم کے لئے مزید منتروں کا مجموعہ ہے۔ پھر ان منتروں سے برہما نے انسان کی خراب حالت اور زوال پذیر حالت پر رحم کھاکر آیوروید پیدا کیا جس میں زندگی کے علم سے بحث کی گئی ہے۔

یہ منتر بذات خود نیست و نابود ہوگئے ہیں اور ان کا جو کچھ بھی علم ہم کو ہوا ہے، وہ انکے بعض اجزاء سے یا ان تبصروں سے جو بعد کے لٹریچر میں ہمیں ملتے ہیں لیکن ان بالواسطہ ماخذوں کی بنا پر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہی آیوروید مدتہائے دراز تک ہندو فن طب کا سنگ بنیاد رہا ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ویدوں کا بھی پتہ نشان باقی نہ رہا اور تمام لوگ پھر ایک بار رنج و مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ بنی نوع کی یہ حالت دیکھکر دیوتاؤں اور راکشسوں نے مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اکٹھا کیں اور انہیں سمندر میں ڈال دیا اس کے بعد اسے چلانے کے لئے مندرا پہاڑ لیا اور وشنو دیوتا کچھوے کی شکل میں دھرا بنے جس پر وہ لکڑی گھومتی تھی بشیش جو سانپ کی شکل کا ہے، ایک رسی بنا جسے ایک طرف سے تمام دیوتا اور دوسری جانب سے راکشش کھینچتے تھے۔ اس طریقہ سے گویا سمندر سے چودہ رتن پیدا ہوئے جن میں سے دھنونتری امرت یا آب حیات لیکر نکلا اور وہی ان دیوتاؤں کا طبیب اول اور فن طب کا سب سے پہلا موجد مانا جاتا ہے۔

دھنونتری، فن طب کا موجد

دھنونتری کا ظہور جو ہندوستان کا ایسکولیپیس مانا جاتا ہے، دنیا میں اس غرض سے ہوا کہ وہ لوگوں کے امراض و تکالیف کا ازالہ کرے اور انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ یونانی ایسکولیپیس کی طرح اس کے ساتھ کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے بلکہ وہ عام طور سے ایک نہایت ضعیف شخص کی صورت میں ظاہر کیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب ہے رشیوں نے دھنونتری کے پاس ایک وفد بھیجا اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ انہیں علم حیات کی تعلیم دے۔ اس وفد میں سوشرت بھی شریک تھا جو قدیم فن جراحت کا بانی ہے

جسے دھنونتری نے آیور وید سکھانے کے لئے منتخب کیا تھا۔ اسی سوشرت نے بعد میں سوشرت کے نام سے فن جراحت پر ایک کتاب لکھی ہے۔

جس طرح سوشرت فن جراحت کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح چرک علم طب کا بانی ہے اور اس نے بھی "چرک سمہیتا" کے نام سے علم طبعیات پر ایک کتاب لکھی۔ سوشرت فن جراحت کا عالم تھا اور چرک طب کا اور انہی دو ہستیوں سے ہندوستان میں فن جراحت و طب کا رواج ہوا

ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیا چرک پہلے پیدا ہوا یا سوشرت۔ علمی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو چرک کی تصانیف زیادہ قدیم نظر آتی ہیں لیکن قدما میں یہ بات بطور ایک مسلمہ امر کے سمجھی جاتی ہے کہ فن جراحت طب سے پہلے وجود میں آیا۔ ڈاکٹر وائز (Wise) نے اپنی کتاب "ہندو طب" میں لکھا ہے کہ ایکبار دھنونتری نے اپنے شاگردوں سے دریافت کیا کہ "سب سے پہلے میں کس چیز پر لکچر دوں؟" تو شاگردوں نے کہا "جراحت پر" اس لئے کہ پہلے دیوتاؤں میں امراض نہیں ہوتے تھے اور سب سے پہلے جس چیز کے لئے علاج کی ضرورت پیش آئی وہ زخم تھے۔ علاوہ اس کے فن جراحت اس حیثیت سے بھی زیادہ مقدم ہے کہ اس سے فوری آرام ملتا ہے اور اس کا تعلق طبابت سے بھی ہے گو موخر الذکر کو جراحی سے کوئی نسبت نہیں۔ سب سے پہلے انسان کو جراحی کی ضرورت ہوئی، امراض بعد میں پیدا ہوئے اور اس وقت جب انسانوں میں بہت ساری خرابیاں آچکی تھیں اور سچ پوچھئے تو یہ خرابیاں ایک طرح سے انکے حد سے زیادہ گناہوں ہی کا نتیجہ تھیں۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوشرت، چرک سے پہلے پیدا ہوا لیکن انکا صحیح زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ انکا زمانہ اتنا قدیم ہے کہ دوسری قومیں اولاً تو ان سے واقف نہ ہو سکیں اور اگر واقف بھی ہوئیں تو ان کمالات کو پورے طور پر سمجھ نہ سکیں۔

مثال کے طور پر عربوں کو لیجئے انکے ہاں انکا ذکر آتا ہے جن سے کہ بعد میں رواج

لے لیا۔ کچھ عرصے کے بعد ہمیں اس چیز کا ذکر ملتا ہے جس کا تذکرہ پروفیسر ڈیتیز نے اپنی کتاب [illegible] کی قدامت کے دلائل میں کیا ہے۔ غرض ہمیں ایک غیر متعین لیکن بلاشبہ بہت ہی قدیم زمانے میں سوشرت کا ذکر فن جراحت کے بانی کی حیثیت سے اور چرک کا فن طب کے موجد کی حیثیت سے ملتا ہے۔

ان تذکروں میں ہمیں ہندو فن طب کی ان دو بڑی شاخوں کی بنیاد نظر آتی ہے، جس کے ساتھ ہی ساتھ تیسری شاخ 'ندان' یعنی تشخیص امراض کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی بنیاد آیورویدپر ہے، جس سے نہایت کثرت کے ساتھ اقتباسات لئے گئے ہیں اور پھر انہی کی تشریح برہمنا اور بعد کے قرون وسطیٰ کی شرحوں میں بھی کی گئی ہے۔

آیورویدکی تقسیم | خود آیوروید جیساکہ اس کے مفسرین نے لکھا ہے، آٹھ حصوں میں منقسم ہے۔ [illegible] فن جراحت کے متعلق ہیں، پانچ طب کی کسی نہ کسی شاخ سے تعلق رکھتے ہیں [illegible] فن جراحت کے پہلے باب میں اجسام غریبہ کے نکالنے، چھری وغیرہ کے زخموں کو کے سینے، پٹیاں باندھنے کے طریقے اور آبلے، آماس اور دمل وغیرہ کے علاج سے بحث کی گئی ہے دوسرے باب میں آنکھ، کان، ناک اور منہ کے امراض سے بحث ہے تیسرے باب میں جو طب کے شعبہ کا پہلا حصہ ہے، ایسے امراض سے بحث ہے جن کا تمام جسم پر اثر ہوتا ہے مثلاً بخار وغیرہ۔ چوتھا باب دماغ کے علاج، پانچواں بچوں کی خبر گیری، چھٹا تریاق کے استعمال ساتواں جوانی دوبارہ عود کرانے اور آٹھواں نسل انسانی کے تحفظ و بقا پر مشتمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کیمیا کا لفظ عربی زبان سے نکلا ہے لیکن خود یہ علم عربوں سے بہت پہلے ہندوستان میں موجود تھا، اس لئے کہ آیوروید کے ساتویں باب میں اس علم سے بہت کچھ بحث کی گئی ہے۔

آیوروید کے یہی آٹھوں باب کم و بیش اسی ترتیب کے ساتھ سوشرت اور چرک نے اپنی تصانیف میں بیان کئے ہیں۔

سوشرت کون تھا؟ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سوشرت، وشوامتر کا لڑکا تھا جو راجہ
جی کا ہمعصر ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ متعین طور پر کس زمانے میں تھا۔ سر ولیم جونس (بانی
رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) نے راجہ چندر کے ہندوستان فتح کرنے کا زمانہ تقریباً ...
قبل مسیح متعین کیا ہے۔ برعکس اس کے بعض علماء نے فلسفہ سوشرت کو گوتم بدھ کا ہمعصر قرار دیئے
ہیں چونکہ وید کے بہت سے شتروں میں اس کا ذکر آتا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ویدوں
کے زمانے میں رہا ہوگا علاوہ اس کے اتھروید کی آٹھویں کتاب کا ایک منتر انسان کی تخلیق
کے متعلق ہے جس میں جسم کے ڈھانچہ کا اس طرح ذکر ہے جس طرح ایتریا اور سوشرت کے ہاں ملتا
ہے۔ اتھروید کا ایک بڑا حصہ مسلمہ طور پر ... ۱ ق۔م کے قریب کا ہے اور منتر مذکورہ بالا اس
سے بھی قدیم حصہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سے اتنی بات تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ
سوشرت ... ۱ ق۔م سے بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اور علاوہ اس کے نہیں اس کا اصل
مسودہ بھی دستیاب نہیں ہوا ہے۔ سنسکرت کی جس کتاب کو ہم "سوشرت" کے نام سے موسوم
کرتے ہیں، وہ نہ جانے کتنی تقریظوں کی تقریظ ہو گی جو اصل تصنیف کے زمانے سے بعد میں
کی گئی ہے۔

اپنی اس کتاب میں اس نے آیوروید کے آٹھوں ابواب کا چھ بڑے بڑے عنوانات
کے ماتحت ذکر کیا ہے۔ وہ وید کے انہی دو ابواب سے جن میں فن جراحت کا ذکر کیا گیا ہے،
خاص طور سے بحث کرتا ہے، اگرچہ کسی قدر طبابت سے بھی تعلق ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ آج کل
بھی دستور ہے۔ ان چھوں ابواب میں سے پہلے باب میں خاص طور سے فن جراحت سے بحث
کی گئی ہے، اگرچہ اس میں کسی قدر آب و ہوا اور غذا کا بھی ذکر ملتا ہے جس کا صحت پر بہت کچھ
اثر پڑتا ہے۔ دوسرے باب میں ان امراض کا علاج ہے جو خراب طوبتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس
کے تیسرے باب کو ہم تشریح الابدان سے تعبیر کر سکتے ہیں، چوتھے کو علم العلاج سے پانچویں
کو علم السموم سے۔ چھٹا اور آخری باب بطور ضمیمہ کے ہے جس میں زیادہ تر اکثر مقامی بیماریوں

سے بحث کی گئی ہے۔

غرض سو شہرت نے صرف فن جراحت پر اپنی توجہ رکھی ہے اور جسے وہ علوم طبی میں اولین اور بہترین علم قرار دیتا ہے، اور جس میں دوسرے علوم کی بہ نسبت قیاسی اور استنباطی طریقہ کی بنا پر سب سے کم غلطیوں کا امکان ہے، جو خالص اور بے آمیز ہے، علم انسان کا بہترین ثمر اور شہرت کا یقینی ذریعہ۔ اس کے بعد ایک عام بے تعلق شخص بھی صحیح طور پر اندازہ کر سکتا ہے کہ موجودہ مغربی نظریوں کی کس درجہ جھلک اس میں نظر آتی ہے۔

چرک کون تھا؟ | چرک کے متعلق غور کرنے کے بعد بھی ہم کم و بیش اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ متعین طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کون تھا اور کس زمانے میں تھا؟۔ اس کی تصنیف مکالمہ کی صورت میں ہے جو ایک استاد اور شاگرد کے درمیان ہے۔ مضامین سے جس انداز میں بحث کی گئی ہے اس میں کوئی خاص نظام نظر نہیں آتا بلکہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے نئے نئے مضامین کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ مکالمہ کا ایک بڑا حصہ غیر دلچسپ ہے لیکن عموماً ایسے مضامین کا ذکر ہے جو انسان کے لئے بہت ضروری ہیں۔

سب سے پہلی کتاب میں جو تین عنوانات پر مشتمل ہے، فن طب کی اصل، وطبیب کے فرائض سے گفتگو کی گئی ہے۔ دواؤں کی ترتیب، انکے خواص اور استعمال، ان میں سے ہر ایک سے بتفصیل بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح امراض کے اسباب، نوعیت اور انکے انسداد و علاج سے بھی بحث ہے۔ غذا، بخارات کے ذریعہ غسل، کھانوں کی بڑی تقسیمیں یہ اُن بے شمار مسائل میں سے صرف چند ہیں جن کا ذکر اس پہلی کتاب میں آتا ہے۔

امراض | دوسری کتاب میں امراض کا بیان ہے مثلاً بخار، جدرہ یا ورم جذام، جنون صرع یعنی مرگی۔ تیسری کتاب میں وبائی امراض کی نوعیت، جسم کے اندر رقیق مادوں کی خصوصیت اور دوسرے مسائل سے بحث ہے۔ چوتھی میں استقرار، مخلوق کی قسموں اور جسم و روح کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔

پانچویں کتاب میں اعضائے جسمی، ان کی خصوصیات اور امراض، گویا اعضائے جسمی میں بیماری کے اسباب، قوت کا یکبارگی زائل ہوجانا اور موت کا بیان ہے، چھٹی کتاب میں زیادہ قوت اور عمر حاصل کرنے نیز مختلف قسم کے امراض کی تکالیف سے بحث کی گئی ہے مثلاً استسقا یرقان، جلد کا صفراوی ورم، دمہ، تشنگی، زہر خوری، التہاب، ورم، سکرات، گٹھیا اور فالج وغیرہ اس قسم کے تمام امراض بھی ہیں۔ ساتویں کتاب میں مقئی و مسہل کا ذکر ہے اور اس کے بارہواں باب میں اس قسم کی بہت سی دواؤں کا ذکر ملتا ہے جو اس زمانے کے ہندوؤں کو معلوم تھیں۔ سب سے آخری اور آٹھویں کتاب میں جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے بخار کے علاج، مختلف اغراض کے لئے انجکشن اور پچکاریوں وغیرہ کے دینے کا ذکر ہے۔ اگرچہ اس زمانے کی طب کے ساتھ بہت کچھ قصہ کہانیوں کا رنگ بھی ملا ہوا ہے، اور یہ ترتیب و نظام آج کل عام طور پر لوگوں کو نظر نہیں آتا، پھر بھی اس زمانے کی غیر معمولی طبی معلومات سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بہت سی باتوں کو جنہیں دور جدید کی اکتشافات شمار کیا جاتا ہے وہ حقیقت میں اس زمانے کے لوگوں کو عام طور پر معلوم تھیں۔

ان دو اشخاص یعنی سوشرت اور چرک سے مختلف گروہ پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر وایز نے اپنی کسی تحریر کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ دو مختلف طریقے فن جراحت کے ہیں، نو طب کے، تین علم الادویہ کے۔ ایک تشخیص امراض کا، ایک دواسازی کا اور تین معدنیات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چار کا تو کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن باقی طریقوں سے ہم ہندوستان کے قدیم فن طب و جراحت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جراحی سے متعلق جتنے آلات و اوزار تھے ان کی بھی مختلف شاخیں اور قسمیں ہیں جن کی مجموعی تعداد کوئی سوا سو ہے۔ ان میں بڑی بڑی دو قسمیں (۱) "یانترا" یعنی بغیر دھار کے آلات، (۲) "شاسترا" یعنی دھار والے آلات جن کا کسی قدر تفصیل سے ذکر آئندہ آئے گا۔

علم تشریح مذکورہ بالا بحث سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قدیم جراح علم تشریح سے بھی کچھ نہ کچھ واقف رہے ہوں گے لیکن آجکل کا یہ حال دیکھکر کہ ہندو طلبہ لاش کے قریب جانے سے کس قدر بھاگتے ہیں، شبہ ہوتا ہے کہ آیا یہ سچ بھی ہے۔ ۱۸۳۶ء میں جب انگریزی طریقہ چیر پھاڑ ہندوستان میں سب سے پہلی بار رائج ہوا، تو اُس وقت بمشکل دس طالب علم اس کے لئے دستیاب ہو سکے اور بوقت تمام اس کام کو شروع بھی کرنا چاہا تو بکری کے ڈھانچوں اور خشک ہڈیوں سے شروع کیا گیا۔ انسان کی لاش پر چیر پھاڑ کرنا تو قطعاً بعید از قیاس تھا۔ صرف ایک بنگالی طالب علم تھا جس نے ہمت کر کے سب سے پہلے یہ راہ کھولی، پھر بھی اس کے لئے سب سے پہلا کمرہ جو تیار ہوا، اس کی دیواریں خاص طور سے بہت بلند رکھی گئی تھیں اور ہر وقت اس کے گرد پولیس کا پہرہ لگا رہتا تھا تاکہ کسی وقت عوام کے جذبات مشتعل نہ ہو جائیں اور لوگ حملہ کر بیٹھیں۔ اس کے متعلق عام خیال یہ بھی پھیلا ہوا تھا کہ ادھر اُدھر سے لڑکے پکڑ لائے جاتے ہیں اور مریضوں کو بعض اوقات قصداً مار ڈالا جاتا ہے تاکہ چیر پھاڑ کے لئے لاشیں مل سکیں، لیکن یہ کوئی خاص ہندوستان ہی کے لئے تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں بھی یہی حال تھا۔

بہرحال علم تشریح کے تین بڑے گروہ ہیں جن میں سے ایک اتریہ (Atreya) کا ہے جس کا زمانہ ۱۲۰۰ قبل مسیح ہے، دوسرا سوشرت کا اور تیسرا واگ بٹ (Vagbata) کا جو دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اگرچہ ان گروہوں کی تشریح میں مستقل تصنیفات درکار ہیں لیکن مختصر طور پر ان کے اصولوں کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چرک کو لیجئے وہ کہتا ہے کہ جسم میں حسب ذیل حصے ہوتے ہیں: دو بازو، ۲ ٹانگیں، سر اور گردن، اور جسم کے بیچ کا حصہ۔ یہ کل جسد انسانی ہے جس میں دانت اور ناخن کو لیکر کل ۳۶۰ ہڈیاں ہوتی ہیں؎ اس کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سر اور گردن کو ملا کر ایک رکھا ہے برعکس اس کے سوشرت کی فہرست میں ہم کو صرف ۳۰۰ ہڈیوں کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ وہ خود

کہتا ہے کہ " علم جراحت کے مطابق صرف ۳۰۰ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ۱۲۰ اعضاء میں ہیں، ۱۱۷ شکم کے جھکاؤ، اس کے ہردو پہلوؤں، پشت، شانوں اور سینہ میں" اور ۶۳ گردن سے اوپر ہیں۔ اس طرح سے مجموعی تعداد ۳۰۰ کی ہوجاتی ہے" اور پھر اس کے علاوہ ہر ایک حصہ کی مزید تفصیل کرتا ہے۔

سوشرت اور چرک کے بیانات میں جو فرق ہے وہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ چرک [illegible] دانتوں اور ۲۰ ناخنوں کو بھی علحدہ ہڈیوں میں شمار کیا ہے۔ بہرحال انکے اعداد وشمار میں خواہ کچھ ہی فرق کیوں نہ ہو، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کے طریقوں سے فن تشریح کے نہایت وسیع اور جامع ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور بڑے سے بڑے اور نازک سے نازک اپریشنوں کے لئے جس کا کہ اس زمانے میں اکثر رواج تھا ایسے ہی جامع اور وسیع علم کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہ اس زمانے کے اپریشن میں صرف جسم کے حصہ کا کاٹنا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ شکم کے اندرونی حصہ میں بھی اپریشن دئے جاتے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑی جاتی تھیں۔ جوڑ بٹھائے جاتے تھے اور فاسد مادہ نہایت خوبی سے نکال لیا جاتا تھا۔ موتیا بند کے علاج کا سہرہ بھی سوشرت ہی کے سر ہے علاوہ اس کے چیڑے کا ٹکڑا اعضا کے جوڑنے اور علاج کا طریقہ بھی جو یورپ کو ابھی حال میں معلوم ہوا ہے، ان قدیم جراحوں کے ہاں برابر جاری تھا۔

چیرپھاڑ کے لئے جو کمرہ ہوتا تھا اس کے لئے بھی مختلف قواعد مقرر تھے۔ اس کو بعض دافع جراثیم بخارات سے صاف رکھا جاتا تھا۔ بعض اپریشنوں سے قبل مریض کو کوئی ہلکی غذا دیجاتی تھی، اور بعض حالتوں میں اسے بالکل فاقہ کرایا جاتا تھا، جراح کے لیے قاعدہ تھا کہ وہ اپنے سر اور داڑھی کے بال چھوٹے رکھے اور اپنے ناخنوں کو بھی صاف اور ترشے ہوئے رکھے جن پر آج کل کے ماہرین علم جراثیم بہت زور دیتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ صاف ستھرے اور خوشبودار کپڑے پہنے۔ نشتر دینے سے پہلے بیہوش کرنے والی دواؤں کے استعمال کا

بھی کہیں کہیں پتہ چلتا ہے۔ آخر زمانے میں سنہ ۱۵۰۰ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب ملتی ہے جس میں نشتر چبھنے سے پیشتر ایک دوا لگانے کا ذکر ہے جسے "سموہنی" کہتے تھے اور جو گوتم بدھ کے زمانے میں بھی استعمال ہوتی تھی۔

[illegible] قدیم تصانیف سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں نیوٹن کی پیدائش سے سیکڑوں برس پہلے لوگوں کو "کشش اجسام" کا مسئلہ بھی معلوم تھا نیز ہاروے کا نام سننے سے پیشتر وہ دوران خون کے علم سے بھی واقف تھے۔ ہریت نامی ایک ماہر فن اپنی کتاب میں انیمیا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ بیماری رگوں کے درمیان میں مٹی کے آجانے سے پیدا ہوتی ہے جس سے کہ خون کا دوران بند ہو جاتا ہے۔ جز لایتجزی کے نظریہ پر حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے صدیوں پہلے بحث ومباحثہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ریاضی و ہیئت میں ان کے معلومات بہت وسیع تھے۔

جسم کے بعض حصوں کے کاٹنے کے ساتھ لوگوں کو بعض اعضا کے از سر نو لگانے کا طریقہ بھی معلوم تھا اور رگ وید میں اس کا بعض بعض جگہ ذکر ملتا ہے ایک موقع پر لوہے کے پاؤں کا ذکر آیا ہے۔ اسی طرح مصنوعی آنکھوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چمڑے کے پیوند لگانے کا ذکر پہلے آچکا ہے جس کا اعتراف ایک جرمن مصنف ڈاکٹر ہرش برگ (Dr. Hirsch Berg) اپنی کتاب میں کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ "یورپ کے اس قدیم فن میں نئے سرے سے ایک جان پڑ گئی جبکہ ہندوستانی جراحوں کے ان کمالات کا ہمیں علم ہوا۔" ذی روح جسم سے چمڑا کاٹ کر جوڑ لگانا بھی خالص ہندوستانی ہی طریقہ ہے۔

ان قدیم جراحوں کو چمڑے سے نئے کان اور نئی ناک بنانے میں بھی دسترس تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انکے ہاں مجرموں یا بیوفا بیویوں کو اکثر ناک اور کان کاٹنے کی سزائیں دی جاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کے جوڑنے اور لگانے کا طریقہ بھی لوگوں نے حاصل کیا۔

[illegible] واگ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ گوتم بدھ کا طبیب جیو کا کھوپڑی کی ہڈیاں

… جوڑ کا علاج بھی کس خوبی سے کر سکتا تھا، علاوہ اس کے جینر (Jenner) سے بہت پہلے
… یہاں کے گوالے چیچک کا ٹیکہ لگانا جانتے تھے۔ وہ آبلوں کے خشک کھرنڈوں کو لیکر کسی قدر اپنے
بازو پر رکھتے اور پھر اس کے بعد جسم میں سوئی چبھو دیتے اور اس طرح گویا وہ چیچک کے حملے سے
محفوظ ہو جاتے۔ اٹھارویں صدی کے ایک فاضل ڈاکٹر ہولیٹ (Dr. Howell) کا خیال ہے کہ
ہندو اطباء اس قسم کا بھی ٹیکہ لگانا جانتے تھے جسے آج کل ویکسی نیشن کہتے ہیں
یہاں تک تو فن جراحت کا ذکر تھا۔ آئندہ سطروں میں فن طب کا تذکرہ کیا جائیگا۔

سلیم کی یاد میں

[illegible] کو یادِ غمدیر بائیس سال ہوگئے۔ وہ بھی کیا وقت تھا جب میں کوہ مینی تال سے [illegible]لو اورینٹل کالج، علیگڑھ میں داخل ہونے کے لئے چلا اور نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں مرحوم نے مجھ سے کہا کہ علیگڑھ پہنچکر مولوی سید وحید الدین سلیم اڈیٹر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے ضرور ملنا [illegible] معارف مرحوم جس کے وہ اور حاجی صاحب مرحوم جوائنٹ اڈیٹر تھے میری نظر سے گزر چکا تھا اسلئے مجھے خود سلیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا بہت شوق تھا مگر میں علیگڑھ پہنچکر کالج کی ایف۔ اے کلاس میں داخل ہوتے ہی بیمار پڑ گیا۔ ایک ماہ تک صاحب فراش رہا جب کچھ افاقہ ہوا تو اس سال کثرتِ طلاب کی وجہ سے جو جگہ پی پارک میں مجھے ملی تھی اس پر دوسروں کا قبضہ ہوگیا تھا اور میں تندرست ہو جانے کے باوجود کرزن ہسپتال ہی میں رہنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ آخرکار کالج کے اربابِ حل وعقد نے جعفر منزل کرایہ پر لی اور مجھ جیسے اور ستم رسیدوں کو بھی وہاں رہنے کا حکم ہوا۔ ازآنجملہ اقتدار عالم صاحب بھی تھے جو تھرڈ ایر کلاس میں تھے اور آج کل غالباً بدایوں میں وکیل ہیں۔ ان حضرت سے صاحب سلامت ہوکر کافی شناسائی ہوگئی تھی۔ جعفر منزل اس وقت زیر تعمیر تھی اور اسی کے جو کمرے تیار ہوگئے تھے وہ بھی آرام دہ نہ تھے۔ اقتدار صاحب کالج کے پرانے طالب علم تھے۔ جوڑ توڑ لگاکر سوسائٹی کو منتقل ہوگئے مگر میں اور دیگر طلبہ کچھ عرصہ تک جعفر منزل ہی میں رہے۔ اب مجھے یہاں رہتے ہوئے دو تین ماہ گذر چکے تھے۔ ایک روز خیال آیا کہ سلیم صاحب سے ملنا چاہئے۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ جعفر منزل سے سوسائٹی کی طرف جہاں سلیم صاحب رہتے تھے پاپیادہ روانہ ہوا۔ ان دونوں میں کم ازکم ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ شام کے کوئی چار بجے ہونگے اور غالباً آخر نومبر یا شروع دسمبر کا زمانہ تھا۔ سوسائٹی پہنچکر سلیم صاحب کا کمرہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ دکن کی جانب کے کمرے میں مقیم ہیں

اُس کمرہ میں پہنچا تو وہاں دو تین اصحاب اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سلام کرکے ایک کرسی پر خاموش بیٹھ گیا اور منتظر رہا کہ اور لوگ اٹھ جائیں تو سلیم صاحب سے اظہار عقیدت کروں۔ خوش قسمتی سے دس پندرہ منٹ کے بعد جس موقع کا میں متلاشی تھا وہ مل گیا۔ میں اور سلیم صاحب رہ گئے باقی اصحاب اٹھ کر چلے گئے۔ اب میں نے از اول تا آخر حاجی محمد اسمٰعیل خاں کا ارشاد اور بیاری کی وجہ سے جلد نیاز نہ حاصل کرنے کی مجبوری وغیرہ وغیرہ تمام قصہ کہا اور اُن کی ملاقات پر فخر کا اظہار کیا اُس وقت تک میں نے دو چار نظمیں ضرور لکھی تھیں مگر وہ سلسلے سے یاد نہ تھیں اس لئے میں نے غزل کے کچھ اشعار سلیم صاحب کو اپنے ادبی مذاق کے ثبوت میں سنانے شروع کئے۔

عرصہ زیادہ ہوگیا ہے لیکن جہاں تک خیال ہے میں نے اپنا یہ شعر پڑھ کر سنایا تھا۔

ہمیشہ نامہ بر سے وہ یہی کہتا ہے "چل آیا" کہاں تک دل کو سمجھاؤں نہ آج آیا نہ کل آیا

سلیم صاحب۔ لغو۔

(مجھے تعجب تو ہوا لیکن میں سلیم صاحب کے "لغو" کہدینے سے ابھی اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا)

میں۔ ارے نادان! تو فکر دنیا میں کیوں سر کھپاتا ہے دھرا رہ جائیگا سب کچھ جو پیغام اجل آیا

سلیم صاحب۔ واہیات۔

اب میں سٹی بھول گیا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلیم صاحب کو اپنی خوش مذاقی کا کیسے یقین دلاؤں میں نے دل میں کہا کہ ۱۹۰۶ء ایک قطعہ مولانا حالی کو سنایا تھا جب وہ میرٹھ خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں تشریف لائے تھے اور انہوں نے اُس کی زبان کی تعریف کی تھی۔ آؤ اُسے سنائیں چنانچہ اس تمہید سے کہ مولانا حالی سے میرٹھ میں مجھے نیاز حاصل ہوا تھا اور یہ قطعہ انہیں بھی سنایا تھا میں نے پڑھنا شروع کیا)

کیسے ہو، بیٹھو، جاؤ جلدی ہے ایسی کیا مدت میں آج ہوئی ہے زیارت حضور کی
تشریف لائے اور کیا مورد کرم تکلیف میرے واسطے اتنی ضرور کی

شب کو قیام کیجیے جو آپ ہی کا گھر | میں آپ ایک ہیں نہیں اب تب ہے دور کی
یہ بات تو ہے خوب ولیکن سحر نہو | جبتک کہ ہم سنے نہیں آواز صور کی

سلیم صاحب - خرافات -

اب مجھے کچھ اور کہنا باقی نہ تھا اور دل ہی دل میں پشیمان تھا کہ سلیم صاحب نے نصیحتاً کہا کہ "شاعری بیکار شے ہے اسے چھوڑنا چاہیے" اور مجھ سے دریافت کیا۔

سلیم صاحب - تم مولانا حالی سے کہاں ملے تھے ؟

میں - میرٹھ میں -

سلیم صاحب - کب ؟

میں - [illegible] میں -

سلیم صاحب - تم انہیں پہچان سکتے ہو ؟

میں - (ذرا ہچکچاتے ہوئے) جی ہاں !

(اسی کمرے کے اندر لکڑی کے تختوں سے ایک حدِ فاصل بنا کر علیحدہ چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا تھا اور دروازہ بھی لگا تھا تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک صاحب باہر تشریف لائے سلیم صاحب فوراً اٹھے، اُنکے اٹھتے ہی میں بھی کھڑا ہوگیا۔ غالباً سلیم صاحب سے انہوں نے دیاسلائی طلب کی اپنا سگار روشن کیا اور کھڑے کھڑے دو تین کش لیکر جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے اور دروازہ بدستور بند ہوگیا۔ سلیم صاحب پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھے)

سلیم صاحب - (مجھ سے مخاطب ہوکر) تم جانتے ہو کہ یہ کون صاحب تھے ؟

میں - (بالکل بے پروائی سے) جی نہیں !

سلیم صاحب - یہ مولانا حالی تھے -

سلیم صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ میرے دل کی عجیب کیفیت ہوگئی اور وہاں سے اٹھنے کے لئے بے قرار ہوگیا - میری بیقراری کو سلیم صاحب نے مولانا حالی سے ملنے کی خواہش پر محمول کیا اور

فرمانے لگے "یہ وقت اُن سے ملنے کا نہیں ہے۔ وہ کراچی ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے اپنا خطبہ تیار کر رہے ہیں ۔ انکو ملنے ملانے کی فرصت نہیں ہے"

میں ۔ (کھڑا ہوکر) السلام علیکم

سلیم صاحب ۔ (بہت بے پروائی سے) وعلیکم السلام

اب دن چھپنے ہی کو تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر مجھے معلوم نہیں ہوا کہ میرا پاؤں کہاں پڑ رہا ہے اور میں کدھر چلا جا رہا ہوں۔ اپنے اوپر لعن و تعن کرتا ہوا اور افسوس کرتا ہوا کہ کیوں اس شخص سے ملنے آیا اور قریب قریب روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بار بار کہتا تھا "یہ عجیب آدمی ہے میں نے مانا مجھے شعر کہنا نہیں آتا۔ میرے اشعار بھی لغو ہیں لیکن یہ کیا انسانیت ہے کہ اس طرح آدمی کو ذلیل کیا جائے۔ کیا اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے کوئی اور مستحسن طریقہ نہ تھا؟ اور لیجئے آپ پوچھتے ہیں تم مولانا حالی کو پہچان سکتے ہو۔ گویا میں جھوٹا ہوں، میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں کوئی پوچھے کہ ایک ہی بار تو میں نے مولانا حالی کو دیکھا تھا۔ پھر دو برس تک دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور تصویر ان کی کہیں شائع نہیں ہوئی تھی۔ کیا یاد رہ سکتا ہے اور ان کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے۔ مگر اس شخص کو ذلیل کرنا مقصود تھا۔ بھئی ہم تو اب اس شخص کے یہاں کبھی نہ جائینگے خدا اس سے پناہ میں رکھے۔ توبہ توبہ! یہ شخص تو بات کرنے کے لائق ہی نہیں ہے" غرض جو میرے منہ میں آیا کہتا چلا گیا۔ اپنے آپ کو بھی برا کہا اور سلیم صاحب کو بھی۔ جب جعفر منزل پہنچا تو میں اس قدر رنجیدہ اور ملول تھا کہ اس روز میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ رات کو کچھ لکھا پڑھا دو تین روز تک میں چپ چپ اور خاموش رہا۔ اس کے بعد یہ جاں گزا سانحہ دل سے محو ہو گیا

ایک روز اقتدار صاحب ملے۔ اس واقعہ کے ایک یا ڈیڑھ ماہ بعد اور میری نظم موسوم بہ "ایک طائر وحشی کی فریاد" علیگڑھ منتھلی دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہو چکی تھی کہنے لگے "سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ"

میں ۔ (دل میں) شاید ان کو میری اور سلیم صاحب کی اس ملاقات کا حال معلوم ہو گیا ہے اور

میں [illegible] (اقتدار صاحب سے) میری [illegible] صاحب کی کوئی واقفیت نہیں وہ مجھ کیوں یاد کرتے؟

اقتدار صاحب۔ (کسی قدر مسکرا کر جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ضرور میری ہنسی اڑا رہے ہیں) بھئی! میں سچ کہتا ہوں وہ آپ کو پوچھ رہے تھے اور جب انہیں معلوم ہوا کہ میری اور آپ کی ملاقات ہے تو مجھ سے باصرار کہا کہ تنہا صاحب سے ضرور ملانا۔ مجھے تو آپ سے کہنا بھی یاد نہ رہا اور وہ کئی بار تقاضا کر چکے ہیں۔ (اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر) اگر تمہیں میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔

اقتدار صاحب کے ساتھی۔ واقعی سلیم صاحب نے مجھ سے اور ان سے کئی بار کہا ہے کہ تنہا صاحب سے ہمیں ملاؤ۔ اور ہم نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ وہ اکثر یہاں تاش کھیلنے آیا کرتے ہیں آپ سے ملا دیں گے۔ آپ سوسائٹی ہم سے ملنے اور تاش کھیلنے اکثر جاتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ہمیں یاد نہیں رہتا۔

میں۔ (دل میں) آپ کے ساتھی ہی کیا قابل اعتبار ہیں۔ اس کالج میں تو ایک سے ایک چھٹا ہوا لڑکا بھرا ہوا ہے۔ بیوقوف بنانا اور ہنسی اڑانا معمولی بات ہے۔ (اقتدار صاحب سے) اچھی بات ہے جب آپ سے ملنے آؤں گا تو سلیم صاحب سے بھی مل لوں گا۔

درحقیقت اقتدار صاحب سے میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی مگر دل میں یہی ارادہ تھا کہ سلیم صاحب سے ہرگز نہ ملوں گا اگر اقتدار صاحب فی الواقع سچ بھی بول رہے ہوں۔ علیگڑھ منتھلی جنوری [illegible] میں اب میری ایک اور نظم "بلبل سے دو دو باتیں" چھپی۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ دونوں نظمیں دیکھ کر سلیم صاحب کو مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور وہ اپنی اور میری اُس ناگفتہ بہ ملاقات کو بھول گئے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ اقتدار صاحب جب کبھی ملتے۔ مجھ سے ضرور تقاضا کرتے کہ سلیم صاحب سے ملنے چلو اور میں ٹال دیتا۔

ایک روز تعطیل تھی اور میں کھانا کھا کر سیدھا سوسائٹی پہنچا۔ شاید بارہ بجے ہوں گے آخر [illegible] شروع فروری کا زمانہ تھا۔ اقتدار صاحب کے کمرے میں تاش کھیلا جا رہا تھا۔ میں بھی

شریک ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اقتدار صاحب سے [illegible] کو سلیم صاحب نے آدمی بھیجکر کسی ضرورت سے بلایا۔ وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ "تنہا صاحب! چلئے۔ آج تو پکڑے گئے۔ سلیم صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں"۔ میں بہت جزبز ہوا مگر چارہ کار کچھ نہ تھا۔ میں نے کالج واپس آنے کا بھی ارادہ کیا لیکن اقتدار عالم صاحب نے مجھے پکڑ لیا اور کشاں کشاں سلیم صاحب کے کمرہ تک لے گئے۔ وہاں پہنچکر مجبوراً میں نے بھی متانت اختیار کی اور کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں چلتا ہوں۔ چنانچہ اسی صدفاصل والے چھوٹے کمرہ میں ہم سب لوگ جو چار یا پانچ تھے داخل ہوئے۔

سلیم صاحب بآں ریش مبارک ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دو تکیے جن کے غلاف میلے تھے ایک سرہانے اور ایک اُن کے زانو کے نیچے تھا۔ پان چبا رہے تھے۔ پاندان چھوٹا سا ایک اسٹول پر تھا اور ایک بوسیدہ ڈبیہ بھی تھی جس میں بہت سے پان بنے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کے بیٹھنے کے لئے کرسیاں پڑی تھیں، ایک آدہ کی جو کمی تھی وہ نوکر نے باہر سے لاکر پوری کردی اور ہم میں سے ایک صاحب سلیم صاحب کی پائینتی بیٹھ گئے۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اقتدار صاحب نے سلیم صاحب سے میرا تعارف کرایا۔

سلیم صاحب۔ (مجھ سے مخاطب ہوکر) آپ کی نظمیں علیگڑھ منتھلی میں دیکھ کر بیحد طبیعت خوش ہوئی آپ بہت اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔ افسوس ہے آپ سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں۔ (دل میں، ارے ظالم! میں ہی جانتا ہوں، میں جیسی اچھی نظمیں لکھتا ہوں (سلیم صاحب سے) کچھ عرصہ ہوا میں آپ کی خدمت میں حاضر تو ہوا تھا۔

سلیم صاحب۔ مجھے بالکل یاد نہیں۔ آپ ایک مرتبہ کے بعد پھر شاید نہیں آئے

میں۔ (دل میں) کون ایسا کمبخت بے غیرت ہوگا جو ایسی ملاقات کے بعد دوبارہ آئے (سلیم صاحب سے) جی ہاں، پھر میں نہیں آیا۔

سلیم صاحب۔ کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔ آپ کے کالج کے اکثر طلبہ جن کو ادبی مذاق ہے تقریباً روزانہ آتے رہتے ہیں۔ مجھے بلکہ تعجب ہے کہ آپ ادھر کا رخ نہ کریں

میں ۔ (دل میں) میں تو بڑے اشتیاق سے آیا تھا لیکن نتیجہ نفرت انگیز نکلا (سلیم صاحب) کبھا ایسا ہی اتفاق ہوا ۔ انشاء اللہ اب حاضر ہوا کروں گا ۔

ہم سب لوگ دس پندرہ منٹ اور بیٹھے اور سلیم صاحب نے سب کو اپنی ڈبیہ میں سے پان عنایت فرمائے ۔ اس کے بعد ہم سب رخصت ہو کر چلے آئے میں جعفر منزل یا غالباً کچی بارک کے کمرہ نمبر ۲ کو چلا آیا کیونکہ میں ۱۹۰۵ء تک جب کہ میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا اسی کمرہ میں رہا ۔ اب میں کبھی کبھی سلیم صاحب کے یہاں جانے لگا اور ان سے ایک قسم کی بے تکلفی ہو گئی ایک روز سلیم صاحب نے فرمایا "بھی تم نثر نہیں لکھتے نظمیں ہی لکھا کرتے ہو ! اس زمانہ نثر کا ہے کوئی مضمون ہمارے اخبار کے لئے لکھو" میں ان سے مضمون لکھنے کا وعدہ کر کے چلا آیا چار پانچ روز بعد میں ایک مضمون لکھ کر لے گیا ۔ اس کا عنوان "شہرت سے خطاب" تھا ۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ اور اسے تمام و کمال پڑھ کر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہنے لگے "یہ مضمون تم نے لکھا ہے" میرا اب وہ زمانہ تو رہا نہیں تھا کہ جب انکے الفاظ "لغو ، واہیات ، خرافات" کڑوے گھونٹ کی طرح پی کر چلا گیا تھا اب میں ان سے مقابلے کے لیے بھی تیار تھا ۔

میں ۔ جی نہیں کسی اور سے لکھوا کر لایا ہوں ۔

سلیم صاحب ۔ واقعی خوب مضمون لکھا ہے ۔ تم نظم لکھنا چھوڑ دو ۔ نثر لکھا کرو ۔ نثر تم بہت اچھی لکھتے ہو ۔ (میرے چہرے کی طرف دیکھ کر) تمہاری صورت پر علمیت نہیں برستی ۔ لیکن آگے چل کر عالمانہ شان بھی پیدا ہو جائے گی ۔

سلیم صاحب نے وہ مضمون علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور ایک ہفتہ تک جو کوئی آتا ان سے میرا تعارف کراتے اور کہتے کہ آپ نے "شہرت سے خطاب" والا مضمون پڑھا ہے ۔ وہ تنہا صاحب یہی ہیں جنہوں نے وہ مضمون لکھا ہے ۔ دو تین ہفتہ کے بعد سلیم صاحب نے اور مضمون لکھنے کے لئے کہا ۔ اور میں نے ایک ہفتہ کے بعد "اعتماد" پر مضمون لکھا ۔ اسے لیکر سلیم صاحب کی خدمت میں پہنچا ۔ پہلے دو پیراگراف دیکھ کر کہا کہ یہ اچھے ہیں لیکن آخر کے حصہ مضمون کو پڑھ کر کہا کہ یہ کچھ

نہیں اس کو بدلو۔ میں اگلے روز اُسے بدل کرلے گیا پڑ ہکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بغلگیر ہوئے بیحد تعریف کی اور کہا کہ تم نے آخر کے حصہ کو خوب ہی بدلا ہے تعریف نہیں ہوسکتی۔ اُس مضمون کو بھی علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھاپا اور لوگوں سے اُس کی تعریف کرتے رہے۔

ایک روز میں ایک انگریزی نظم کا اردو نثر میں ترجمہ کرکے لے گیا۔ بہت داد دی اور کہا کہ بہت سی انگریزی نظموں کا ترجمہ کرکے ایک کتابی شکل میں چھپواؤ چنانچہ انکے ارشاد کے مطابق شاعرانہ خیالات کے نام سے میں نے اس قسم کی کتاب ۱۹۱۰ء میں چھپوائی تھی سلیم صاحب اس وقت لکھنؤ کے مسلم گزٹ کے اڈیٹر تھے۔ اُس اخبار میں آپ نے اس کتاب پر ریویو کیا اور لکھا کہ ایک شخص نے فرانسیسی نظموں کا ترجمہ عربی میں چھاپا ہے۔ وہ ترجمہ میں ایسا کامیاب نہیں ہوا جیسے کہ تنہا صاحب اس کے علاوہ اور بہت کچھ تعریف لکھی۔

ایک روز چند طلبا انکے پاس بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ گرمی کا موسم۔ مجھے سوسائٹی کے دروازے سے آتا دیکھکر بڑے زور کے ساتھ ہاتھ سے اشارہ کرنے لگے کہ فوراً آؤ۔ انیس احمد صاحب بھی تھے جو شیخ الہند مولوی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہونے کی وجہ سے مولوی انیس احمد صاحب مشہور ہیں اور ہندوستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے بھی اشارہ کیا کہ فوراً آؤ۔ میں تیز قدمی کے ساتھ ان لوگوں کے پاس پہنچا اور حیران تھا کہ کیا ایسا ضروری کام ہے جو اس قدر جلد بلاتے ہیں فوراً مجھے بیٹھنے کے لئے کہا گیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب سلیم صاحب نے کہا۔
سلیم صاحب۔ اس وقت ہم سب آدمی مشدد آباد کے رہنے والے موجود ہیں۔ ہم میں کوئی غیر شخص نہیں۔ مشدد آباد سے اضلاع سہارنپور، کرنال، مظفرنگر اور میرٹھ کا کچھ حصہ مراد ہے اس حلقہ کو مشدد آباد کیوں کہتے ہیں۔ اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ ہر لفظ تشدید کے ساتھ بولتے ہیں۔ مثلاً روٹی کہنا ہو تو کہیں گے روٹّی۔ لوٹا کہنا ہے تو کہیں گے لوٹّا۔ ایک لطف اور ہے جن الفاظ پر تشدید ہو، اُس تشدید کو حذف کردیتے ہیں مثلاً کتّا کہنا ہے تو کہیں گے کتے! بلّی کہنا ہو تو کہینگے بلی۔ بعض اوقات اکثر الفاظ میں سے الف حذف کردیتے ہیں مثلاً کہنا ہو ابے! اٹھا تو کہیں گے کہ بے! نھا

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ آگئے اور مزاح موقوف ہوگیا۔

[illegible]ء میں مسٹر آرچبولڈ پرنسپل نے براہ راست ہیوٹ صاحب لفٹنٹ گورنر کو استعفا بھیجا اور انگریزی اسٹاف نے بھی ایسا ہی کیا۔ نواب وقار الملک کا زمانہ تھا لیکن ٹرسٹیوں کی بیسی کچھ اس وقت جماعت تھی خوف تھا کہ شاید نواب صاحب کا ساتھ دیں اور لفٹنٹ گورنر کے منشا کی مطابق عمل کریں۔ میں نے ایک نظم اس اندیشہ کی بنا پر "ایک گمنام سولن کی صدا" کے عنوان سے لکھی۔ سلیم صاحب کو دکھلائی۔ بعض اشعار سلیم صاحب نے پسند کئے اور بعض کی نسبت کہا کہ انہیں بدل دو میں روزانہ دو چار شعر بدل کر لیجاتا تھا اور وہ پسند کر لیتے تھے۔ نظم بڑی تھی اس لئے ایک ہفتہ تک تو یہی سلسلہ رہا۔ ایک روز دوپہر کا وقت تھا جب میں سلیم صاحب کے پہنچا۔ کہنے لگے کہ اب تھوڑے تھوڑے رہ گئے ہیں جن کو بدلنا مقصود ہے، اس لئے تم ان کو میرے سامنے یہیں بدلو چنانچہ میں نے ترمیم و تنسیخ شروع کردی ایک مصرع جو بدل کر سنایا تو ہاتھ کے اشارے، جیسے کوئی [illegible]تا ہو، جلد جلد کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا مطلب ہے فرمایا اس مصرع پر تلو جوتے، یہ کہکر خوب ہنسے۔ اس وقت تو میں چپ ہو رہا۔ حضرت بھی میرے مصرعوں کی بجائے دوسرے مصرعے رکھتے جاتے تھے اور جب ہم دونوں پسند کر لیتے تھے اس مصرع کو لکھ لیتے تھے سلیم صاحب نے ایک مصرع میرے مصرع کی بجائے کہا وہ اچھا نہ تھا میں نے بھی ہاتھ کا وہی مخصوص اشارہ کیا [illegible]تے سیکتا تھا اس وقت سلیم صاحب کی ہنسی کا کہیں پتہ نہ تھا بالکل متین بن گئے تھے اور میں ہنس رہا تھا فوراً کہا کہ اچھا یہ مصرع پسند نہیں اور لو۔ غرض اسی ہنسی دل لگی میں وہ نظم اسی وقت پوری کردی گئی۔

ایک روز جو میں حسب عادت سلیم صاحب کے یہاں حاضر ہوا تو کہنے لگے "میری دعا ہے کہ تم کبھی بی۔ اے پاس نہ ہو" میں اس بددعا کو سنکر سہم گیا اور میں نے سلیم صاحب سے کہا کہ مجھ سے ایسا کیا قصور ہوا ہے جو آپ یہ بددعا دیتے ہیں فرمایا "بھئی! تم سے پہلے بھی اور لوگ ادبی ذوق رکھتے تھے لیکن جب کمبخت بی۔ اے پاس ہوئے اور ان کو ڈپٹی کلکٹری ملی پھر لکھنا پڑھنا کیسا س

[illegible] قبول کرتے نہیں آئے۔ تم بی اے پاس ہو جاؤ گے تمہارا بھی یہی حال ہوگا۔ اس لئے میں کہتا ہوں خدا تمہیں بی اے پاس نہ کرے تاکہ یہ ادبی شوق تو برقرار رہے۔" میں نے مولوی [illegible] صاحب کہا کہ آپ مطمئن رہئے میں ہرگز یہ ادبی شوق نہ چھوڑوں گا لیکن آپ میرے لئے دعا کیجئے کہ میں بی اے پاس ہو جاؤں تاکہ یہ شوق اچھی طرح پورا کرسکوں۔ سلیم صاحب نے کہا کہ میں تو اسی خیال سے کہتا تھا ورنہ کوئی مجھے تم سے دشمنی نہیں ہے۔ خدا تمہیں بی اے کرے لیکن تم کو ادبی شوق بھی برابر رہے۔

میں ایف اے پاس کرکے میرٹھ کالج کی تھرڈ ایر کلاس میں داخل ہوگیا اور اس کے بعد سلیم صاحب سے جو روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں ان کا لطف جاتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں پانی پت گیا تو سلیم صاحب سے وہاں نیاز حاصل ہوا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں بھی پانی پت ان سے ملنے کے ارادہ سے گیا اور ملاقات کی۔ سنہ ۱۹۰۵ء اور سنہ ۱۹۲۳ء میں بہت فرق پایا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں تو حالت بدستور تھی۔ سلیم صاحب مرنجان مرنج آدمی تھے۔ سنہ ۱۹۰۵ء بلکہ سنہ ۱۹۱۱ء تک دہریت کی طرف راغب تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ رجحان کیوں اور کیسے جاتا رہا لیکن سنہ ۱۹۲۵ء میں وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوگئے تھے اور ان کے عقائد بہت درست اور صحیح ہوگئے تھے۔ مسلمانوں اور اسلام کے ہمیشہ سچے بہی خواہ رہے۔ مزاج میں ظرافت بہت تھی۔ اردو کے فاضل ادیب تھے۔ جدت پسند تھے۔ آزاد طبع تھے۔ مولانا حالی کا بہت ادب کرتے تھے اور ان کو بیحد مانتے تھے۔ افسوس سنہ ۱۹۲۸ء میں انتقال فرما گئے۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

گرفتاری

حلقۂ گردن زیندائے بیکران آب گل　　آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

بچپن کے رفیق! میں نے بچپن میں ایک مرجھایا ہوا سا پودا دیکھا تھا، اور آج سے بالکل سوکھا سمجھ کر میں اس کی ننھی ننھی شاخیں توڑنے لگی، شاخیں واقعی سوکھی تھیں، اور ایسی طرح چٹ چٹ ٹوٹ گئیں گویا انہیں میرے توڑنے کا انتظار تھا میں نے ایک ایک کر کے سب شاخیں زمین پر بکھیر دیا اور پودے کا نازک تنا بالکل ٹنڈ منڈ ہو کر رہ گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ترس آیا اور شرارت نے یہ مشورہ دیا کہ اگر شاخیں توڑ دالیں تو تنے کو کھڑا چھوڑ دینا اور زیادہ ظلم ہے۔ میں نے اس کا پتلا سرا اپنے ہاتھ میں لیا اور ذرا سا جھٹکا دیا۔ تنا نہیں ٹوٹا، اس کے تیور دیکھ کر میں نے بھی پوری طاقت آزمائی کہ وہ جڑ سے ٹوٹ گیا۔ لیکن جڑ جہاں سے ٹوٹی وہاں تری تھی، اور ہلکی سی سبزی، وہاں زندگی کا رشتہ ابھی قائم تھا۔ اس رشتے نے اپنے ٹوٹنے پر فریاد کی اور آنسو بہائے۔ یوں ہی میں بھی، جب مرکے تیس بائیس سال گذر گئے ہیں، اپنی ہستی کو تصور کرتی ہوں میں ایک قصبہ میں رہتی ہوں۔ جہاں کے وہ بسنے والے جنہوں نے اسے اپنا آشیانہ بنایا تھا اور اپنے فلک پیما حوصلوں کی بنیاد پر وہاں ایک زندگی تعمیر کی تھی اب بے نشان قبروں میں آرام کر رہے ہیں اور انکے بعد سے سارے قصبہ پر موت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ میں ایک مکان میں رہتی ہوں جس کے در و دیوار زمین کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اور اس زندگی سے شرمندہ ہیں جس میں ان کی رسوائی ہی رسوائی ہے۔ اس مردہ بستی اور اجڑے مکان میں صرف میں زندہ ہوں، میرا جسم میری روح، میری امیدیں۔ اس سوکھے پودے کی شاخوں کی طرح یہ سونی بستی اور یہ ویران گھر اس کے منتظر ہیں کہ کوئی شوخ شریر ہاتھ انہیں گرا دے اور وہ مٹی میں مل جائیں میں اس کھنڈر میں گرفتار ہوں اور میری گرفتاری وہ سلسلہ قائم کئے ہے جسے زندگی کہتے ہیں، مگر اس پودے کی تری

اور ہلکی سی سبزی اور آنسوؤں کی طرح میں بھی نظر سے چھپی ہوئی ہے جسے وہی دیکھ سکتا ہے جس کے شعلہ
شرر بار نہ اس کھنڈر کی آرزو پوری کریں، اسے رسوائی سے بچائیں، اور موت کے دامن میں
[illegible] اس کھنڈر کے ساتھ ممکن ہے میں بھی دفن ہو جاؤں، لیکن میں فریاد کروں گی،
اور ممکن ہے یہ پھٹے کپڑوں کی مانند زمین پر گر جائے۔ میری ہستی اور دنیا کی نظروں کے درمیان
کوئی پردہ باقی نہ رہے تب بھی مجھے شکایت نہ ہوگی، کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ میں ایک بجھی ہوئی
آگ کی آخری چنگاری ہوں، یا ایک آتش جہاں سوز کا پہلا شعلہ، اور مجھے حوصلہ فنا کا کرنا چاہئے
یا بقا کا موت کی تاریکی سے بغل گیر ہونا چاہئے یا روشنی میں جلوہ افروز۔ مجھے صرف اتنا معلوم
ہے کہ میں زندہ ہوں، مجھ میں زندگی کا سامان ہے اور زندہ رہنے کی آرزو۔ مگر میں گرفتار بلا
اور میری گرفتاری عشق کی نہیں اور ہوس کی نہیں۔ اس گرفتاری میں میری ہستی مرجھاتی ہے
سرسبز نہیں ہوتی۔ میں ہر حالت میں راضی برضا ہوں، مگر میرا دل یہ کہتا ہے، ممکن ہے اسے
محض مغالطہ ہو۔ کہ یہ آگ بجھنے کے لئے نہیں جلائی گئی تھی۔

میں جس مکان میں رہتی ہوں اس کی بنیاد علاؤالدین خلجی کے ایک سردار نے ڈالی
تھی، اس نے یہ قصبہ بھی آباد کیا تھا۔ اس کے زمانے سے اس وقت تک اس خاندان نے
عجیب عجیب جوہر دکھائے ہیں اس نے کوئی ایسی شخصیت نہیں پیدا کی جو تمام ہندوستان
میں مشہور ہوئی ہو لیکن قوم اور ملت کو صرف بڑی شخصیتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آئین
پر استقلال سے قائم رہنے پرانے اصولوں میں جوش عقیدت سے ہر دم نئی جان پھونکنے
والی ہستیاں درکار ہیں جن کو عوام بہت بلند پایہ نہ سمجھیں، اور خدا کے خاص بندے انہیں
محض مٹی کے پتلے دیکھ کر مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ وہ زنجیریں جو سکون کی حالت میں جہاز کو لنگر
سے علیحدہ نہیں ہونے دیتیں وہ بادباں جو جہاز کو چلانے کے لے اپنا سینہ پھیلا دیتے ہیں۔
اس خاندان میں ایک نصرت خاں تھے جنہوں نے شاہان دہلی کے لئے ہزاروں لڑائیاں
لڑی تھیں، اور بعد کو جب انہیں احساس ہوا کہ شاہان دہلی خود کو آئین اسلام کے پابند نہیں

ہجے تو انہوں نے بغاوت کی اور اسی میں شہید ہوئے۔ اسی خاندان میں شجاعت خاں تھے جن
کی ... غریب کسان کو ایک کھیت واپس دلانے میں گذری جو کسی مقدم نے اُس سے جبراً
چھین لیا تھا۔ غریب کسان کے کھیت کے لئے وہ اپنے باپ سے خفا ہوگئے، گھر بار چھوڑ کر
... دہلی پہنچے، وہاں کوئی پرسانِ حال نہ ہوا تو فوج میں نوکری کی، رفتہ رفتہ
رتبہ حاصل کیا، بادشاہ کے مشیر بنے، اور خدمت کا حق ادا کرکے شاہی فرمان کے ذریعہ سے
... انہیں دربار کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، علمی ذوق کے آدمی تھے لیکن
جو بات جی میں ٹھان لی تھی اُس پر قائم رہے، اُس کے لئے تمام عمر صرف کرنا گوارا کیا جب وہ واپس
آئے تو کسان اور مقدم دونوں مر چکے تھے، انھوں نے فرمان کی بنا پر کسان کے وارثوں کو وہ
کھیت واپس دلوایا، جب وہ کسان کے وارثوں کو فرمان سنا رہے تھے، تو انہیں اپنی عمر
کی بربادی کا خیال آیا اور فرمان پر دو آنسو ٹپک پڑے۔ کھیت اور فرمان دونوں انکے بیٹے
نے ان کے مرنے کے چند مہینے بعد کسان سے خرید لئے۔ یہ فرمان ابتک موجود ہے، اور اُس
پر آنسوؤں کے دھبے بھی اب تک نظر آتے ہیں ہمارے خاندان ہی میں ایک رنگیلے میاں تھے
جو بعد کو رنگیلے شاہ کے نام سے کافی مشہور ہوئے، انہوں نے ساری جوانی عیاشی اور ہوس
پرستی میں گذاری تھی، ایک روز جب وہ شراب پیئے بیٹھے تھے تو لوگوں نے خبر دی کہ بیوی
کا دم نکل رہا ہے، اور وہ اُسی طرح سے بدمست اُن سے آخری بار رخصت ہونیکے لئے پہنچے
بیوی کا وہ آخری وقت تھا، لیکن وہ محبت کیش عورت شوہر کو پاس کھڑا دیکھ کر اپنی تمام
مصیبتیں بھول گئی، جو کچھ جسم میں طاقت باقی تھی اُسے جمع کرکے شوہر پر ایک لمبی پراسرار نظر ڈالی
مسکرائی اور آنکھیں بند کرلیں، رنگیلے میاں محبت کا یہ جلوہ دیکھکر سودائی ہوگئے کئی روز تک
بیوی کی قبر کے پائنتی کھڑے رہے، جب کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تو گر پڑے، لیکن اُس
جگہ سے نہ ہٹے۔ دنیا کی نعمتیں رنگیلے میاں کے جی سے اتر گئیں، انہوں نے وہیں اپنی بیوی
کی قبر کے پائنتی ایک جھونپڑی بنائی، رات بھر عبادت کرتے اور دن کو غریب عورتوں کی خدمت

کرتے تھے سال دو سال میں انہیں عوام نے رنگیلے شاہ کا خطاب دیا اور انکے مرید ہونے لگے۔ رنگیلے شاہ اگر سودائی نہ سمجھے جاتے تو ان پر کفر کا فتوی دیا جاتا، کیونکہ وہ لوگوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ خدا کی خدائی بغیر عورت کی محبت کے قائم نہیں رہ سکتی۔

لیکن یہ صورتیں مدت ہوئی خاک میں مل گئیں۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف صورتیں ہی اور نہیں بلکہ خود صورتگر بدل گیا ہے میرے والد مقدمہ بازی کی فضا میں پیدا ہوئے بچپن سے انکا حوصلہ مقدمے بازی کرنا، لڑنا اور جیتنا رہا ہے۔ روزہ نماز کے نہایت پابند ہیں، قرآن شریف کی روزانہ تلاوت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جب کوئی آباؤ اجداد کا ذکر چھیڑتا ہے تو اعتقاد سے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ اپنی حالت پر انہیں رونا آتا ہے، لیکن وہ ہمت جو زندگی تعمیر کرتی ہے، جس سے ویرانے آباد ہوتے ہیں ان میں نہیں ہے، اور کوئی اثر آسے پیدا نہیں کر سکتا۔ دوسرا کوئی مانے نہ مانے مجھے اس کا پورا یقین ہے، کیونکہ اگر ان میں ہمت ہوتی تو وہ میری آرزوئیں محسوس کر سکتے، میری نظر سے نظر لڑتی تو میرے دل کی کیفیت سمجھ لیتے، میری خاموشی انکے لئے ایک معمہ ہوتی، میرے لئے ایک پر کیف کہانی۔

میرے بھائی کی چودہ برس کی عمر میں شادی کر دی گئی ورنہ اچھی خاصی جائداد ہاتھ سے جاتی رہتی، میری چوبیس سال تک شادی نہیں ہوئی، لڑکیوں کے بیاہنے میں خرچ ہی خرچ ہے، اور سمجھدار والدین، آمدنی کا خانہ خالی نہیں رکھنا چاہتے۔ میرے لئے ایک شوہر چاہئے تھا جو خود امیر ہو اور بیوی کی غریبی کا مطلق خیال نہ کرے، جس کی اطمینان بخش آمدنی ہو اور سسرال کی جائداد حاصل کرنے کی ہوس سے اسکا نفس بالکل پاک ہو، اس سے بڑھ کر حوصلہ جب دنیا میں کسی کو نہ تھا تو میری گرفتاری میں تڑپنے کا کسے تعلق ہوتا، اور یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ بس مرغ کے گلے پر چھری پھیر دی گئی ہو وہ زیادہ عرصے تک تڑپ بھی نہیں سکتا۔ میں تڑپتی رہی، زمانہ گذرتا گیا۔

میرے بھائی کی شادی چودہ برس کی عمر میں ہوئی۔ شادی کے بعد وہ اسکول کیسے واپس جاتے "ہم نہیں جاتے، وہاں ہمارا سب مذاق اڑائیں گے"، یوں تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا میرے والد

نے تعلیم کے فوائد پر اکثر تقریریں کیں، ایک بار اس شرط پر کہ داخلہ کسی دوسرے اسکول میں ہو انھوں نے میرے بھائی کو راضی کر لیا۔ ایک اسکول میں نام لکھوا دیا، گاڑی کے وقت سے تین چار گھنٹے پہلے ناشتہ، اسباب، سب تیار کرا دیا، لیکن جب جدائی کا وقت آیا تو انکی آنکھوں میں آنسو آگئے، میری بھاوج بھائی سے چمٹ کر زار و قطار رونے لگیں، باہر لوگ چلاتے رہ گئے اور گاڑی چھوٹ گئی۔ وہ عمر جس میں بھائی تعلیم حاصل کر سکتے تھے یوں گذر گئی، کچھ مہینے بعد اولاد کی پہلی قسط عطا ہوئی، ماں باپ، دادی، دادا کے بلند حوصلے پورے ہوئے جب صاحب اولاد ہونے کا فخر حاصل ہوا اور کسی فن میں طبع آزمائی کی حاجت نہیں۔ یہ کارنامہ تمام عمر کے لئے کافی ہے۔ لوگوں کے اصرار سے بھائی کے لئے نوکری تلاش کی جا رہی تھی لیکن وہ خود بچے کو کھلانے میں اس قدر مصروف تھے کہ لوگوں پر صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ نوکری کی شرطیں پوری نہیں کر سکتے، اور اگر ماں باپ کی محبت آمیز نظروں سے دیکھا جائے تو وہ نوکری سے ہزار درجہ بہتر کام میں مشغول ہیں، وہ غالباً تمام عمر اسی مبارک کام میں مشغول رہتے لیکن فطرت کے بھی کچھ احکام ہیں جن کے خلاف عمل کرنے کی سزا ملتی ہے۔ اٹھارہ برس کے سن تک میری بھاوج کے تین بچے ہو چکے تھے، یوں وہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھیں مگر دیکھنے میں دس سال کا فرق معلوم ہوتا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے، گالوں پر جھریاں، کمر میں خم، بڑھاپے کے تمام آثار نوجوانی میں دیکھنا انکی قسمت میں لکھا تھا، انھوں نے دیکھا اور گھبرائیں، میرے بھائی نے دیکھا اور اپنی پرانی محبت بھول گئے۔ کمسنی میں شادی کرنے سے انکی صحت کچھ دنوں خراب رہی جسمانی نشو و نما رک گئی، ہوس میں کوئی فرق نہیں آیا، میری بیچاری بھاوج کو انکے ہوس کی شدت، اور طبیعت پر ہوس کا بوجھ ہلکا کرنے کی ترکیبیں چند دنوں میں معلوم ہو گئیں، اور بڑھاپے کے آثار موت کا پیش خیمہ بن گئے۔

کبھی کبھی مجھے انسان کی قوت برداشت دیکھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم ذی روح نہیں۔ اگر ہوتے تو یہ چند روزہ تماشا ہمیں ہرگز اتنا عزیز نہ ہوتا، اور ہم خوشی سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے بھائی کا رنگ دیکھ کر بھاوج کو یا تو زندگی کا نیا سامان کرنا چاہیے تھا، یا موت میں پناہ لینا مگر وہ علاج کرا کر موت کو

ثابت رہیں، انہیں مرتے مرتے کئی سال گذر گئے، حالانکہ اُنکے مرنے سے بہت پہلے انہیں لوگ دفن کر چکے تھے۔

بیوی سے لطف اٹھانے کی امید جاتی رہی تو میرے بھائی کو نوکری کی پھر فکر ہوئی علاوہ طلب معاش کے اس میں اور مصلحتیں بھی تھیں آزادی، اطمینان، بیمار بیوی کے پنجے سے رہائی بھابی کی تیمارداری میرے حصہ میں آئی، بچوں کا دلار میرے والد کے۔ بھائی جب جانے لگے تو ایسی عجلت تھی کہ بیوی سے رخصت ہونا بھی بھول گئے۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد جب وہ بیوی کی قبر میں مٹی بھر خاک ڈالنے آئے تو اُن کی آنکھوں میں ایک نئی، اور میرے نزدیک ایک بیہودہ مستی کا خمار تھا۔ طبیعت میں بے پروائی اور ایک خاص قسم کی صحبت کا شوق، جس میں بہن یا باپ کی موجودگی نامناسب تھی۔ دوسرے کچھ بھی کہیں میں ایسے لوگوں کو زندہ نہیں سمجھتی۔ ان میں وہی بدبو ہوتی ہے جو سڑے گوشت میں۔ میرا رویہ تو نہایت درست تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے میری آنکھیں میرا راز چھپا نہ سکیں، میرے بھائی مجھ سے شرمانے لگے، مجھ سے چھپنے لگے اور میں نے کوئی شکایت نہیں کی۔ ہم دونوں میں محبت ہوتی تو کس بنا پر! یہی بہتر تھا کہ ہم یہ حوصلہ ہی نہ کریں۔

لیکن میرے باپ کی محبت کے ساتھ حوصلے کی شرط نہیں تھی، اُن کو بہو کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا اس صدمے نے یہ خواہش پیدا کی کہ لڑکے کو اپنی نظروں کے سامنے رکھیں بھائی کو بھی گھر پر رہنے کی کوئی مصلحت سوجھی، اور انہوں نے ایک روز باقاعدہ استعفا بھیجدیا میرے والد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بوڑھے باپ کی اور کیا آرزو ہو سکتی ہے؟ میرے بھائی سویرے اٹھ کر کسی سے ملنے چلے جاتے ہیں، دن کا کھانا کھا کر تین چار گھنٹے سوتے ہیں پھر شام اور رات کو کون جانے کب گئے کب آئے۔ کوئی پوچھے بھی تو بتائے کون؟ بوڑھا باپ بڑھاپے کے حوصلے پورے کر رہا ہے، جوان بیٹا جوانی کے۔ یہی ہمارے آئین حیات ہیں۔ جو زمانے آئے دو چار اور باپ بیٹوں کی داستان سنا دیجئے، اگر نہ سمجھے تو بیوقوف ہے اس

کی ہنسی اڑانے . . .

ایک عمر تھی جب میں نے صبر کرنا نہیں سیکھا تھا، لیکن اب میں اسی فن میں دوسروں [illegible] پر تیار ہوں بغیر اپنی بیقراری کھوئے ہوئے دنیا کو اس کے رنگ پر چلتے دیکھ سکتی [illegible]، اور فریاد نہیں کرتی، شکایت نہیں کرتی۔ میں نے جن حوصلوں سے زندگی شروع کی [illegible] آزادی کی ہوس میں میں نے اپنی گرفتاری منظور کی تھی وہ اب ایک دھندلا سا خواب ہو گئی ہے، کبھی کبھی جی بہلانے کے لئے میں دل آزار حقیقتوں سے منہ پھیر لیتی ہوں، میری تمنائیں زندگی کا نقشہ ایسا بگاڑ دیتی ہیں کہ میں اس سے ایک نئی زندگی بنا سکوں لیکن میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتی کہ یہ بگاڑنا اور بنانا محض تصور کی اٹکھیلیاں ہیں جنہیں ہستی کا جامہ پہننا کبھی نصیب نہ ہوگا . . لیکن اگر میں نے یہ تسلیم کر لیا تو میں اپنی زنجیریں کیوں نہیں توڑ ڈالتی۔ اپنی تمناؤں کی طرح ہستی سے مایوس ہو کر اگر ہستی کی حسرت دل میں لئے ہوئے نیستی میں کیوں پناہ نہیں لیتی؟ ہونا تو یہی چاہئے ہوگا بھی یہی، مگر اس وقت جب میں زندگی کی ساری رسوائی جو میری قسمت میں لکھی معلوم ہوتی ہے، برداشت کر چکوں گی۔ کیا کروں کیا کہوں، انسان مٹی سے بنا ہے۔

کبھی کبھی جب پوتوں کو دیکھتے دیکھتے تو اسے بھی دیکھنے کو جی چاہتا ہے تو میرے والد ان چند احباب سے جو شام کو انکے پاس آ بیٹھتے ہیں، میری شادی کے امکان پر گفتگو کر لیتے ہیں۔ ابھی تک تو یہ محض ایک گفتگو کا موضوع ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اسکا کوئی نتیجہ نکلے میں اسی اندیشہ میں اپنی سرگزشت لکھ رہی ہوں، شاید کبھی، جب میری زنجیریں مجھ میں جنبش کی کوئی طاقت نہ چھوڑیں تو میرا یہ جوش میری یہ حسرتیں مجھے اس شدت سے یاد آئیں کہ میں اپنے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالوں یا اپنی زنجیریں، انسان کا دل بھی خود انسان کی طرح مٹی کا ہوتا ہے، میں یہ بھی ڈرتی ہوں کہ کبھی اسے نجس یا تنگ پا کر میری تمنائیں اسے چھوڑ نہ دیں۔

سچ پوچھے تو مجھے سب سے زیادہ اسی کا خوف ہے۔ اپنے قصبہ اور اپنی زندگی کو دیکھتے

ہوئے اس کی امید کرنا فضول ہے کہ مجھے ایک رفیق اور ہمدم ملے گا جو میری فطرت سے واقف ہو، یا واقف ہونا چاہئے، مجھے اس امید پر بھی کوئی اعتبار نہیں کہ میری بیقراری ایک حیوانی سکون میں تبدیل نہ ہو جائے گی۔ میری دعا یہی ہے کہ میرے توسط سے جو ہستیاں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں وہ میری تڑپ میری بیقراری اپنے میں لے کر آئیں، میری آرزوؤں کو ورثے میں طلب کریں۔ اس آگ کو لے کر جو میرے سینے میں دہک رہی ہے، اس مٹی سے جس کے آس پاس ڈھیر لگے ہیں پکی، دلدار اینٹیں بنائیں اور ان اینٹوں سے زندگی کی ایک نئی عمارت کریں، ہمت کی طرح مضبوط، حوصلے کی طرح بلند اور دل کی طرح کشادہ۔

فتح مبین

یہ نظم جناب اقبال سہیل صاحب نے سنہ ۲۲ء میں لکھی تھی جب ترکی نے یونان پر فتح عظیم حاصل کی بات پرانی ہو گئی لیکن نظم ابھی نئی ہے اس لئے کہ اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔

صبح آمد و از فیض سحر نغمہ سرا شد — ہر غنچہ کہ وا شد
گلبرگ تو گوئی ہمہ تن دست دعا شد — بہ بہ چہ بجا شد
صد شکر شب تیرۂ آفات سر آمد — صبح ظفر آمد
ہر طرب از پردۂ شب جلوہ نما شد — بہ بہ چہ بجا شد
صد شکر کہ باز آں قدح بادہ بگردید — پر از مے توحید
گوئید بتاں کہ در میکدہ وا شد — بہ بہ چہ بجا شد
ہر اشک کہ از دیدہ فرو ریخت گہر شد — ہمدوش اثر شد
ہر نالہ کہ از سینہ بروں جست رسا شد — بہ بہ چہ بجا شد
ہر عقدہ کہ در حیطۂ تدبیر نبودہ — تقدیر کشودہ
ہر کام کہ ملت ز خدا خواست روا شد — بہ بہ چہ بجا شد
خون ام ریختہ از غصہ جود و ناں — عدلیہ یوناں
خود تیغ ستمگر بسرش برق بلا شد — بہ بہ چہ بجا شد
صد چاک بشد سینۂ سر عسکر یوناں — از خنجر یوناں
انجام جفا عاقبت الامر جفا شد — بہ بہ چہ بجا شد
عیارا روپا کہ پس از پردہ فسوں کرد — تجہیز فسوں کرد
حیرت زدۂ بوالعجبیہائے قضا شد — بہ بہ چہ بجا شد
آن گرگ فسوں ساز نکا بینہ بدر شد — داغش بجگر شد
بر ہم ہمہ شیرازہ دارالوزرا شد — بہ بہ چہ بجا شد

شذرات

ہمیں نہایت ندامت ہو کہ ہم نے رسالے کی اشاعت کو وقت پر لانے کے لئے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا نہیں کرسکے۔ اگست اور ستمبر کے نمبر پہلے مہینے میں تیار ہو چکے تھے لیکن طباعت کی مشکلات سے اگست کا پرچہ ۱۵ اکتوبر کو شائع ہوا اور ستمبر کا اب چھپ رہا ہے۔ اکتوبر کے پرچے کو نومبر کے پہلے ہفتے میں شائع کرنے کی کوشش ہو خدا کرے اب کے ہمیں قارئین کرام سے ندامت نہ اٹھانا پڑے۔

جامعہ ملیہ کے سرپرستوں اور بہی خواہوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ بھوپال اور حیدرآباد میں ہمارے وفد کو شاندار کامیابی ہوئی۔ افسوس ہے کہ ہم تفصیلات شائع نہیں کرسکتے کیونکہ جناب شیخ الجامعہ نے ابھی باضابطہ روداد نہیں بھیجی ہے۔ انشاءاللہ آئندہ مہینے میں ہم وفد کی رپورٹ شائع کرینگے

اس مہینے کے وسط میں افغانستان سے جو خبریں آئی ہیں انھوں نے سب ہندوستانیوں کے دلوں کو خوشی سے معمور کر دیا ہے افغانستان کے مایہ ناز فرزند امان اللہ خاں کی بدولت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ہندوؤں کو بھی اپنی ہمسایہ قوم سے سچی محبت ہو اور وہ اس کی فلاح و بہبود کے دل سے خواستگار ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے سنا کہ افغانیوں نے آخر کار جاہل اور ظالم بچہ سقہ کے پنجۂ غضب سے چھوٹ کر جنرل نادر خاں کے سایہ عاطفت میں پناہ لی تو انہیں ایسی مسرت ہوئی کہ اس سے بڑھ کر اگر کبھی ہوگی تو خود اپنے ملک کی آزادی سے ہوگی۔ کسی قوم کو عقل سلیم اور عزم مستقیم کی بدولت آزادی اور ترقی کے نصب العین کی طرف بڑھتے دیکھ کر

بعض اندرونی جھگڑے کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے

ہمیں بھی بیحد مسرت ہندوستانیوں کو ہوتی اگر اہل افغانستان امان اللہ خاں کو اٹالیہ سے بلا کر اپنا بادشاہ بناتے۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ افغانستان میں اندرونی پیچیدگیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور کوئی شخص باہر سے بیٹھ کر صحیح اندازہ نہیں کرسکتا کہ ان دونوں سرداروں میں سے کون اپنے ملک کی عنان حکومت ہاتھ میں لے کر ملک و قوم کی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتا ہے۔ اس لئے وہ حسن ظن سے کام لے کر کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غالباً موجودہ صورت میں وہی سب سے مناسب ہے۔

لیکن ابھی افغانستان کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوا۔ جن عناصر نے امان اللہ خان کی حکومت کی بنیاد متزلزل کر دی تھی یعنی امرا کی خودغرضی اور علماء کی ناعاقبت اندیشی اور مالی دقتیں وہ سب بدستور باقی ہیں۔ نادر خاں سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ملک کو دوبارہ ذلت اور غلامی کی پستی سے عزت و آزادی کی بلندی پر پہنچا چکے ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ ان میں ملک گیری کے ساتھ ملک داری کی قابلیت بھی ہے یا نہیں۔ اسی لئے افغانستان کے بہی خواہ وہاں کی حالت سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ اور واقعات کی نشوونما کا بہت تردد کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں خدا کرے وہ دن جلد آئے کہ افغانستان میں امن و آسایش کا دور دورہ ہو اور یہ ملک جس نے حصول آزادی کی کوشش میں اب تک صرف مصیبتیں جھیلی ہیں آزادی کی برکات سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔

ہندوستانی اکادمی نے اپنے ممبروں اور دوسرے اہل قلم کے پاس ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے جس میں اپنا لائحہ عمل بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اکادمی چاہتی ہے کہ اردو اور

ہندی میں تین طرح کی کتابیں شائع کرائے

(۱) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اوسط درجے کی تعلیم پائی ہے اس طرح کی کتابیں جن کے پڑھنے سے ان کی معلومات میں وسعت ہو اور وہ ذاتی مطالعے کے ذریعے اعلیٰ میعار تعلیم تک پہنچ جائیں۔

(۲) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ابتدا سے انگریزی مدارس میں تعلیم پائی ہو اور اسے تکمیل کے درجے تک پہنچایا ہے ایسی کتابیں جنہیں پڑھ کر وہ اپنی مادری زبان کے ادب اور اپنے قومی تمدن سے گہری واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۳) کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے عام فہم کتابیں۔

اکادمی نے ان موضوعوں کی فہرست شائع کی ہے جن پر کتابیں لکھی جائیں گی۔ یہ فہرست بہت طویل ہو اور اس میں تقریبًا کل علوم و فنون شامل ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت ہندوستان میں متعدد ادارے اُردو اور ہندی کی ترقی کے لئے موجود ہیں اور اپنے اپنے رنگ میں ان کی خدمت کر رہے ہیں مگر افسوس ہو کہ ان میں ابتک پوری طرح تقسیم عمل نہیں ہوئی ہے۔ اُردو میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد، دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ہندوستانی اکادمی الہ آباد اور اردو اکادمی دہلی اور بعض دوسرے ادارات تقریبًا ایک ہی قسم کا کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض کے مقاصد مخصوص ہیں لیکن ان مقاصد کی پوری طرح پابندی نہیں ہوتی غالبًا یہی حال ہندی کی اشاعت کے ادارات کا بھی ہو اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ ان متفرق کوششوں کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ اتحاد عمل بھی ہو سکے اور تقسیم عمل بھی۔ یہ کام کسی عام کانفرنس میں انجام پانا ناممکن ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ صرف

مختلف ادارات کے نمائندے ہر سال کسی جگہ جمع ہو کر تبادلہ خیالات کیا کریں۔ خواہ اس کا مرکز کسی ایک ادارہ قرار دیا جائے یا باری باری سے ہر ادارہ دوسروں کو جمع کیا کرے۔

ہمیں امید ہے کہ ان سب اداروں کے مدیر اس تجویز پر غور فرمائیں گے اور [illegible] کے لئے بہت جلد مناسب تدابیر اختیار کریں گے۔

جامعہ کے ایک طالب علم نے ۱۲ ستمبر ۱۹۳۰ء کا اخبار "سچ" مجھکو لاکر دکھایا جس میں مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا ہے "روضۂ اقدس (رسول) زمین، آسمان، کعبہ، عرش اور کرسی سب سے افضل ہے" جس کے صریح معنے یہ ہوئے کہ رسول کا روضہ جب عرش الٰہی سے بڑھ کر ہوا تو رسول اللہ سے بڑھکر ہے (نعوذ باللہ)

کیا یہ اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی اہانت نہیں ہے!!

بریلی اور بدایوں کے رسول پرستوں نے تو اسی پر اکتفا کی تھی کہ

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

مگر مولوی عبدالماجد صاحب نے اس سے بھی آگے قدم اٹھایا اور رسول کا رتبہ اللہ سے بھی بڑھا دیا۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ فقہا نے ایسا کہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فقہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عقیدہ کا ہے جسکے لئے نص صریح کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے جذبہ کی حالت میں ایسا لکھا بھی ہو تو وہ شطحیات میں شمار ہوگا سند نہیں ہو سکتا۔
قرآن میں ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ رؤئے زمین کے اکثر لوگ اگر تو انکی اطاعت کرے تو تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔

رسول بندہ ہے اور بشر۔ یہی قرآن میں اسکو حکم دیا گیا ہے کہ "قل انما انا بشر مثلکم" اسکی عظمت کیلئے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ کا پیغامبر ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسکا رتبہ اللہ سے بڑھایا جائے اور ایسی بے ادبی کا ارتکاب کیا جائے جس کی نظیر زمانہ جاہلیت میں بھی نہیں مل سکے گی۔

THE CULTURAL SIDE OF ISLAM

Madras Lecture on Islam

(No. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1927.

CONTENTS.

Price 1/8
Bound 2/-

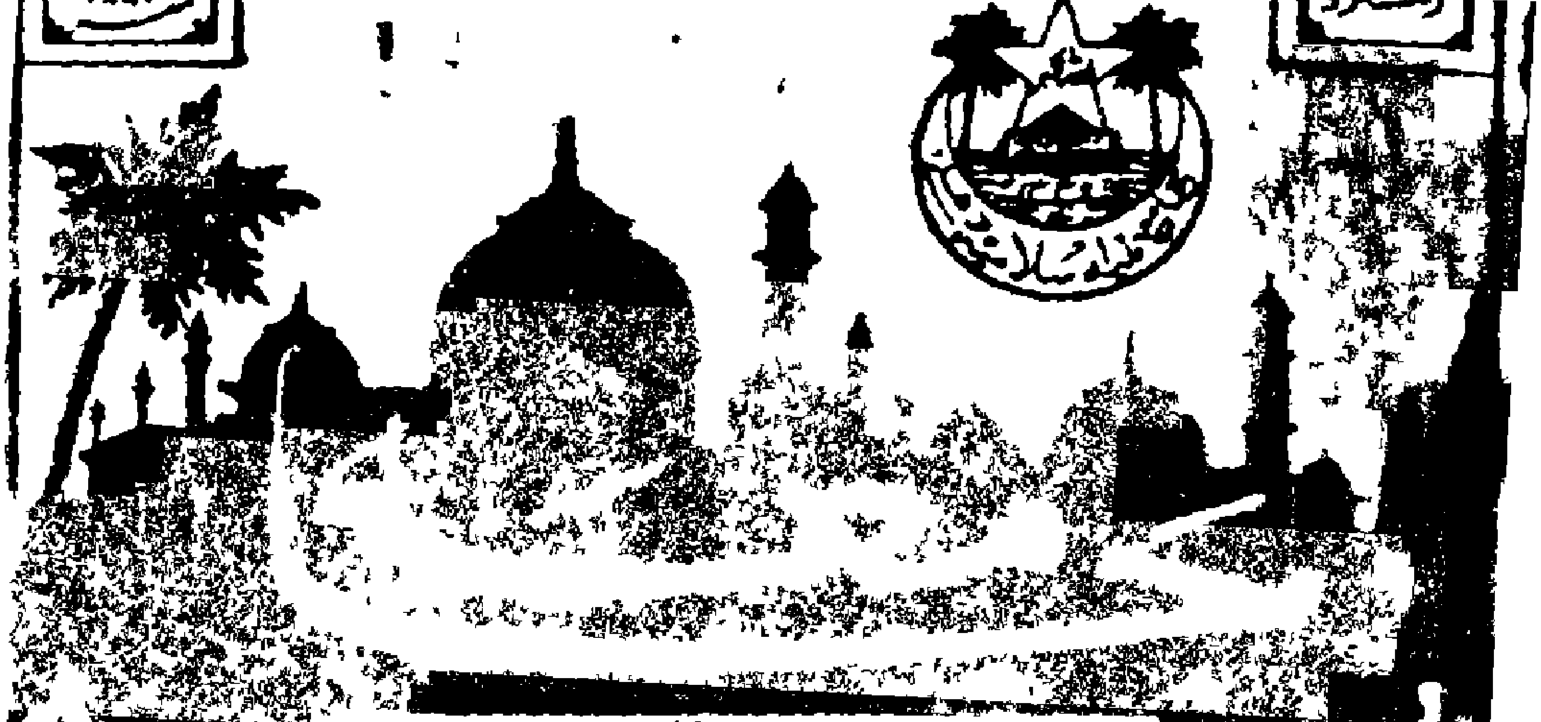
To be had of.—

National Muslim University Book Depot,

Karol Bagh,

DELHI.

۱۳۴۸ھ

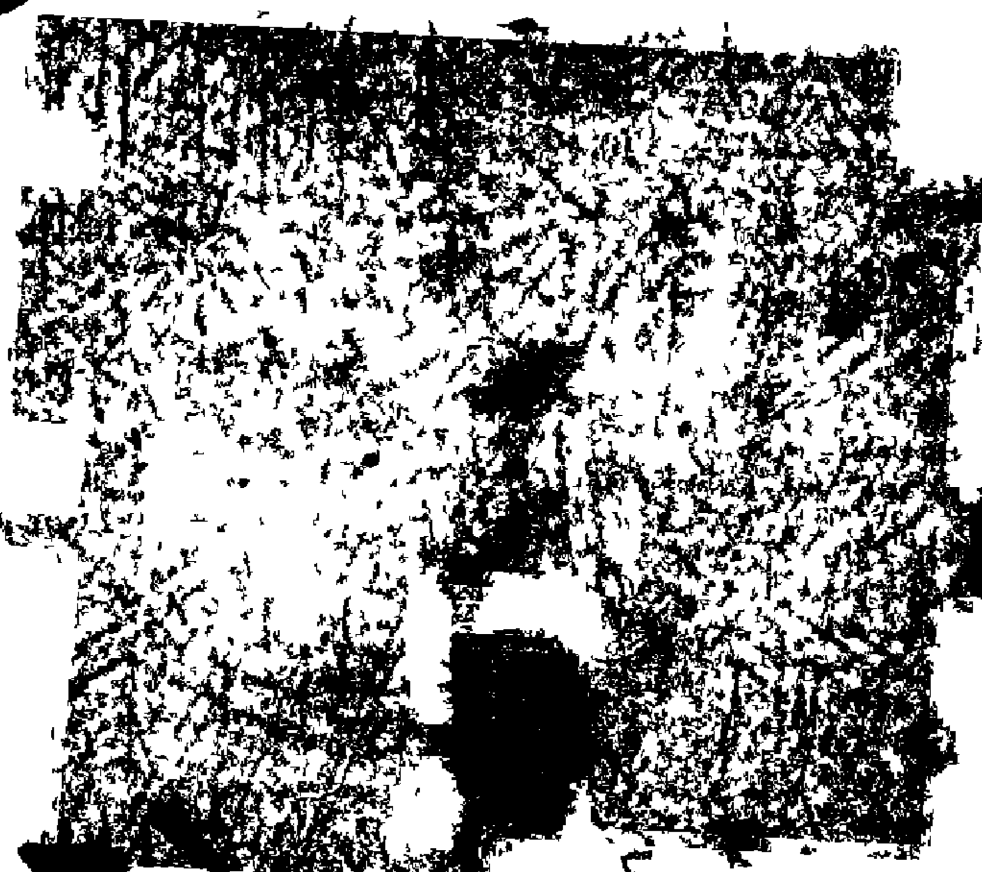


جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۵

بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۹ء

۱۲ جلد



مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

نمبر ۱۸۴۷

رجسٹرڈ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۵

بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۹ء

۱۲ جلد

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی

نمبر ۵	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۹ء	جلد ۱۳

فہرست مضامین

تاریخ عثمانیہ پر[1] ایک نظر

آل عثمان کی حکومت غازی عثمان خاں کے عہد سے جس نے سلطان علاء الدین سلجوقی کے تاتاریوں کے ہاتھ سے مارے جانے کے بعد سنہ ۶۹۹ھ میں بالاستقلال سلطنت حاصل کر لی تھی اس خاندان کے آخری فرمانروا عبدالمجید ثانی کے عہد تک جو ۱۳۴۲ھ میں معزول کیا گیا چھ سو بیالیس سال رہی۔ یہ ایسی طویل مدت ہے جو کسی اسلامی حکمراں خاندان کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس مدت میں ۳۷ فرمانروا ہوئے جن میں سے پہلے ۹ بایزید ثانی تک سلطان تھے اور بقیہ سلیم اول سے لیکر عبدالمجید ثانی تک سلطنت کے ساتھ خلافت کے منصب سے بھی ممتاز تھے۔

آل عثمان کا یہ کل عہد دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک دور ترقی دوسرا دور زوال غازی عثمان خاں کے استقلال یعنی سنہ ۶۹۹ھ سے لیکر سلیمان اعظم کی وفات یعنی ۹۷۴ھ تک دور ترقی رہا جس میں یہ سلطنت قوت۔ شوکت اور مقبوضات کی وسعت کے لحاظ سے برابر بڑھتی رہی اور اس کے بعد سے آجتک دور زوال ہے جس میں سلسلہ وار اس کے حصے نکلتے جا رہے ہیں۔

عین عروج کے زمانے میں بایزید یلدرم کے عہد میں جبکہ وہ یورپ میں فتوحات کر رہا تھا ۸۰۴ھ میں تیمور لنگ کے ناگہانی حملہ سے اس سلطنت کو کاری زخم لگا تھا مگر چونکہ اس وقت اقبال کا دور تھا اور ترکوں کے فاتحانہ جذبات جوش پر تھے اس لئے بہت جلد یہ زخم مندمل ہو گیا

سلطنت

جس وقت آل عثمان نے اپنی سلطنت قائم کی اس وقت تاتاریوں کے حملہ سے بغداد کی عباسی خلافت کا چراغ گل ہو چکا تھا اور جملہ اسلامی مشرقی ریاستیں انکے پنجہ ستم میں نیم جان ہو رہی

---

[1] یہ مضمون تاریخ الامت حصہ ہشتم کا آخری باب ہے جس پر یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے

تھیں۔ خود ایشیائے کوچک میں سلجوقی سلطنت کو بھی انہوں نے فنا کر ڈالا تھا اور طوائف الملوکی کی حالت میں چند چھوٹی چھوٹی امارتیں رہ گئی تھیں جو باہمی جنگ و پرخاش سے فنا کے ساحل سے آلگی تھیں۔

آل عثمان نے اپنی شجاعت اور فرزانگی سے ان متفرق ریاستوں سے جو سلجوقی سلطنت کے کھنڈر پر قائم تھیں ایک زبردست سلطنت تعمیر کی۔ اور پھر اولوالعزمی سے مقبوضات کا دائرہ وسیع کیا کہ یورپ میں داخل ہو گئے اور رفتہ رفتہ بلقان کے اکثر حصہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو بھی فتح کر لیا جو اسلام کی ایک پرانی آرزو تھی اور سلطان سلیم نے شام و مصر کو مع حرمین شریفین بلکہ سارا عرب عثمانی قلمرو میں آگیا۔ اس کے بعد سلیمان اعظم وسط یورپ میں ویانا کی فصیل تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف افریقہ میں الجزائر اور مراکش تک ہلالی پرچم کے نیچے آگئے اور عثمانی سلطنت نہ صرف اپنی وسعت بلکہ بری اور بحری قوت کے لحاظ سے بھی اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور طاقتور سلطنت ہو گئی جس کے حدود بوداپسٹ سے دریائے نیل تک اور فرات سے جبل طارق تک پھیلے ہوئے تھے۔

شاہان یورپ اس زمانے میں بجائے سلطان کے اس کے صدر اعظم کو مخاطب کرتے تھے اور اپنی مشکلات میں امداد مانگتے تھے ۱۵۸۸ء مطابق ۹۹۶ھ میں جب ہسپانیہ کا گریٹ آرمیڈا انگلستان پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا ملکہ الیزبتھ نے مسٹر ہیر لون کو سفیر بنا کر قسطنطنیہ بھیجا اور سلطان مراد ثالث کے وزیر محمد پاشا صقلی سے ان "کیتھولک کفار" کے مقابلہ میں مدد چاہی مگر اس وقت جنگ ایران کی وجہ سے امداد نہ دی جا سکی سلیمان اعظم کے عہد میں شاہ فرانس فرانسیس اول نے شارلکان کے مقابلہ میں امداد کی دوبار درخواست کی اور دونوں مرتبہ سلطان نے بری اور بحری مدد دی۔

خلافت

۹۲۳ھ میں اسلامی خلافت آل عثمان کے ہاتھ میں آئی۔ ترک چونکہ حنفی المذہب تھے

اس وجہ سے حنفیہ نے بالعموم آپکی خلافت کو تسلیم کرلیا۔ اور جا بجا ملکوں میں انکے نام کے خطبے پڑھے جانے لگے۔ لیکن مالکیہ ایک مدت تک بوجہ قریشی نہ ہونے کے عثمانیوں کی خلافت کے قائل نہ ہوئے۔

چونکہ آل عثمان کو خلافت فتح مصر سے ملی تھی اس لئے بالطبع وہ اپنے اس رتبۂ سلطنت کو جس کی بدولت انہوں نے مصر کی سلطنت اور خلافت دونوں کو حاصل کیا تھا ہمیشہ اہم سمجھتے رہے لیکن خلافت کی مذہبی وقعت انکی نگاہ میں تھی چنانچہ سلطان محمود نے سنہ [illegible]ھ میں انکشاریہ کی بغاوت میں علم نبوی کو نکالکر اسکی روحانی قوت سے کام بھی لیا مگر انہوں نے شروع سے آخر تک بجز حرمین شریفین کے خادم اور عرب کے محافظ ہونے کے جو انکی سلطنت کا ایک جزو تھا فرائض خلافت کا خیال نہ رکھا۔ نہ عالم اسلامی کی دینی یا دائمی رہنمائی کی اور غالباً یہ ان سے ہو بھی نہیں سکتی تھی اور نہ کبھی انکی وحدت کا کوئی ذریعہ تلاش کیا۔ یہانتک کہ حج میں جس میں اقطار عالم سے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں اس میں بھی وہ کبھی نہیں آئے۔ آخری زمانے میں سید جمال الدین افغانی کے اثر سے عبدالحمید ثانی نے وحدت ملت کی طرف توجہ کی اور حجاز ریلوے کو اس کی مشترکہ ملکیت قرار دیکر عالم اسلامی کے اندر ترکی خلافت کا احساس پھیلایا جس سے ممکن تھا کہ اچھے نتائج مترتب ہوتے کہ سنہ [illegible]ء میں جمہوریہ ترکیہ نے خلافت ہی کا الغا کر دیا جس سے یہ منصب اپنے عظیم الشان فوائد کے نہ صرف ترکوں بلکہ امت کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔

ولی عہدی

آل عثمان میں اگرچہ شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ خاندان کا بڑا شخص سلطنت کا متولی ہو لیکن پھر بھی اکثر تخت نشینی پر نزاعیں برپا ہوتی رہیں۔ اس وجہ سے ایک بھائی جب تخت پر آجاتا تھا تو اپنے دوسرے بھائیوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ چنانچہ بایزید اول نے اپنے بھائی یعقوب کو علماء سے فتویٰ لیکر اور سلیم اول نے اپنے دونوں بھائیوں احمد اور کرکود کو گرفتار کرکے مار ڈالا۔ مراد ثالث نے اپنے پانچ بھائیوں کو قتل کیا اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے چھوٹے

بھائیوں کو جو سب کے سب برادو کے ساتھ ہی دفن کئے گئے۔

آخر میں یہ صورت اختیار کی گئی کہ محروم شاہزادے محلات میں نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ کوئی خطرہ بھی نہ رہے اور خون ناحق بھی نہ بہے۔

نظام سلطنت

مہات سلطنت میں سلطان فرمانروائے مطلق تھا جس کی اطاعت لازمی تھی اور بشرط رعایت نصوص قرآن اس کو رعایا کے جان و مال اور سلطنت کے سیاہ سفید پر کلی اختیارات حاصل تھے۔

حکومت کے سب سے بڑے دو عہدہ دار تھے ایک صدر اعظم جو امور ملکی و فوجی کا کفیل ہوتا تھا دوسرا شیخ الاسلام جو شرع شریف کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا صدر اعظم کے ماتحت جملہ وزراء اور ملکی دفاتر تھے اور شیخ الاسلام کی نگرانی میں جملہ قضاۃ اور محکمہ جات شرعی۔ علاوہ مذہبی امور کے مہات سلطنت مثلاً اعلان جنگ معاہدہ۔ عزل ونصب سلاطین وغیرہ میں بھی شیخ الاسلام کا مشورہ یا فتویٰ ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

فرق علماء یعنی رجال شرع میں سے دو شخص خاص امتیاز رکھتے تھے۔ ایک قاضی عسکر روم ایلی دوسرا قاضی عسکر اناطولیہ۔ یہ دونوں جنگ اور سفر میں سلطان کے ہمراہ رہتے تھے تاکہ فوج میں کوئی اختلاف پیدا ہو تو رفع کریں۔ انہیں میں سے کوئی شیخ الاسلامی کے منصب پر آیا کرتا تھا۔ سلطان اگرچہ شیخ الاسلام کو برطرف کرسکتا تھا مگر جبتک وہ اپنے عہدہ پر ہو اس کو سزا نہیں دیسکتا تھا۔ نہ اس کے فتوے کی مخالفت کا اختیار رکھتا تھا۔ چنانچہ سلطان سلیم اول نے جو اپنے عقیدہ اور عزم دونوں میں بہت سخت تھا عثمانی قلمرو میں شیعوں کے استیصال کے بعد یہ ارادہ کیا کہ سلطنت کے جملہ مشرکوں۔ کافروں۔ یہودیوں۔ عیسائیوں کو قتل کر کے ان کے معبدوں اور کنیسوں کو مسجد بنالے تاکہ ملک میں صرف ایک ہی دین رہجائے۔ مشورتاً ایک دن شیخ جمالی سے جو اس کے عہد میں مفتی اعظم تھے پوچھا کہ دنیا کو فتح کرنا بہتر

ہے یا قوموں کو مسلمان بنانا؟ ۔ شیخ مذکور نے جواب دیا کہ مسلمان بنانے میں زیادہ ثواب ہے ۔ اس کے بعد سلطان نے صدر اعظم کو لکھا کہ سلطنت کے ہر گوشہ میں اعلان کر دیا جائے کہ جو اسلام نہ لائے گا قتل کر دیا جائے گا ۔

اس سخت فرمان سے صدر اعظم کو تردد ہوا ۔ اس نے شیخ جمالی سے کہا کہ سلطان نے اس حکم میں تمہارے قول سے سند لی ہے ۔ شیخ مذکور آستانہ کے بطریک کو لیکر سلطان کے پاس جو اس وقت ادرنہ میں تھا پہنچے ۔ اور وہ عہد نامے پیش کرائے جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد نے نصارا کے ساتھ کئے تھے ۔ نیز قرآن کا حکم سنایا کہ اہل کتاب جزیہ لیکر مذہب میں آزاد چھوڑ دئے جائیں ۔ سلطان کو مجبوراً اپنا فرمان واپس لینا پڑا ۔

داخلی نظم ونسق کے لئے جو دفتر تھا اس کو دیوان دولت کہتے تھے ۔ اس میں پہلے تین وزیر ہوتے تھے لیکن سلطان احمد ثالث نے ان میں منافست دیکھکر جس کی وجہ سے اکثر کاموں میں ابتری واقع ہو جاتی تھی ان کی تعداد آٹھ کر دی جن کا رئیس صدر اعظم ہوتا تھا ۔ انہیں کی مشاورت سے مہمات سلطنت طے پاتے تھے اور ماتحت دفاتر نیز سلطنت کے صوبوں اور ایالتوں کے حکام وعمال کی نگرانی بھی انہیں کے ذمہ تھی ۔

بحری فوج قپودان پاشا کے ماتحت ہوتی تھی اور بری صدر اعظم کے ۔ ان افواج کی تربیت اور تنظیم میں ترک اپنے دور ترقی میں دیگر اقوام عالم سے فائق رہے

یہ ارکان دفاتر ۔ حکام ولایات جاگیرداران امرا لشکر بلکہ بالعموم متوسلین سلطنت بوجہ دولت کی فراوانی کے رئیسانہ بلکہ شاہانہ عیش وآرام سے زندگیاں گزارتے تھے چونکہ غلامی کا بھی رواج تھا اس وجہ سے انکے گھروں میں غلاموں اور کنیزوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی تھی ۔

ترک

اصلی اوغوز ترک جو ارطغرل اور دو ہزار کے ساتھ ارض روم میں آئے تھے دو ہزار نفوس سے زیادہ ۔ تھے لیکن رفتہ رفتہ دیگر قبائل جو سلجوقی عہد میں وسط ایشیا سے گئے تھے انکے ساتھ مل

اور پھر انکی سلطنت کے عروج کے ساتھ ساتھ مفتوح اقوام رومی اور صقلابی وغیرہ ، کثیر تعداد میں اسلام لاتی گئیں جو سب کے سب ترک بولے جاتے گئے اور یہ لفظ مسلمانان سلطنت ترکی کے مترادف ہو گیا جن میں مختلف قومیں شامل تھیں۔

اسلام

ترکوں نے شعائر اسلامی کا ہمیشہ احترام رکھا۔ یہ انکے بے ریا اور مخلصانہ اسلام کا اثر تھا کہ مفتوحہ قومیں جن کو پوری مذہبی آزادی تھی اپنے دلی شوق سے اسلام قبول کرنے لگیں بلغاریا۔ رومانیا اور یونان خاصکر البانیا میں بلا جبر واکراہ بے شمار عیسائی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ انکشاری فوج جس میں وہ نصرانی جوان لے جاتے تھے جو مسلمان ہو جاتے تھے اس کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تھی اور بلقان کے عیسائی روسا اپنے اپنے بیٹوں کو خود خوشی سے لاکر اس میں بھرتی کراتے تھے۔

ترک بالعموم مجاہد اور سر فروش ہونے کے ساتھ عقائد کے پکے اور عبادات کے پابند تھے اور اپنی خانگی زندگی روزمرہ کے معاملات اور اخلاق میں خالص مسلمان۔ اُن میں بخلاف دیگر اقوام کے باہمی محبت اور اخوۃ بھی زیادہ ہے۔

ترک سلطان و رعایا ہمیشہ سے ایک مذہب حنفی کے پابند رہے اس وجہ سے ان میں اختلافی جھگڑے بہت کم پیدا ہوئے لیکن تصوف کے ساتھ بھی انکو عقیدت تھی اور پیری و مریدی کا سلسلہ بھی رائج تھا جس کے باعث کبھی کبھی فتنوں کا ظہور ہوتا رہا۔

سلاطین آل عثمان میں سے سلیم اول مذہب حنفی کا سب سے بڑا علمبردار تھا جس کی خواہش یہ تھی کہ اس کے قلمرو میں بجز اس مذہب کے اور کوئی دوسرا مذہب نہ رہنے پائے۔

رواداری

ترکوں کے اوصاف میں جہاں شجاعت سب سے نمایاں وصف ہے جس کو ان کے دوست و دشمن سب تسلیم کرتے ہیں وہاں انکی رواداری کی صفت بھی اقوام عالم سے بڑھکر ہے

انہوں نے ہمیشہ غیر جنس اور کمزور قوموں کے ساتھ نہ صرف عادلانہ بلکہ مساویانہ سلوک کیا محکوم قوموں کے مذہب میں کبھی دست اندازی نہیں کی۔ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں یہودی مقہور اور مظلوم تھے اور ترکوں کے سایہ میں انکو امن و آرام نصیب ہوتا تھا۔ سلطان محمد نے فتح قسطنطنیہ کے بعد بطریک کے عہدہ اور عیسائیوں کے حقوق کو محفوظ رکھا جس کی وجہ سے رومی جو وہاں سے بھاگ گئے تھے پھر واپس آکر امن سے رہنے لگے۔

سلطان مراد ثانی کے مقابلہ میں جب صلیبی لشکر ہونیاد کی قیادت میں جو کیتھولک تھا میدان کسوہ میں صف آرا تھا اس وقت اس کے ساتھی شاہ سربیا نے اس سے پوچھا کہ اگر تم کو فتح حاصل ہوگئی تو کیا کروگے؟ اس نے کہا کہ سب کو کیتھولک بنا کر چھوڑوں گا لیکن یہی سوال جب شاہ سربیا نے سلطان مراد کے پاس بھیجا تو اس نے جواب میں لکھا کہ میں اگر کامیاب ہوا تو ہر مسجد کے پہلو میں کنیسہ بنوا دوں گا کہ جسکا جی چاہے مسجد میں آئے اور جس کا جی چاہے کنیسہ میں جائے۔ چنانچہ شاہ سربیا نے جو یونانی چرچ کا تابع تھا ہونیاد کا ساتھ چھوڑ دیا اور مورخین لکھتے ہیں صلیبیوں کی شکست کھانے کی یہی وجہ ہوئی۔

ایک بار عثمانی مفتی سے کسی نے سوال کیا کہ اگر دس مسلمان کسی ایک یہودی یا عیسائی ذمی کے قتل میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قتل کر دئے جائیں گے؟ مفتی نے جواب دیا بے شک دس نہیں ایک ہزار بھی۔

ان رواداریوں کی وجہ سے باوجود بیرونی سلطنتوں کی ریشہ دوانیوں کے بھی غیر مسلم خاصکر ان عیسائیوں کے دلوں میں جن کو ترکوں سے واسطہ پڑا تھا ترکوں کی وقعت اور عظمت تھی چنانچہ عبدالحمید ثانی کے آغاز جلوس ۱۸۷۶ء میں جب روسیوں نے دولت علیہ کے خلاف جنگ شروع کی اس وقت ہنگری کے عیسائیوں نے جو ایک مدت سے عثمانی سلطنت سے مطلقاً آزاد تھے اپنے اخلاص کا اس طرح اظہار کیا کہ ایک وفد بھیجکر مرصع تلوار عبدالکریم پاشا کی خدمت میں پیشکش کی جو روس کے مقابلہ کے لئے مامور ہوئے تھے۔

[illegible] ادب

عثمانی ترکی چغتائی کی ایک شاخ ہے۔ اس میں سلطنت عثمانی کے قیام سے پیشتر کوئی
[illegible] نہ تھی۔ چونکہ ترک سلجوقی سلطنت کے وارث ہیں جن کا علم ادب فارسی تھا اسلئے
[illegible] کی بھی بنیاد فارسی ہی ادب پر پڑی اور مذہبی علوم براہ راست عربی سے اخذ
[illegible] وجہ سے عثمانی ترکی میں فارسی اور فارسی سے زیادہ عربی الفاظ کی کثرت ہوگئی۔
[illegible] صدی ہجری کے وسط میں جب سلطان حسین والی ہرات کے وزیر امیر علی شیر نوائی
کا [illegible] قسطنطنیہ میں پہنچا اس وقت سلطان محمد فاتح کے وزیر احمد پاشا نے جو ادب سے ذوق
رکھتا تھا ترکی میں شعر گوئی شروع کی جس کی وجہ سے نہ صرف عوام بلکہ خود سلطان کو بھی اس سے
دلچسپی ہوگئی اس کے بعد رفتہ رفتہ ترکوں میں شعر کا ذوق بڑھتا گیا۔ اور بڑے بڑے شعراء مثلاً
ابن کمال۔ فضولی۔ نابی۔ ندیم اور غالب وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے غزل۔ قصیدہ اور
مثنوی میں نام پایا۔ خود بعض سلاطین آل عثمان بھی شعر کہتے تھے جن میں سے سلیم اور مراد خاص
طور پر مشہور ہوئے لیکن ترکوں کی یہ شاعری نہ صرف وزن و بحر بلکہ معنی اور روح کے لحاظ سے
بھی فارسی شاعری کے مشابہ تھی جس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے منقطع ہو چکے تھے آخری
دور میں جب مغربی خیالات کے اثر سے ترکی میں نئی ذہنیت پیدا ہوئی تو انکی شاعری نے بھی
یا رنگ اختیار کیا جس کے علمبردار نامق کمال۔ حامد۔ توفیق فکرت اور محمد عاکف وغیرہ
ہیں جنہوں نے حسن و عشق کے فرسودہ افسانے چھوڑ کر اثبات زندگی اور ذوق عمل کے نغمے گائے
اور عقل و تدبیر کی تحقیر اور توکل و تقدیر کی غلط تعبیر جو تصوف کے اثر سے دلوں میں جاگزیں
ہوگئی تھی دور کر کے حریت فکر اور سعی پیہم کی طرف راہنمائی کی۔ ترکی میں بھی فارسی کی طرح نظم نے
بہ نسبت نثر کے زیادہ ترقی پائی۔ نثر کی پہلی کتاب انوار سہیلی کا ترجمہ ہے جو سلطان محمد فاتح کے وقت
[illegible] کیا گیا۔ اس کے بعد سے دینیات۔ تاریخ اور ادب میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔
ترکی میں پہلا مطبع وزیر اعظم ابراہیم پاشا نے جو ندیم شاعر کا ممدوح تھا قائم کیا۔ اس میں

ترکی کی پہلی مطبوعہ کتاب ترجمہ قاموس ۱۷۲۸ء میں چھاپکر شائع کی گئی
عثمانی ترکی جب سے کتابت میں آئی اسی وقت سے عربی حروف میں لکھی جاتی تھی
سال گذشتہ سے جمہوریہ ترکیہ نے اس کو لاطینی حروف میں کر دیا ہے

انقلاب

ترکوں میں بھی دوسری مسلمان قوموں کی طرح بجز ذات شاہانی کے کوئی ادارہ سیاسی نہ تھا۔ یورپ میں انقلاب فرانس کے بعد چپہ چپہ میں آزادی کے خیالات پھیل گئے تھے جن سے عثمانی عیسائی رعایا بھی متاثر ہوئی اور اپنی آزادی کے لئے مختلف طریقوں سے جدوجہد کرنے لگی جس میں آخرکار وہ کامیاب بھی ہوئی مگر ترکی طبائع پر اس کا اثر بہت کم پڑا تھا۔

سب سے پہلا شخص جس نے ترکوں میں حریت کا احساس پیدا کیا مدحت پاشا تھا جس کی کوششوں سے سلطان عبدالحمید ثانی نے اپنے آغاز جلوس میں دستوری حکومت کا اعلان کیا مگر احساس اس قدر کمزور تھا کہ سلطان نے دستور کو توڑ کر مدحت پاشا کو طائف میں نظر بند کر دیا اور احرار ترکوں کو ملک بدر کرنے لگا اور کوئی بغاوت رونما ہوئی۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ عبدالحمید کے استبداد سے حریت کے شعلے بڑھ گئے اور اس کی سختیوں نے جو اس نے دستور کے حامیوں پر کیں اس آگ پر تیل کا کام دیا چنانچہ جمعیت اتحاد و ترقی نے جس کے سرگرم ارکان نیازی بک۔ انور بک۔ محمود شوکت پاشا جیسے لوگ تھے ۱۳۲۶ھ میں قوت کے ساتھ دستوری حکومت حاصل کر لی۔ اور اب جنگ عمومی کے بعد سے تو مصطفٰے کمال پاشا نے اس کو کامل جمہوری بنا دیا ہے۔

اسباب زوال

ترکوں کی جس طرح ترقی بتدریج ہوئی اسی طرح ان کا تنزل بھی رفتہ رفتہ ہوا اور یہ "تلک الایام نداولہا بین الناس" کا فطرتی قانون ہے جو اٹل ہے خاصکر شخصی اور استبدادی حکومتوں کا زوال جن میں لازماً نقائص موجود رہتے ہیں ہم اس جگہ مختصراً ترکوں کے اسباب زوال کو لکھتے ہیں

(۱) ترکی قوم ایک سپاہی اور شجاع قوم ہے۔ اس نے ملک داری میں ہمیشہ دماغی تدبیر اور انتظامی اہلیت کی بہ نسبت اپنی بہادری اور شمشیر پر زیادہ اعتماد رکھا۔ اس وجہ سے اپنی [illegible] اقوام سے نہ خود زیادہ نفع اٹھا سکے نہ انکو زیادہ نفع پہنچا سکے۔ غیر قوموں کو چھوڑ کر خود مسلمان قومیں جو انکی حکومت میں آئیں انکی ملی جنسیت اور عصبیت کو یہ اپنے ساتھ موافق نہ کر سکے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باوجود صحابہ کی کوششوں کے عراق اور مصر کے علاقوں کو فوج میں نہیں تقسیم ہونے دیا بلکہ براہ راست خلافت کا محکوم رکھا جس سے تھوڑے ہی دنوں میں ان مقامات کے باشندوں کی عصبیت فنا ہوگئی اور وہ اسلامی قومیت کا جزو بن گئے مگر ترکوں نے مفتوحہ اقوام کے علاقے سپاہیوں میں بانٹ دیئے۔ ان جاہل آقاؤں کے مظالم سے ان قوموں میں حکومت کی ہمدردی نہ پیدا ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں جس قدر ضعف آتا گیا اسی قدر ان میں اپنی جنسیت کا احساس اور آزادی کا خیال بڑھتا گیا چنانچہ سلطان عبدالحمید اول کے عہد میں ۱۷۸۷ء میں جب روس و آسٹریا نے دولت علیہ پر حملہ کیا اس وقت بلقان کے بہت سے اصلی باشندے جا کر ترکوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوگئے۔ جب لڑائی ختم ہوگئی تو واپس آگئے۔ جاگیرداروں نے بوجہ باغی ہونے کے ان پر سختیاں شروع کیں جس سے شورش بپا ہوگئی باب عالی نے آخر میں عفو عام کا اعلان کر کے فوج کے ہاتھوں سے انکے علاقے نکال لئے۔ اس پر کمشاریہ نے بغاوت کر دی۔ بازنداوغلی نے کوشش کر کے پھر وہ علاقے فوج کو دلوا دئے۔ انہوں نے پھر وہی مظالم شروع کئے۔ اب اصل باشندے جو جنگ پیکار سے واقف ہو چکے تھے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے اور مشہور سرد زعیم پیٹر و نتش کی قیادت میں حزب وطنی قائم کی اور سلسلہ وار جدوجہد کرنے لگے یہاں تک کہ آخر میں استقلال حاصل کر کے رہے۔

(۲) بعض ترکی وزراء اور امراء کی خیانت، جنہوں نے نازک سے نازک موقعوں پر دشمنوں سے رشوتیں لیکر فتوحات کو شکستوں میں تبدیل کر دیا۔ اور سلطنت کو عظیم الشان نقصانات

پہنچائے۔

دولت علیہ کا سب سے بڑا اور خطرناک دشمن روس تھا خاصکر اسکا شہنشاہ پطر اول
جس نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرانا روس کے لائحہ عمل میں داخل کر لیا تھا سلطان احمد ثالث کے عہد
میں جب اس نے عثمانی علاقہ پر چڑھائی کی اس وقت محمد پاشا صدر اعظم نے جو دو لاکھ فوج لیکر
مقابلے کے لئے گیا تھا۔ دریائے پروت کے متصل اس کو مع اس کی محبوبہ ملکہ کیتھرائن کے ایک
قلعہ میں محصور کر لیا۔ اس موقع پر اگر دیانت اور صبر سے کام لیکر اس نے ان کو گرفتار کر لیا ہوتا
تو ترکوں کی ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا لیکن ملکہ مذکورہ نے اپنے زیورات اور جواہرات
پاس بھیجدیے جس کی وجہ سے اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور معاہدہ کر کے واپس آ گیا۔

سلطان عبدالمجید خان کے عہد میں جب محمد علی پاشا خدیو مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا
نے ترکوں کو نصیبین میں شکست دیدی جس سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ وہ نہ صرف اناطولیہ بلکہ قسطنطنیہ پر
بھی قبضہ کرلے گا اس وقت احمد پاشا قبودان عام نے سارا ترکی بیڑہ اسکندریہ میں لیجا کر خدیو مذکور
کے حوالے کر دیا۔ اگر انگلستان اور فرانس بیچ میں نہ آ پڑتے تو محمد علی قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیتا اور ترکی
سلطنت صفحہ وجود سے مٹ جاتی

عبدالحمید ثانی کے عہد میں انگریز کوشش میں تھے کہ جزیرہ قبرص لے لیں لیکن سلطان کسی
طرح تیار نہ تھا۔ ۱۸۷۸ء میں صفوت پاشا نے صدارت پر آتے ہی جزیرہ مذکور انگریزوں کے حوالے
کر دیا اور سلطان سے کہدیا کہ برلن کانفرنس میں یہ ہماری مدد کرینگے۔

یہ اور اس قسم کے واقعات ترکی تاریخ میں اور بھی ہیں بعض مورخین نے تو یہاں تک لکھا
ہے کہ روس کی اکثر فتوحات دولت علیہ پر زر کی بدولت تھیں نہ کہ زور کی۔

(۴۴) دور انحطاط میں چند سلاطین مرا د رابع سلیم ثالث۔ محمود ثانی یا عبدالحمید ثانی
اور بجز چند وزرا جیسے خاندان کوپریلی وغیرہ کے عام طور پر عثمانی سلاطین۔ انکے وزرا، امرا اور
ارکان دولت سیاست اور ملک داری میں نا اہل تھے جو خارجی تعلقات کو ٹھیک رکھ سکے

...نہ دو اُمکی انتظام کو جس کے باعث دن بدن فوجی اور اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی یہانتک ... عثمانیہ کو "مرد بیمار" کا خطاب دیا گیا جس کی ہلاکت میں بہت کم مدبرین کو شبہ تھا۔

دوسری طرف اس کے حریف یورپ نے دور جہالت و نشت سے نکلکر علم اور وحدت ... کی طرف قدم بڑھایا اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرکے ترکوں کو پیہم شکستیں دینے لگا، یہانتک کہ انکی سلطنت کے حصے بخرے کرنے کے منصوبے باندھنے لگے چنانچہ یکے بعد دیگرے ... چھینے بھی گئے جس کے باعث بجائے اس کے کہ سلیمان قانونی کے عہد میں ترکی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی اب گھٹکر ایک معمولی ریاست رہ گئی۔ ع

وہ بڑھو کے بدرہوے گھٹ کے ہم ہلال ہوئے

(۴) ترکوں اور بالخصوص انکے علمأ میں تقلید اور قدامت پرستی زیادہ تھی اور حریت فکر اور وسعت نظر کمتر۔ اس وجہ سے اکثر انہوں نے جدید اصلاحات کی مخالفت کی اور مذہب کے نام سے مفید دنیاوی علوم و فنون کو رد کیا۔ سلیم ثالث نے ۱۷۹۲ء میں جب جدید طرز کی فوجیں تیار کرنی شروع کیں اور خاصکوئی اور جزیرہ بکیہ لی میں انکی تعلیم کے لئے حربی مدارس کھولے ... رجعت پسند جماعت نے قیامت برپا کردی اور انہوں نے نہ صرف ان اصلاحات کے حامی وزرا کو قتل کیا بلکہ سلیم کو بھی تخت سے اتار کر چھین لیا کیونکہ طوبال عطا راللہ آفندی شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا تھا کہ مغربی فوجی لباس شریعت کے خلاف ہے۔

دوبارہ سلطان محمود نے جب پھر وہ اصلاحات شروع کیں اس وقت انکشاری پھر مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے مجبور ہوکر سلطان نے انکشاری فوج کو توڑ دینے کا فیصلہ کرلیا مگر اس میں کامیابی اس وقت ہوئی جب آتی میدان میں انکی چالیس ہزار لاشوں کے پشتے لگا دیے گئے۔

یورپ میں جابجا مطابع قائم ہو چکے تھے اور علوم و فنون کا سیلاب رواں تھا لیکن ترکی میں ایک مدت کے بعد احمد ثالث کے عہد میں ۱۷۲۷ء میں پہلا مطبع قائم ہوسکا اس پر بھی مفتی اعظم نے یہ قید لگا دی کہ قرآن کریم نہ چھاپا جائے کیونکہ موصوف کو تحریف کا خطرہ تھا۔

اسی جمود کا یہ رد عمل ہے کہ جمہوریہ ترکی کے ارباب اختیار نے مغرب کی تقلید شروع کی ہے۔ یہاں تک کہ جملہ باشندوں کے لئے یورپین لباس کو بھی لازمی قرار دیا ہے ترکی زبان کو بھی حکماً لاطینی حروف میں منتقل کر دیا ہے اور مشرقیت سے اپنے رشتے توڑ رہے ہیں تاکہ وہ قدیم ذہنیت بدل جائے لیکن اصل چیز جس نے یورپ کو یورپ بنایا ہے وہ سائنس ہے جبتک اس کو قابو میں نہ لائیں گے ان تبدیلیوں سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

بعض پرانے خیال کے مسلمان ترکوں کے مغربی تہذیب اختیار کر لینے کی وجہ سے یہ کہنے لگے ہیں کہ وہ اسلام ہی سے بیزار ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام مغربی یا مشرقی تہذیبوں سے بالاتر ہے وہ کسی خاص ملکی یا مقامی طرز اور وضع میں محدود نہیں بلکہ اس کا تعلق قلب و عمل کے ساتھ ہے اگر نوجوان ترکوں کا یہ بیان صحیح ہے کہ وہ قرآن کریم کو جو اصل الاصول ہے مضبوط پکڑے ہوئے ہیں تو پھر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ ممکن ہے کہ انکا یہ زوال جس میں جمہوریت پیدا ہو گئی ہے ایک نئے دور اقبال کا فاتحہ ہو۔

ڈراما کیا چیز ہے؟

(گزشتہ سے پیوستہ)

(ب)

فرحیہ: جس ڈرامے میں واقعات کی عام رفتار اور قصہ کا انجام خوشگوار ہو یعنی جس سے دیکھنے والوں کے دل پر فرحت و مسرت کا اثر ہو اسے فرحیہ کہتے ہیں۔ مگر جس طرح وہ المیے کی شان نہیں رکھتا بلکہ ایک کمتر درجے کی چیز ہے اور میلوڈراما (رقت آمیز ڈراما) کہلاتا ہے اسی طرح وہ کھیل جو محض تفریح اور دل لگی کا باعث ہوتا ہے فرحیے کے معیار سے پست ہوتا ہے اور فارس (نقل) کے نام سے موسوم ہے۔ فرحیے سے راحت و مسرت کے علاوہ دیکھنے والے کی طبیعت کو اطمینان اور آزادی کی ایک مستقل کیفیت محسوس ہوتی ہے اور زندگی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہٹ جاتا ہے

عموماً اس کیفیت کا اظہار ہنسی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس پر غور کریں کہ ہنسی عموماً کن چیزوں پر آتی ہے تو ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فرحیے کے کیا عناصر ہونا چاہئیں نفسیات کے ماہروں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہنسی کی محرک تین چیزیں ہوتی ہیں کسی شخص کی خفت یا ذلت، اسکا بھونڈاپن یا بے تکاپن اسکا شخصیت سے محروم اور مشین نما ہونا۔ مثلاً جب کسی کا خصوصاً کسی خواہ مخواہ مرد آدمی کا پیر پھسلے اور وہ گرے تو ہمیں ہنسی ایک تو اس لئے آتی ہے کہ یہ افتاد اس شخص کی خفت کا باعث ہو دوسرے اس لئے کہ گرتے وقت اور گرنے کے بعد اس کی قطع بے تکی ہو جاتی ہے۔ چہرے کی عجب بر ترنج ہو جاتی ہے۔ منہ پھیل کر رہ جاتا ہے ٹانگیں اوپر اٹھ جاتی ہیں۔ تیسرے اس لئے کہ اس کی بے بسی دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حضرت اشرف المخلوقات ہیں۔ جن سے ہمیں ہمدردی کرنا

چاہئے بلکہ سمجھتے ہیں کہ یہ گوشت اور چربی کا ایک تودہ ہے جسے تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔

فرانسیسی فلسفی برگساں نے ہنسی کے محرکات کی تحلیل کی ہے جو زیادہ مکمل ہے۔ وہ کہتا ہے ہنسی کے لئے تین شرطیں ہیں (۱) اس کا موضوع شکل صورت وضع قطع یا سر سے فطرت میں سوسائٹی کے عام رنگ سے مختلف ہو (۲) جس حالت میں وہ پایا جائے اس میں اس کی شخصیت چھپ جائے اور وہ مشین یا کٹھ پتلی کی طرح معلوم ہو (۳) دیکھنے والے کو اس وقت اس کے انسانی جذبات کا احساس نہ ہو۔ مثلاً اوپر کی مثال میں موٹا ہونا سوسائٹی کی عام روش سے ہٹی ہوئی چیز ہے۔ پیر پھسل کر گرنے میں ہر شخص کٹھ پتلی کی طرح مجبور ہوتا ہے اور پھر موٹے آدمی کی بے بسی کا تو کیا پوچھنا ہے، رہی تیسری شرط تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں بیچارے الفربہ کے جذبات کا کسے احساس ہوتا ہے۔

لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک اور چیز ہنسی کی محرک ہوتی ہے جس کا برگساں نے ذکر نہیں کیا اور وہ تہذیب اور ثقاہت کے تکلفات سے آزادی کا احساس ہے مثلاً ایک مجمع میں جہاں سب مقطع اور ثقہ لوگ بیٹھے ہیں اور انسان وہاں بات کرنے بلکہ سانس لینے میں بھی تکلف محسوس کرتا ہے کوئی شخص کوئی موٹی سی گالی بک دے یا بھونڈا مذاق کر بیٹھے تو حالانکہ خوش مذاق لوگوں کے لئے گالی یا بیہودہ مذاق بجائے خود کوئی ہنسی کی چیز نہیں مگر ایسے موقع پر انہیں بے اختیار ہنسی آ جائے گی۔

ہنسی کی اس نفسیاتی تحلیل کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس میں وہ کیفیت جس پر ہنسی آتی ہے پانچ طرح سے پیدا ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک تو کسی شخص کی بے تکی جسمانی صفات سے مثلاً ناک کا بڑا ہونا۔

(۲) اس کی انوکھی ذہنی اور روحانی صفات سے مثلاً بیچ بیچ کا مراق یا خبط، یا کسی معمولی صفت میں اس قدر مبالغہ جو مراق کی حد تک پہنچ جائے۔

(۳) اس کی نرالی عادتوں اور حرکتوں سے مثلاً کندھے اچکانا، منہ چڑانا۔

(۱) کسی مضحک حالت کے دکھانے سے۔

(۲) مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنے سے۔

مزاح نگار ان سب ترکیبوں سے کام لیتا ہے لیکن انکے استعمال میں تناسب کو مدنظر رکھتا ہے جس ڈرامے میں محض بے تکی جسمانی صفات یا نرالی عادتیں اور حرکتیں دکھائی جائیں وہ فرحیہ نہیں رہتا بلکہ نقل (فارس) بن جاتا ہے۔ فرحیے میں یہ چیزیں اسی حد تک کھپتی ہیں جہاں تک [illegible] بے اعتدالی کی علامت ہوں۔ البتہ انوکھی ذہنی صفات کو نمایاں کرنا مضحک حالتوں کا پیدا کرنا مضحک الفاظ اور فقرے استعمال کرنا فرحیے کا اصل جوہر ہے۔

یہاں تک ہم نے فرحیے کے عناصر مضمون کے لحاظ سے بیان کئے اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنسنے کے لئے طرز ادا کیا اختیار کیا جاتا ہے۔

انسان اپنی خوش طبعی کا اظہار ان تین طرزوں میں سے کسی طرز سے کرتا ہے۔ مذاق یا دل لگی، ظرافت، طنز۔

مذاق یا دل لگی اسے کہتے ہیں کہ آدمی اپنی فطری شگفتہ طبعی سے ہر بات میں ہنسی کا پہلو ڈھونڈے، خود ہنسے اور جب پڑھے اسے بھی ہنسائے۔ اس کی بنیاد ہمدردی، یار باشی، کشادہ دلی پر ہوتی ہے۔ مذاق کرنیوالے کا مقصد کسی کو خفیف کرنا نہیں بلکہ سب کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ وہ جس طرح دوسروں پر چوٹ کرتا ہے اسی طرح اپنے آپ پر بھی فقرے کستا ہے۔ اس کی طبیعت میں یا اس کی باتوں میں کوئی خاص نفاست یا باریکی نہیں ہوتی لیکن وہ تناسب کا کسی قدر احساس رکھتا ہے، اس کی نظر بے ڈول یا بے تکی چیز پر فوراً پڑتی ہے، وہ بیساختہ ہنس پڑتا ہے اور اس کے ہنسنے پر دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے۔ مذاق کرنے والا اگر متانت اور خودداری سے بالکل خالی ہو اس کی باتوں میں بازاری پن کی جھلک اور خوشامد یا مطلب براری کا پہلو ہو تو وہ مسخرا اور اسکا مذاق مسخراپن کہلاتا ہے۔

وہ مذاق جو پستی کی طرف جھکنے کی بجائے بلندی کی طرف ابھرتا ہے جس میں نفاست، ندرت

ستھرا پن پایا جاتا ہے اسے ظرافت کہتے ہیں ۔

ظرافت کی بنیاد شوخ طبعی، نکتہ سنجی اور ذہنی رعونت پر ہوتی ہے۔ ظریف آدمی کا احساس [illegible] اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ ذرا سا بے تکا پن بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ جب وہ بیڈول چیزوں اور بے تکے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں ہمدردی کی جگہ ایک طرح کی حقارت پیدا ہوتی ہے۔ وہ دل لگی بازی کی طرح کھلے دل سے اور کھلے الفاظ میں مذاق نہیں کرتا بلکہ برتری کے احساس کے ساتھ اپنے آپ کو لیے دیے ہوئے لطیف اشاروں اور کنایوں میں چوٹیں کرتا ہے اور اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے دوسروں کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس کا مقصد کمتر ہنسنا اور زیادہ تر بیوقوفوں اور سادہ لوحوں کو بنانا اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔

اگر ظرافت حد سے زیادہ تلخ اور ترش ہو جائے تو وہ طنز کے درجے پر پہنچ جاتی۔ طنز کرنے والا عموماً اکل کھرا اور مردم بیزار ہوتا ہے۔ اس کی نظر حماقت اور بے تکے پن کے علاوہ اخلاقی کمزوریوں پر بھی ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اسے تکلیف ہوتی ہے اور وہ ان کی پردہ دری کر کے دوسروں کو بھی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کی ہنسی زہرخند کی شان رکھتی ہے اور اس کی ظرافت غم اور غصے میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔

ان میں سے فرسیے کا مخصوص طرز ادا مذاق اور دل لگی ہے۔ ظرافت کا استعمال محدود ہے اس کی باریکی اور شوخی سے کام لیا جاتا ہے لیکن رعونت کا انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ اکثر اعلیٰ درجے کے فرسیہ نگار مثلاً شیکسپیئر جن لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں انکی تحقیر نہیں کرتے بلکہ ان سے ایک حد تک محبت رکھتے ہیں شیکسپیئر کی ہنسی میں تلخی نہیں ہوتی اس کی پھبتیوں میں نیش نہیں ہوتا۔ اس کے سب سے مشہور مضحک کیرکٹر فالسٹاف کی حماقت، لالچ، شیخی پر ہم جی کھول کے ہنستے ہیں لیکن جب وہ اپنے کیے کی سزا پاتا ہے تو ہمیں اس پر رحم آجاتا ہے۔ مولیر جو غالباً فرسیہ نگاری کا سب سے بڑا استاد ہے شیکسپیئر سے زیادہ سخت گیر ہے لیکن اس کا دل بھی رعونت اور تحقیر کے جذبات سے خالی ہے۔ وہ جن لوگوں کا خاکہ اڑاتا ہے انہیں اپنے سے کم درجے کا مخلوق نہیں بلکہ

...ی طرح انسان سمجھتا ہے۔

بقیہ دو طرز یعنی مسخراپن اور طنز فرسے کے لئے مناسب نہیں۔ مسخرے پن پر ہنسی تو آتی ہے لیکن خوشی کی جو کیفیت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ سطحی اور عارضی ہوتی ہے اس سے تھوڑی دیر دل بہلتا ہے لیکن زندگی کی دشواریوں میں کوئی مستقل سہولت حاصل نہیں ہوتی۔ اس طرز کا محل استعمال نقل (فارس) ہے جو عوام میں بہت مقبول ہے لیکن خوش مذاق لوگوں کی نظر میں زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

طنز کی گنجایش فرسے میں اور بھی کم ہے۔ فرسے کی سبک روی اس کی تلخی اور ترشی کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ طنز کی جان غم و غصہ اور نفرت کے جذبات ہیں جو مذاق کے ہلکے سے پردے میں چھپے ہوتے ہیں۔ تنقید اور تضحیک کے لئے یہ بہت اچھا آلہ ہے لیکن فرسے میں جس کا اصل مقصد تفریح اور خوش وقتی ہے۔ اس کی آشفتہ نوائی سارے عیش کو تلخ کر دیتی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہنسی زیادہ تر ان لوگوں پر آتی ہے جس میں شخصیت نہ ہو بلکہ جو کٹھ پتلی کی طرح کسی بیرونی قوت کے اشارے پر حرکت کرتے ہوں اس لئے فرسے میں جس کا دارومدار ہی اس پر ہے کہ ہر شخص کو مضحک حالت میں دکھایا جائے عموماً کوئی نمایاں شخصیت رکھنے والا کیرکٹر یعنی کوئی ہیرو نہیں ہوتا۔ اگر کسی کیرکٹر کو خاص طور سے مضحک بنایا جائے تو اس کی شخصی حیثیت پر زور نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے کسی جماعت یا طبقے کی مثال (Type) کا کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً مولیئر کے ڈراموں میں جہاں کہیں ایک طبیب یا ایک کنجوس آدمی کی خبر لی گئی ہے تو اس سے کوئی خاص شخص مراد نہیں بلکہ سارے طبیب اور سارے کنجوس آدمی۔ اکثر فرسوں میں اصل قصے کے ساتھ ایک یا زیادہ ضمنی قصے بھی ہوتے ہیں جن کے اشخاص کی اہمیت قریب قریب مساوی ہوتی ہے۔ اس طرح فرسے میں عمومیت کا رنگ جس کے لئے المیے میں خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ عمومیت پیدا کرنے کی اور ترکیبیں مثلاً مافوق الفطرت قوتوں کا ذکر فرسے میں کام نہیں دیتا کیونکہ ان سے خوف اور دہشت کا اثر پڑتا ہے۔ اور یہ فرسے کی

انتشار کے خلاف ہو۔

ڈراما کی نشو ونما عہد قدیم سے عہد جدید تک

انسانی زندگی کی تمثیلیں ناٹک کے ذریعے دکھانے کی رسم اکثر قوموں میں قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے لیکن اسے ادبی اور شاعرانہ حیثیت پہلے پہل تینوں یونانیوں، اور ہندوؤں نے دی۔ ان تینوں قوموں نے ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر الگ الگ اس صنف شاعری کو ایجاد کیا یونانیوں میں اس رسم کی بنیاد اس طرح پڑی کہ انکے یہاں ابتدا سے ڈائیونی سیس دیوتا کے پوجا کے سلسلے میں مذہبی روایات ناٹک کی شکل میں دکھائی جاتی تھیں۔ جب یونانی تمدن نے ترقی کی تو شعرا اس رسم کے لئے خاص ڈرامے تیار کرنے لگے عام دستور یہ تھا کہ اس موقع پر ایک فرحیہ اور تین المیے دکھائے جاتے تھے جو ڈراما نگار چوٹی کے سمجھے جاتے تھے انکے ڈرامے اس کام کے لیۓ منتخب ہوتے تھے یونانی زبان کے اکثر بہترین ڈرامے اسی تقریب سے لکھے گئے۔

یونانیوں میں ڈراما کے اصول وضوابط سب سے پہلے ارسطو نے اپنی شعریات (poetics) میں مرتب کئے۔ ارسطو کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانیوں کے ذہن نے اپنی فطری تخلیقی رو میں علم وادب اور فنون لطیفہ کے جو نمونے پیدا کئے تھے اس نے انکا غور و فکر سے مطالعہ کیا اور انکے اہم عناصر دریافت کرکے علمی قوانین بنا دیئے تاکہ آئندہ نسلیں اپنے بزرگوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں اور بنے بنائے راستوں پر چل کر کم وقت میں زیادہ ترقی کر سکیں اس کے عہد میں باکمال شعرا صرف المیے لکھتے تھے۔ اچھے فرحیے یا تو اس سے پہلے لکھے گئے یا

---

(۱) اس دیوتا کے متعلق ابتدا میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ سارے نباتات کے اگنے اور بڑھنے کا کفیل ہے لیکن آگے چل کر اسکا کام محض یہ سمجھا جانے لگا کہ انگور میں شراب پیدا کرے۔ اسی کو Bacchus کہتے ہیں۔

اُس کے بعد کچھ اس وجہ سے اور کچھ اپنی فطری سنجیدگی اور خشک مزاجی کی بدولت اُس نے اعلیٰ ڈراما صرف المیے کو قرار دیا اور طربیے کو ادنیٰ درجے کی چیز سمجھ کر اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اس کے عہد میں اسٹیج بالکل ابتدائی حالت میں تھی، فنی ([illegible] ہوتے تھے، پردوں کے بدلنے میں بڑی دقت ہوتی تھی، اس لیے اس نے یہ اصول قرار دیا کہ ہر ڈرامے میں صرف ایک قصہ ہو، ہر قصے کا محل وقوع ابتدا سے آخر تک ایک ہی جگہ ہو، زمانہ وقوع جہاں تک ممکن مختصر رکھا جائے۔ یہ سہ گونہ وحدت کا قانون کہلاتا ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کا نظریہ یونانی حالات کا پابند تھا اور اُس نے جو اصول بنائے تھے وہ ہمیشہ کے لئے نہ تھے۔

مگر جب یونانیوں کے تمدن کا زوال ہوا اور انکی وراثت اہل روما کو ملی تو انھوں نے اپنی فطری تقلید پرستی کی بدولت فنونِ لطیفہ میں یونانیوں کے بنائے ہوئے اصولوں کو دوامی قانون سمجھا جس کی مخالفت اُن کے نزدیک کسی طرح جائز نہ تھی۔ ہورلیس نے ارسطو کے ضوابط کی تشریح کی اور انکی پابندی کو ہر ڈراما نگار کے لئے لازمی قرار دے دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے ڈراما کی آزاد نشو و نما رک گئی اور وہ زیادہ ترقی نہ کر سکا۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا کی مذہبی تعلیموں کے سبب سے ڈراما کو اور تنزل ہوا۔ اس زمانے میں زندگی پر مذہب اور کلیسا کا رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے ڈراما بھی اسی رنگ میں رنگ گیا۔ لوگ اپنے ذوقِ تمثیل کو مذہبی سوانگ سے پورا کرتے تھے جس میں مسیح کی ولادت اور شہادت اور اولیا کی زندگی کے سیدھے سادے قصے ہوتے تھے مگر اصول فن میں بدستور یونانیوں کی تقلید ہوتی تھی۔ عہد جدید میں سب سے پہلے شیکسپیر نے جو قدیم علوم سے تقریباً بالکل ناآشنا تھا اپنی فطری قوتِ تخلیق کی بدولت ڈراما کو فرسودہ قوانین کی پابندی سے آزاد کر کے آسمان تک پہنچا دیا۔ مگر سولھویں صدی کے نقاد ابتک پرانے ضوابط کے قائل تھے اور شیکسپیر کے ڈراموں کو بے اصول سمجھ کر رد کر دیتے تھے [illegible] جو بادشاہ سخن کے فطری جوہر کے قائل تھے انھوں نے بھی اصول فن میں

کسی طرح کی تبدیلی گوارا نہیں کی ہاں اتنا کیا کہ شیکسپیر کو مستثنیٰ قرار دے دیا۔ فرانس کی تنقید میں یہ قدامت پرستی اٹھارہویں صدی تک جاری رہی۔ البتہ سترھویں صدی میں ڈرائیڈن اور اٹھارھویں صدی میں ڈاکٹر جانسن نے لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ ارسطو کے اصول بہت سی باتوں میں اس کے عہد کے حالات کے پابند تھے اور جب وہ حالات بدل گئے تو ان اصولوں کی پابندی بھی لازمی نہیں رہی۔ ان نقادوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ شیکسپیر کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ اس کی قوت تخلیق نے فرسودہ ضوابط کی زنجیروں کو توڑ کر اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں رومانی تحریک کے بانی ہرڈر نے تو فن تنقید میں بالکل کایا پلٹ ہی کر دی۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ہر قوم اور ہر دور کی ایک مخصوص شاعرانہ روح ہوتی ہے جو اپنے اظہار کے لئے خود راہ نکالتی ہے۔ اس کے خیال میں ادب اور شاعری کو دوامی قواعد و ضوابط کا پابند بنایا گویا اس کی روح کو طوق و سلاسل میں جکڑ کر رکھنا ہے۔ رومانی دور کے ڈراما میں جو جدتیں پیدا کی گئیں انہیں دیکھ کر سولھویں اور سترھویں صدی کے نقاد آپے سے باہر ہو جاتے۔ سہ گونہ وحدت کا قانون بالکل پس پشت ڈال دیا گیا ڈراما کے طول میں کسی طرح کی پابندی نہ رہی المیہ کا موضوع بجائے بادشاہوں کی زندگی کے عوام کی زندگی بن گئی۔

شیکسپیر کے عہد اور رومانی دور کے ڈراما میں قدیم یونانی رومی ڈراما یا قرون وسطےٰ کے فن تمثیل کے مقابلہ میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ محض قانون صورت اور اصول فن کے لحاظ سے نہ تھیں بلکہ عہد جدید میں شاعری کی اور اصناف کی طرح ڈراما کا بھی مزاج ہی بالکل بدل گیا۔ یہ تغیر اصل میں انسان کے نفسی انقلاب کا نتیجہ تھا یونان کے سقراطی دور اور روما کے شاہنشاہی دور کا انسان ایک ایسی تمدن کا حامل تھا جو بڑھاپے کی منزل میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے خیالات میں پختگی تھی اور سادگی جو پختگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی پختگی اور یہی سادگی اس زمانے کے فلسفے میں، آرٹ میں خصوصاً ڈراما میں پائی جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسیحی مذہب نے رومی اور المانی قوموں میں

پہنچ گیا ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی جسے ہم مغربی تمدن کہہ سکتے ہیں۔ صدیوں تک یہ تمدن بچپن کی حالت میں رہا۔ لوگوں کے دلوں پر بھولے پن، عقیدت، تقلید کا رنگ غالب تھا جیسا کہ اثر اس عہد کے طرز تعمیر شاعری ڈراما سبھی چیزوں پر پڑا شیکسپیر کے زمانے میں اس تمدن نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے ہمعصروں کے جذبات میں تلاطم برپا تھا انکے تخیل میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اس کے نفس میں نئی قوتیں، امنگیں، آرزوئیں پیدا ہو رہی تھیں یا بہ قول افلاطون کے انکا مرغ روح پر پرواز پیدا کر رہا تھا۔ اس سیلاب تخیل، طوفان آرزو، جوش جوانی کو راہ پر لگانے کے لئے اٹھارہویں صدی کی نئی روشنی کی تحریک نے عقلیت کے پشتے تیار کئے لیکن یہ دریا ان کے روکے نہ رکا، اٹھارہویں صدی کی شاعری اور ڈراما میں لیسنگ اور اس کے ہمعصروں کی کوششوں سے کچھ دن تک پختگی، سنجیدگی، ضبط کا چلن رہا لیکن رومانی تحریک نے وضع احتیاط سے اکتا کر گریبان عقل کا چاک کر دیا اور جذبات پرستی کا دور دورہ ہو گیا۔ قلب انسانی کی گہرائی سے احساس اور تخیل کے چشمے ابل پڑے اور بحر ذخار کی طرح پھیل گئے۔

مگر انسانی تمدن اور انسانی روح کو پہلے کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کو سمیٹے جوانی کی شوریدہ سری اور مطلق العنانی، تھوڑے دن رہتی ہے پھر خود بخود یہ احساس ہوتا ہے کہ بس اب سنبھلنے کا وقت ہے۔ یہ صورت مغربی تمدن کو انیسویں صدی کے نصف اول میں پیش آئی۔ رومانی دور کی جذبات پرستی نے تخیل کو بڑی وسعت دی تھی اور احساس کو بہت تیز کر دیا تھا لیکن بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ محض تخیل احساس اور جذبات کی بنا پر مکمل تمدنی زندگی کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اہل نظر تنقید اور غور سے کام لینے لگے اور ایک با اصول اور مستحکم عقیدہ زندگی تلاش کرنے لگے۔ اس جستجو کا پہلا علمبردار شاعری اور ڈراما میں جرمن شاعر گوئٹے ہے۔ گوئٹے ابتدائی عمر میں رومانی شاعر تھا لیکن مدت تک زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد اس کے عقائد بہت کچھ تبدیل ہو گئے اور وہ زندگی کا ایک برتر اور بہتر نصب العین تلاش کرنے لگا۔

لیکن گوئٹے انقلاب کا قائل نہیں تھا بلکہ ارتقا کو مانتا تھا ۔ وہ تاریخ کے ہر دور کو تمدنی نشو و نما کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھتا تھا اور کسی کڑی کو توڑنا اسے گوارا نہ تھا۔ رومانی خیالات کا اس پر بڑا گہرا اثر تھا اور ان کی خامیوں سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اس نے انہیں بالکل رد نہیں کیا۔ بلکہ ان کے ایک اہم عنصر کو اپنے فلسفۂ زندگی میں جذب کر لیا۔ اس کے نزدیک رومانیوں کی جذبات پرستی، مادیت سے بے اطمینانی، بے راہ روی سطحی اور عارضی چیز تھی لیکن ان کی باطنیت بڑی گہری حقیقت پر مبنی تھی۔ اس باطنیت کو اس نے لے لیا لیکن یوں نہیں کہ حواس ظاہری اور عقل کو معطل کر کے نامعلوم قوتوں کے آگے سر جھکا دیتا بلکہ اس طرح کہ انسانی زندگی کو اس نے ایک مجازی چیز قرار دیا جو عقل و ادراک کے مرحلوں سے گذرتی ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر حقیقت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔ اس کے آگے جو کچھ ہوتا ہے اس کی کسی کو خبر نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

مگر گوئٹے کے بعد انیسویں صدی کے نصف دوم میں یورپ کی زندگی اور خیالات میں بڑا انقلاب ہو گیا۔ سائنس کی ترقی اور اس کے استعمال سے صنعت کو بے حد فروغ ہوا۔ بڑے بڑے کارخانے کھل گئے۔ دیہات کی آبادی کھنچ کر شہروں میں آ گئی۔ زندگی کی ضروریات بڑھ گئیں اور ان کے پورا ہونے میں دقت ہونے لگی۔ کارخانے کے مزدور جب دفعۃً ایک نئی فضا میں آئے تو ان کی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا۔ ان معاشی اور سماجی پیچیدگیوں کے سبب سے لوگوں میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ نئے مادی حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے حکومت و سیاست، مذہب و اخلاق، ہر چیز میں انقلاب کی ضرورت ہے۔

قدرتی بات تھی کہ اس زمانے میں روزمرہ زندگی کے واقعات نے لوگوں کو اس قدر متوجہ کر لیا کہ زندگی کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام پر غور کرنے کی فرصت نہیں رہی۔ ادھر نظری فلسفے پر ثبوتیت کا رنگ چھا گیا۔ یعنی علم کا تنہا معیار تجربہ اور مشاہدہ قرار پایا اور تخیل وجدان اور باطنی احساسات ناقابل اعتبار سمجھ کر ترک کر دئے گئے۔ مادہ پرستی فلسفے میں افادیت دخیل ہو گئی۔ زندگی کا اعلیٰ مقصد حصول راحت ٹھہرا اور اس کے حصول کا ذریعہ سائنس۔

عام خیال یہ تھا کہ زندگی کی تشکیل اور تہذیب کو مذہبی عقائد یا فلسفیانہ تخیلات پر نہیں چھوڑنا چاہئے بلکہ تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے اسکا ایک صحیح علم مرتب کرنا چاہئے۔ اس علم کا نام عمرانیات [illegible] رکھا گیا اور یہ سارے علوم کا سرتاج سمجھا جانے لگا۔

اس انقلاب کا اثر ناول نویسی اور ڈراما پر بھی بہت گہرا پڑا۔ ان فنون کا اصل مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسان کے ذوق جمال اور ذوق مشاہدہ کو پورا کریں۔ ان سے زندگی کی تنقید یا اصلاح کا کام اگر لیا جاتا تھا تو محض ضمنی طور پر۔ اب انکا سب سے بڑا فرض یہ قرار دیا گیا کہ فرسودہ اصولوں اور عقیدوں کی چیتھاڑ کریں اور زندگی کے نئے نصب العین پیش کریں۔

عمرانیات [illegible] اس زمانے میں عام طور پر چرچے ہوتے تھے مثلاً فرد کی جسمانی اور روحانی آزادی عورتوں اور مردوں کی مساوات، مروجہ اخلاق کی تنقید وغیرہ وہی ناولوں اور ڈراموں کے بھی موضوع ہو گئے۔

بے قید تخیل اور بے روک جذبات پر اب بڑی قدغن ہونے لگی۔ ایسی باتیں جن میں واقعیت کا رنگ نہ ہو بالکل ترک کر دی گئیں۔ مافوق الفطرت عناصر جیسے دیوتا، تقدیر، جن، پری، وغیرہ جن سے پہلے ڈراما میں بہت کام لیا جاتا تھا اب صرف بچوں کی کہانیوں تک محدود رہ گئے۔ ان سے جو تخیلی اثر پیدا ہوتا تھا وہ اب زندگی کی ظاہری قوتوں مثلاً وراثت، قوت حیات، اور نفسیاتی عناصر سے پیدا کیا جانے لگا۔ یوں بھی صنعتی ترقی نے اسٹیج پر ہر طرح کے مناظر دکھانے میں آسانی پیدا کر دی تھی کہ ڈراما کے زور اور اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہونے پائی۔

یہ نئی روح ناروے کے ڈراما نگار ابسن کی تصانیف میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اسی لئے وہی نئے ڈراما کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ابسن یہ محسوس کرتا تھا کہ مغربی سماج کے اصول و قواعد اور اخلاق و رسوم فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ان میں اتنی جان نہیں ہے کہ نئے زمانے کا ساتھ دے سکیں اور نئی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ لوگ محض قدامت پرستی کے سبب سے ان سے اب تک مانوس ہیں۔ اور وہ ان میں اتنی بصیرت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اپنے پرانے خیالات اور [illegible]

یا در رسم و رواج کی کمزوریوں کو سمجھ لیں اور اتنی ہمت کہ ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیں۔ جب وہ اصلاح کے جوش میں اپنے عہد کے اصول اخلاق پر پے در پے حملے کرتا ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے اجتماعی اخلاق ہی کا قائل نہیں اور اس کے نزدیک فرد انسانی پر باہر سے یعنی مذہب یا تمدن کی طرف سے کسی طرح کی قیود عائد نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے اس کی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے تاکہ اس کی جبلتیں اور صلاحیتیں آزادی سے نشوونما پا سکیں۔ لیکن اس کی تصانیف کو غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حد تک نراجی نہیں ہے۔ اس کا منشا اصل میں یہ ہے کہ اخلاقی اصول اور رسوم جو انسان کی مادی اور روحانی ترقی میں مدد دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں اسی حد تک قابل عمل ہیں جب تک وہ زمانے کے حالات افراد کے فطری رجحانات اور اس کی مخصوص ضرورتوں سے نہ ٹکرائیں۔ جہاں یہ تصادم پیدا ہو تو جیتے جاگتے انسان کی راحت و عافیت کو مقدم سمجھنا چاہئے اور بے رنگ اور بے جان اصولوں کی پروا نہ کرنا چاہئے۔ اگر یہ کشمکش اکثر پیدا ہونے لگے تو سمجھنا چاہئے کہ اب ہمارا مروجہ اخلاق زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا اور نظر ثانی کا محتاج ہے۔

ابسن کا کمال یہ ہے کہ باوجود تنقیدی اور مصلحانہ طرز اختیار کرنے کے وہ آرٹ کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے اصلاحی جوش اور اس کی انقلاب پسندانہ شورش نے اس کی شاعری کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کے کلام میں اور زیادہ زور اور اس کے انداز بیان میں اور زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا۔ وہ اپنے عہد کی معاشرت کا نقاد ہے، نئی سماجی تحریک کا علم بردار ہے مگر اسی کے ساتھ وہ شاعر ہے اور اسکے یہاں رومانی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ آگے چل کر یہ رنگ ہلکا ہو گیا مگر پھیکا نہیں پڑنے پایا۔ آغاز صدی کے رومانیوں میں اور ابسن میں بس اتنا فرق ہے کہ ان لوگوں کی نظر کو جذبات پرستی نے دھندلا کر دیا تھا اور انہیں انسانی زندگی گویا کہر میں چھپی ہوئی نظر آتی تھی مگر ابسن کو بس اتنا نشہ تھا کہ اس کا احساس تیز ہو گیا تھا اور ادراک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس میں وہی داخلیت تھی اور وہی انفرادیت مگر تنقید اور تحلیل کے ساتھ سموئی ہوئی۔ یہ تحلیل منطقی

تحلیل نہ تھی جو زندگی کے پھول کو بیجان سمجھ کر اس کی پتی پتی الگ کر کے دیکھتی ہو بلکہ نفسیاتی تحلیل جو اس کے اندر سما کر اس کے رنگ و بو، اس کی تازگی اور خوشنمائی کا جائزہ لیتی ہے اور اس کے خونِ دل اور چاک جگر کا بھید پاتی ہے۔

[illegible] نے "دشمن مردم" میں فرد اور جماعت کے تعلقات سے بحث کی ہے [illegible] اور "سمندر کی خاتون" میں مرد اور عورت کے تعلقات پر تبصرہ کیا ہے۔ لیکن "ہیٹ" [illegible] تبصرہ"، خشک علمی مذاکرے نہیں ہیں بلکہ ان میں آرٹ کی سبکدستی نے دلکشی اور دلربائی پیدا کر دی ہے۔ "دشمن مردم" جماعت کے خلاف۔ فرد کا نعرۂ جنگ، "سمندر کی خاتون" اور اس سے بھی بڑھ کر "گڑیا کا گھر" مرد کے مقابلے میں عورت کا اعلان آزادی ہے۔ مگر ان میں سے کسی میں مناظرے کی درشتی اور تلخی شاعری کی نرمی اور حلاوت پر غالب نہیں آئی۔

آخری عمر میں ابسن کے شاعرانہ تخیل نے واقعیت نگاری میں استعاریت کا رنگ پیدا کر دیا [illegible] عمدہ نمونہ اس کا مشہور ڈراما "ماہرین فن تعمیر" ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک ذکی الطبع ماہر فن تعمیر سولینس کچھ خودغرضی اور کچھ رشک کے سبب سے اپنے نوجوان نائب راگنر کی ترقی کو روکنا چاہتا ہے [illegible] سمجھتا ہے کہ اگر راگنر اس کی ملازمت ترک کر کے اپنا کاروبار الگ جاری کر دے گا تو اس کے گاہک ٹوٹ کر راگنر کی طرف چلے جائیں گے۔ اور اس میں اس کا بڑا نقصان ہے۔ علاوہ اس کے اسے یہ گوارا نہیں کہ شباب کا بڑھتا ہوا زور بڑھاپے کی گھٹتی ہوئی قوت پر فتح پائے۔ اس لئے ایک طرف تو راگنر کے بنائے ہوئے نقشوں میں خواہ مخواہ عیب نکال کر اس کی ہمت کو پست کرتا ہے اور دوسری طرف راگنر کی منگیتر کے بھولے دل کو اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیتا ہے تاکہ نہ وہ خود اس کی نوکری چھوڑے اور نہ راگنر کو چھوڑنے دے مگر شباب ایک نوجوان سیلانی لڑکی ہلڈا کی شکل میں آتا ہے اور اس کے دل کو پُراسرار طریقے سے تسخیر کر لیتا ہے۔ ہلڈا اسے اس پر آمادہ کرتی ہے کہ اپنی بنائی ہوئی عمارت کے مینار پر جا کر ہار چڑھائے۔ سولینس لکڑی کے ڈھانچے پر جو معماروں نے مینار کے گرد کھڑا کر دیا ہے چڑھتا ہے۔ مگر آخری زینے پر پہنچ کر اس کا سر چکرا جاتا ہے اور وہ

اس بلندی سے زمین پر گر کر مر جاتا ہے اس طرح پیری کی شکست ہوتی ہے مگر بڑی شاندار شکست۔
ابسن کو اس ڈرامے میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ موجودہ نسل کا آئندہ نسل کی اٹھان کو روکنا گویا
قانون فطرت کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کا انجام ناکامیابی ہے مگر یہ ناکامیابی پیری کے لئے باعث
ذلت نہیں۔

اس ڈرامے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما کے جدید دور میں رومانیت رفع معدوم
نہیں ہوئی بلکہ نئے روپ میں استعاریت (Symbolism) کے نام سے
تخیل کی آگ کو ہوا دیتی رہی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ رومانیت تو عجائب پسندی کی دھن
میں واقعیت کے قوانین سے صریحی انحراف کرتی ہے، جذبات پرستی کے جوش میں اعتدال کے
اصول کو کھلم کھلا توڑتی ہے مگر استعاریت عقل اور عادت کے پردے کو قائم رکھتی ہے اور اس کے
پیچھے سے رموز و اسرار کی جھلک دکھلاتی ہے۔ یہ طرز بیان جو ابسن کے یہاں صرف آخری دور
میں نظر آتا ہے۔ اسٹرنڈبرگ، میٹرلنک، روستان کے یہاں عام ہے آئرلینڈ کے ڈراما نگاروں
خصوصاً ییٹس کی تمثیلوں میں یہ استعاریت اور گہری ہو کر باطنیت بن گئی ہے۔

روستان میٹرلنک اور ہاؤپٹمان کی بعض تمثیلوں اور خود ابسن کے نوجوانی کے ڈراموں میں
رومانیت اپنی اصلی حالت میں بھی نظر آتی ہے۔ مگر یہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنیں ہیں جن
سے شام غربت کی سنجیدگی اور افسردگی کم نہیں ہوتی۔

زمانے کا عام رجحان، جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں، واقعیت نگاری اور اخلاق و معاشرت
کی تنقید کی طرف تھا۔ ڈرامے عموماً اس قسم کے موضوعوں پر لکھے جاتے تھے جیسے شادی اور اس
کے بعد کی زندگی، طلاق کا مسئلہ، مرد اور عورت کے جنسی تعلقات، عشق و محبت، عزت و وقار اور
حریت و حمیت کے موجودہ نصب العین کی تنقید، سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کشمکش وغیرہ وغیرہ۔
خوف تھا کہ ان خشک اور سنجیدہ مسائل پر تنقیدی بحث کرنے سے ڈراما میں آرٹ کا عنصر
کم ہو جائے گا لیکن اس دور کے تمثیل نگاروں کا کمال تھا کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں فن کی خوبی
کو ہاتھ [illegible]

اور دلکشی کو قائم رکھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہمعصر اسٹرنڈبرگ، جرمنی کے ہاؤپٹمان اور زوڈرمان، آسٹریا کے شنٹسلر، انگلستان کے گالزوردی کے قلم میں یہ جادو تھا کہ انہوں نے زندگی کی عکسی تصویروں میں بھی نقاشی کا لطف پیدا کر دیا۔

[illegible] کے زولا اور بریو کی تصانیف کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ واقعیت نگاری اور سماجی تنقید کو آرٹ بنا دینا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ زولا کی نخش اور برینگ اور بریو کی [illegible] اور جنسی تمثیلیں نہ صرف آرٹ [illegible] ہیں بلکہ شہوانی جذبات اور خبیث امراض کی بے حجابانہ نمائش سے ذوق سلیم کو اس قدر آزردہ کر دیتی ہیں کہ تنقیدی اور اصلاحی مقاصد میں بھی انکی کامیابی بہت محدود ہے۔ بات یہ ہے کہ سماجی تنقید اور مصلحانہ تبلیغ کو کامیابی کے انتہائی درجے پر پہنچانے کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے یعنی اخلاقی خلوص اور جوش [illegible] اور ظرافت انکی زولا اور بریو میں بہت کمی تھی۔ دوسرے ڈرامانگاروں میں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ چیزیں موجود تھیں مگر اسی حد تک کہ آرٹ کی سبک روی میں خلل نہ پڑے۔ اخلاقی مقاصد کے آگے آرٹ کی پروا نہ کرنا اور اس کے باوجود لوگوں کے قلوب کو تسخیر کر لینا صرف دو شخصوں کے حصے میں آیا جن میں ایک روس کا ناول نویس ٹالسٹائے تھا اور دوسرا انگلستان کا ڈرامانگار برنارڈ شا۔ ٹالسٹائے نے سوز و درد سے اور برنارڈ شا نے طنز و ظرافت سے یورپ کی ادبی دنیا میں قیامت برپا کر دی۔ ان دونوں کے فلسفہ زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ انکے اصلاحی جوش اور خلوص نے آرٹ کی خوشنما زنجیروں کو توڑ کر اور گلا کر اخلاقی تبلیغ کی تلواریں بنائیں جن کی چمک نے آرٹ کے قدردانوں کی نظروں میں چکاچوند ڈال دی۔ ٹالسٹائے کو ڈراما سے سروکار نہیں اس لئے اسکا ذکر ہم نظر انداز کرتے ہیں اور اپنے مضمون کے تیسرے حصے کو برنارڈ شا کی زندگی اور اس کے ڈراما کی نشوونما کے بیان کے لئے وقف کرتے ہیں۔

لندن اور پیرس وغیرہ میں باقر آگاہ کی تصنیفات

رسالہ اُردو جلد ۹ حصہ (۳۴) میں مولانا باقر آگاہ کے متعلق ایک دلچسپ اور پُر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ مگر اس میں زیادہ تر ان کی لائف اور دیوان سے بحث کی گئی ہے۔ دیگر تصانیف کے متعلق پوری صراحت صحت کے ساتھ نہیں ہے۔ چونکہ مصنف مضمون کو ان کی تمام تصنیفات نہیں ملی ہیں اس لئے انکے متعلق فروگذاشتوں کا ہونا ناگزیر ہے

یہاں اس امر کا موقع نہیں ہے کہ اس مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ البتہ یورپ میں ان کی جو کتابیں ملی ہیں انکے لحاظ سے ایک سرسری نظر ان کے تصنیفات پر ڈالی جاتی ہے۔ میرا مقصد باقر آگاہ کی لائف بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ رسالہ اردو میں اس پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند امور کا بیان بطور تمہید ضروری ہے تاکہ ناظرین جامعہ باقر آگاہ کی شخصیت سے واقف ہوجائیں۔

آگاہ کا نام محمد باقر ہے انکے اجداد بیجاپور کے رہنے والے تھے ان کے والد محمد مرتضیٰ ویلور (احاطہ مدراس) آئے اور اسی کو وطن بنالیا آگاہ کی پیدائش ۱۱۵۸ھ میں یہیں ہوئی اس طرح آگاہ ویلوری ہیں مگر اپنی تصنیفات میں ویلور کے ساتھ ساتھ بیجاپور کی نسبت بھی ضرور دی ہے اس سے آگاہ کی وطنی محبت بیجاپور کے ساتھ (جو دکن کا گویا بغداد تھا) بخوبی ثابت ہوتی ہے۔

آگاہ عربی فارسی اور اردو کے جیّد عالم اور بڑے پرگو شاعر تھے عربی اور فارسی میں اشعار کہا کرتے۔ عربی اور فارسی میں آگاہ اور اردو میں باقر تخلص تھا ان کی عربی قابلیت کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے۔ انھوں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی عربی تصنیف "سبحۃ المرجان" پر چار سو اعتراض کئے تھے۔

آگاہ کے علم و فن کی انکے زمانے میں بڑی قدر و منزلت ہوئی مدراس کے نواب محمد علی والا جاہ نے انکی اچھی توقیر کی ۔

آگاہ نے ۷۲ سال کی عمر پائی ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ مدراس میں دفن ہوئے
ان کی تصنیفات عربی فارسی اور اردو ہیں جن کی صحیح تعداد معلوم کرنی دشوار ہے ۔
[illegible] ۳ بتائی جاتی ہیں۔ اس میں سے ۱۶ اُردو ہیں جن کی فہرست ذیل میں دیجاتی ہے۔
(۱) ہشت بہشت (۲) فرائد در عقائد (۳) ریاض الجنان (۴) تحفۂ احباب (۵) محبوب القلوب
(۶) تحفۃ النسا (۷) گلزار عشق عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا (۸) روضۃ السلام (۹) من سمجھن
(۱۰) مثنوی روپ سنگار (۱۱) ہدایت نامہ (۱۲) فرقہ ہائے اسلام (۱۳) معراج نامہ (۱۴) دیوان
[illegible] (۱۵) ریاض السیر (۱۶) رسالہ عقائد ۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اُردو تصنیفات کی تعداد ۱۴ ظاہر کی گئی ہے مگر نمبر ۲ جسے مضمون نگار نے تین کتابوں کا مجموعہ سمجھا ہے اصل میں ایک ہی کتاب ہے۔ اس کے علاوہ نمبر ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و [illegible] اس مضمون میں نہیں ہے ۔

[illegible] سے [illegible] کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں آئندہ صفحات پر ان [illegible] کئے جاتے ہیں ۔

ہشت بہشت " یہ دراصل آٹھ رسالوں کا مجموعہ ہے جس کی تصنیف ۱۱۹۶ھ سے [illegible] ہر رسالہ کا نام علحدہ ہے اور ان میں آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک

[illegible] تصنیف چند خصوصیتیں رکھتی ہے اول تو یہ کہ اس وقت تک دکھنی زبان میں اس قسم کی [illegible] یں تصنیف نہیں ہوئی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی۔ اس سے پہلے ایک کتاب شیدا حیدرآبادی کی تصنیف سے تھی مگر وہ چھوٹے چھوٹے قصوں سے مملو تھی۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی اور فارسی کی معتبر کتابوں [illegible]

حاصل کیا گیا ہے۔ تیسری یہ کہ اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں لکھی گئی تھی عربی اور فارسی سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ کا زیادہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ یہ آٹھوں رسالے آٹھ مختلف بحروں میں ہیں۔ ان رسالوں کے نام اور ان کے مضمون کے متعلق خود مصنف کا کلام ملاحظہ ہو:۔

پہلا اس کے ہے نور کا در اول — من دیپک اُسے لقب ہے اجل
دوسری میں ہیں اسکی سب بشارات — ہر من ہرن نام اس کا خوشدہات
تیسری میں لکھا ہوں اسکا مولود — سیے من یمن نام اس کا مسعود
چوتھی میں زہشت سال اے جان — سرور کی وفات لگ ہے بیان
پنجم میں بیان کیا ہوں خوشدہات — اخلاق و شمائل اوپر جادہ ابتیہ
چھٹی میں خصائص اس کے اکثر — بولاہوں مفصل اے برادر
ہفتم میں معجزات سالار — تفصیل سے لکھا ہوں اے یار
لکھتا ہوں بفضل و رحمت رب — آداب محبت اس کی کچھ اب
ہور اُس کی درود کے فضائل — کرانکوں توں نقش صفحہ اول
ہور اس کی فضائل زیارت — میں جس کی شرف کوں حد و غایت
دکھنی میں کہا ہوں اس لئے میں — تا ہوسے سمجھ عوام گیت میں
تا سر بسر اسیاں ہور عورات — پڑنی ستی اسکی پادین لذات
گرچہ یہ کتب ہیں دکھنی یک یک — اخبار کے ترجمے ہیں بیشک
جو کچھ یہ کتب ہی ہیں مذکور — ہے ترجمہ حدیث اسے سور
اس فن میں جو معتبر کتب ہیں — بلکہ وہ سیر کی نپج اب ہیں
اُن سب کا خلاصہ لیا ہوں — ان نسخوں میں درج اسے کیا ہوں
دیباچے میں ان کتب کی تفصیل — نلہو نکی کروں گا ان کی تفصیل

بھی جیوں آسی ہی نام دل خواہ

ہو اُس سے حیات ہر دل آگاہ

(مخطوطہ برٹش میوزیم نمبرہ ۶۶۷ ورق ۲۳۴ ب)

ہشت کا ایک نسخہ برٹش میوزیم(۱) میں ہے اور ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ(۲)

پیرس کے نسخہ کو یہ خصوصیت حاصل ہو کہ کاتب کے لکھنے کے بعد مصنف نے اس پر نظرثانی کی ہو اور کئی اشعار کا اضافہ، ترمیم اور اصلاح وغیرہ کی ہے۔

اول الذکر کی تاریخ کتابت ۱۴، رجب ۱۲۲۱ھ ہو آخر الذکر کی تاریخ درج نہیں ہو صرف کاتب کا نام اور مقام کتابت تحریر ہے:۔

" از دست عاصی محمد زاہد در باغ نواب والاجاہ "

اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ نسخہ شاہی محل میں لکھا گیا ہو۔ دونوں کتابوں میں چند صفحات کا نثر میں دیباچہ بھی ہو۔ جس میں ان کتابوں کی صراحت کی گئی ہے جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہو۔

یہ کتاب مدراس اور بمبئی میں متعدد مرتبہ طبع ہوئی ہے اور ایک زمانہ دراز تک لوگ اس کے خواہشمند رہے جب بدرالدولہ نے آنحضرت کی سیرت " فوائد بدریہ " اردو نثر میں مرتب فرمائی تو بلحاظ زبان کی تدریجی ترمیم اور اصلاح کے اس کتاب کا رواج نہ رہا۔

بہر حال آگاہ کی یہ تصنیف خاص حیثیت رکھتی ہے جس پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

---

(۱) برٹش میوزیم کا نمبر 6675 + 6 ہو

(۲) کتب خانہ پیرس کا نمبر (872 n. dram &)

(۴) ریاض الجنان ۔ اسکا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر 676505 پر اور ایک نسخہ پیرس میں نمبر ۲۸۹ پر موجود ہے ...

یہ مثنوی ہے جو اہل بیت کے فضائل میں لکھی گئی ہے اس کی تصنیف ۱۲۰۶ھ میں ہوئی ہے اس کے دیباچہ سے کئی ایک امور پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کا کسی قدر انتخاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دیباچہ میں حمد و نعت اور ان کتابوں کی تفصیل کے بعد جن سے اس کو مرتب کیا گیا ہے لکھتے ہیں :-

"... بعضے علما ان مناقب اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں لیکن کوئی کتاب مستقل اس بیان میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی پس تصنیف ہونا اسکا ہندی زبان میں معلوم۔ مگر یہ کہ ولی ایلوری و شیدائے حیدرآباد دکھنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھتے ہیں اُن کا نام روضۃ الشہدا اور روضۃ الاطہار مناقب عترت اخیار کے اُن دونوں میں بہت کم ہیں بلکہ نہیں ہیں واقعات شہادت کے کچھ تفصیل کئے ہیں اور اکثر بیاں دو نو کا غلط اور بے اصل ہے جیسا اتمام چہناعکاستہ کا آنحضرت کی ... سے معلوم ہے ...

... اکثر اہل سیر اس فن کے تساہل و سہل انکاری کہتیں شیوہ اپنا کیا کر کر تواریخ کی لکھنے میں ضبط و تدقیق نہیں کئے بلکہ رطب و یابس جو پائی سو لکھ گئے اس جہت سے ان کی کتابوں میں غلط باتیں اور بے اصل روایتیں بہت پائی جاتی ہیں جیسا حبیب السیر اور روضۃ الصفا اور روضۃ الشہدا بخلاف ثقاۃ حدیث کے کہ تصانیف انکی غایت تحقیق سے موزوں اور نہایت تدقیق سے مشحون ہیں ..."

"... اور بوجھ اے بھائی کہ یہ عاصی بیدروہیں سال سے شعر کے ساتھ الفت اور ارتباط رکھتا ہے اگرچہ شعر کم کہتا تھا اسی واسطے تخلص اپنا مدت تک مقرر نہیں کیا۔

…جب ۱۱۸۱ھ اور ۱۱۸۲ھ میں یہ سات رسائل ہشت بہشت کی منظوم کیا لفظ باقر کا جز
…بجائے تخلص رکھا اس بعد ۱۱۹۳ھ وقت نظم کرنے دیوان عربی کے تخلص اپنا
آگاہ مقرر کیا اس تخلص کو عربی فارسی میں لایا اور اکثر مراثی اور ریختیوں میں بھی
[illegible] تخلص کو اختیار کیا اور تتمہ رسائل ہشت بہشت میں کہ ہیچ … کے منظوم ہوئی
… ہیچ کتاب محبوب القلوب کے در ۱۱۸۶ھ کی منظوم ہوئی تھا ویہاں اس رسالہ میں کہ
ریاض الجنان نام رکھتا ہے تخلص اپنا وہی باقر رکھا ہے کیا واسطے کہ رسائل اول
… جا بجا مشہور ہوئی تھی اگر بعد ہوئی سو رسالوں میں تخلص آگاہ ولاتو دو تخلص
ہوتے اس واسطے وہی تخلص باقی رکھا تا سب مثنویات دکھنی میں ایک تخلص رہے"

اس صراحت سے جن امور پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) مناقب کے متعلق کوئی مستقل کتاب فارسی میں نہیں تھی آگاہ نے اس مضمون کو اردو میں ایک مستقل کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔

(۲) ولی ویلوری اور سید اسد حیدرآبادی نے دو کتابیں شہادت امام حسین میں مرتب کی تھیں مگر وہ صداقت سے دور غلط واقعات پر مبنی تھیں۔

(۳) اس وقت کی جتنی کتابیں سیر وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ بھی اسی طرح غلطیوں سے خالی نہیں تھیں۔

(۴) آگاہ نے پندرہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔

(۵) ۱۱۸۱ھ میں جبکہ ہشت بہشت کے چند رسالے مرتب ہوئے اپنا تخلص باقر رکھا۔

(۶) ۱۱۹۳ھ میں عربی دیوان مرتب ہوا جس میں آگاہ تخلص رکھا گیا۔

(۷) اسی زمانے میں فارسی کلام میں اسی تخلص کو اختیار کیا گیا۔

(۸) آگاہ نے مراثی اور اردو غزلیں بھی کہیں جن میں آگاہ تخلص ہے۔

(۴۲) محبوب القلوب اور ریاض الجنان ۱۲۲۰ھ میں مرتب ہوئے جس میں باقر تخلص ہے

(۳) "محبوب القلوب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۶۵۰۲ پر موجود ہے ایک مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۰۰۰ شعر ہیں۔ اسمیں شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات بیان کئے گئے ہیں ابتدا میں چھ ورق نثر میں دیباچہ بھی درج ہے۔ اس کے سنہ تصنیف کے متعلق رسالہ اردو میں حسب ذیل شرح کی گئی ہے:-

"اس کی تصنیف کا سال خود مخطوطہ سے ۱۲۳۰ھ معلوم ہوتا ہے لیکن ریاض الجنان کے دیباچے میں ۱۱۲۰ھ لکھا ہوا ہے جو درحقیقت ایکہزار ایک سو تائیس ہے اگر یہ آخری تاریخ صحیح ہو اور کاتب کی غلطی سے بجائے ۲ کے ۲ نہ لکھ دیا گیا ہو تو غالباً یہ ۱۱۲۰ھ میں شروع ہوا ہوگا اور دس سال بعد ختم ہوا۔"

صاحب مضمون سے اس میں سہو ہوئی ہے کیونکہ ۱۱۲۰ھ یا ۱۱۳۰ھ کوئی بھی صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس زمانے میں آگاہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے چنانچہ خود اسی مضمون میں انکی پیدائش کو ۱۱۵۸ھ میں لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۰۲ سطرہ) ریاض الجنان کے دیباچے سے صاف ۱۲۲۰ھ ظاہر ہوتا ہے اس کی تصنیف اسی سنہ کو قرار دینا چاہئے علاوہ ازیں مصنف نے ۱۱۸۰ھ سے اپنی تصنیفات آغاز کی ہیں۔ اس لئے ۱۱۲۰ھ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اور ۱۲۳۰ھ میں وہ زندہ نہیں تھے۔

(۴) "تحفۃ احباب" اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے نمبر ۶۵۰۴ پر موجود ہے یہ بھی مثنوی ہے جس میں تقریباً ۳۵۰۰ شعر ہیں۔ اس میں اصحاب کی فضیلت اور مناقب بیان کئے گئے ہیں کتاب میں چھ باب ہیں اور ہر باب میں کئی کئی فصلیں۔

رسالہ اردو والے مضمون میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی گئی برٹش میوزیم والا مخطوطہ ۱۲ محرم ۱۲۳۶ھ کا لکھا ہوا ہے کاتب عبدالواحد ہے اس مثنوی کے ابتدا میں

بھی ایک دیباچہ نثر میں لکھا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے علما، دکنی زبان [illegible] دیکھتے تھے چنانچہ لکھتے ہیں :-

"[illegible] بھائی اکثر ملک سب دکھنی کتاباں ناے واسطے بیان میں ایسی بہت غلط کئے ہیں
[illegible] کو بے اعتبار کر دے اس لئے علما اُن کتابوں طرف التفات نہیں
[illegible] آج تک کوئی کتاب دکنی صحیح و معتبر میری نظر میں آئی نہیں بلکہ بعضے اُن
[illegible] سر تاپا جھوٹ سے بھری ہیں اور بعضوں میں جھوٹ زیادہ ہے اور بعضوں میں
جھوٹ کم ہے روایات موضوع کا سننا اور سنانا اور پڑھنا اور پڑھانا استماع پر
اس بات پر سب علما کا اجماع ہے شکر خدائے تعالیٰ کا کہ میرے تمام رسائل
بہت صحیح و معتبر و نہایت مضبوط و مدلل ہیں کوئی محدث اور صاحب علم کو مقدور
نہیں کہ اس کی کوئی روایت پر حرف رکھ سکے۔"

(۵) "تحفۃ النساء" اس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانہ میں نمبر ۸۰۲ پر موجود ہے۔
یہ بھی مثنوی ہے جس میں ۸۰۰ شعر ہیں اور اُسکی تصنیف ۱۱۸۵ھ میں ہوئی ہے ان دونوں امور کو خود مصنف نے بیان کیا ہے :-

[illegible] سو اس کے جلے ابیات ۔ پڑے ہیں ہر اک میں بہوت برکات
گیارہ سو اوپر تھے پنج و ہشتاد ۔ ہجرت سے بنا ہے تب یہ [illegible]

(س ۱۴۵ ب)

اس کتاب میں اول تو حمد و نعت ہے اس کے بعد اپنے مرشد ابوالحسن کی مدح کرتے ہیں :-

اس ملک منی تھا پیر میرا ۔ ہر کام میں دستگیر میرا
[illegible] ابوالحسن جسکا ۔ اس علی حسین ہوا حسن جس
[illegible] دور کا ہو جنید آیا ۔ الحاد کی حرف کو [illegible] مٹایا

... وصف اسکا ہے ... بیان مدح کوں اسکی کر کوتی آخر

(ص ۲۲۸)

اس مثنوی میں ازواج مطہرات اور دیگر خواتین کی فضیلت بیان کی گئی ہے مثنوی کے مضمون کو خود بیان کر دیا ہے

امت میں نبی کی جو ہیں عورات — افضل ہیں سب عورتاں سوں بات
لکھتا ہوں میں اس کتاب انہیں — احوال ان سب کا اسے ... در
اس شاہ کی دختران کا احوال — اس شاہ کی عورتاں کا احوال
امت میں جو عورتاں تھے کامل — تھا قرب خدا کا ان کو حاصل

(ص ۲۲۸ ب)

سب سے پہلے فاطمہ زہرا کی فضیلت ہے اس کے بعد دیگر صاحبزادیوں پھر ازواج اور اس کے بعد رابعہ بصری وغیرہ دیگر خواتین کا بیان ہے۔

یہ مثنوی مصنف کے ابتدائی زمانے کی تالیف ہے کیونکہ انہوں نے اس قلم کے کام کی ابتدا ۱۰۳۱ھ میں کی ہے اور یہ تصنیف ۱۰۳۵ھ میں ہوئی ہے۔

(۶) "رسالۂ فرقہ ہائے اسلام" یہ بھی پیرس میں موجود ہے نمبر ۸۰۲ اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۳۲۵ ہیں اس میں صرف فرقہ ہائے اسلام کا ذکر نہیں ہے بلکہ عقائد مثلاً اسما صفات رویت حسن و قبح عفو۔ ایمان۔ توبہ فاسق وغیرہ کا بیان بھی ہوا ہے۔

پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

خدا کوں سرا وار حمد و ثنا — کہ ہے گا مبرا ز نقص و فنا

آخر پر لکھتے ہیں:۔

نہ تھا ستان میرے کا یہ تقضا — کہ ہندی زباں کا کرنے اصطفا
وہلے بعض یاروں کا ایا ہوا — سو ہندی زباں یہ رسالہ ہوا

امر کا خیال رہے کہ مصنف نے اکثر جگہ اردو کے بجائے ہندی کا استعمال کیا ہے یہ خیال کرنا چاہئے کہ آج کل کی "ہندی" نہیں بلکہ سوبی ہند میں عام طور حال تک اردو کو ہندی ہی سے موسوم کیا گیا ہے۔ باقر آگاہ کے بعد قاضی بدالدین کی اردو تصنیفات میں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے

(۲) "ہدایت نامہ" یہ بھی پیرس میں نمبر ۴۰۰ پر موجود ہے۔ اس مثنوی کے اشعار تقریباً ۶۰۰ ہیں اور اس میں گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلا شعر :-

کروں آغاز حمد حق سوں اول ۔۔۔ کہ تا نامہ ہو دے یگی مکمل

کتاب کا نام بھی اشعار میں بیان ہوا ہے :-

ہدایت نامہ یو پورا کیا میں ۔۔۔ ہدایت خلق کوں پورا دیا میں

الہی یو ہدایت نامہ میرا ۔۔۔ حقیقت میں سخن یو سب ہو تیرا

(ص ۱۰۴۳)

(۳) "معراج نامہ" پیرس میں نمبر دی ۲۷۸ اشعار کی تعداد ۱۵۷۵ ہے قدیم دکنی شعرا کی مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد ضرور معراج کا عنوان قائم کیا جاتا تھا جس میں آنحضرت کے معراج کے حالات بیان کیے جاتے تھے۔ بعض شاعروں نے معراج کے متعلق علیحدہ مستقل تصنیفیں کی ہیں جن کے منجملہ یہ بھی ایک ہے پہلا شعر حسب ذیل ہے :-

سزا نا خدا کوں سزاوار ہے ۔۔۔ ہر ایک ذرہ اس کا نمودار ہے

خاتمہ :-

کیا ختم یو ذکر معراج کا ۔۔۔ بنام محمد نبی مصطفیٰ

کیا ختم میں نے محمد کا نام ۔۔۔ علیہ الصلوٰۃ وعلیہ السلام

کتاب کے آخر میں کاتب کا نام اور اشعار کے تعداد کی صراحت ہے :-

"جملہ ابیات این کتاب یکہزار پانصد چہل و سہ است از دست عاصی محمد زاہد در باغ نواب والاجاہ"

(۹) "رسالہ عقائد" پیرس کے ۷۷۸ نمبر پر موجود ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً ۶۰۰ ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے عقائد کا ذکر ہے جس کو خود مصنف نے بیان کر دیا ہے :-

گیا میں اس لیے یہ نسخہ منظوم
کہ تا ہر کس کوں ہوئے جلدی سے مفہوم

کیا ہوں میں بیان اس نظم اندر
عقائد اہل سنت کا سراسر

کہا نہیں میں کبھی دکھنی کا اشعار
منجی ہے شعر کہنے سوں بیتا بہ

ولی یو نظم بولیا بضرورت
پڑی تا اس کو ہر امی وعوام

(ص ۲ ۲)

غالباً یہ بھی ابتدائی زمانے کی تصنیف ہے۔ سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔

(۱۰) "مثنوی گلزار عشق (عرف قصہ رضوان شاہ و روح افزا) یہ مصنف کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔ رسالہ اردو والے مضمون میں صراحت اس کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کو تین علحدہ کتابوں سے موسوم کیا گیا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ تینوں نام ایک ہی مثنوی کے ہیں۔

اس کا ایک نسخہ آکسفورڈ کے بوڈلین لائبریری میں موجود ہے۔ کیٹلاگ میں اس کے متعلق حسب ذیل صراحت ہے۔

(۶۶۶۷) ایک مثنوی جو عشقیہ داستان رضوان شاہ و روح افزا ہے مصنف مولوی محمد باقر جنہوں نے اس کو ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں لکھا ہے۔ ابتدا میں ایک دیباچہ ہے گارساں دو تاسی کی فہرست میں یہ شریک ہے اور کسی نے نہیں بیان کیا۔ ورق ۲۰۰ سطر ۱۱ تا ۱۴ سائز ۸ × ۱۲"

کتاب میں سب سے پہلے ۱۴ صفحے کا نثر میں دیباچہ ہے جو اپنے بیان کے لحاظ سے قابل قدر

[illegible] جس کی صراحت آگے آئے گی۔

مثنوی میں اول حمد ہے جس کے ۵۳ شعر ہیں اس کے بعد مناجات میں ۵۴ شعر، پھر نعت میں ۴۹ شعر۔ اس کے بعد معراج کے بیان میں ۹۹ شعر [illegible] منقبت بھی ہے پھر "عرض [illegible]" کا عنوان آتا ہے جس میں ۱۰۲ شعر درج ہیں اس کے بعد محبوب سبحانی کی مدح میں ۱۰۰ شعر۔ امام حسین کی مدح میں ۳۲ شعر سبب تالیف کتاب اور اپنی ستایش میں ۱۹۳ شعر۔ اس کے بعد اصل قصہ کا آغاز ہے جس کے تقریباً ۲۸۹۰ شعر ہیں قصہ کے ختم ہونے کے بعد خاتمہ کا عنوان ہے جس میں ۵۹ شعر ہیں اس طرح کل مثنوی تقریباً ۳۵۹۱ شعر پر ختم ہوئی ہے۔

"یہ مصنف کے آخری زمانے کی تصنیف ہے جو ۱۲۱۲ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور ان کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا ہے۔"

مصنف کٹلاگ کو اس کے سنہ کے متعلق کسی قدر غلط فہمی ہوئی ہے خود مصنف نے صاف طور پر عبارت کی تشریح کر دی ہے چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"الحال کہ تاریخ ہجرت با جاہ و جلال کے یک ہزار دو سو پر گیا رہواں سال ہے قصۂ رضوان شاہ و روح افسزا کا پسند کر کے اُسے نظم کیا۔"

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کا دیباچہ بھی خاص حیثیت رکھتا ہے جس میں پہلے حسب رواج حمد و نعت وغیرہ کے بعد اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ زبان کو خدا نے اپنی قدرت کی بڑی علامت قرار دی ہے اس کے بعد نصرتی کی تصنیفات پر بحث کرتے ہوئے شعرا عادل شاہی وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اُردو کی ابتدا اور اس کی ترقی بتائی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان معنی اور ہرزہ درایاں لایعنی زبان دکھنی پر معترض اور گلشن عشق۔ و علی نامہ کے پڑھنے سے اعتراض کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان انکی درمیان

اسکے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا وہاں کے فضل شاطی. ورتی
شوقی، خوشنود، غواصی، ذوقی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، بہتاب وغیرہم
جیسے بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و مثنویات و قطعات نظم کے
اور داد سخنوری کا دئے لیکن نصرتی ملک الشعرا تنگ نظری سے مبرا ہے۔
جب شاہان ہند اس کشور جنت نظیر کو تسخیر کئے طرز و روزمرہ دکھنی نہج
محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تاآنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو ترجیح
ہونے لگی اور ہندوستان مدت تلک زبان ہندی کہ اُسے برج بھاکا بولتے ہیں
رواج رکھتی تھی اگرچہ لغت سنسکرت اکی اصل اصول اور مخرج نون فروع و اصول
ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب
خاص کو اس کی کھونے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمی
ہوئی جب شمالی ظہوری نظم و نثر فارسی میں بانی طرز جدید کے ہوے ہیں
ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا مبتدا اور استاد ہے بعد اس کے
جو سخن سنجان ہند پرور کئے (۹) بے شبہ اس نہج کو اس سے لے اور اس بعد
اس کو باسلوب خاص مخصوص کر دئے اور اُسے اردو کے بھاکے سے موسوم کئے
اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کے جب شاہجہاں آباد لکھنؤ و اکبرآباد وغیرہ
رواج پایا اور جون چاہی سبھوں کی من بھایا۔

اواخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تلک اس فن میں اکثر مشاہیر شعراء عرصہ میں
آئی اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے ہیں مثل درد مظہر فغاں دردمند
یقین۔ سوزاں۔ ابر۔ آرزو۔ سودا۔ تاباں وغیرہم لیکن ان سبھوں سے کوئی بھی
مثنوی مستعد (؟) بھی نہیں کیا فقط غزلیات و قصائد و قطعات پر اکتفا کیا ہاں
اس عصر میں حسن دہلوی یک مثنوی مختصر لکھا دیانت اس کی میر مصحف پر موقوف

ابتدا اول سے برخلاف شعرائے دکن کے کہ اکثر مثنویات کہے ہیں بالاتفاق غزل بولنا آسان ہے اور مثنوی کا کہنا دشوار و گراں ہے اس سے ملک شعرائے دکن بطور تعریض کہتا ہے ؎

دس بارہ بیتاں کے سلئے شوقی اگر تو کیا ہوا
معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بتاز ؟ کا

اس کے بعد وہ شعرا کے اقسام بتاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں :۔

"اور روشن اسے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعضے فقط شاعر ہیں اور بعضے شاعر کے ساتھ حاشنی عشق و عرفان میں بھی ماہر ہیں شلاً مولنا شاہ ندیم اللہ ندیم تخلص و قاضی محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جان جاناں و خواجہ میر درد شعرائے ہند سے بعد ازیں مخفی نہ رہے تمام ریختہ گویوں میں سودا ... اعتبار نمایاں پایا ہے"

اس بیان کے بعد سودا اور نصرتی سے بحث کی ہے اور انکا مقابلہ کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

" بعضے اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا کھولتے ہیں کہ اس بیچارے کو سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں اور وہ جھلا و احسن تا ملک شعرا نصرتی کو نہیں مانتا اور قدر اس کے سحر حلال کی نہیں جانتے بڑی دستاویز انکی یہ ہے کہ زبان اس کی کج مج ہے۔ یہی دریافت و خوش سخن فہمی و عجب سمجھ آیا نہیں جانتے کہ اتفاق سے شعرائے عرب و عجم و ہند کے معنی جان سخن آبدار اور لباس مستعار ہے ۔ ۔ "

اس کے بعد گلشن عشق سے نصرتی کا کچھ کلام درج کر کے لکھتے ہیں :

"... تعصب کو یک طرف رکھ کر سب کلیات سودا کو بغور ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان سبھوں کو یک داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا انداز

نے اُس کی اور اس کی بو اتمی واقف ہوئے ۔ سودا کو چھوڑ دے جس شاعر عاری
گو سے چاہے خواہ قصائد میں خواہ مثنوی میں اُسے موازنہ میں لاوے بالفعل
بھی مہر و ماہ یکتائی من طرازی عاقل خان رازی کیتس قصہ مہر و مدمالتی کا گلشن
عشق سے مواجہہ کر دیکھیے تا سنی ستن و کمی کے ہات کنگن کو ارسی کیا در کار خود پیدا
ہے ۔ [illegible]
کبھی نصرتی سن [illegible] ملا بعد مدت ہے کے مجکو جہلم
کہا سودا کتیں انصاف سے کہ صدقے کرو مجکو آگاہ کہے"
بیان بالا سے یہ بھی واضح ہوتا ہے آگاہ گلشن عشق کو مہر و ماہ کا ترجمہ نہیں خیال کرتے
یہی رائے میں نے اپنے ایک جداگانہ مضمون میں دی ہے۔ میرے بیان کی آگاہ کے
قول سے تائید ہوتی ہے حالانکہ میں آگاہ کے اس بیان سے اس وقت لاعلم تھا ۔
نصرتی کو سودا سے فوقیت دینے کے بعد وہ سودا کے کمال کے بھی انصاف کیا تھ
معترف ہیں چنانچہ کہتے ہیں:۔

"باوجود ان سب مراتب کے ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و
غزل میں تراشن تراش و صاحب تلاش ہے محاورہ شستہ و صاف میں یگانہ
زمانہ اور شوقی مزاج و رنگینی طبیعت میں کہیں افسانہ پر افسوس کہ بجو ہائے
رکیک سے آشنا تھا اور از دین تم ہمکیں سے بیگانہ تھا"

اس کی صراحت کے بعد وہ اس امر کو بیان کرنے میں کہ گلشن عشق اور علی نامہ کو
دیکھکر کسی مثنوی کے لکھنے کا شوق ہوا اور اس مثنوی کی ابتدا کی مگر چہ سو اشعار کے بعد
دیگر تصنیفات میں مشغول ہو گئے ۔ اس کے بعد اپنی کتابوں کی تفصیل دی ہے جن کا ذکر صفحات
بالا میں ہو چکا ہے ۔ اس دیباچہ میں بھی اپنے تخلص کی صراحت کی ہے ان امور کے بعد بتایا ہے
کہ اس مثنوی کو دکھنی زبان کے بجائے شمالی ہند کی اردو میں لکھا گیا ہے اور پھر اس کی وجہ بتائی

ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

ابیات ان نسخوں کے تخمیناً چوبیس ہزار ہیں اس نے تکمیل قصہ عشق کی نہیں ہوئی الحال کہ تاریخ ہجرت با ماہ وجلال کے یکہزار دو سو گیارہواں سال ہے قصہ مذکور [illegible] افزا کا پسند کر کر اُسے نظم کیا جب زبان قدیم دکنی اس سبب سے کہ آگے مرقوم ہوا اس عصر میں رائج نہیں ہے اُسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف [illegible] شستہ کو قریب روزمرہ اردو کی ہے اختیار کیا صرف اس بہا کے میں کہنے سے

دو چیز مانع ہوئے اول یہ کہ تاثیر وطن یعنی دکن اس میں باقی ہے کیا واسطے کہ اجداد پدری ومادری اس عاصی کے اور سب قوم اس کی بیجاپوری ہیں دوسرے یہ کہ بعضی اوضاع اس محاورہ کے میرے دل میں بھاتے نہیں ازاں جملہ یہ کہ تذکیر و تانیث فعل نزدیک اہل دکن کے تابع فاعل ہو اگر یہ مذکر ہے تو وہ بھی مذکر ہے اور اگر مونث ہو تو مونث یہ قاعدہ موافق قاعدہ عربی کے ہو کہ سید لسنہ ہے اور قیاس صحیح بھی اس کی تائید کرتا ہے برخلاف محاورہ اردو کے کہ اس میں نسبت فعل کی مفعول کی طرف ہے مذکر کو مونث اور مونث کو مذکر کرتے ہیں ۔

اس وضاحت سے امید ہے کہ دیباچہ گلزار کی حقیقت ظاہر ہو جائے۔ اب میں اصل مثنوی کی جانب متوجہ ہوتا ہوں ۔

قبل ازیں اس کی صراحت ہو چکی ہے کہ مثنوی میں عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور اس کے تحت بیان ہوا ہے۔ مگر عنوانات بھی گلشن عشق کی تقلید میں شعر میں لکھے گئے ہیں مثلاً مناجات کا عنوان :۔

غنچہ دل کی عرض حیرانی   در حضور نسیم رحمانی

معراج کا عنوان ہے :۔

ذکر معراج صاحب لولاک   پائیں جس کے سیر کی تئیں افلاک

شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کا عنوان ہے۔

وصف محبوب بارگاہ قدم ۔ سرافراز رہے جس کا قدم

اپنی تعریف کا عنوان ہے

فخریہ کا ہے اس میں کچھ انداز ۔ اور تصنیف کے سبب کا راز

اس میں کوئی شک نہیں شعرا خود ستائش میں حد سے بڑھ جاتے ہیں مگر پھر بھی ان سے ایک حد تک انکے کلام پر روشنی پڑتی ہے۔ آگاہ اول اپنے عربی نظم ونثر کا فخر اس طرح کرتے ہیں:۔

میری نظم دلکش کو وہ فیض ہے ۔ کہ اُس سے ہوا نام طائی کا طے
ابوطیب اس خوف وہیبت سے تھی ۔ کیا تو بہ لاف نبوت سستی
میری نثر میں ہولی صابی صبی ۔ نظر آوے وہاں ابن عتبی غنی
گر انشا کا بانی ہے عبدالحمید ۔ ولے میں ہوں خاتم بوجہ سدید
اگر قاضی مصر ہوتا یہاں ۔ یہ دعویٰ او پر حکم کرتا عیاں
بھیجے گر انشا میری تا رشید ۔ مقامات کی بھیج دیتا رسید
اگر ابن عباد ہووے حکم ۔ نہ سمجھے مجھے بو محمد سے کم

اس کے بعد انہوں نے اپنی فارسی نظم اور اس کے جملہ اقسام میں اپنی مہارت کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

ہر جیسا عرب میں مجھے دار وگیر ۔ ہوں ویسا ہی ملک عجم کا امیر
سنے شعر کا میری گر یک نوا ۔ تو کہتا اوٹھے رودکی مرحبا
کہو گر قصائد تو افضل سے کہے ۔ کہ سلمان و مسعود عرفی رہے
ثنائی کرے یوں ثنا گستری ۔ ہوا اس بد [illegible]
غزل میں اگر دیوں رقت کا داد ۔ تو حافظ پڑھے آیت ان یکاد

[illegible] معنی میں حسن و تلاش — حسن اور خسرو کہیں شاد باش
کہوں مثنوی گر تو ہے دل گواہ — نظامی و سعدی کہیں واہ واہ
[illegible] کہوں گر معارف کہیں خاص و عام — ہوا پھر کے گردش میں جامی کا جام
کروں نظم اگر قطعہ ہائے متین — پڑی رشک میں جان ابن یمین
کہوں گر رباعی تو کھا پیچ و تاب — سحابی کی آنکھیں ہوں مثل سحاب
بہ فرد و بہ تسمیط و ترجیع بند — میری فکر ہے مستزاد و بلند
[illegible] چشمہ صاف ہے — عیاں جس میں اوصاف و صاف ہے
عبارت ہے میری وہ رنگیں بہار — کہ جان ریاض اس سے ہے خار خار

اپنے دکھنی اور اردو شاعری پر فخریہ کہتے ہیں :-

ہو دکھنی میں تجکو بہا ... تی — کہ النصر منکم کہے نصرتی
گر اردو کی بھاکے میں کھولوں زباں — تو سودا کا سب سود ہو وے زیاں

وہ اپنے علم و فن کا ذکر کرتے ہوئے فلسفہ سے نا واقف ہونے کا صاف طور سے اظہار کرتے ہیں مثلاً -

غرض در علوم فروع و اصول — خدا کی عنایت سے ہوں باحصول
نہیں فلسفہ کا مجھے کچھ بھی پاس — وگرنہ وہ کیا چیز ہے میرے پاس

آگاہ اگرچہ مدراس کی ریاست میں صاحب عزت اور مرتبہ تھے مگر معلوم ہوتا ہے عام طور سے لوگ علم کے قدر دان نہیں تھے چنانچہ آگاہ نے اس کا گلہ کرتے ہوئے زمانے کی حالت [illegible]

یہ سب کچھ ہے لیکن کروں کیا علاج — [illegible] بعد میں ہے ہنر کا رواج
[illegible] کے بعد لکھتے ہیں :-
ہے اب ہزل اور مسخرے کو قبول — ہنر ہے پھر اور فضیلت فضول

تفاخر میں ازدال ہیں جابجا — ندامت میں اشراف ہیں مبتلا
جہاں لگ جو نوع مسلمان ہیں — سو تکلیف و محنت سے حیران ہیں
سب ہی ہات سو غم کے پامال ہیں — اراذل جوان میں ہیں پامال ہیں
پہ اہل نجابت او پر قہر ہے — حیات انکی تلخی سو جوں زہر ہے
کرے کوئی اس وقت کیا فکر شعر — کہ بدتر ہے دشنام سے ذکر شعر
کرے کوئی کیوں عزم تصنیف کا — ہو کس طرح سے شوق تالیف کا

آگاہ نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی تصنیف پر اعتراض کئے تھے جس سو خیال ہوتا ہے دونوں میں صفائی نہ ہوگی مگر آگاہ اپنے دوستوں کے ذکر میں نہایت خلوص کے ساتھ انکا ذکر کرتے ہیں۔

جیسا رازدان خفی و جلی — ندیم سخن میر [illegible]
سیادت کی میزان کا حرف صحیح — نجابت کے انشا کا لفظ فصیح
زہی سرو موزوں باغ سخن — حسینی نسب بلگرامی وطن
ہو اہل سخن سے اسے اتحاد — میرے سات الفت ہو اسکی زیاد
دگر دوست میرا ہے عبد السلام — مروت میں کامل وفا میں تمام

اصل قصہ فارسی زبان میں ہے اس کو آگاہ سے بہت پہلے [illegible] میں فائز نے دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے۔ آگاہ اس سے واقف ہیں اور اس دکھنی قصہ کو مکمل تصور نہیں کرتے لکھے ہیں اسے فارسی نثر ہیں۔

کیا نظم دکھنی میں فائز اسے — یہ مجمل وہ نہیں رائج اس عصر میں
نہیں شعر کا برگ و ساز اس میں کچھ — سخن میں نہ تھی راہ ہرگز اسے
مضامین ہیں اس کے پر بے اثر — نہ مضموں تلاشی کا راز اس میں کچھ
ہیں الفاظ سب اس کے زیر و زبر

جو تھا عقل اور نقل کے درمیاں
کیا ہوں بیاں میں انصاف سو اسکو صاف

جہاں اسمیں اعجاز سے تھا عمل
گیا اس کو انتخاب سو میں بدل

جہاں عشق کے جوش کا ہے مکاں
کیا ہوں وہاں اُسکا پورا بیاں

نکات اسمیں عرفاں کے لایا ہوں میں
مجازی میں اس کو چھپایا ہوں میں

کیا علم میں انکا گلزار عشق
کہ کل جوش میں اس کا اسرار عشق

اصل قصہ کا لب لباب اس طرح ہے :-

چین کے بادشاہ کا لڑکا رضوان شاہ علم و ہنر میں سر آمد روزگار تھا باپ کے انتقال پر سلطنت کا مالک بنا ایک دن شکار کو روانہ ہوا - اور ہرن کا تعاقب کیا مگر ہرن ایک چشمہ میں غائب ہوگیا - رضوان شاہ نے اس ہرن پر فریفتہ ہو کر خود غوطہ لگانا چاہا مگر ارکان سلطنت مانع ہوئے - نجومی اور رمال اسکا سراغ لگانے کا وعدہ کرکے بادشاہ کو واپس لائے - رضوان شاہ ہرن کے عشق سے از خود رفتہ ہوگیا آخر کار اس چشمہ پر ایک محل تعمیر کرکے رہنے لگا روز محل روشنی سے جگمگا جاتا اور عطر و گلاب کی خوشبو سے معطر ہوا کرتا ایک رات روح افزا پری اس چشمہ سے باہر آئی دونوں کا وصال ہوا مگر جدائی ہوگئی اور ایک زمانے تک فراق میں بسر ہوئی ، مصیبتوں میں گرفتار رہے اور پھر ایک مدت کے بعد دونوں کی شادی ہوئی اور اس طرح بامراد چین کو واپس ہوئے -

اب مختلف مقامات سے مثنوی کا انتخاب[1] پیش کیا جاتا ہے - قصہ کی ابتدا :-

محبت کے گلزار کا باغباں
جو تھا اس کے اخبار سو گل فشاں

ہلا اپنے خامہ کے شاخ نول
جیوایا یہ قصہ کا اوتار پھل

کہ تھا ملک میں چین کے ایک شاہ
تھا حکم اُسکا ماہی سے لا تا باہ

---

(۱) انتخاب میں ہم نے کوئی خاص بات مد نظر نہیں رکھی ہے بلکہ یوں ہی کچھ نمونہ دیا گیا ہے -

رضوان شاہ کی تعلیم و تربیت کا حال :-

بلا بھیج ہر علم کے اوستاد — کئے اُس کی تعلیم کو دل نہاد
کئے اُس کو جوں جاری وہ تربیت — ہوئے پوری تا آ سکے تئیں معرفت
طبیعی الٰہی میں فاضل ہوا — ریاضی کے ہر فن میں کامل ہوا
ہیأت و ہندسہ میں خبیر — حساب و مساحت میں بے نظیر
ہوا موسیقی میں وہ یوں اوستاد — کہ زہرہ کرے اس سے اس فن کو یاد

رضوان شاہ کی بے قراری :-

ہوا رنج ضائع میرا سال کا — عجب ہی کہا را مرے حال کا
ہوا سینہ حسرت سے ناشاد ہے — گنہ لازم و رنج برباد ہے
نہ اب جان نہ جاناں میری بات میں — مجھے بخت ڈالے ہیں کس گھات میں
کہاں سے گیا کھیلنے میں شکار — کہاں سے وہ ہرنی کئے وہاں کنار
میں کیا کیا سہانگ و ناموس کھو — برس ایک اک شکل آداس ہو

کشتی میں سوار ہو کر تلاش میں روانہ ہوتا :-

بہرحال دو تو ہو کشتی سوار — چلے تن بہ تقدیر بے اختیار
اوپر انکے تھا نیلگوں آسماں — تلے انکے دریائے دوراز گراں
ہو دونوں بھی جیسے سے بے ڈول — گئے یک قلم اپنی ہستی کو بھول
کئے قطع اس طرح کئی روز جب — سمایا کھڑا ایک اژدر عجب
نمایاں ہوئی رات کو یک نہنگ — اڑے کوہ کا جس کے ہیبت سے رنگ

رضوان شاہ روح کو نامہ تحریر کرتا ہے :-

میں یک جزی کالعدم اے صنم — سہا ہوں تیرے غم سے کیا کیا ستم

کہ تیرا نگہبان ہو نت ذوالجلال — [illegible] مجکو دائم بلا سے سنبھال
[illegible]دے پہنچنے تجھے کچھ بھی غم — مسلم رکھے دل تیرا از الم
تیرے تن پہ داں جو جو آزار ہے — میری جان پر اُسکا سب بار ہے
پڑی جیسے پاؤں میں بیڑی تجھے — میرا دم ہوا پاؤں بیڑی مجھے
رگ رگ ہوئی میری زنجیر اب — کروں کیا میں اس غم کی تدبیر اب

[illegible] کے متعلق دیو سے اظہار واقعہ :-

محبت میں کیا کیا مصیبت سہا — عجب ہے کہ اب تک وہ جیتا رہا
اگرچہ خمیر اُسکا ہے گا ز خاک — ولے آتشی سے ہوا جل کے راکھ
تیری شاہزادی کہ ہے شہ پری — اوسے داغ سے غم کے بریاں کری
کبھو وحش صحرا کی فوجوں میں پھر — کبھو جوش دریا کی موجوں میں پھر
بہر حال پہنچا ہے اب وہ یہاں — ہلاکی سے مجکو دیا ہے اماں
تو جو ہو سکے تجھ سے تدبیر کر — اعانت میں اُس کی نہ تقصیر کر
[illegible] اول خبر اس سگ محبوب کی — پس فکر کر اس کے مطلوب کی

رضوان شاہ کامیاب ہو کر وطن کو واپس ہوتا ہے :-

خبر شہر میں یوں پہنچی ہے تب — نبی بیگ کے رضوان آیا ہے اب
یہ مژدہ سنے جب صغار و کبار — چلے اب ہیں سب دوڑ دریا کنار

بصد شان و شوکت کے انکو لئے — تھے چھوٹے بڑے جو محل میں ملے

خاتمہ کتاب میں کہتے ہیں :-

اگر دیکھے اس نظم کو طمطراق — تپ دق سے سودا کو ہو احتراق
بجز نصرتی ساتھ ہے گفتگو — اُسے کیا ہے طاقت کہ ہو رو برو

اگر چاہو سے چالیس میں یہ تو ارمن ملک اس کو اپنا کرے من و من
جو دل عشق کی شمع کا ہے لگن یہ نسخے کو اپنا کرے من لگن
جو ہو شوق شغل اور شور عزائم نشاطی ہو اس پھول کا وہ مدام
فکر تا ہوں ہر گز مباہات میں کہاں یہ ریاست ہو شبلا س بات میں
اگر شعر کے فن میں ساحر ہے تو وہی عشق اور عرفاں میں ماہر ہو تو
یہی ہے آلکا بھید میں تجکو راہ کبت اور دوہرے میں ہو دستگاہ
جو باور کرے گا تو یہ حرف صاف وگرنہ کہیگا ہے لاف و گزاف
تھے جب یکہزار اور لوکم دو سو بنا اسکا دیباچہ اے گرم رو
گزر گئے ہیں جب اسپرز میں سال ہوا مدکامل یہ دیباچہ لال
کیا ایک بیتوں کو جب میں عدد ہوے سہ ہزار اور پانسو نو و
محمی محبوب سبحاں کے اوپر سدا
محب جس کے ہیگے تمام اصفیا

اگرچہ ان اشعار سے سنہ تصنیف ۱۲۰۱ھ ہوتا ہے ممکن ہو مثنوی کا اختتام اس سنہ میں نہ ہوا ہو کیونکہ دیباچہ جو نثر میں لکھا گیا۔ اسمیں صراحت سے ۱۲۱۱ھ کا ذکر ہے۔

آگاہ کی تصنیفات آجکل کے نقطۂ نظر سے غور سے کرنا چاہئے ڈیڑھ سو سال پیشتر کا ماحول آج کل کے ماحول کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ آگاہ نے جس زمانے میں اپنی تصنیفات شروع کیں اسوقت ہندوستان میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی کلایو اور وارن ہیسٹنگز کا دور دورہ تھا مغلیہ خاندان پر زوال آچکا تھا اور اس کا چراغ گل ہو رہا تھا اہل قلم دنیا سے گزر رہے تھے اور انکی جگہ پر کرنے والا نظر نہ آتا تھا۔ سلطنت کی زبان فارسی باقی نہ رہی تھی اس لئے اس کے جاننے والوں کا کال ہو رہا تھا۔ ملک کی عام زبان بھی فارسی تھی اس کے بجائے عام طور سے اردو کا رواج ہو رہا تھا مگر تعلیم اردو میں علم و فن کا ذخیرہ نہ تھا بلکہ نایاب تھا۔ شمالی میں صرف غزل نویسی کا زور

...یوں کا رواج تھا مگر اس میں بھی علمی مواد بہت کم تھا۔
...یان فرنگ ہنوز اردو کی سرپرستی کی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے نہ تو کلکتہ کے
فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات شائع ہوئی تھیں اور شاہ عبدالقادر نے قرآن کی تفسیر قلمبند کی تھی۔
...تعلیم کی کمی تھی خصوصاً عورتوں کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند تھا اور یہ ناممکن تھا کہ فارسی
...اور ی زبان نہ رہی تھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اس نقص کے باعث سوسائٹی کو سخت
نقصان پہنچ رہا تھا۔ اور حالت   سے بدتر ہوتی جا رہی تھی

اس نقص کو معلوم کرنے والا۔ اس مرض کو دریافت کرنے والا۔ اس کے علاج پر کمر ہمت
باندھنے والا۔ اور اپنی تصنیفات سے اسکا علاج کرنے والا آگاہ اور صرف آگاہ ہے۔

آگاہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کو ضروری تصور کیا اور انکے لئے خاص کتابیں لکھیں۔ آگاہ نے اپنی تصنیفات میں صاف طور سے اس امر کی صراحت کی ہے کہ انکا مقصد خاص طور سے صنف لطیف کی بہبودی ہے۔ دیباچہ ہشت بہشت میں لکھتے ہیں:۔

"بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی پڑھ نہیں سکتے ہیں ان سے فائدہ پاویں لیکن اکثر عورتاں اور تمام ایسے فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عاصی مطلب تسموں کا بہت اختصار کے ساتھ لے کر دکھنی رسالوں میں بولا ہے"

اسی کتاب میں بیان کرتے ہیں:۔

"دکھنی میں کہا ہوں اس لئے میں — تا ہووے فیض عوام کے تیں
تا سمر لسرامیاں مور عورات — پڑھے ستی اُسکی پاویں لذات"

رسالہ عقائد میں لکھتے ہیں:۔

دکھنی یو نظم ہو لیا بالضرورت — پڑھے تا اُسکو ہر امی وعورت

[illegible]

غرضکہ آگاہ کا سب سے پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان میں سیر فقہ عقائد پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور انکو خاص طور سے عورتوں کی تعلیم کے لئے مرتب کیا ۔

علاوہ آگاہ کے زمانے میں مبالغہ اور دروغ گوئی کلام کا خاص امتیاز تھا اور جو کتابیں واقعہ کربلا وغیرہ پر لکھی گئی تھیں وہ صداقت سے دور تھیں اس کے برخلاف آگاہ نے دروغ گوئی اور مبالغہ سے پرہیز کیا اور پھر عام طور سے اس وقت کی عام فہم اور سلیس زبان میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا ۔

آگاہ نے آنحضرت کی لائف میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ آپ کے بہترین اخلاق اور پاکیزہ سیرت کو صداقت کے ساتھ پیش کیا جائے اور بعض بعد کے مصنفین کی طرح معرکہ آرائی اور جنگ کو پیش نہیں کیا ۔ آگاہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ آنحضرت کی مبارک زندگی میں اخلاق اور عادات ہی امت کے لیے چراغ ہدایت ہیں اور ان کی پیروی صراط مستقیم پر گامزن کرا سکتی ہے ۔

آگاہ آج دنیا میں موجود نہیں ہے اس کی تصنیفات ہندوستان سے معدوم ہو چکی ہیں مگر جب تک زبان اردو قائم ہے اس کے محسنوں کی پہلی صف میں آگاہ کو جگہ دی جائیگی اور اس کے کارنامے گو پوشیدہ ہیں مگر فراموش نہیں ہو سکتے ۔

ادبیات ایران کی ترقی میں

سلطان محمود غزنوی کا حصہ

(بسلسلہ گذشتہ)

ایک یہاں رئیس نے بوڑھے بوڑھے پراتم جمع کئے اور پرانی روایتوں کی مدد سے ان منتشر اجزا کو ترتیب دیکر ایک مکمل کتاب تیار کرائی مولانا شبلی نے اس کی تردید میں متعدد دلائل سے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ درحقیقت شاہنامہ کا ماخذ وہی عربی تراجم ہیں۔

اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہنامہ ایک تاریخی نظم ہے اور فردوسی کا ان داستانوں کے نظم کرنیکا مقصد بھی یہی تھا کہ ایران کی قدیم تاریخ کے منتشر اوراق یکجا ہوجائیں اور ایرانیوں کو بھی عربوں کے مقابلہ میں اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرنیکا موقع ملے لیکن ان قصوں میں اس قدر تخیل آرائی اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور ایسے دور از کار افسانے اس میں درج ہیں کہ مہابھارت کے قصے بھی انکے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کی تاریخی وقعت واہمیت بالکل نظروں سے گر جاتی ہے لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ایران کی تاریخ کا جوکچھ سرمایہ ہے وہ یہی ہے اس سے زیادہ صحیح تاریخ مل بھی نہیں سکتی۔ سرجان مالکم تاریخ ایران میں لکھتے ہیں :-

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ وخیالات شاعری بسیار دارد لکن تقریباً صحیح اخبار سے که در تاریخ قدیم ایران و توران در ملک آسیا یافت می شود وراں مندرج است"

ایک بڑی وجہ اس کی بے اعتباری کی یہ تبلائی جاتی ہے کہ اس میں فرضی افسانے اور دور از کار قصے شامل ہیں۔ لیکن فردوسی نے جن کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے وہ ابتدائی عہد کی لکھی ہوئی ہیں اور آپ ہر قوم کے ابتدائی عہد کی تاریخوں میں اسی قسم کے وہمی دنیاوی افسانے پائیں گے

علاوہ بریں فردوسی نے جن ماخذوں کی مدد سے اپنی کتاب تیار کی جو ان میں یہ قصے اسی طرح درج تھے فردوسی نے ذمہ سمجھکر ان قصوں کو جوں کا توں نقل کر دیا۔

مستشرقین نے زمانہ ماقبل اسلام کی کتابیں بڑی کاوش کے بعد ڈھونڈھ کر نکالی ہیں ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکی ہیں۔ شائع شدہ کتابوں میں کچھ، شاہان عجم کی تاریخ سے متعلق بھی ہیں غالباً فردوسی کا ماخذ بھی یہی کتابیں تھیں۔ ان تاریخوں اور فردوسی کے بیان میں مطلق فرق نہیں ہے کارنامگ اردشیر جو کچھ عرصہ قبل اسلام کی تاریخ ہے اور پہلوی زبان میں جرمن ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے مولانا شبلی نے اس کے متعلق پروفیسر براون کا حسب ذیل بیان نقل کیا ہے۔

"اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے بڑی دیانتداری برتی ہے اور نظم میں اس کی دقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے اس سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے"(۱)

غرضکہ مستشرقین نے اس امر کا پورے طور پر اعتراف کیا ہے کہ فردوسی نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدیم ایرانی تاریخوں سے حرف بحرف مطابق ہے خود فردوسی کو اپنی ذمہ داری کا اس قدر خیال ہے کہ وہ ماخذ کا بیان کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے(۲)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہنامہ قدیم ایران کا مرقع ہے۔ وہ صرف ایک رزمیہ مثنوی ہی نہیں ہے بلکہ آپ اس سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا بھی بخوبی پتہ لگا سکتے ہیں مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

"شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آجاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامے

---

(۱) شعرالعجم حصہ اول (۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شعرالعجم حصہ چہارم

کی نمونے اس زمانے کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے۔

"بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا۔ امرا کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے عرض و معروض [illegible] آداب تھے۔ انعام و اکرام کا کیا طریقہ تھا بادشاہ اور امرا کا درباری لباس کیا ہوتا تھا فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ نامہ و پیام کا کیا انداز تھا۔ مجرموں کو کیونکر سزائیں دی جاتی تھیں بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کی جاتی تھی وغیرہ وغیرہ"

"شادیوں کے کیا مراسم تھے۔ جہیز میں کیا دیا جاتا تھا۔ عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں دولہا دلہن کا کیا کیا لباس ہوتا تھا۔ پیش خدمت غلام اور لونڈیوں کی وضع اور لباس کیا تھا"

"خط و کتابت کا کیا طریقہ تھا۔ کس چیز سے ابتدا کرتے تھے۔ خاتمہ کی کیا عبارت ہوتی تھی۔ خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے۔ ان کو کیونکر بند کرتے تھے۔ کس چیز کی مہر لگاتے تھے"

"مالگزاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا۔ زمینوں کی کیا تقسیم تھی مالگزاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں ٹیکس کیا کیا تھے کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے"(۱)

مولانا نے اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں لیکن مضمون اس قدر تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

شاعری کی حیثیت سے بھی شاہنامہ کا جو مرتبہ ہے اس پر حرف رکھنے کی گنجائش نہیں، مولانا نے شعرالعجم کے پہلے اور چوتھے حصے میں فردوسی کی خصوصیات شاعری پر مفصل بحث کی ہے اس کے تذکرہ میں انہوں نے فردوسی اور نظامی کا موازنہ بھی کیا ہے اور اس میں اگرچہ انہوں نے

---

(۱) شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۱۴۶

نظامی کو اکثر مقامات پر ترجیح دی ہے لیکن آخر میں انہیں لکھنا پڑا ہے کہ

"ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہے اور نظامی نظامی"(۱)

عنصری

محمود کے دربار کا یہی نامور شاعر ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود کو بقائے دوام اسی کی وجہ سے حاصل ہوئی دولت شاہ اس کے متعلق لکھتا ہے۔

"مناقب وبزرگواری او اظہر من الشمس است و سرآمد شعرائے روزگار سلطان محمود شاہ بودہ و اوراہ ومناقب شاعری فضائل است بعضے اورا حکیم نوشتہ اند"(۲)

حسن بن احمد نام ابوالقاسم کنیت اور عنصری تخلص ہے بلخ اصلی وطن ہے ابتدا میں مروجہ علوم وفنون حاصل کئے لیکن شاعری کا ذوق سب پر غالب آگیا۔ اس نے اسی فن کو اپنے لئے منتخب کیا اور اس قدر ترقی کی کہ سلطان محمود کی ندیمی کا منصب ملا۔

"اورا در مجلس سلطان منصب ندیمی با شاعری ضم بودہ وپیوستہ"

سلطان محمود کے دربار میں چار سو شاعر تھے اور عنصری کی حیثیت ان سب سے بلند تر تھی وہ گویا انکا افسر اور استاد تھا(۳) محمود نے اسے ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا تھا اور تمام شعرا کو حکم تھا کہ پہلے اپنا کلام اصلاح کی غرض سے عنصری کو دکھائیں بعد کو بارگاہ سلطانی میں پیش کریں۔ اس کے انہیں اعلیٰ مناصب کی وجہ سے اکثر بڑے بڑے شعرا نے اسکی شان میں قصیدے لکھے ہیں۔ وہ خود بھی شاعروں کا قدردان تھا اور ہر طریقہ سے انکی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ دولت وثروت کا

---

(۱) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۳۰۶

(۲) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۴

(۳) " " "

یہ حال تھا کہ چار سو زریں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے۔ اس کی شاعری کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ درباری شعرا کا افسر تھا اور دیگر شعرا کے قصائد سلطان کی خدمت میں پیش ہونے سے پیشتر اس کو دکھائے جاتے تھے۔ اس کے دیوان میں تیس ہزار اشعار تھے۔ دولت شاہ لکھتا ہے:

"دیوان استاد عنصری قریب سی ہزار بیت است مجموع آں اشعار مصنوع و معارف توحید و مثنوی و مقطعات"[1]

مگر اب صرف تین ہزار شعر باقی ہیں اس وقت شعرا کی طبائع کا رجحان زیادہ تر قصائد کی جانب تھا لیکن جیسا کہ مندرجہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے اس کی شاعری صرف قصائد تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں قطعات و مثنویاں وغیرہ سبھی شامل تھیں اس نے متعدد مثنویاں لکھی تھیں جو اب ناپید ہیں۔ بدیہہ گوئی شاعری کا لازمی جزو سمجھا جاتا تھا شاہی درباروں میں درخور حاصل کرنے کے لئے بدیہہ گوئی میں کمال پیدا کرنا ناگزیر تھا۔ عنصری اس وصف میں سب سے آگے تھا۔ مولنا شبلی نے عنصری کی بدیہہ گوئی کے متعدد واقعات لکھے ہیں[2] اس کی طبیعت

---

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۷

(۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۶۲ نظامی عروضی نے بھی عنصری کی بدیہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے یہ محمود و ایاز کے متعلق ہے وہ لکھتا ہے ایک رات محمود نے شراب بہت پی لی اسی حالت بدمستی میں ایاز کی طرف نگاہ اٹھائی اس کی پیچ در پیچ زلفیں دیکھکر بے قرار ہو گیا اور والہانہ اس کی طرف بڑھا لیکن یک بیک اس کی حالت سنبھل گئی اور تقوے کا جوش بدمستی پر غالب آگیا۔ فوراً قینچی ایاز کی طرف بڑھائی اور زلفیں کاٹنے کا حکم دیا۔ اسی حالت میں خوابگاہ کو چلا گیا صبح کو اٹھا تو ایاز کی یہ حالت دیکھکر بہت متاثر ہوا اپنے کئے پر نادم و پشیمان تھا اور بے قراری میں اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ درباریوں میں کسی کی ہمت نہ تھی کہ دریافت کرتا آخر حاجب علی قریب کے حکم سے عنصری اس کی خدمت میں حاضر

میلان زیادہ تر قصیدہ گوئی کی جانب تھا قصیدہ میں اس نے نت نئی طرز بیان پیدا کی ہے۔ ان قصائد میں اس نے اپنا زور صرف ممدوح کی مبالغہ آمیز تعریفوں ہی پر صرف نہیں کیا ہے بلکہ اکثر قصیدوں میں سلطان کی لڑائیوں کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ایک قصیدہ میں شروع سے آخر تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے ایک دوسرا قصیدہ سوال و جواب سے شروع کیا ہے اور آخر تک اسے نباہا ہے (۱)

فرخی

علی نام (۲) ابوالحسن کنیت فرخی تخلص سیستان وطن (تذکرۃ الشعرا میں ترمذی لکھا ہے) باپ کا نام جولوغ یا قلوع، نہایت نیک سلیم الطبع اور ذہین تھا۔ شاعری میں خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا تھا۔ سیستان کے ایک دہقان کا ملازم تھا۔ دو سو کیل

ہوا سلطان نے کہا میں تیرے ہی انتظار میں تھا تجھے معلوم ہے کہ کیا واقعہ ہو گیا ہے کچھ ایسے شعر کہہ جو مناسب حال ہوں عنصری نے برجستہ کہا

ای عیب سر زلف بت از کاستن است　　چہ جای بغم نشستن و خاستن است

جای طرب و نشاط و می خواستن است　　کاراستن سرو ز پیراستن است

سلطان یہ اشعار سنکر بے انتہا خوش ہوا اور حکم دیا کہ تین مرتبہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ (چہار مقالہ صفحہ ۳۵) یہ واقعہ شعر العجم میں بھی کم و بیش اسی طرح مذکور ہے لیکن مولانا نے چہار مقالہ کا حوالہ دیکر لکھا ہے کہ اس میں بجائے منہ کے دامن ہے لیکن (مولانا کو غالباً کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ) جو نسخہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس میں بجائے "دامان کے" "دہان" ہی لکھا ہے۔

(۱) تفصیل کے لئے شعر العجم حصہ اول تذکرہ دولت شاہ سمرقندی صفحہ ۴۷ و ۴۸ لباب الالباب صفحہ ۲۹ و ۳۰، ۳۱، ۳۲

(۲) فرخی کے ابتدائی حالات لکھتے وقت ہم نے چہار مقالہ اور شعر العجم دونوں کو پیش نظر رکھا ہے مولانا شبلی نے بھی ابتدائی حالات تمامتر چہار مقالہ سے اخذ کئے ہیں۔

اور سو درہم سالانہ معاوضہ مقرر تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ایک امیر عورت سے شادی کی جس کی
[illegible] خرچ میں زیادتی ہوئی اور موجودہ آمدنی ناکافی ہونے لگی فرخی نے زمیندار سے مقررہ
معاوضہ میں اضافہ کی درخواست کی زمیندار نے معذوری کا اظہار کیا اس سے فرخی کو بہت
مایوسی ہوئی اور اب وہ اس تلاش میں رہنے لگا کہ کسی امیر کے دربار تک رسائی ہو جائے
تا اس کی موجودہ مشکلات کے حل ہونے کی کوئی صورت نکل آئے لوگوں نے اسے بتلایا کہ
امیر ابو المظفر چغانی بہت بڑا سخن سنج اور قدر دان علم وفن ہے۔ شعرا کی جماعت کو بیش قرار انعامات
اور صلے دیتا ہے اور معاصر امرا میں اس بارے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ سنکر
اس نے ایک قصیدہ کہا جسکا پہلا شعر یہ ہے

با کاروان حلہ برفتم ز سیستان — با حلہ تنیدہ ز دل بافتہ زجاں

اور چغانی کی جانب روانہ ہو گیا جہاں ابو المظفر محمود کی جانب سے گورنر تھا۔ اسے گھوڑوں سے
بہت شوق تھا۔ اس کے چراگاہ میں اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیرے تھے ہر سال وہ انکا
جائزہ لیتا تھا اور داغ کراتا تھا۔ فرخی جس وقت بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر "داغگاہ" میں ہے
اسکا مختار کل عمید اسعد بھی وہیں موجود تھا فرخی اس کے پاس پہنچا۔ اور قصیدہ جو لکھکر لایا تھا
اسے سنایا اور امیر ابو المظفر کی خدمت میں پیش کرنے کی درخواست کی خواجہ اسعد ایک فاضل
"شاعر دوست" آدمی تھا قصیدہ سنکر اور اس کی صورت دیکھکر اسے سخت تعجب ہوا
اس لئے کہ قصیدہ بہت اچھا تھا اور فرخی کی صورت بالکل دیہاتی گنوار کی سی اس لئے عمید
اسعد کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ قصیدہ اسی گنوار کا لکھا ہوا ہے جس کو شاعری سے کوئی مناسبت
نہیں معلوم ہوتی۔ امتحاناً کہا کہ میں تمہیں امیر کی خدمت میں باریاب کردوں گا مگر پہلے تم
داغگاہ کی توصیف میں ایک قصیدہ لکھکر لاؤ اس نے داغگاہ کا نقشہ کھینچکر بتلایا کہ یہ بہت خوش
منظر مقام ہوتا ہے کوسوں تک سبزہ زار چلا جاتا ہے۔ خیموں کی قطار لگی ہوئی ہے چاروں
طرف چشمے بہتے ہیں احباب ایک ساتھ بیٹھکر شراب پیتے ہیں جشن کرتے ہیں بادشاہ کے

ایک ہاتھ میں شراب اور دوسرے ہاتھ میں کمند ہوتی ہے شراب پیتا جاتا ہے اور گھوڑے بخشتا جاتا ہے۔ فرخی نے رات بھر میں یہ قصیدہ کہہ ڈالا۔ اور دوسرے دن [illegible] پڑھا اس قصیدہ کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

چوں پرند نیلگوں بر روئے پوشد مرغزار	پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چوں ناف آہو مشک زاید بے قیاس	برگ را چوں پر طوطی برگ روید بے شمار
دوش وقت صبحدم بوئے بہار آورد باد	حبذا باد شمال و خرما بوئے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں	باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد در کنار
نسترن لولوئے بیضا دارد اندر مرسلہ	ارغواں لعل بدخشی دارد اندر گوشوار
تا برآمد جامہائے سرخ مل بر شاخ گل	پنجہائے دست مردم سر فرو کرد از چنار
باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نما	آب مروارید گون و ابر مروارید بار
راست پنداری کہ خلعتہائے رنگیں یافتند	باغہائے پر نگار از داغگاہ شہریار

خواجہ عمید یہ قصیدہ سنکر حیران رہگیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسے اشعار اس کے گوش زد نہیں ہوئے تھے۔ تمام کام چھوڑ چھاڑ فرخی کو اپنے ساتھ لے امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ خداوندا دقیقی کے بعد سے ابتک ایسا شاعر نہیں پیدا ہوا اور تمام واقعہ بیان کیا۔ غرضکہ ابو المظفر کے دربار میں اُسے جگہ مل گئی اور ابو المظفر نے جوہر قابل دیکھکر کچھ عرصہ کے بعد محمود کے دربار میں پہنچا دیا جہاں اس نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی بیس سیس کمر غلام اس کی رکاب میں چلتے تھے (۱)

فرخی کی تعلیم و تربیت دیہات میں ہوئی اس کی شاعری نے بھی اگرچہ بعد میں ترقی

---

(۱) مولانا شبلی نے شعر العجم میں .... زریں کمر لکھا ہے لیکن چہار مقالہ میں سیمیں کمر ہے۔

طے کئے لیکن اس کی ابتدائی نشو و نما دیہات ہی میں ہوئی۔ اسی لئے اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو ایک فطرتی شاعر میں ہونے چاہئیں۔ زبان کی صفائی روانی اور سلاست اس کے کلام کا عام جوہر ہیں اس کی فطری ذکاوت و ذہانت اور شاعرانہ کمال کی محمد عوفی اس طرح مدح سرائی کرتا ہے :

فرخی کہ از روئے بلاغت را مسافت فصاحت ادرخیال آراست کہ ہیچ کامدح انگشت برحرف آن نہاد و شعرا عذب و رمعنی است با دل و صنعت سخن و بدقت معانی کوشید و دراں از اقراں سابق آمد و آخر سخن بعمل مختع ایراد ولی کرد۔[1]

دولت شاہ سمرقندی ایک قدم اور آگے بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے فرخی کی تعریف کے سلسلہ میں وطواط کا قول بھی نقل کیا ہے وہ کہتا ہے۔

ذہن سلیم و طبع مستقیم داشتہ استاد رشید وطواط می گوید کہ فرخی عجم را ہچناں است کہ متنبی عرب را و ایں ہر دو فاضل سخن را سہل ممتنع می گویند[2]

قصیدہ اور واقعہ نگاری میں اس نے کمال حاصل کیا تھا مرثیہ کے اشعار پہلے فارسی میں بہت کم پائے جاتے تھے شاعری کی اس صنف کو بھی اس نے درجہ کمال تک پہنچا دیا اس نے سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا زبردست مرثیہ لکھا تھا۔ مولٰنا شبلی اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پر درد اور اثر سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور قوانین اس سے منضبط کئے جا سکتے ہیں[3]

---

(۱) لباب الالباب صفحہ ۲۴
(۲) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۵
(۳) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲۴

اس مرثیہ کے چند اشعار نمونہ کے طور پر ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار   چہ فتاد ست کہ امسال دگرگون شد کار
کوہہا بینم پر شورش و سرتاسر کوے   ہمہ پر جوشن و جوشن درو پر خیل و سوار
مہتران بینم بر روے زناں ہمچو زناں   چشمہا کردہ ز خوں نابہ برنگ گلنار
ملک امسال دگر بار نہ پیادہ ز غزا   و شنیدہ روے نہادہ است دریں شہر و دیار
سپرے خوردہ مگر دی کہ بخفتہ است امروز   دیر تر خاست مگر رنج رسیدش ز خمار
خبر شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند   ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار
کہ تو امروز بکہ برانگیزد از یں خواب ترا   خفتنی خفتنی کز خواب نگردی بیدار
خفتن بسیار نہ خواجہ خوے تو نبود   ہیچ کس خفتہ ندیدہ است ترا زیں کردار
یکدمک بار دے ورقانہ بایست نشست   تا بدیدے روے تو عزیزان و تبار
بہ حصار از فزع و بیم تو رفتند شہاں   تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی بہ حصار
شعرا را بہ تو بازار برافروختہ بود   رفتی و با تو بیکبار برفت آں بازار

اس کے دیوان کو ماوراء النہر میں بہت شہرت حاصل ہوئی نظم کے علاوہ نثر میں بھی اسکی ایک تصنیف ہے جو اس نے فصاحت و بلاغت پر لکھی ہے "ترجمان البلاغت" نام ہے[1] لیکن رشید الدین وطواط[2] نے اس کتاب کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی ہے[3] اور

---

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۵۷

(۲) رشید الدین محمد عبد الجلیل سلسلہ نسب حضرت عمر بن الخطاب سے جا کر ملتا ہے بہت بزرگ فاضل اور ادیب تھا بہت سے فنون میں مہارت تھی اس کی قابلیت علم کا اعتراف وقت کے تمام اکابر کو تھا اصل مسکن بلخ تھا لیکن خوارزم میں سکونت اختیار کی قطب الدین خوارزم شاہ کے عہد میں نشو و نما پائی۔ دور دور سے لوگ آکر شعر و شاعری میں اس سے استفادہ کرتے تھے۔ نہایت تیز زبان اور فصیح تھا فن نقد میں خاص کمال

[illegible]

اسدی طوسی

یہ بھی سلطان محمود کی بزم ادب کا ایک اہم رکن ہے [illegible] سے اسکا مرتبہ اپنے ہمعصر شعرائے کسی طرح کم نہیں تھا دولت شاہ نے اس کو فردوسی کا استاد لکھا ہے۔ لیکن مولنا شبلی نے اس کی تردید کی ہے اور خود اسدی کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فردوسی کا استاد نہیں بلکہ ہمعصر ہے محمود کے زمانے میں وہ خراسان کے شعرا کا استاد تھا۔ اسے بار ہا شاہنامہ نظم کرنے کے لئے مجبور کیا گیا لیکن اس نے ہمیشہ اس سے پہلو تہی کی اور اپنے بڑھاپے کا عذر پیش کرتا رہا۔ البتہ فردوسی سے ہمیشہ شاہنامہ نظم کرنے کی فرمائش کرتا رہا کہ اُسے وہ اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتا تھا۔(۱) دولت شاہ نے ایک روایت اور بھی نقل کی ہے یعنی یہ کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر دوسرے مقامات سے ہوتا ہوا اپنے وطن پہنچا ہے تو موت کے کنارے آن لگا تھا۔ اس نے اپنے استاد اسدی کو بلا کر کہا کہ استاد! موت کا وقت قریب پہنچ گیا ہے اور شاہنامہ ہنوز مکمل نہیں ہوا ہے اگر میں مر گیا تو مجھے خوف ہے کہ میرے بعد کسی کو اس کی تکمیل کی ہمت اور توفیق نہیں ہوگی۔ اسدی نے کہا کہ ہرگز کچھ فکر مت کرو اگر زندگی رہی تو تمہارے بعد میں اسے پورا کروں گا فردوسی نے کہا کہ آپ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اس لئے کس طرح آپ اس کام کو انجام دے سکیں گے اسدی نے کہا کہ انشاء اللہ [illegible] یہ کہکر وہ مکان پر واپس ہوا اور اسی روز دوسری نماز کے وقت

حاصل تھا اسی لئے اکثر شعرا اس سے ناراض تھے۔ بہت سے شعرا نے اس کی ہجو بھی لکھی ہے اور طرح طرح کے الزامات بھی قائم کئے ہیں لیکن وہ ان تمام الزامات سے بالاتر ہے۔ تذکرۃ الشعرا صفحہ ۸۰

[illegible]

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۳۵

تک ۔۔۔ ۴۰ چار ہزار شعر کہہ ڈالے۔ الی آخرہ"[1] لیکن مولنا شبلی نے اس کو بھی نہایت معقول دلائل کے ساتھ فرضی اور غلط ثابت کیا ہے[2]۔ اسدی کا اصلی نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے۔ طوس وطن تھا تعلیم سے فراغت حاصل کر کے عراق آیا اور دیلمیوں کے دربار میں اسکی رسائی ہو گئی یہاں سے آذربائیجان کا رخ کیا وہاں کے رئیس ابو دلف کا وزیر نہایت قدر شناس تھا اس نے اسے شاہنامہ کے طرز پر ایک کتاب لکھنے کی ترغیب دی چنانچہ گرشاسپ نامہ اسی ترغیب کا نتیجہ ہے[3]

فارسی مصطلحات پر بھی اس کی ایک کتاب ہے اور یہ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ چنانچہ خود اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے اور یہ ایک یوروپین مستشرق نے اسے چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[4]

عسجدی

عسجدی بھی محمود کے دربار کے مقبول شعرا میں تھا دولت شاہ نے اسے "از جملہ شاگردان استاد عنصری"[5] لکھا ہے وطن کے متعلق بھی تذکروں میں اختلاف ہے عوفی اسے ہرو کا باشندہ بتاتا ہے[6]۔ دولت شاہ نے ہروی الاصل لکھا ہے[7] دولت شاہ اس کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "قصائد را متین وملائم می گوید" عسجدی کے دیوان کو شہرت نہیں نصیب ہوئی لیکن اسکا جستہ جستہ کلام مختلف رسائل اور تذکروں وغیرہ میں پایا جاتا ہے محمود نے جب سومنات فتح کیا تو اس نے بھی ایک قصیدہ لکھا چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد | کردار خویش را علم معجزات کرد
آثار روشن ملکاں گذشتہ را | نزدیک بخرداں ہمہ از مشکلات کرد

(۱) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۳۶ (۲) شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۸۳ (۳) ایضاً صفحہ ۱۸۴ (۴) ایضاً ... (۵) تذکرۃ الشعرا صفحہ ۴۷ (۶) ایضاً

[illegible] ... جهانی دیراین دریا　　شکر دو ما خویشتن از واجبات کرد
محمود شہریار کریم آنکہ ملک را　　بنیاد بر محامد بے مکرمات کرد الخ

یہ [illegible] بھی اسی کی ہے۔

از شرب مدام ولاف مشرب توبہ　　از عشق بتان سیم غبغب توبہ
دل دو ہوس گناہ و برلب توبہ　　زیں توبہ نادرست یارب توبہ(۱)

غضائری

[illegible] عراق کا سرتاج سمجھا جاتا ہے سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں رتے سے ملازمت کی غرض سے غزنین آیا۔ شاعری کے تمام اصناف پر اسے قدرت تھی، صنعت اغراق میں خصوصاً کمال حاصل تھا۔ سلطان محمود کی شان میں متعدد قصیدے کہے ہیں ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

اگر مراد بجاہ اندر است وجاہ بمال　　مرا ببیں کہ ببینی جمال را بکمال
من آں کنم کہ بمن تا بحشر فخر کنند　　ہر آنکہ بر سر یک بیت بر نویسد قال

اس قصیدہ میں صنعت اغراق ہے جس کے صلہ میں محمود نے سات توڑے دئے جن کی قیمت ۱۴ ہزار درہم تھی۔ اغراق یہ ہے

صواب کرد کہ پیدا نہ کرد ہر دو جہاں　　یگانہ ایزد دادار بے نظیر و ہمال
وگرنہ ہر دو ببخشیدے آں بروز سخا　　امید بندہ نماندے بایزد متعال

روایت دولت شاہ کی ہے مولانا شبلی نے ۷ کے بجائے دو توڑے لکھے ہیں اور خود غضائری کے ان اشعار سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

---

(۱) یہ بیان تمامتر لباب الالباب جزو دوم اور تذکرۂ دولت شاہ سے ماخوذ ہے۔ (۲) شعر العجم جلد اول

مرا دو بہت بفر سود شہر یار جہاں
برائے جشن عزیز عبد الشکیم خان
[illegible] نیفز ستادہ دو ہزار درم
بر غم حاسد و تیار بد سگال نکال[1]

---

(۱) عضاری کا بیان بھی لباب الالباب جلد دوم تذکرۃ الشعرا اور شعر العجم حصہ اول سے ماخوذ ہے۔

غزلیات

(از جناب احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ)

کئی مہینے ہوئے یہ غزلیں حضرت احسانؔ نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی درخواست پر عطا فرمائی تھیں ادارت کی غفلت سے ابتک شائع نہ ہوسکیں۔ دینے والے اور دلانے والے دونوں سے معافی کی التجا ہے۔

(۱)

محسوس ہو رہی ہیں خود اپنی تجلیاں
اب کعبہ چاہئے نہ صنم خانہ چاہئے

وہ شمع حسن آج بھی ہے مائل کرم
سوز و گداز سینۂ پروانہ چاہئے

کیا کیا لطافتیں انہی ناکامیوں میں ہیں
احساس لذت غم جانانہ چاہئے

دیکھوں تو پھر حقیقت اوج حریم ناز
اک بیخودی کا نعرۂ مستانہ چاہئے

نغمے عجیب شور سلاسل میں ہیں نہاں
سننے کو لیکن اک دل دیوانہ چاہئے

اس بزم قدس تک تو پہنچنے کے واسطے
زاہد مری یہ لغزش مستانہ چاہئے

[illegible] تشنگی کو میں تو سمجھتا ہوں زندگی — اہل ہوس کو ساغر و پیمانہ چاہیے

نالہ و بکا تو نہیں کارِ عاشقی — سرمایۂ عزیز کا نذرانہ چاہیے

[illegible] جیب و گریباں کا پھاڑنا — اس کے لئے بھی عاقل و فرزانہ چاہیے

[illegible] عشق میں تو بس اتنا ہے مجھکو ہوش — ہر ہر قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیے

دشواریاں حیات کی آساں کچھ نہیں — فکرِ بلند و ہمتِ مردانہ چاہیے

(۴۳)

کس کے فیضانِ تجلی سے یہ دل سیراب ہے — آج ہر داغ چمکتا ہے گلستاں ہو کر

راحتِ روح ملی، دولتِ کونین ملی — [illegible]م جلوۂ کیفِ غمِ پنہاں ہو کر

دیکھیے پھر ہوتی ہے کیا بارشِ انوارِ کرم — [illegible] مقصدِ عشق میں آ سرِ عریاں ہو کر

کر دیا بزمِ دہر کو معمورِ گداز — خاکِ پروانہ کے ذرے بھی پریشاں ہو کر

وادیٔ عشق ہے یہ، نالہ و شیون کیسا — ہاں، اٹھا گامِ طلب تجھ و رقصاں ہو کر

کر دیا برقِ سرِ طور کو محرومِ جمال — جلوہ ہائے دلِ بیتاب سے عریاں ہو کر

اب تو اس برقِ تجلی سے ہے اک ربطِ لطیف — مجھکو کیا چیز ملی سوختہ ساماں ہو کر

پردۂ اسرار کے پردوں کو اٹھاتا تھا جسے — رہ گیا ہاتھ وہ پابندِ گریباں ہو کر

دل میں اک رقص تو ہے روح میں اک وجد تو ہے — گرچہ کچھ بھی نہ ملا چاک گریباں ہو کر

کاش رہ جائے مرے سینہ میں یہ داغِ جنوں — اک نشاطِ ابدی کا چمنستاں ہو کر

تجھکو گرنا تھا مرے قلب پہ اے برقِ جمال — کیا ملا طور پہ تجھکو شرر افشاں ہو کر

دو عینکیں

بابو صاحب علیگڑھ کے گریجوایٹ تھے اور یجی میں منصرم تھے۔ مولوی صاحب اپنے استاد مرحوم کے شاگرد تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مولوی تھے۔ بابو صاحب دبلے پتلے آدمی تھے، داڑھی منڈاتے تھے، مونچھیں اتنی بڑی رکھتے تھے کہ دودھ کی بالائی اُن میں اٹک کر رہ جاتی تھی۔ مولوی صاحب فربہ اندام تھے۔ انکی داڑھی عرض میں زنخداں تک محدود تھی مگر طول میں بہت دور تک پہنچی تھی۔ مونچھیں صاف رہتی تھیں یخنی، حریرہ، ہریسہ مالحم کسی چیز کے پینے میں دقت نہ ہوتی تھی۔ بابو صاحب گھر پر قمیص اور ڈھیلا پاجامہ پہنتے تھے اور دفتر میں سوٹ سے مشابہ ایک چیز جو چھاؤنی کا درزی انہیں سی کر دیا کرتا تھا۔ مولوی صاحب گھر پر اور مدرسے میں ہر جگہ نیچا کرتہ اور اونچی ازار پہنتے تھے جو انکی بیوی سیتی تھیں۔ بابو صاحب ولایتی چشمہ لگاتے تھے جس کی کمانی پر سونے کا ملمع تھا مولوی صاحب بہت موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے جس میں بٹا ہوا دھاگا کمانی کا کام دیتا تھا۔

بابو صاحب پہلے لیڈر کے خریدار تھے مگر جب سے پائنیر کا چندہ کم ہو گیا، پائنیر منگواتے تھے۔ مولوی صاحب کوئی اخبار خریدتے نہیں تھے مگر اسکول کے دار المطالعہ میں جتنے اردو اخبار آتے تھے سب کو پڑھا کرتے تھے بابو صاحب کو کتب بینی کا شوق نہ تھا۔ اخبار کے علاوہ اگر وہ کچھ پڑھتے تھے تو اپنے صوبے کی سول لسٹ مولوی صاحب کے مطالعہ میں کوئی نہ کوئی موٹی سی عربی کی کتاب ہمیشہ رہا کرتی تھی۔ بابو صاحب کو سوائے اصلاح معاشرت کے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ مولوی صاحب کو علاوہ دینیات کے علمی اور سیاسی مسائل سے بھی شغف تھا۔ اور انہیں بھی وہ دینیات کا جزو سمجھتے تھے بابو صاحب اپنے آپ کو آزاد خیال اور مولوی صاحب کو تنگ نظر اور متعصب سمجھتے تھے مولوی صاحب اپنے آپ کو مسلمان اور بابو صاحب کو ملحد کہتے تھے۔

ان اختلافات کے باوجود بابو صاحب اور مولوی صاحب میں بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے جس میں زنانے کے دو الگ حصے تھے۔ مگر مردانہ مشترک تھا۔ مردانے میں غسلخانے، پاخانے اور نوکروں کی کوٹھری کے علاوہ چار بڑے کمرے تھے جس میں سے ایک بابو صاحب کی نشست گاہ کا کام دیتا تھا۔ اس میں دری بچھی تھی اور چند بید کی کرسیاں اور چند مونڈھے۔ دوسرا بابو صاحب کے مطالعہ کا کمرہ تھا جس میں ایک میز تھی اور دو کرسیاں۔ میز پر لکھنے کا سامان دفتر کی مسلیں، تار اور منی آرڈر وغیرہ کے فارم، سول لسٹ اور ریل کا ٹائم ٹیبل سب چیزیں قرینے سے رکھی رہتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں مولوی صاحب رہتے تھے۔ اس میں آدھے کمرے میں چٹائی پر ایک بوسیدہ چاندنی بچھی ہوئی تھی صدر میں ایک میلا سا گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ اس کے آگے چار پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ چھوڑ کر سو سوا سو کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرے کے بقیہ نصف حصے میں نماز کی چوکی تھی اور ایک تخت جس پر مولوی صاحب کے کپڑے اور گھر کی بہت سی چیزیں جن کے رکھنے کا کہیں اور ٹھکانا نہ تھا، پڑی رہتی تھیں۔ چوتھے کمرے میں بابو صاحب کا لڑکا اور مولوی صاحب کا لڑکا جو ہم عمر تھے اور گورنمنٹ اسکول میں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے، رہا کرتے تھے۔

مولوی صاحب دونوں لڑکوں کے ساتھ مدرسے سے ساڑھے چار بجے واپس آیا کرتے تھے اور ساڑھے پانچ بجے تک عصر کی نماز سے اور سہ پہر کے ناشتے سے فارغ ہو جاتے تھے۔ اس وقت بابو صاحب اپنے دفتر سے لوٹتے تھے۔ بابو صاحب کا معدہ کمزور تھا اس لئے وہ سہ پہر کو ناشتہ نہیں کرتے دفتر سے لوٹ کر وہ منہ ہاتھ دھوتے تھے اور پھر اپنے نشست کے کمرے میں یا گرمی کے دن ہوں تو صحن میں ایک تکیہ دار مونڈھے کے سامنے ایک تپائی رکھ کر دراز ہو جاتے تھے۔ مولوی صاحب بھی آ بیٹھتے تھے اور محلے کے بعض احباب بھی جمع ہو جاتے تھے مغرب تک یہیں نشست رہتی تھی۔ مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی جس میں مولوی صاحب بہت زیادہ اور بابو صاحب بہت کم حصہ لیتے تھے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اور دوسرے حضرات

جو نماز کے پابند تھے محلے کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے چلے جاتے تھے اور بابو صاحب [illegible] بدستور باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے مسجد سے واپس آنے پر سب احباب رخصت ہو جاتے تھے اور مولوی صاحب اور بابو صاحب اور دونوں لڑکے سب مل کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا کھا کر بابو صاحب اپنے مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور دفتر سے جو مسلیں ساتھ آتی تھیں انکے ساتھ تین چار گھنٹے مصروف رہتے تھے۔ مولوی صاحب اپنے کمرے میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔

عشا کی نماز مولوی صاحب گھر پر پڑھتے تھے اور نماز سے فارغ ہو کر گھر میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ بابو صاحب کو بارہ بجے کے قریب سونا نصیب ہوتا تھا۔ مولوی صاحب صبح کو تڑکے اٹھتے تھے۔ نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر ٹہلنے جاتے تھے وہاں سے واپس آ کر دونوں لڑکوں اور بعض طالب علموں کو عربی فارسی اور دینیات کی کتابیں پڑھاتے تھے اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر مدرسے کی راہ لیتے تھے۔ بابو صاحب ساڑھے سات بجے بیدار ہوتے تھے اور ناشتہ کرتے ہی جج صاحب کے گھر چلے جاتے تھے کیونکہ دفتر کے وقت سے پہلے انہیں وہاں بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

یوں تو بابو صاحب اور مولوی صاحب میں روز شام کو باتیں ہوتی تھیں لیکن چونکہ بابو صاحب ذرا محتاط اور خوددار آدمی تھے اس لئے اور لوگوں کی موجودگی میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کرنا وہ خلاف مصلحت اور خلاف شان سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولوی صاحب کا مزاج بہت تیز تھا اور جب ان سے اور کسی شخص سے مجمع میں گفتگو ہوتی تھی تو ذرا سی دیر میں گفتگو مناظرہ بن جاتی تھی اور مناظرہ مجادلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ برخلاف اس کے جب وہ کسی سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے تو انکا رویہ اول سے آخر تک عدم تشدد کا رہتا تھا۔ اس لئے بابو صاحب ان سے اگر کبھی کھل کر باتیں کرتے تھے تو اتوار سے پہلی رات کو جب ان دونوں کے سوا کوئی تیسرا نہیں ہوتا تھا۔ اس رات کو عموماً دونوں صاحب کام نہیں کرتے تھے اور اکثر کھانے کے بعد دو ایک گھنٹے تبادلۂ خیالات میں صرف کرتے تھے۔ موضوع بحث عموماً معاشرت کے مسائل ہوتے تھے کیونکہ بابو صاحب کسی اور مبحث سے ذوق نہیں رکھتے تھے۔

خیالات کی عجیب شان ہوتی تھی۔ دوران گفتگو میں مولوی صاحب ٹکٹکی باندھ کر چھت
کی طرف دیکھتے تھے اور انکی آنکھوں کی چمک سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انکی نظر ناممدود فضا سے گذر کر
آسمانی بلندیوں کی سیر کر رہی ہے اور بابو صاحب بڑے گہرے غور و فکر کے انداز سے فرش پر
نظر جمائے تھے گویا طبقات ارض کے نیچے تحت الثرٰی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دونوں عجب
محویت کے عالم میں باری باری سے گفتگو کرتے تھے اور بیچ بیچ میں بابو صاحب اپنے رومال
اور مولوی صاحب اپنے کرتے کے دامن سے عینک صاف کرتے جاتے تھے اس حالت
میں کوئی انہیں دیکھتا تو یقینا یہ سمجھتا کہ ان دونوں حضرات کے پیش نظر یہ زندگی اور یہ دنیا
نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی عینک کی مدد سے کسی اور طلسمی عالم کا نظارہ کر رہا ہے۔
اور دوسرے کے سامنے اسکے منظر کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ ان دونوں کے طرز گفتگو سے اس
خیال کو اور تقویت ہوتی تھی۔ مثلاً بابو صاحب حکیمانہ شان سے پیشانی پر شکنیں ڈال کر فرمایا کرتے
تھے "مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ ایشیا جہالت اور تعصب کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو گیا ہے اور
اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے۔ قدامت پرستی اور تنگ نظری قصہ
پارینہ ہو گئی ہے، روشن خیالی کا دور دورہ ہے۔ تہذیب و تمدن کا چاند جو مغرب سے طلوع ہوا تھا
مشرق کی تاریکی کو آہستہ آہستہ دور کر رہا ہے۔ اسکی چاندنی کا دریا دو طرف سے بڑھ رہا ہے
امریکہ کی طرف سے اور یورپ کی طرف سے اور ظلمت شرق اس سیلاب میں غرق ہوتی جاتی ہے۔
جاپان اس نور سے منور ہو چکا ہے اور چین اب منور ہو رہا ہے۔ ترکی اور مصر اس کی تابانی سے
جگمگا اٹھے ہیں۔ ایران، شام اور عراق، وسط ایشیا اور افغانستان کی نظریں اس کی درخشانی سے
خیرہ ہو رہی ہیں۔ ہندوستان پر اس کی کرنیں مدت سے پڑ رہی ہیں اور اس کی روشنی سارے
ملک میں پھیل چکی ہے لیکن چونکہ یہاں کی فضا میں غیر معمولی تاریکی ہے اس لئے یہ چاندنی ابتک
مدھم ہوتی ہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے جائیں گے اندھیرا چھٹتا جائے گا اور چاند کی روشنی
اجلی ہوتی جائے گی،، مولوی صاحب یہ سنکر تھوڑی دیر خاموش رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انکے

چہرے پر عارفانہ جبروت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور انکی زبان یوں شعلہ فشانی کرتی تھی۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ ایشیا یورپ کی تقلید میں آنکھ بند کرکے ہلاکت کے غار میں گرنے کو تیار ہے۔ عقل شیطانی کے غرور میں ڈوبا ہوا، علم انسانی کے نشے میں بدمست وہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کو پامال کر رہا ہے اور بہائم کی طرح شرم وحیا کی رسیاں تڑا کر ہوائے نفس کے میدان میں بھاگا چلا جاتا ہے۔ کفروالحاد کی ایک آگ بھڑک اٹھی ہے جو ایمان اور عقیدے کے خرمن کو پھونکے ڈالتی ہے اس کی چمک نے جسے نور کہنا نور کی توہین ہے چین و جاپان، روم و روس، ایران و افغانستان سب کی آنکھوں میں چکا چوند ڈالدی ہے اور اسکی آنچ نے سب کے منکو جھلس دیا ہے اسکے شعلے ہندوستان میں زمین کے اندر اندر پھیل رہے ہیں اور ایک دن سارے ملک کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ وہ خدا جس نے ابراہیم پر آگ کو گلزار کر دیا تھا اگر چاہے تو اس بدنصیب ملک کو بچا سکتا ہے اور اپنے برگزیدہ بندوں کو یہ قوت دے سکتا ہے کہ دہریت کی آگ کو اپنے پیروں سے کچل کر بجھا دیں"

بابو صاحب یہ سنکر ذہنی تفوق کے احساس سے مسکراتے تھے اور کہتے تھے "دنیا میں جہالت کی قوتیں ہمیشہ مذہب کے نام سے ترقی اور اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتی رہیں مگر کبھی کامیاب نہیں ہوئیں مجھے وہ دن نظر آ رہا ہے جب لوگوں کی آنکھوں سے توہمات کے پردے اٹھ گئے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ انکے دینی پیشواؤں نے انہیں صدیوں تک گمراہی میں مبتلا رکھا اپنی کوتاہبینی اور بزدلی سے انہیں خدا کی بہترین نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ دھوکے کا طلسم ٹوٹنے کے بعد یہ فریب خوردہ بھیڑیں شیر بن گئی ہیں اور فریب دینے والوں کو غضبناک تیور سے گھور رہی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، اسے دیکھ کر دل ہلتا ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے زبان کانپتی ہے"

اب مولوی صاحب کا چہرہ روحانی طیش سے سرخ ہو جاتا تھا۔ اور انکی آواز سارے کمرے میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی تھی "روز ازل سے شیطان اور اس کے پیرو ترقی اور اصلاح

کے بہانے سے احکام خداوندی سے سرکشی کرتے آئے ہیں مگر انکا انجام دائمی ذلت اور ابدی ہلاکت ہے۔ میں وہ دن دیکھ رہا ہوں جب لوگوں کے اعمال میزانِ عدل میں تولے جا رہے ہیں اور انہیں بہ قدر استحقاق جزا و سزا مل رہی ہے، بندوں کو خدا کی راہ سے ہٹانے والے نافرمانی اور غرور کا بیج بونے والے کیفرِ کردار کو پہنچ رہے ہیں جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی زبانیں ایندھن مانگ رہی ہیں۔ اس کے بعد جو آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور روح لرزتی ہے۔"

اس نقطے پر پہنچ کر گفتگو عام مباحث سے ہٹ کر ذاتی مسائل پر آجاتی تھی۔ دونوں حضرات بہ تقاضائے دوستی ایک دوسرے کے عیوب اور نقائص گنانے لگتے تھے اور حق گوئی میں اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ حق کی تلخی کام و دہن کے لیے اور اس کی بو مشامِ جاں کے لئے ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھی۔

ایک بار جمعے کے دن مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو مارا کیونکہ اس نے نہانے میں دیر کر دی اور نمازِ جمعہ میں شامل نہ ہو سکا اور اتفاق سے بابو صاحب نے بھی اسی دن اسکول دیر میں پہنچنے کے قصور میں اپنے نورِ عین کی گوشمالی کی۔ سنیچر کے دن صبح کو دونوں لڑکوں نے آپس میں صلاح کر کے ان پدرانہ مظالم کا انتقام اس طرح لیا کہ مولوی صاحب اور بابو صاحب دونوں کی عینکیں خدا جانے کہاں چھپا دیں کہ لاکھ ڈھونڈھا مگر نہ ملیں۔ عینک نہ ہونے سے دونوں کو دن بھر بڑی دقتوں کا سامنا ہوا۔ مولوی صاحب لڑکوں سے درسی کتابوں کا آموختہ نہ سن سکے اور انہیں اس پر قناعت کرنا پڑی کہ صرف و نحو کے پیچیدہ مسائل زبانی سمجھائیں اور لڑکوں کی سمجھ میں کچھ نہ آئے تو قلمی سے ان کی تشریح کریں ادھر بابو صاحب کو مسلیں ایک محرر سے پڑھوا کر سننا پڑیں جس میں بہت وقت ضائع ہوا اور جج صاحب کے سامنے کاغذات پر دستخط کرانے وہ اس دن نہ جا سکے۔ شام کو واپسی کے بعد دونوں صاحبوں نے پھر عینکیں تلاش کیں مگر کہیں پتہ نہ چلا مجبوراً

یہ فیصلہ کیا کہ اگلے دن تعطیل ہے بازار جا کر دوسری عینکیں خرید لائیں گے۔

کھانے کے بعد حسبِ معمول دونوں حضرات بابو صاحب کی نشست گاہ میں رونق افروز ہوئے اور پھر وہی نپی تلی باتیں چھڑ گئیں۔ پہلے تو کچھ یونہی سی ردّ و بدل ہوتی رہی پھر رفتہ رفتہ دونوں گرمانے لگے اور اپنی اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بابو صاحب کی نظر فرش پر جم گئی اور انہوں نے چہرے کو فلسفیانہ ساز و سامان سے آراستہ کر کے اسی پرانے انداز میں گفتگو شروع کرنا چاہی مگر خدا جانے عادت کا اثر تھا یا کوئی اس سے زیادہ گہرا بھید کہ پہلا لفظ منہ سے نکالتے ہی بابو صاحب کا رومال والا ہاتھ عینک کو تلاش کرتا ہوا آنکھ تک پہنچا اور جب عینک نہ ملی تو ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی انکے ہاتھ پیر کانپنے لگے ان کی زبان رکنے لگی "مجھے نظر آتا ہے — مجھے۔ یہ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اندھیرا ہے۔ ہر طرف۔ اندھیرا۔

بابو صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب بھی سراسیمہ ہو گئے۔ انکے کرتے کا دامن اٹھا اور آنکھ کی طرف بڑھا مگر وہاں عینک کہاں تھی۔ ان کی زبان بھی لغزش کرنے لگی "میں یہ دیکھتا ہوں۔ میں۔ یہ۔ دیکھتا۔ میں۔ مجھے۔ کچھ دکھائی۔ نہیں۔ دیتا۔ کچھ۔ ہے۔ مگر۔ خدا۔ جانے۔ کیا۔"

غزل

از حضرت جلیل قدوائی بی اے (علیگ)

خوبی حسن یار کی باتیں — شہر بہ شہر ہیں بہار کی باتیں
مجھکو دیکھا تو بس یاد وہ شوخ — اس تغافل شعار کی باتیں
آہ وہ ابتدائے عشق کے دن — وہ زمانِ بہار کی باتیں
ذکر ایامِ کامرانِ وصل — طالع سازگار کی باتیں
چشم پر شوق کے پیام لطف — نگہ شرمسار کی باتیں
دل مرحوم کی اٹھان کی شان — ہائے اس ہونہار کی باتیں
اب نہ دل ہے نہ دل میں سوز و نیاز — نہ وہ اس دل فگار کی باتیں
چپ لگے اس کو ایک سال ہوا — ہیں یہ پچھلی بہار کی باتیں
اب نہیں ہے بہار اب نہ کرو — اس خزاں میں بہار کی باتیں

بے رخی کا کسے یقیں ہو جلیل
یاد ہیں اس کے پیار کی باتیں

شذرات

پچھلے مہینے متعدد قومی اخبار وں اور رسالوں نے "عربوں کا تمدن" مورد اعتراض قرار دیا۔ ہم نے مولانا محمد علی صاحب، مولنا ابوالکلام صاحب اور علامہ اقبال سے مشورہ کیا۔ تینوں حضرات نے یہ رائے دی کہ مصنف کی غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں پر جو تردیدی نوٹ مترجم نے لکھے ہیں وہ کافی مفصل اور مدلل نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ گہری تنقید کی ضرورت ہے۔ جناب شیخ الجامعہ حیدرآباد میں تشریف رکھتے ہیں ان کی خدمت میں یہ روداد پیش کی گئی۔ انہوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ اپنی واپسی پر جو بہت جلد ہونیوالی ہے۔ ہمدردان جامعہ کی شکایت کے رفع کرنیکا معقول انتظام فرمائیں گے ممدوح کی طرف سے اس کا اعلان اس رسالے کے چھپنے سے پہلے اخبارات میں شائع ہوجائے گا۔

---

۳۰ نومبر کو الہ آباد یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسے میں سر مالکم ہیلی گورنر صوبجات متحدہ نے ایک مختصر گر پر مغز خطبہ صدارت پڑھا جس کا لب لباب یہ ہے کہ ہندوستان میں مغربی اور مشرقی تمدنوں کا امتزاج ہو رہا ہے لیکن ابھی تک اسکا فیصلہ نہیں ہوا کہ آیا یہ ملک یورپ کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور علمی نظاموں کو اختیار کرکے ان میں اپنی ضروریات کے مطابق تصرف کرے گا یا اپنی زندگی کی بنیاد اپنی قدیم روایات پر رکھے گا اور مغربی تہذیب سے محض وہ عناصر لے گا جو مشرقی تہذیب میں کھپ سکیں۔ موصوف نے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ ہندوستانی رہنمایان ملت آج اور کل کی فکر میں دور و دراز مستقبل کی طرف سے غافل ہیں اور انہیں نصیحت فرمائی کہ جہاں تک ممکن ہو وہ جذبات کے جوش سے دل کو خالی کرکے حکیمانہ بے تعلقی سے ان مسائل پر غور کریں اور اس غور کا جو نتیجہ نکلے اسے علمی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ موصوف نے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ خود اور دوسرے

انگریز بڑے خلوص اور گرمجوشی سے اس دن کے منتظر ہیں جب ہندوستان راہ ترقی کے دشوار مراحل طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ جائے

سر مالکم نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے انکی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہندوستان ایشیا کے اور سب ملکوں کی طرح مشرق و مغرب کے تمدنوں کا جولانگاہ ہے اور اگر اس نے ان میں مصالحت کی کوشش نہ کی تو انکے آپس میں ٹکرانے سے اس کے پس جانے کا اندیشہ ہے لیکن موصوف کی فلسفیانہ وسعت نظر سے تعجب ہے کہ انہیں وہ مجبوریاں نظر نہیں آئیں جو ہندوستان کو اپنے مستقبل پر غور کرنے میں پیش آرہی ہیں۔ جب ایک ملک اپنی زندگی کے تمام اہم مسائل میں اپنے حکمرانوں کی مرضی کا پابند ہے تو وہ کس بنیاد پر اپنی آئندہ نشوونما کا اندازہ کرے اور کس رستے پر اس کی تشکیل کی تدابیر سوچے۔ جب تک وہ قوت جو دریا کی دھار کو موڑ سکتی ہے اپنے ہاتھ میں نہ ہو اس کے بہاؤ کا رُخ پہلے سے کیسے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہی احساس ہے جس کی بدولت اکثر ارباب فکر اور ارباب عمل جو واقعی ملک و قوم سے محبت رکھتے ہیں دوسرے کام چھوڑ کر سیاسی آزادی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور بعض عام تعلیم یا صنعتی تعلیم کے ذریعے ملک سے افلاس و جہالت کو دور کرنے کی دھن میں ہیں۔

سر مالکم کی نصیحت سن کر اکبر مرحوم کا ایک شعر یاد آتا ہے

غنیمت ہے شب فرقت کی فرصت
رسالہ لکھو تحقیق کمر میں

مگر اکبر مرحوم خوب جانتے تھے کہ شب فرقت میں جو کرب اور بے چینی ہوتی ہے اس میں سوائے اختر شماری کے اور کسی قسم کی علمی تحقیقات ممکن نہیں۔ سر مالکم بھی اسے خوب سمجھتے ہیں لیکن ان کی حکمت عملی کا یہی تقاضا ہے کہ ملک کی توجہ کو جس طرح ممکن ہو آزادی کی تحریک سے

اور طرف لگائیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو ہندوستانی حضرات ایسے موقعوں پر خطبات صدارت ارشاد فرماتے [illegible] ہی اپنے آقا کی آواز کو دہرایا کرتے ہیں اور جہاں [illegible] پروپوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

[illegible]

سر ہاکم کی زبان سے یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ انگریزوں کو بھی ہماری بہبود و ترقی دلچسپی ہے اور وہ اس کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سفر کی کڑیاں جھیل کر منزل مقصود تک پہنچ جائیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے ہمدرد ترقی کسے کہتے ہیں اور منزل مقصود سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر گول میز کانفرنس جس کا آج ہر طرف شہرہ ہے کبھی منعقد ہوئی تو یہ راز بھی غالباً کھل جائیگا۔

[illegible]

ہے استادی بھی عجب چیز ہے۔ اگر کوئی دوسرا ہم سے کہتا کہ وقتی جھگڑوں میں زیادہ ... بلکہ ابدی مسائل کیطرف توجہ کرو یا سیاسی اور اقتصادی آزادی پر زیادہ زور نہ دو بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی کی کوشش کرو تو ہم اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے لیکن سر ہاکم کی زبان یہ باتیں سن کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں لامکان ولازمان کا خواب اس لیے تو نہیں دکھاتے ہیں کہ زمان و مکان کو اپنے لئے محفوظ کرلیں، کہیں موصوف کی یہ کشادہ دلی اس بڑے بھائی کی فیاضی تو نہیں ہے جس نے چھوٹے بھائی سے کہا تھا۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آن من
از سقف بام تا بہ ثریا از آن [illegible]

ہٹاکر کسی اور طرف لگائیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو ہندوستانی حضرات ایسے موقعوں پر خطبات صدارت ارشاد فرماتے ہیں وہ بھی اپنے آقا کی آواز کو دہرایا کرتے ہیں اور جہاں موقع ملتا ہے تو ی تحریک پھوٹ کرنے سے نہیں چوکتے۔

سر مالکم کی زبان سے یہ خبر سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ انگریزوں کو بھی ہماری بہبود و ترقی سے دلچسپی ہے اور وہ اس کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم سفر کی کڑیاں جھیل کر منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ ہمارے ہمدرد ترقی کسے کہتے ہیں اور منزل مقصود سے ان کی کیا مراد ہے۔ اگر گول میز کانفرنس جس کا آج ہر طرف شہرہ ہے کبھی منعقد ہوئی تو یہ راز بھی غالباً کھل جائیگا۔

ہے آزادی بھی عجیب چیز ہے اگر کوئی دوسرا ہم سے کہتا کہ وقتی جھگڑوں میں زیادہ نہ الجھو بلکہ ابدی مسائل کی طرف توجہ کرو یا سیاسی اور اقتصادی آزادی پر زیادہ زور نہ دو بلکہ ذہنی اور روحانی آزادی کی کوشش کرو تو ہم اپنا سب سے بڑا خیر خواہ سمجھتے لیکن سر مالکم کی زبان سے یہ باتیں سن کر شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں لامکان و لازمان کا خواب اس حیلے تو نہیں دکھاتے ہیں کہ زمان و مکان کو اپنے لیے محفوظ کرلیں۔ کہیں موصوف کی یہ کشادہ دلی اس بڑے بھائی کی فیاضی تو نہیں ہے جس نے چھوٹے بھائی سے کہا تھا۔

از صحن خانہ تا بہ لب بام از آں من
از سقف بام تا بہ ثریا از آں تو

The Cultural Side of Islam

Madras Lecture on Islam

(No. 2)

BY

Muhammad Marmaduke Pickthall

Delivered at Madras in January 1929

—0—

CONTENTS

جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر [illegible]

بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927

AHHaruqi

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی

جلد ۱۳ بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء نمبر ۶

فہرست مضامین

مسئلۂ قضا و قدر

تعلیم یافتہ اور باخبر مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو سید جمال الدین افغانی، اور انکے زندہ کارناموں سے واقف نہ ہو، اور یہ نہ جانتا ہو کہ سید صاحب موصوف اپنے مذہب و ملت کے کیسے سچے فدائی، غمخوار اور مسلمانوں کے کتنے بڑے محسن تھے۔

یہ مضمون انہیں کے پرزور، حقیقت شناس قلم اور حساس فکر کا نتیجہ ہے جسے محمد فواد منقارہ طرابلسی نے جو جامعۂ ازہر مصر کے متعلم تھے ۱۳۳۵ھ میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک رسالے کی صورت میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے نشر و اشاعت کا فخر مصر کے مشہور مطبعۃ المنار نے حاصل کیا، چونکہ غرض اس کی اشاعت سے ناشر کی ہے، اسی نے مجھے بھی اس کی اشاعت پر آمادہ کیا کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی بدقسمتی سے قسمت اور تقدیر کے معنی نہایت ہی غلط سمجھ رکھے ہیں۔

علامہ سید افغانی (رح) نے مسئلہ قضا و قدر کے ذیل میں جن جن باتوں کو حوالۂ قلم کیا ہے کہ ہر متنفس مسلمان بلکہ ہر مشرقی شخص کا ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مولنا کے زور قلم کی داد نہ دینا بھی انصاف کا خون کرنا ہے۔

محوی

اپنی مخلوقات میں خدائے تعالیٰ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ انسان کے دلی عقائد کا جسمانی اعمال پر زبردست اثر ہوتا ہے یعنی افعال میں جو کچھ برائی یا بھلائی ہوتی ہے اس کا اصلی سرچشمہ عقیدے کی عمدگی یا خرابی ہے۔ اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عقیدہ انسان کے تمام خیالات پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ دوسرے عقائد اور معلومات بھی اسی کے تابع بن جاتے ہیں اور انسان کے تمام اعضا اور جوارح سے اسی عقیدے کے موافق ایسے اعمال ظاہر ہوتے ہیں

جس کا اثر نفس انسانی پر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان پر خواہ کیسا ہی مفید اور بہتر اصول پیش کیا جائے کیسی ہی بہتری کی بات بتائی جائے، خواہ وہ تعلیمی ہو یا تبلیغ مذہب کے لئے لیکن وہ اسے قبول کرنے میں تامل کرتا ہے اور اس کی بھلائی میں شبہ کرتا ہے۔ اور یہ شبہ بدستور اسے اصل عقیدے کے بالکل منافی اعمال میں مبتلا رکھتا ہے۔ اصل عقیدے کی ظاہری و معنوی صورت [illegible] جاتی ہے اور اپنی غلط فہمی یا خبث استعداد کی بدولت اُن سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ ان کا [illegible] ہو گیا مگر یہ نہیں جانتا کہ اس کے غلط اور گمراہ کن اعتقاد نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا [illegible] پھر کا فریب خوردہ انسان سمجھتا ہے کہ میرے تمام اعمال اس مبارک اور سچے اعتقاد کا [illegible] اسی قسم کے انحراف عقیدہ سے مذاہب و ادیان کے بعض اصولی اعتقادات میں تحریف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً کیا بلکہ یقیناً یہی چیز ہر مذہب میں بدعت و گمراہی کی اصلی علت ہے۔ اکثر و بیشتر یہی انحراف عقیدہ اور اس کے توابع دوسری بدعتیں انسانی طبائع کی بربادی اور اُن سے بدترین اعمال کے ظہور کا سبب ہو جاتی ہیں۔ خدا جسے اس ام[ب]ارک بلا میں مبتلا کرتا ہے یہ بلا اُسے ہلاکت و تباہی تک پہنچا دیتی ہے، اور یہ انسان کا بدترین آل کار [illegible] "اعلم اعضا"۔ یہی چیز اُن لوگوں کو جو اصل راز سے بے خبر ہیں ایک سچے اور پاک مذہب پر لعن طعن کی زبان کھولنے اور صحیح و حق عقیدے پر نکتہ چینی کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ اس طعن و طعن کی بنیاد زیادہ تر اُن سادہ لوحوں کے اعمال ہوتے ہیں جو اس دین کے نام لیوا ہوتے [illegible]

اسی قسم کے عقائد میں سے ایک عقیدہ قضا و قدر بھی ہے جو اسلام کے سچے اور حق مذہب کے اصولی عقائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت سے یورپین غفلت کیش نکتہ چینوں نے چیخ پکار مچائی ہے اور بہت خیال آرائیاں کیں ہیں۔ وہ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ جس قوم کے [illegible] یہ عقیدہ متمکن ہو گیا ہے اس نے ساری قوم کی ہمت و قوت سلب کر لی ہے۔ [illegible] اور ان میں ضعف و انحطاط پیدا کر دیا ہے وہ مسلمانوں کو اس قسم کی بہت سی صفتوں سے

[redacted]

مسلمان فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں وہ دنیا کی تمام قوموں سے جنگی اور سیاسی قوتوں میں پیچھے ہیں۔ ان میں کثرت سے اخلاقی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً بہت زیادہ جھوٹ، باہمی نفاق، بدعہدی و خیانت ایک دوسرے پر حسد، اور بغض و کینہ۔ ان کا شیرازہ اتحاد منتشر ہو چکا ہے وہ اپنے موجودہ اور آنے والے حالات سے بالکل بے خبر ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کیا چیز اُن کے لئے مفید اور کیا ضرر رساں ہے۔ وہ ایسی زندگی پر قانع ہیں جس میں کھانے پینے اور سو رہنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں برتری حاصل کرنے کا خیال بھی کبھی اپنے دلوں میں نہیں لاتے البتہ جب کبھی کوئی مسلمان اپنے کسی مذہبی بھائی کو نقصان پہنچانے پر آمادہ و قادر ہوتا ہے تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ اُن کا خوف و رعب آپس ہی میں ایک دوسرے پر مسلط ہے۔ اور اُن کی قوتیں باہم صرف ہو رہی ہیں۔ دنیا کی دوسری بیدار قومیں لقمہ لقمہ کر کے ان کو چبا تی ہیں اور نگلتی جا رہی ہیں مگر وہ ہر پیش آنے والی مصیبت پر راضی اور ہر حادثے کو انگیز کرنے پر آمادہ ہیں، وہ اپنے مکانوں کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں نہایت سکون کے ساتھ رہتے ہیں صبح اپنی چراگاہوں میں جاتے ہیں اور شام کو اپنے دارالامن (گھروں) میں پلٹ کر آتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی کا معیار ہے اور بس۔

مسلمان امرا، دولت کے نشہ میں مست ہیں، کھیل کود میں مصروف ہیں۔ نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں اپنی عمر عزیز زندگی کی منزلیں آرام سے قطع کر رہے ہیں، حالانکہ اُنکے لئے اور بھی بہت سے فرائض ہیں، جن کے ادا کرنے میں انہیں اپنی عمریں صرف کر دینی چاہئیں۔ مگر یہ ان فرائض کا ادنےٰ حصہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اپنی عزیز دولت کو صرف اُن چیزوں پر اٹھاتے ہیں جن میں اپنی حیات کے عزیز لمحات کا شمار رہے ہیں، وہ بھی نہایت فضول خرچی و بے دردی کے ساتھ۔ اُن کے مصارف نہایت وسیع ہیں، مگر مصارف کے ذیل میں کوئی ایسی مد نہیں

جس کا نفع قوم وملت کو پہنچتا ہو۔ اپنے ذاتی مصالح اور فوائد پر وہ عمومی مصلحتوں اور فائدوں کو بیکار جاکر نہایت بے دردی سے قربان کر دیتے ہیں۔ اُن سے نفرت کرتے اور پس پشت ڈالتے رہتے [illegible] اوقات دو امیروں کا باہمی تنافر پوری قوم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک [illegible] سے برباد کرتا ہے اور اس پر اُس کی کسی ہمسایہ حکومت کو مسلط کر کے [illegible] نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک اجنبی حکومت محسوس کر لیتی ہے [illegible] اور ضعف قاتل پیدا ہوگیا ہے تو دونوں امیروں کے مقبوضات سے [illegible] ہڑپ کر لیتی ہے جن سے بظاہر اُن کو کوئی تکلیف و تکلف نہ ہو۔ مسلمانوں میں [illegible] عام طور پر پھیل گیا ہے۔ بزدلی و کاہلی ان پر چھا گئی ہے، وہ ہنگامے سے گھبراتے ہیں۔ ذرا سی مصیبت سے چیخ اُٹھتے ہیں۔ دوسری قوموں اور حکومتوں کو جو شوکت و قوت حاصل ہے اُسے خود حاصل کرنے سے الگ تھلگ رہتے ہیں یاد رہے کہ اس باب میں وہ کھلم کھلا غلطی پر ہیں، وہ اپنے احکام دین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ اپنی ہمسایہ قوموں کے [illegible] دیکھ رہے ہیں، بلکہ جو قومیں اُنکے اقتدار و اثر میں تھیں وہ بھی اُن سے آگے نکل گئی ہیں اور اپنے حاصل کئے ہوئے مرتبے پر بجا طور پر فخر کر رہی ہیں۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ جب کسی ایک اسلامی ملک پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا کوئی دشمن دست درازی کرتا ہے تو دوسرے ملک کے عاقل مسلمان اُن کی مصائب کو دور یا کم کرنے میں کامل حصہ نہیں لیتے۔ نہ اُس مظلوم کی امداد کے لئے اُٹھتے ہیں ان میں بڑی بڑی ملکی و ملی انجمنوں کا وجود نہیں ہے نہ ایسی خفیہ یا علانیہ مجلسیں ہیں جن کے مقاصد میں یہ باتیں داخل ہوں ا۔ مذہبی غیرت اور جوش کو زندہ کرنا، قومی حمیت کے جذبے کو ابھارنا۔ کمزوروں کی دستگیری کرنا، غرباء اور کمزوروں کے حقوق کو طاقت وروں اور سرکشوں کے ہاتھوں پامال نہ ہونے دینا اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ ''

غرض ایسی بہت سی باتوں سے ارباب مغرب مسلمانوں کو متصف کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی

منسوب کرکے نشانہ ملامت اور ہدف ذلت بناتے ہیں، اور اُس کی علت غائی عقیدۂ قضا و قدر کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

مسلمان فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں۔ وہ دنیا کی تمام قوموں سے جنگی اور سیاسی قوتوں میں پیچھے ہیں۔ ان میں کثرت سے اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں مثلاً بہت زیادہ جھوٹ بولنا، باہمی نفاق، بدعہدی وخیانت ایک دوسرے پر حسد، اور بغض وکینہ۔ انکا شیرازہ اتحاد منتشر ہو چکا ہے وہ اپنے موجودہ اور آنے والے حالات سے بالکل بے خبر ہیں، وہ نہیں جانتے کہ کیا چیز اُن کے لئے مفید اور کیا ضرر رساں ہے۔ وہ ایسی زندگی پر قانع ہیں جس میں کھانے پینے اور سو رہنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں برتری حاصل کرنے کا خیال بھی کبھی اپنے دلوں میں نہیں لاتے البتہ جب کبھی کوئی مسلمان اپنے کسی مذہبی بھائی کو نقصان پہنچانے پر آمادہ وقادر ہوتا ہے تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتا۔ اُن کا خوف و رعب آپس ہی میں ایک دوسرے پر مسلط ہے۔ اور اُن کی قوتیں باہم صرف ہو رہی ہیں۔ دنیا کی دوسری بیدار قومیں لقمہ لقمہ کرکے ان کو چباتی ہیں اور نگلتی جارہی ہیں مگر وہ ہر پیش آنے والی مصیبت پر راضی اور ہر حادثے کو انگیز کرنے پر آمادہ ہیں، وہ اپنے مکانوں کے چھوٹے چھوٹے حصوں میں نہایت سکون کے ساتھ رہتے ہیں صبح اپنی چراگاہوں میں جاتے ہیں اور شام کو اپنے دارالامن (گھروں) میں پلٹ کر آتے ہیں۔ یہی اُن کی زندگی کا معیار ہے اور بس۔

مسلمان امراء دولت کے نشہ میں مست ہیں، کھیل کود میں مصروف ہیں۔ نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں اپنی عزیز زندگی کی منزلیں آرام سے قطع کر رہے ہیں۔ حالانکہ اُنکے لئے اور بھی بہت سے فرائض ہیں، جن کے ادا کرنے میں انہیں اپنی عمریں صرف کردینی چاہئیں۔ مگر یہ ان فرائض کا ادنےٰ حصہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اپنی عزیز دولت کو صرف اُن چیزوں پر اٹھاتے ہیں جن میں اپنی حیات کے عزیز لمحات کاٹ رہے ہیں، وہ بھی نہایت فضول خرچی و بے دردی کے ساتھ۔ اُن کے مصارف نہایت وسیع ہیں، مگر مصارف کے ذیل میں کوئی ایسی مد نہیں

قوم وملت کو پہنچتا ہو۔ اپنے ذاتی مصالح اور فوائد پر وہ عمومی مصلحتوں اور فائدوں کو بیکار جاکر
نہایت بے دردی سے قربان کر دیتے ہیں۔ اُن سے مغفرت کر لے اور پس پشت ڈالتے رہتے
اوقات دو امیروں کا باہمی تنافر پوری قوم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک
دوسرے کو خوشی سے برباد کرتا ہے اور اس پاس کی کسی ہمسایہ حکومت کو مسلط کر کے
مسرور ومطمئن ہوتا ہے نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک اجنبی حکومت محسوس کر لیتی ہے
کہ ان میں ایک خانی قوت اور ضعف قاتل پیدا ہو گیا ہے تو دونوں امیروں کے مقبوضات سے
آنا حصہ ملک خود ہڑپ کر لیتی ہے جن سے بظاہر اُن کو کوئی تکلیف و تکلف نہ ہو۔ مسلمانوں میں
خوف ورعب عام طور پر پھیل گیا ہے۔ بزدلی وکاہلی ان پر چھا گئی ہے، وہ ہنگامے سے گھبراتے
ہیں۔ ذرا سی مصیبت سے چیخ اٹھتے ہیں۔ دوسری قوموں اور حکومتوں کو جو شوکت وقوت
حاصل ہے اُسے خود حاصل کرنے سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس باب میں وہ کھلم
کھلا غلطی پر ہیں وہ اپنے احکام دین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ باوجودیکہ اپنی ہمسایہ قوموں کے
اقدام کو دیکھ رہے ہیں، بلکہ جو قومیں اُنکے اقتدار واثر میں تھیں وہ بھی اُن سے آگے نکل گئی
ہیں اور اپنے حاصل کئے ہوئے مرتبے پر بجا طور پر فخر کر رہی ہیں۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ
جب کسی ایک اسلامی ملک پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا کوئی دشمن دست درازی کرتا ہے
تو دوسرے ملک کے عاقل مسلمان اُن کی مصائب کو دور یا کم کرنے میں بالکل حصہ نہیں لیتے۔
نہ اُس مظلوم کی امداد کے لئے اٹھتے ہیں ان میں بڑی بڑی ملکی وملی انجمنوں کا وجود نہیں ہے
نہ ایسی خفیہ یا علانیہ مجلسیں ہیں جن کے مقاصد میں یہ باتیں داخل ہوں: ۔ مذہبی غیرت اور جوش کو
زندہ کرنا، قومی حمیت کے جذبے کو ابھارنا کمزوروں کی دستگیری کرنا، غرباء اور کمزوروں کے
حقوق کو طاقت وروں اور سرکشوں کے ہاتھوں پامال نہ ہونے دینا۔ اپنے حقوق کی حفاظت کرنا
. . . . . وغیرہ وغیرہ ۔"

غرض ایسی بہت سی باتوں سے ارباب مغرب مسلمانوں کو متصف کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی

کہتے ہیں کہ اس کا سبب اصلی اور حقیقی سرچشمہ مسلمانوں کا عقیدۂ قضا و قدر ہے جس نے اپنے تمام اہم مقاصد اور معاملات کو قدرت خداوندی کے سپرد کر دیا، ان لوگوں کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ اگر مسلمان اس عقیدے پر یونہیں ہمیشہ قائم رہے تو ایک دن دنیا میں انکا کوئی مرکز و مرتبہ نہ رہے گا اور نہ وہ کبھی عزت کے اعلیٰ مدارج پر قائم ہو سکتے، نہ اپنے حقوق پا سکتے، نہ دوسروں کے مقابلہ پر حقوق کی پامالی کو دور کر سکتے نہ اپنے کسی بادشاہ کی حمایت کے لئے اٹھ سکتے بلکہ برابر ان کا قومی زوال بڑھتا اور ان کے نفوس میں گھن کی طرح اپنا کام کرتا رہے گا ان کے دلوں کو پیچھے ہٹاتا رہے گا یہانتک کہ ان کو نتہائے فنا تک پہنچا دے گا۔ (معاذ اللہ خدانخواستہ) خود ان میں سے ایک دوسرے کو اپنی ذاتی خصومتوں کی بدولت ہلاک کرے گا۔ اور جو کچھ اس کے ہاتھوں سے بچ رہے گا اُسے اغیار جھپٹ لیں گے۔

دانایان مغرب کا یہ خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ عقیدۂ قضا و قدر، اور عقیدۂ جبریہ میں (جو یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال میں مجبور محض ہے) کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ مسلمان اس عقیدۂ تقدیر کی بنیاد پر بالکل اس تنکے کے مانند ہیں جو ہوا میں معلق ہو۔ ہوا اُسے ہچکولے دیتی رہتی ہے اور جدھر چاہتی ہے جھکا دیتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اس کو قول، فعل، حرکت، سکون، غرض کسی میں بھی کچھ اختیار نہیں۔ بلکہ وہ مجبور محض ہے، اور یہ سب ایک زبردست طاقت، ایک قوی قدرت کے ہاتھ میں ہے تو یقیناً اس قوم کے تمام قوائے بالکل معطل اور بیکار ہو جائیں گے اور خدائے تعالےٰ نے مدارج اور عقل انسانی کا جو حصہ انہیں دیا ہے وہ بالکل معدوم ہو جائے گا۔ اُن کے دلوں سے سعی و عمل کا پاک جذبہ فنا ہو جائے گا۔ اس صورت میں تو ایسی قوم کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ اس عالم وجود سے ہمیشہ کے لیے سیدھا عالم عدم کا رستہ لے۔

یورپ ہی کے ایک گروہ کا یہ خیال خام اور ذوق فاسد نہیں بلکہ بہت سے ضعیف العقول مشرقی بھی ان کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں۔ مگر میں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتا کہ یہ

گمان بالکل جھوٹ ہو، یہ خیال سرتاپا غلطی پر مبنی ہے اور یہ وہم تامتر باطل و بے سروپا ہے۔ یہ گروہ خدا سے ایک اور تمام مسلمانوں پر افترا کرتا اور جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ایک متنفس بھی، شیعہ، سنی، زیدی، اسماعیلی، وہابی یا خارجی ایسا نہیں جو [illegible] ہو۔ اور اپنے کو بالکل غیر مختار جانتا ہو۔ بلکہ ان تمام اسلامی فرقوں میں ہر ایک کا یہ اعتقاد ہے کہ ہمیں اپنے اعمال میں یقیناً اختیار کا بھی ایک جز حاصل ہے۔ اور اسی [illegible] "کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس پر ثواب و عذاب کا دار و مدار ہے۔ [illegible] کے نزدیک یہ مسلّم ہے کہ خدا نے جتنا اختیار کا حصہ دیا ہے، اس کا محاسبہ کیا جائے گا۔ ان سے تمام خداوندی احکام کی بجاآوری اور ممنوعاتِ ربانی سے بچنے کا مطالبہ ہوگا۔ یہی اوامر و نواہی دراصل فلاح و خیر کی جانب انسان کو لیجانے والے ہیں اور یہی ہر بہبودی کی طرف راہ نما ہیں۔ اختیار کی یہی وہ قسم ہے جسے تکلیفات شرعیہ کا سرچشمہ کہتے ہیں۔ اور اس پر حکمت و مصلحتِ الٰہی کی تکمیل ہوتی ہے۔

ہاں، بیشک، مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا تھا جسے "جبریہ" کہتے ہیں۔ اُس کا یہ مسلک تھا کہ انسان اپنے تمام اعمال میں ایسا مجبور رہے کہ اُسے اختیار کی ہوا تک نہیں لگی۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی کھانے اور چبانے کے لئے اپنے جبڑوں کو جو حرکت دیتا ہے، شدت سردی سے کپکپاتا ہے، اس میں بھی مجبور محض ہے مگر عام مسلمان اسے "لاادریہ" کے جاہلانہ اور فاسدانہ نزاعات میں شمار کرتے ہیں اس عقیدے کے قائل چوتھی صدی ہجری کے آخر میں دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے، اُن کا نام و نشان تک آج صفحۂ ہستی پر باقی نہیں۔ عقیدۂ قضا و قدر، بعینہٖ "عقیدۂ جبر" ہرگز نہیں ہے۔ اور اس عقیدے کے نتائج اور مقتضیات میں جو بہ مغربی وہمی اور خیالی پلاؤ پکانے والے سمجھے ہوئے ہیں۔ ہمارا "عقیدۂ تقدیر" اس کی تائید ایک زبردست دلیل سے ہوتی ہے۔ بلکہ [illegible] کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔ جس کو غور و فکر کا مادہ قدرت نے دیا ہے۔

اس کے لئے یہ کچھ دشوار نہیں کہ ہر پیش آنے والی چیز کی طرف ایک نگاہ ڈالے اور ذرا التفات سے کام لیکر یہ سمجھے کہ ہر پیش آنے والی چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، جو دنیا میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ غور و فکر کرنے والا اس سلسلہ اسباب میں انہیں اسباب کو دیکھ سکتا ہے جو خود اس کے پیش نظر ہوں۔ اور ان کے ماضیات کو اس خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا جو خود اس کے نظام کو عدم سے وجود میں لانیوالا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک سبب کا اپنے آگے آنے والے واقعات میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ خود خدائے عزیز و علیم کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ انسانی ارادہ اس سلسلہ کی کڑیوں میں سے صرف ایک کڑی ہے۔ یہ ارادہ بھی آثار و ادراک کا ایک نشان و اثر ہے ادراک کیا چیز ہے؟ نفسانی خواہشات کا علم جو حواس اور شعور پر صادر ہوتی ہیں اور جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں اُن سے نفس کی اثر پذیری کائنات کے ظاہری حالات کو ارادہ و فکر پر جو قدرت و تسلط حاصل ہے اُس سے کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ عقلمند آدمی! — جن اثرات کو تم مظاہر میں موثر دیکھتے ہو۔ ان سب کا مبدا اُس کائنات کے مدبر اعلم کے ہاتھ میں ہے۔ جس نے تمام اشیاء کو اپنی حکمت و مصلحت کی بنیاد پر پیدا کیا ہے اور ہر نو پیدا کو اپنی ہی جیسے کا تابع بنایا ہے گویا وہ اس کا ایک بدل ہے خاصکر عالم انسانی میں۔

اگر ہم فرض کر لیں کہ ایک جاہل ایسے معبود کے ماننے سے منکر ہے جو اس عالم کا بنانے اور ایجاد کرنے والا ہے، پھر بھی اُس کے امکان سے یہ باہر ہے کہ بشری ارادوں میں حوادث زمانی اور موثرات طبعی کی تاثیر کو ماننے سے وہ پہلو تہی کرے۔ کیا کسی انسان کے امکان میں یہ ہے کہ وہ اپنے کو خدا کے اس قانون و قاعدے سے الگ رکھ سکے۔ جو اس کی مخلوق میں جاری اور نافذ ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے تمام طالبان حق و صداقت مانتے ہیں۔ واصلین کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

اس کے علاوہ یورپ کے بعض فلاسفہ اور علمائے سیاست خود قضا و قدر کی طاقت و سطوت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے بہت تفصیل سے اثبات

...ذریعے بیانات و مضامین میں کام لیا ہے۔ مگر ہمیں اُن کی آرا، و افکار سے سند و شہادت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہو۔

تاریخ کے لئے روایت سے بالاتر ایک علم اور ہے۔ جس کی طرف ہر قوم و ملت کے علما نے اپنی پوری توجہ صرف کی ہے۔ یہ وہ علم ہے جو قوموں کے عروج و زوال، انحطاط و اقبال کے اسباب میں اُن کی اخلاق و سیرت سے بحث کرتا ہے، اور اہم ترین حوادث کے عام و خاص وجوہ، اصل راز و خصائص سے پتا چلاتا ہے کہ اُن کے عادات اور خیالات کیا ہوں گے۔

اس کے تابع قوموں کے نشوو ارتقا اور نئی حکومتوں کا وجود میں آنا۔ یا بعض قوموں کا فنا ہونا، کہنہ و فرسودہ ہونا، غرض کیا کیا تغیرات ہوسکے ہیں کیا کیا صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب سے زیادہ اہم اور بلحاظ فائدہ سب سے بالاتر قرار پایا ہے۔ اس علم کی بنیاد بحث عقیدہ ... ہے اور اس یقین و ایمان پر کہ تمام بشری طاقتیں، مدبر کائنات (باری تعالیٰ) ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جو کائنات کا منتظم اور واقعات و حادثات کو عمل میں لانے والا ہے اور اگر قدرت بشری بلحاظ اثر اندازی کچھ قادر و موثر ہوتی تو نہ کوئی بلند مرتبہ آدمی زوال کا شکار ہوتا۔ نہ کوئی ضعیف و کمزور طاقت ور ہوسکتا نہ کوئی اپنے مرتبے سے گرتا اور نہ کسی سلطنت و سطوت کا کبھی خاتمہ ہوتا

قضا و قدر کا مسئلہ اگر جبر محض کی بداثری سے الگ ہو تو یہ حقیقت ہو کہ اس کے ساتھ ہی جرأت و اقدام کی صفت اور بہادری و دلاوری کی خصلت ظہور میں آتی ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو ہلاکت آفریں معاملات میں گھس پڑنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ وہ معاملات جن سے بڑے بڑے شیروں کے دل لرزتے اور جن سے دلاور چیتوں کے پتے پانی ہوجاتے ہیں۔ یہی اعتقاد نفوس انسانی کو ثبات کا خوگر، مصائب کی برداشت کا عادی، اور ہولناک مہمات میں کود پڑنے کا متحمل بنا دیتا ہے۔ انسان کو سخاوت و دریا دلی کے نفیس زیوروں سے آراستہ کر دیتا ہے۔ ہر اُس چیز پر آمادہ کر دیتا ہے۔ جو آدمی پر گراں ہوسکتی ہے بلکہ انہیں اپنی جانیں فدا کر ڈالنے، شادانی

حیات سے کنارہ کش ہوجانے تک پر بخوشی تیار کردیتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حق و انصاف کی راہ میں صرف اُسکا عقیدۂ قضا و قدر ہی آمادہ کرتا ہے۔

جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زندگی محدود ہے۔ رزق مقسوم ہے۔ تمام اشیاء اور اُن کا نظام خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ انہیں جس طرح چاہتا ہے تصرف میں لاتا ہے ظاہر ہے کہ ایسا آدمی حق و صداقت کے لئے مدافعت کرنے میں موت کی کیا پروا کرسکتا ہے، اپنی قوم و ملت کا بول بالا ہونے پر خدا نے جو فرض اُس پر عائد کیا ہے اس کے بجا لانے میں موت سے کیا ڈر سکتا ہے۔ اپنے عزیز مال و دولت کو حمایت حق، اور اپنے مجد و شرف کے استحکام میں صرف کرنے پر، اور وہ بھی اوامر خداوندی کے بموجب، نیز انسانی تمدن و اجتماع کے موافق، وہ تنگ دستی و فقر کے خوف سے کیا اثر پذیر ہوسکتا ہے۔

خدائے بزرگ و برتر نے اس عقیدے کی بنیاد پر مسلمانوں کی تعریف کی اور فضیلت بیان فرمائی ہے۔ وہ ارشاد فرماتا ہے:-

الذین قالوا ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوہم
فزادہم ایمانا وّ قالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل ہ
فانقلبوا بنعمۃ من اللہ و فضل لم یمسسہم سوءٌ
واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم ہ

مسلمانوں نے اپنی نشأت اولین میں اقطار عالم کی طرف پیش قدمی کی اُن کو فتح و تسخیر کرتے، اور اُن پر اپنی سطوت و جبروت کا سکہ قائم کرتے چلے گئے۔ اس شان سے کہ انسانی عقلیں محو تعجب رہ گئیں اور فہم و خرد سراپا تصویر تھی۔ یہ دیکھکر کہ بڑی بڑی با جبروت حکومتوں کی انہوں نے اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور زبردست قوموں کو مغلوب کرلیا۔ اُن کی حکومت کا سکہ برنیز کے پہاڑوں سے، جو اسپانیا اور فرانس کے درمیان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوار چین تک رائج ہوگیا باوجودیکہ اُن کی تعداد قلیل تھی اور مختلف آب و ہوا کے خوگر، رنگا رنگ ممالک کے موسمی اثرات کے

عادی نہ تھے بڑے بڑے گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑوا دیں۔ پرشوکت قیصروں اور کسراؤں [illegible] ظہور اور وہ بھی اتنی قلیل مدت میں جو اسی سال سے زیادہ نہیں کہی جا سکتی۔ حقیقت میں یہ چیز خوارق عادات، اہم ترین معجزات میں شمار ہونے کے قابل ہو۔ [illegible]رت ہے۔ مسلمانوں نے بڑے بڑے ممالک کو زیرنگیں کیا۔ سربفلک دمدموں اور ٹیلوں کو ملیامیٹ کر دیا۔ زمین کے اس ساتویں طبقے پر جنگی گرد وغبار سے ایک آٹھواں طبقہ [illegible] کر دیا۔ انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا اور اُن کی جگہ اُن کی سطوت کے خلاف سر اٹھانے والوں کے سروں سے پہاڑ اور ٹیلے کھڑے کر دیے [illegible]وں کو لرزا دیا۔ اور ہر شانے کو پیٹر کا دیا۔ دیکھو تو ان کو ان ہمتوں میں آگے بڑھانے والا عقیدہ قضا و قدر کے سوا کون تھا۔

یہ اعتقاد ہی وہ زبردست قوت ہے جس کی بنیاد پر مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے قدم اُن جرار لشکروں کے سامنے جمے رہے اور نہ ڈگے۔ جن سے قضائے الٰہی برہم تھی۔ اور یہ بسیط ارض ان پر تنگ ہو گیا تھا۔ پس ان جاں باز ٹکڑیوں نے دشمنوں کو اُنکے مرکزوں سے ہٹا دیا۔ اور پیچھے پاؤں لوٹا دیا۔

اسی اعتقاد کی بدولت مشرق میں اُن کی خارا شگاف تلواریں چمکیں اور اُنکے جہاں سوز شعلوں نے جنگ کی آندھیوں میں مغرب کے برگشتہ نصیبوں کو خاک کر دیا۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں کو اپنی دولت اموال لٹا دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ اور اپنی تمام املاک کو محض اپنی قومی حکومت کے اعلاء کلمہ (بول بولا) کے لئے خرچ کر کے نہ وہ فاقے سے ڈرتے تھے۔ نہ فقر کے اندیشے سے سراسیمہ و پریشان ہوتے تھے۔ یہی اعتقاد تو ہے جس نے مسلمانوں پر یہ اثر کیا کہ وہ اپنی بیویوں، بچوں، اور جو کچھ اُن کی گودوں میں تھا سب کو جدال و قتال کے میدانوں میں لیکر پہنچ جاتے تھے۔ اور وہ بھی دنیا کے بالکل آخری سرے تک اور اس طرح جیسے سیر و تفریح کے لئے باغوں کو جا رہے ہیں، گویا وہ اپنی جانوں کا ہر آفت، بلا سے خدا کے

... بھروسہ کا بیمہ کرا چکے تھے۔ اور اپنی عزیز جانوں کے گرد انہوں نے اعتماد کا ایک مضبوط حصار تیار کر لیا تھا۔ وہ حصار جو رات کی آنے والی تاریکیوں میں آنے والی مصیبت سے اُن کو، اُن کے بچوں، اور بیویوں کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔ وہ بیوی، بچے جنہیں یہ مٹھی بھر مسلمان اپنی فوج ظفر موج کو پانی پلانے اور دیگر مایحتاج کی فراہمی و خدمت پر مامور کرتے تھے۔ ان معرکوں میں عورتیں اور بچے جوانوں اور بوڑھوں سے الگ نہیں رہتے تھے۔ نہ اُن میں کوئی مابہ الامتیاز فرق رکھا جاتا تھا نہ عورتوں پر کوئی خوف طاری ہوتا تھا۔ نہ بچوں پر کوئی خطرہ کی حالت۔ یہی وہ اعتماد تھا جس نے مسلمانوں کو اس حد پر پہنچا دیا تھا کہ اُن کا نام لینا دلوں کو ہلا دیتا تھا۔ اور جگر کے ٹکڑوں کو پراگندہ کر دیتا تھا یہاں تک کہ وہ صرف رعب سے فتح حاصل کر لیتے تھے اور اپنے دشمنوں کے دلوں کو نشانہ بناتے چلے جا رہے تھے وہ محض اپنی سپاہ رعب و سطوت سے دشمنوں کو شکست دیدیتے تھے۔ قبل اس کے کہ دشمن اُن کی تلواروں کی بجلیوں کو کوندتا ہوا دیکھیں۔ اور اُن کے بھالوں، برچھیوں اور نیزوں کی تڑپ اور چمک کا روح فرسا نظارہ کریں بلکہ اس سے بھی پہلے کہ دشمنوں کے حدود میں مسلمانوں کے لشکر پہنچیں۔

میں روتا ہوں اُن بزرگوں پر اور نوحہ و ماتم کرتا ہوں ان اسلاف پر۔ کہاں ہو تم اے حزب اللہ؟ کہاں ہو تم اے انصار اللہ! کہاں ہو تم اے بہادری اور دلاوری کے اٹل چشمو! کہاں ہو تم! اے قوت و شوکت کے بلند ستونو؟ کہاں ہو تم اے شرفاء کی اولاد امجاد؟ اور مصیبت کے وقتوں میں مظلوموں کے فریاد کو پہنچنے والو؟! کہاں ہو تم اے

خیر اُمّۃ اخرجت للناس تامرون
بالمعروف وتنہون عن المنکر؟

کہاں ہو تم اے شرفاء و معزز لوگو؟! اے عدل و انصاف کے علم بردارو! اے مساوات کے قائم کرنے والو! اے حکمت کی بات بولنے والو! اے امت کی بنیاد رکھنے اور مضبوط کرنے والو! تم اپنی قبروں کے شگافوں سے کیا نہیں دیکھتے کہ تمہارے خلف کس درجہ کو پہنچ گئے ہیں؟ اور تمہاری

[illegible] مصیبت کا شکار ہے ؟ تمہارے لگائے ہوئے پودے میں کیا گھن لگ رہا ہے ؟ آہ!
تمہارے گوش قدم سے ہٹ گئے، یہ تمہارے طریقوں سے دور ہو گئے، تمہارے راستے سے الگ جا پڑے ہیں، ٹکڑیاں ٹکڑیاں ہو گئے ہیں، ضعف و انحطاط کی آخری حد کو پہنچ گئے ہیں۔ ان پر افسوس و تاسف سے دل پانی پانی، رنج و حزن سے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ وہ آج غیر قوموں کے شکار ہیں۔ آج اتنی سکت نہیں رکھتے کہ اپنے دائرہ حکومت سے مدافعت کر سکیں دشمنوں کو اپنے احاطہ مملکت سے باہر نکال سکیں کیا تمہارے بزرگوں میں کوئی اتنا پکار کر کہنے والا نہیں جو غافلوں کو ہشیار اور سوتوں کو بیدار کرے گمراہوں کو سیدھا [illegible] (انا للہ وانا الیہ راجعون)

"میں کہتا ہوں، اور کسی ایسے خام خیال سے نہیں ڈرتا جو مجھ سے میرے اس قول میں بحث کرے، کہ انسانی تمدن و اجتماع کے آغاز تاریخ سے آج تک کوئی ایسا زبردست فاتح نہیں پایا جاتا۔ اور نہ ایسا جنگ جو گزرا جو متوسط طبقے میں پیدا ہوا ہو۔ اور محض اپنی ہمت سے ترقی کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا ہو کہ بڑے بڑے سورما اس کے آگے جھک گئے ہوں اور گردنیں اس کے آگے خم ہو گئی ہوں۔ اس نے ملک و حکومت کو اتنا وسیع کر لیا ہو کہ موجب حیرت ہو اور اپنی فکر کو حصول منافع کے لئے انتہائی حد تک جولانی دی ہو۔ مگر یہ کہ وہ قضا و قدر کا ضرور قائل ہوگا۔" سبحان اللہ "انسان اپنی زندگی پر حریص ہے، وہ فطرت و جبلت کے موافق اپنے کو زندہ و برقرار رکھنے کا آرزومند ہے، پھر وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جو اس کے لئے ہولناکیوں میں گھس پڑنے، اور خطرناک مہموں میں در آنے، موت و فنا سے دو بدو مقابلہ کرنے کو آسان کر دے۔ اور کچھ نہیں صرف یہی عقیدہ قضا و قدر ہے۔ اور دل کو اس اعتقاد پر ثابت رکھنا!۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ کورش فارسی (کے خسرو) جو تاریخ قدیم میں دنیا کا پہلا فاتح تھا۔ اس کے وسیع ترین فتوحات کے سلسلے کو جس چیز نے جاری رکھا وہ یہی قضا و قدر کا اعتقاد تھا۔ اس اعتقاد کی وجہ سے کوئی خطرہ اسے ہراساں اور کوئی مصیبت اس کے عزم کو شکست نہیں

کرتی تھی ۔ یونان کا اسکندر اعظم بھی انہیں لوگوں میں تھا جن کے دلوں میں یہ عقیدۂ جلیلہ راسخ تھا چنگیز خاں تاتاری، صاحب فتوحات مشہورہ بھی اس عقیدے کے لوگوں میں تھا بلکہ نپولین اول بوناپارٹ (فرانسیسی) قضا وقدر پر سب سے زیادہ استوار رکھنے والا سردار تھا۔ یہی عقیدہ تو تھا جو اُس کے مختصر سے لشکر کو ایک ٹڈی دل پر بڑھائے لئے چلا جا رہا تھا ۔ اُس کے فتح و نصرت کے سامان پیدا کر رہا تھا، اور وہ حسب آرزو فتح حاصل کرتا چلا جاتا تھا ۔

پس کیا اچھا اعتقاد ہے وہ، جو نفوس انسانی کو نامردی و بزدلی کی کثافت سے پاک کرے۔ وہ بزدلی جو اپنے مبتلا کو اس کے طبقے میں درجۂ کمال پر پہنچنے سے سب سے پہلا مانع ہو ۔ ہاں! بیشک! میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ اس عقیدے کو بعض عوام مسلمانوں کے دلوں میں عقیدۂ جبر کے شائبوں سے مخلوط کر دیا ہے ۔ اور یہی خلط ملط بعض مصائب میں ان کے گھر جانے کا سبب ہو گیا۔ جس کی وجہ سے آخری صدیوں میں اُن کو چند حوادث نے گھیر لیا ۔

اب ان علمار مصر سے جو راسخ العقیدہ ہیں ۔ ہماری یہ استدعا ہے کہ اس مبارک عقیدے پر جو بدعات وغیرہ طاری ہو گئے ہیں اُن سے اسے چھڑانے اور بچانے پر کوشش و توجہ مبذول کریں ۔ عامۃ الناس کو سلف صالحین کے عقیدے یاد دلائیں ۔ اور جو کچھ وہ کرتے تھے ۔ ان میں بھی اس کا رواج پھیلائیں ۔ ہمارے ملت کے امام جیسے غزالی اور اُن کے مانند دیگر علمار نے جو کچھ بیان کیا ہے کہ قضا و قدر پر توکل و تکیہ کا اصل مفہوم کیا ہے ۔ اس کو سمجھائیں کہ شریعت غرا، قوم سے عمل میں توکل چاہتی ہے نہ کہ غفلت اور کاہلی و سستی میں ہمیں خدا نے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ اپنے فرائض کو چھوڑ دیں ۔ جو ہمارے حیاتی و قومی واجبات ہیں ، خدا پر توکل کر کے اُن سے کنارہ کش ہو جائیں ۔ یہ دلیل تو دین سے نکل جانے اور پھر جانے کی ہے ۔ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس میں شک نہیں کرسکتا کہ اس وقت ہر مسلمان مکلف پر " دفاع عن الملۃ " فرض عین ہے ۔ اس وقت کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں کو اُن کے عقائد حقہ کی طرف ملتفت کرے،

اُن کی جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرے اُن کی عزت وعظمت کو دوبارہ دلائے، اپنی پہلی شان دوبارہ حاصل کرنے کے لئے اُن کی غیرتوں کو ابھارے۔ سو اعلا، کی بہترین دعوت ہے۔ اور یہ انہیں علما، کے ذمے اور انہیں کی توجہ پر منحصر ہے۔

اب رہا مسلمانوں کا انحطاط، اور دوسری قوموں سے پیچھے رہنا، اس کا سبب نہ عقیدہ ہے اور نہ اسلامی عقائد میں سے کوئی اور دوسرا عقیدہ۔ اس عقیدے کی طرف مسلمانوں کے قومی انحطاط کی نسبت کرنا، گویا ایک نقیض کی نسبت دوسری نقیض کی طرف کرنا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ ایسا ہی جیسے حرارت کی نسبت برف کی طرف اور برودت کی آگ کی طرف۔ ہاں! مسلمانوں کی نشأت کے بعد اُن کی فتح وظفر کو دھکا لگا اور اُن کے اقتدار وعظمت کو صدمہ پہنچا۔ وہ یہ کہ مسلمان اس عالم ترقی میں تھے کہ اچانک دو زبردست صدمے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مشرق سے۔ یہ تاتاریوں یعنی چنگیز خاں اور اس کے اخلاف کی غارتگری تھی۔ دوسرا صدمہ مغرب کی جانب سے یہ یورپین اقوام کا اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں پر حملہ تھا۔ بڑھتی ہوئی حالت میں ایکدم ایسا صدمہ انسان کی صحیح رائے کو کھو دیتا ہے۔ اور بتقاضائے فطرت دہشت وخوف اور بدحواسی وبے ہوشی کا سبب ہوجاتا ہے۔ آخر یہی ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں مختلف حکومتیں رہیں۔ امارت نااہلوں کے ہاتھ آئی۔ اور جہات کی باگ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی جو سیاست کے حسن وخوبی سے بیگانہ تھے۔ یہی حکام اور امرا مسلمانوں کے اخلاق اور طبائع میں نقائص پیدا کرنے والے جراثیم تھے اور اُن پر ادبار وبدبختی کی بلا لانے والے۔ اس سے مسلمانوں کے نفوس میں ضعف جاگزیں ہوگیا۔ اور اُن میں سے بہتوں کی نظریں جزئیات تک محدود ہوکر رہ گئیں۔ جو موجودہ لذت ولطف سے متجاوز نہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی کھوپری پکڑلی اور ہر پہلو، ہر صورت سے اس کو نقصان پہنچانے اور تباہی وخرابی میں مبتلا کرنے کی ٹوہ میں رہنے لگے۔ وہ بھی بغیر کسی صحیح ومناسب سبب اور کسی قوی وواقعی باعث کے اس کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھنے لگے۔ آخر اُس کا ہر شعبۂ حیات ضعف ویاس تک پہنچ گیا۔ جو آج نظر آرہی ہے۔

مگر میں یہ دیکھتا اور کہتا ہوں کہ یہ قوم کبھی مردہ نہیں ہوسکتی۔ جبتک یہ پاکیزہ عقائد اس قوم کے دلوں میں راسخ اور اپنے صحیح مرکز پر ہیں اور جب تک ان عقائد کے نقوش اُنکے ذہنوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس وقت جو مرض بھی عقلی ہو کہ نفسی ان کو عارض ہوگیا ہے ان عقائد صحیحہ کی قوت اُسے رفع کرے گی۔ وہ انشاء اللہ پھر اُسی حالت پر پہنچ جائیں گے جس پر پہلے تھے۔ اور اپنے مضبوط پندھنوں سے کھل جائیں گے۔ اپنے ملک کو نجات و آزادی دلانے میں طامع و حریص اقوام کو مرعوب و خوف زدہ کرنے میں حکمت و بصیرت کے جو طریقے ہیں وہ اختیار کریں گے۔ اور انہیں اُن کی حد پر رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ یہ کچھ آسان ہونا دور نہیں ہے، تاریخی واقعات اس کی تائید کرتے ہیں تم ذرا انہیں ترکوں کو دیکھو جو اسی قوم کے زبردست صدمات اور نقصانات کے بعد بیدار ہوئے ہیں۔ (یعنی تاتاری اور صلیبی جنگوں کے بعد) انہوں نے اپنے جرار لشکر اطراف عالم میں دوڑا دئے۔ اور فتوحات کے میدان اُن کے لئے برابر وسیع ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے ملکوں کو روند ڈالا۔ گردن فراز بادشاہوں کی ناکیں رگڑوا دیں۔ اور یورپ کی حکومتوں کی گردنیں اپنی سطوت و جبروت کے آگے جھکوا دیں۔ حتیٰ کہ دول یورپ عثمانی سلطان کو "سلطان اعظم" کے نام سے یاد کرتی تھیں۔

پھر اب ذرا نظر پھیر کر دیکھو! تم اب بھی ان میں ایک لہر اور ایک حرکت پاؤ گے۔ آخری حادثات کے انجام، اور نامبارک نتائج کے بعد جو خوفناک اثرات ظہور پذیر ہوئے ہیں ترکوں میں یہ حرکت اُن سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ حرکت ترکوں کے ارباب دانش و بصیرت کے افکار و خیالات میں ساری ہوگئی ہے۔ انکے ملک کے اکثر حصوں میں، مشرق و مغرب میں حمایت حق کے لئے بہترین لوگوں کی جماعتیں بن گئی ہیں۔ جنہوں نے اپنی جانوں پر عدل و انصاف کی مدد، شریعت و قانون کی اعانت، اور سعی و عمل کو فرض کر لیا ہے۔ اپنے افکار و خیالات پھیلانے اور اتحاد کے منتشر شیرازے کو جمع کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ متفرق ٹکڑیوں کو ملانے پر کامیاب ہوگئے ہیں انہوں نے اپنے کاموں کی فہرست میں سب سے چھوٹا کام ایک عربی اخبار کا اجرا

قرار دیا ہے، تاکہ جو کچھ اُس میں لکھا جائے دور دراز مقامات پر رہنے والوں تک پہنچ جائے۔ [illegible]سان کی نسبت جو کچھ دل میں لئے ہوئے ہیں وہ اُن تک منتقل ہو جائے میں دیکھتا ہوں کہ بہترین سیاسی انجمنوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان انجمنوں کو ان کے ارادوں میں کامیابی ہو۔ ان کا جو سچا اور حق مقصد ہے۔ تائید الٰہی اس کے شامل حال رہے اور اُسی کے فضل و کرم سے مجھے یہ بھی توقع ہے کہ ان انجمنوں کی حسن سعی کا کوئی ایسا اثر مرتب کرے جو مشرقیوں کے لے عموماً اور مسلمانوں کے [illegible]ے مفید ہوگا۔ انشاءاللہ۔

ادبیات ایران کی ترقی میں
سلطان محمود غزنوی کا حصّہ

(سلسلۂ گذشتہ)

محمود غزنوی کی علمی قدردانیاں | اس سے پہلے آپ جو کچھ پڑھ چکے ہیں اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ محمود غزنوی کی ادبی قدردانیوں نے ایرانی شاعری اور زبان کو عروج کمال پر پہنچا دیا تھا لیکن اس نے ادبی قدردانی اور شعرا نوازی پر ہی اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ وہ علماء کا بھی ویسا ہی قدردان تھا۔ اگر ایک طرف عنصری فردوسی اور فرخی جیسے مایۂ ناز شعراء اس کے دربار کی زینت تھے تو دوسری طرف البیرونی احمد بن حسن میمندی اور بیہقی اور ابن الخمار جیسے مشہور اہل علم اس کی قدر افزائیوں کے خوشہ چیں تھے علماء کی صحبت سے فیض حاصل کرنیکا اسے شوق نہیں حرص تھی مشہور علماء کو اپنے دربار میں لانے کے لئے وہ اپنی پوری کوشش صرف کرتا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ خوارزم شاہیوں سے معرکہ آرائی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بیرونی اور دوسرے علماء کو حاصل کرے اور وہ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس نے بو علی سینا کو بھی اپنے دربار میں بلانیکی کوشش کی لیکن اس نے متعدد مصالح کی بناء پر اس کو قبول نہیں، اور بدقسمتی سے محمود کا دربار ایک ایسے نادرۂ روزگار عالم سے محروم رہا۔ بیرونی کے علاوہ اس کے دربار میں احمد بن حسن میمندی اور دیگر علمائے وقت بھی موجود تھے گو انہوں نے کچھ ایسی نمایاں شہرت حاصل نہیں کی لیکن کوئی شک نہیں کہ یہ اپنے وقت کے کامیاب لوگوں میں سے تھے اور محمود کے دربار کی زینت تھے یہاں مختصر طور سے محمود کے دربار کے بعض مشہور علماء کا مختصر طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

بیرونی

بیرونی کی پیدائش حوالیٔ خوارزم[1] کے ایک قریہ میں ہوئی سنہ پیدائش ۳۶۲ھ (۴ ستمبر ۹۷۳ء) ہے بعض مورخین نے اس کا وطن سندھ بتایا ہے لیکن انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے سندھ میں بیرون (بالنون) ایک قصبہ تھا جسے بعض مورخین نے بیرون پڑھ لیا اور بیرونی کو اسی بیرون کا باشندہ سمجھ لیا لیکن یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ مضافات خوارزم کے ایک قریہ کا رہنے والا تھا۔ جس کا نام غالباً بیرون تھا (یا وہ بیرون شہر کا رہنے والا تھا) بیرونی کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں اتنا معلوم ہے کہ اس کی ابتدائی تربیت آل عراق (خوارزم کا شاہی خاندان) کی سرپرستی میں ہوئی خصوصاً ابو نصر منصور بن علی بن عراق نے اس کی طرف خاص توجہ کی افسوس ہے کہ باوجود بہت کچھ تلاش و تفحص کے بیرونی کا سلسلۂ نسب دریافت نہ ہو سکا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے والدین کی کوئی غیر معمولی حیثیت نہیں تھی کسی معاصر شاعر نے اس کے مجہول النسب ہونے کا طعنہ بھی دیا ہے لیکن بیرونی نے اس کا نہایت معقول اور مناسب جواب دیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس کی عظمت و شہرت بجز ذاتی کمال کے کسی دوسری چیز کی مرہون منت نہیں۔

بیرونی نے جس زمانہ میں جنم لیا تھا وہ عجمی ممالک میں علوم و فنون کی اشاعت کے لحاظ سے

---

[1] "البیرونی" کے نام سے انجمن ترقی اردو کی جانب سے بیرونی کی سوانح عمری شائع ہو چکی ہے (نوشتہ سید حسن برنی علیگ) ہم نے اسی کتاب کو زیادہ تر اپنا ماخذ قرار دیا ہے اس کے علاوہ (کتاب الہند مرتبہ راحو وغیرہ) بھی دو تین کتابیں پیش نظر ہیں لیکن زیادہ تر مدد اسی سے لی گئی ہے حسن برنی صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ بیرونی جیسی عظیم الشان شخصیت کی ایک مستند سوانح حیات لکھ کر انہوں نے علمی طبقہ پر احسان عظیم کیا ہے۔

[2] مقدمہ کتاب الہند از زاخو۔

نہایت شاندار دور تھا۔ وسط ایشیا کا ہر ہر حصہ علوم و فنون کا مرکز بن رہا تھا۔ بیرونی سے پہلے ان ممالک میں علم و فضل میں ممتاز شخصیتیں پیدا ہو چکی تھیں۔ خود بیرونی اور ابن سینا اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ بیرونی کی تربیت بھی تمام تر علمی ماحول میں ہوئی۔ ابو نصر منصور حسن نے اس کی تربیت کی جانب خاص طور پر توجہ کی تھی خود بھی اس زمانہ کا زبردست فاضل اور علوم ریاضی کا ماہر تھا نیز اس نے بیرونی کے نام متعدد کتابیں بھی معنون کی تھیں بیرونی نے ایک قصیدہ میں اپنے مربیوں کے احسانات کا اعتراف کیا ہے اور آل عراق کے سلسلہ میں ابو نصر منصور کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

مضی اکثر الایام فی ظل نعمتہ
علی رتب فیھا علوت کراسیا
فآل عراق قد غذونی بدرھم
و منصور منھم قد تولی غراسیا

… کی عمر تک بیرونی اپنے وطن میں حکومت کی زیر سرپرستی علمی تحقیقات میں مصروف و منہمک رہا۔ بالآخر اس کے مربیوں کی حکومت ختم ہوگئی تو اسے ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا کئی سال تک وہ پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار شمس المعالی والی جرجان و طبرستان کے دربار میں کسی طرح اس کی رسائی ہوگئی۔ یا یہ کہ شمس المعالی نے خود اسے اپنے ہاں مدعو کیا۔ شمس المعالی خود ایک بڑا ادیب اور فاضل تھا۔ علوم حکمیہ سے اسے خاص تعلق تھا اسی لئے اس نے بیرونی کی زیادہ سے زیادہ عزت کی لیکن وہ ایک سخت گیر حکمران تھا بیرونی کو بھی اس کی حرکات پسند نہیں تھیں اس لئے وہ زیادہ عرصہ تک وہاں نہیں رہا۔ اس زمانے میں علی بن مامون خوارزم کا حکمراں تھا اسے جب بیرونی کی قدر و منزلت معلوم ہوئی۔ نیز شمس المعالی سے اس قدر تقرب کے حالات سے تو اس نے خود اپنے یہاں مدعو کیا۔ اپنے ہی قصر میں اسے فروکش کیا۔ اور اس کی عزت و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ دیگر والیان ملک کی

طرح وہ بھی علم و فن کا شائق اور اہل علم کا قدر دان تھا۔ اس کے دربار میں ابو الحسین احمد بن محمد السہیلی[1] جو وزارت کے عہدہ پر فائز تھا علوم حکمیہ کا خاص ذوق رکھتا تھا علی بن مامون کے بعد اس کا بھائی ابو العباس مامون تخت حکومت پر متمکن ہوا وہ بھی نہایت ذی علم اور قدردان علم و فن بادشاہ تھا۔ اس کی علمی قدردانی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا دربار ماہرین علم کا مرکز بن گیا تھا۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ علوم حکمت میں تاریخ اسلامی کی سب سے بڑی شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں[2] یعنی ابوریحان بیرونی اور بوعلی سینا ان دونوں میں عرصہ تک [illegible] بھی چھڑی رہیں خوارزم کے بعد ابن سینا اور بیرونی کو پھر کبھی باہم مجتمع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ بالآخر ناسازگاری روزگار سے یہ علمی مجلس درہم برہم ہو گئی۔ محمود غزنوی نے خوارزم کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابو العباس مامون اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہوا اور

---

[1] السہیلی خوارزم کے اکابرین سے تھا اور اسکا خاندان ریاست و وزارت کا گھرانہ تھا۔ ثعالبی نے لکھا ہے کہ وہ وزیر بن وزیر تھا اور ریاست کے ساتھ علوم و آداب میں بھی امتیاز رکھتا تھا۔ اور کرم و حسن خلق کے لئے مشہور تھا۔ کتاب روضۃ السہیلیہ اس کی تصنیف تھی۔ اسی کے حکم سے الحسن بن الحارث نے کتاب السہیلی تصنیف کی تھی جس میں فقہ شافعی و حنفی سے بحث کی گئی تھی۔ وہ شعر بھی کہتا تھا۔ ابن سینا نے اپنے حالات میں لکھا ہے کہ وہ علوم حکمیہ کا محب تھا۔ اور اسی کے توسط سے ابن سینا بخارا سے آکر علی بن مامون کے دربار میں پہنچا۔ الخ البیرونی صفحہ ۵۵

[2] نظامی سمرقندی لکھتا ہے۔

ابو العباس مامون خوارزم شاہ وزیرے داشت نام او ابو الحسین احمد بن محمد السہیلی و سے حکیم طبع و کریم نفس و فاضل۔ خوارزم شاہ ہم چنیں حکیم طبع و فاضل دوست بود و بسبب ایشاں چندے حکیم و فاضل براں درگاہ جمع شدہ بودند چوں بوعلی سینا و ابو سہل مسیحی و ابو الخیر خمار و ابوریحان بیرونی و ابو نصر عراق الخ (چہار مقالہ مطبوعہ یورپ)

[illegible]م کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔ اس کے دربار کے علماء کچھ تو پہلے ہی محمود غزنوی کی خواہش کے مطابق اس کے دربار میں منسلک ہوگئے تھے[1] کچھ اس انقلاب کے بعد محمود کی بیعت پر مجبور ہوئے البیرونی نے اس موقع پر جب کہ ابوالعباس مامون

---

[1] نظامی عروضی نے اس شاندار علمی مجلس کی تباہی اور انتشار کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے :-

روزگار بر نپسندید و فلک روا نداشت آں عیش برایشاں منغص شد و آں روزگار برایشاں بزیان آمد از نزدیک سلطان یمین الدولہ محمود معروفے رسید با نامہ آں کہ شنیدم کہ در مجلس خوارزم شاہ چند کس اند از اہل فضل کہ عدیم النظیر اند چوں فلاں و فلاں - باید کہ ایشاں را بمجلس ما فرستی تا ایشاں شرف مجلس ما حاصل کنند تا بعلوم و کفایات ایشاں مستظہر شویم و آں منت از خوارزم شاہ داریم و رسول وے خواجہ حسین بن علی میکال بود کہ یکے از افاضل و اماثل عصر و اعجوبہ بود رجال زمانہ و کار محمود در اوج ملک او رونقے داشت و دولت او علوے - و ملوک زمانہ او را مراعات ہمی کردند و شب روبہ اندیشہ ہمی خفتند خوارزم شاہ خواجہ حسین میکال را بجائے نیک فرود آورد و تکرف فرمود و پیش از انکہ او را بار داد حکما را بخواند و ایں نامہ را ایشان عرضہ کرد و گفت محمود قوی دست است و لشکر بسیار دارد و خراسان و ہندوستاں ضبط کردہ است و طمع در عراق بستہ من نمی خواہم کہ مثال او را امتثال نہ نمایم و فرمان او را بنفاذ نہ پیوندم شما دریں چہ گوئید - ابو علی و ابو سہل گفتند ما نرویم اما ابو نصر و ابو الخیر و ابو ریحان رغبت نمودند کہ اخبار صلات و ہبات سلطان ہمی شنیدند - پس خوارزم شاہ گفت شما دو تن را کہ رغبت نیست پیش از انکہ من ایں مرد را بار دہم شما سر خویش گیرید . . . روز دیگر خوارزم شاہ حسین علی میکال را بار داد و گفت نامہ خواندم و بر مضمون و فرمان پادشاہ وقوف افتاد - ابو علی و ابو سہل رفتہ اند لیکن ابو نصر و ابو ریحان و ابو الخیر بسیج می کنند کہ بپیش خدمت آیند الخ (چہار مقالہ نظامی مطبوعہ یورپ)

کی سلطنت خطرہ میں پڑی ہوئی تھی اور محمود اس کو فتح کرنے کی فکر میں تھا بادشاہ کے لئے بہترین مشیر ثابت ہوا اگر اس کی تدبیریں اور مشورے سلطنت کے استحکام میں کارگر نہ ہوئے تو یہ قصور اسکا نہیں مامون کی قسمت کا ہے کہ خود اس کی قوم اس کی دشمن ہوگئی۔

خوارزم کی فتح کے بعد بیرونی بھی دیگر اعیان و مشاہیر خوارزم کی طرح محمود کے ساتھ غزنین پہنچا۔

محمود اور بیرونی کے تعلقات[1]

اس خصوص میں ہم محمود کے بیان میں تفصیلی بحث کر آئے ہیں اس لئے یہاں اس کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ جناب سید حسن برنی صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ عام طور پر محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ ایسا نہیں تھا کہ اس سے کسی خاص شکایت کا موقع پیدا ہوتا یہ دوسری بات ہے کہ خود محمود کے علم میں اسقدر گہرائی نہیں تھی کہ وہ اس کی قدر پہچانتا۔ اور اس کے شایاں شان اس سے سلوک کرتا۔

شروع میں انہوں نے معجم الادبا اور خود اس کے ایک قصیدہ کے کچھ اقتباسات دیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کا سلوک بیرونی کے ساتھ کس قسم کا تھا مسئلہ کی وضاحت کے

---

[1] زاخو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمود اور بیرونی کے تعلقات آخر تک ناخوشگوار رہے اس سلسلے میں اس نے بہت سے دلائل پیش کئے ہیں مثلاً بیرونی سے احمد بن حسن کی رقابت۔ احمد کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کر دیا۔ کتاب الہند کا انتساب سلطان مسعود کی جانب حالانکہ کتاب سلطان محمود کے زمانے میں لکھی گئی ہر کتاب میں جہاں کہیں محمود کا تذکرہ آیا ہے وہاں بجائے سلطان کے امیر لکھا ہے برخلاف اسکے اپنے گذشتہ محسین کا جو محمود سے کہیں فروتر تھے نہایت شاندار الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ محمود کی فتوحات کے متعلق اسکا خیال تھا کہ اس نے ہندوستان کی خوشحالی کو تباہ کر دیا اور ایسے حیرت انگیز حملے کئے جن سے ہندی شل ذروں کے تمام طرف بکھر گئے۔ لیکن برنی صاحب نے زاخو کے اس خیال کی تردید کی ہے تفصیل کیلئے دیکھو البیرونی (طبع دوم) مقدمہ و ترجمات الصمد

دونوں اقتباسات ذیل میں نقل کرتے ہیں :

(۱) بیرونی نے ابوالفتح بستی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں اس نے محمود کا بھی تذکرہ کیا ہی چنانچہ وہ لکھتا ہی ۔

ولم یقبض محمود علی بنعمتہ	محمود نے کسی نعمت کو مجھ سے دریغ نہیں کیا ۔ مجھے مالا
فاغنی واغنی منعضیا من مکا سیا	مال کر دیا اور میری سخت طلبی سے چشم پوشی کی۔
عفا عن جہالاتی وابدیٰ تکرما	میری جہالتوں کو معاف کیا اور میری توقیر کرنے لگا۔
و، و، و، وطری بجاہ رونقی ولباسیا	اور اس کے جاہ سے میری رونق اور لباس تازہ ہو گئے

(۲) یاقوت الحموی نے محمد بن محمود النیشاپوری سے ایک روایت نقل کی ہی جس سے محمود اور بیرونی کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے ۔

ولما استقاہ السلطان الماضی لنفاصتہ امرہ	چونکہ سلطان ماضی (محمود) نے البیرونی کو اپنے خاص کام
وھو جار صدرہ کان یفادش فیما یسنح لخاطر	اور دلی حاجت کے لئے مخصوص رکھا تھا اس لئے امور
من امرالسمار النجوم فیحکی انہ ورد علیہ رسول	سماوی نجوم کے متعلق جو بات اس کے دل میں آتی تھی
من اقصی بلاد الترک وحدث بین یدیہ بما	اس کے تعریض کرتا تھا۔ اس سے ایک قصہ بیان کیا
شاہد فیما وراء البحر نحو القطب الجنوبی من	جاتا ہے کہ اقصے بلاد ترک سے ایک ایلچی آیا اور اس
دور الشمس علیہ ظاہرۃ فی کل دورہا فوق	نے محمود کے روبرو بیان کیا کہ میں نے سمندر پر قطب
الارض بحیث یبطل اللیل فنارع علی عادتہ	جنوبی کے قریب دیکھا کہ سورج کا پورا دور وہاں زمین
فی التشدد فی الدین الی نسبتہ الرجل الی الحاد	پر ظاہر رہتا ہے اور رات نہیں ہوتی یہ سنکر محمود نے
والقرمطۃ علی براتہ اولٰئک القوم من ہذہ	بوجہ اپنی تشدد دینی کی عادت کے فوراً اس شخص کو
الآفات حتی قال ابونصر مشکان ان ہذا لایذکر	ملحد اور قرمطی قرار دیدیا حالانکہ ترک ان آفات سے
ذلک من رای برئیۃ ولکن من شاہدۃ تحکیہ	محفوظ ہیں اس پر ابونصر مشکان نے کہا کہ یہ شخص

…ر وجل وجدہا تطلع علی قوم لم نجعل … ۃ فسال ابا الریحان عنہ فقد … سف لہ علی وجہ الاختصار ویقررہ علی طریق الاقناع وکان السلطان فی بعض الاوقات یحسن الاصغار ویبذل الانصاف فقبل ذلک وانقطع الحدیث بینہ وبین السلطان وقت …

(معجم الادبا بحوالہ البیرونی)

اپنی طرف سے کسی رائے کو پیش نہیں کر رہا ہے بلکہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے بیان کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن شریف کی یہ آیت وجدہا تطلع الخ پڑھی۔ محمود نے اس کے تعلق ابوریحان البیرونی سے پوچھا تو البیرونی نے مختصر مگر شافی طریق پر اس بحث کو سمجھا دیا۔ سلطان محمود بعض اوقات بغور سنتا اور انصاف کرتا تھا۔ اس نے اس کو تسلیم کرلیا اور وہ بات اسوقت وہیں ختم ہو کر رہ گئی۔

بیرونی کے علمی کارنامے بیرونی کے علمی کارناموں کی تفصیل کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ یہ مختصر مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ابتدائے عمر سے لیکر موت کے آخری دم تک وہ علمی تحقیق و تفحص میں منہمک رہا۔ اور کسی موقع پر ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس کی تربیت ابونصر منصور کی سرپرستی میں ہوئی جو خود بہت ذی علم اور علوم حکمیہ کا ماہر تھا۔ البیرونی ایک غیر معمولی ذہن و دماغ لیکر پیدا ہوا تھا اسپر شفیق اور علم دوست استاد اور مربی کی سرپرستی نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اور بہت جلد اس زمانے کے مشہور علما میں اس نے امتیاز پیدا کر لیا اور علمی دنیا میں اس کا ایک خاص وقار قائم ہو گیا۔ غیر معمولی ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ محنتی بھی بہت زیادہ تھا۔ اس کا ذوق تفحص اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ایک کتاب کے لئے وہ ۴۰ سال تک سرگرداں رہا ہے[1]۔

علم وفن کے ہر شعبہ میں اسے یکساں مہارت حاصل تھی فلسفہ، علم ہیئت، ریاضی، جغرافیہ تاریخ تمدن، علم آثار اور علم المذاہب سب میں اسے کامل دسترس تھی ان تمام شعبہ ہائے علوم میں اس کے کارنامے آج بھی حیرت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں عربی و فارسی کے علاوہ اپنی

---

[1] البیرونی صفحہ ۲۱۴

علمی تصنیفات کے سلسلہ میں اسے اور بھی بہت سی زبانیں سیکھنا پڑیں۔ فارسی اس کی مادری زبان تھی عربی چونکہ اس وقت کی تصنیفی زبان تھی اس لئے اس میں بھی اس نے پوری دستگاہ حاصل کی۔ ہندوستان میں اسے سنسکرت زبان سے واسطہ پڑا جو اس وقت کی مشکل ترین زبانوں میں تھی لیکن اس نے اس پر بھی عبور حاصل کر لیا اور غالباً عبرانی اور سریانی زبانوں سے بھی واقفیت پیدا کر لی[1]۔ ان زبانوں کے سیکھنے میں اسے کیا کچھ دقتیں نہیں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ اسکے طالبعلمانہ شوق اور محنت کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سنسکرت اس نے پچپن برس کی عمر میں سیکھی تب وہ روز و مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رہتا تھا شہرزوری اس کے علمی انہماک اور محویت کے متعلق لکھتا ہے۔

"بیرونی ہمیشہ علوم کے حاصل کرنے میں محو رہتا تھا اور کتابوں کی تصنیف میں جھکا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ سے قلم کو، دیکھنے سے آنکھ کو اور فکر سے دل کو کبھی جدا نہیں کرتا تھا مگر سال میں صرف دو دن یعنی نوروز اور مہرجان کے دن جب وہ اپنے کھانے وغیرہ کے سامان کو مہیا کرتا تھا[2]"

بیرونی کے علمی کارناموں کا "البیرونی" میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے اس لئے یہاں انکا بیان تحصیل حاصل ہوگا۔ اس کے علم و فضل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آخر عمر تک اس نے تقریباً ۱۴۷ کتابیں لکھیں جن میں مختصر رسائل اور ضخیم کتابیں سب کچھ شامل ہیں اس کی ان تالیفات و تراجم میں ہر علم و فن کی کتابیں ہیں اور تقریباً تمام علوم و فنون کو محتوی ہیں[3]۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار کس قدر افسوسناک ہوگا کہ ان بے شمار کتابوں میں سے ہندوستان یورپ اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں ہنوز صرف ۲۲ کتابوں کا پتہ چلا ہے۔ بہت سے مشہور علما نے خود اس

---

[1] البیرونی صفحہ ۲۱۳   [2] شہرزوری بحوالہ البیرونی صفحہ ۲۱۴

[3] تفصیل کے لئے دیکھو البیرونی صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۹ ایضاً ۱۲۹

کے نام پر بھی اپنی کتابیں معنون کی ہیں ان میں ابونصر منصور اور ابوسہل مسیحی خاص طور پر قابل
ذکر ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کو بیرونی سے کس قدر محبت و عقیدت تھی
... کی بعض کتابیں کتاب الہند وغیرہ یورپ سے شائع ہو چکی ہیں۔ اب ہندوستان میں بھی
اس طرف توجہ ہوئی ہے چنانچہ قانون مسعودی کو (مع ترجمہ انگریزی و اردو) مسلم یونیورسٹی
... کیا جا رہا ہے انجمن ترقی اردو سے کتاب الہند کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ ممکن ہے
اسکے بعد دوسری کتابوں کی طرف بھی توجہ ہو۔

خواجہ احمد بن حسن میمندی

خواجہ احمد بن حسن میمندی کے ابتدائی حالات افسوس ہے کہ تفصیل سے معلوم نہ ہو سکے وہ
محمود غزنوی کا بہت کامیاب وزیر تھا۔ زاخو کا خیال ہے کہ اس کے اور بیرونی کے تعلقات کشیدہ تھے بلکہ اسی کے مشورے سے بیرونی کو ہندوستان جلاوطن کیا گیا تھا لیکن محمود کے دربار
میں حسنک نام ایک اور ہستی بھی تھی اس کی تربیت خود محمود کے ہاتھوں ہوئی تھی اس لئے
وہ اسکا خاص خیال رکھتا تھا۔ حسنک اور احمد بن حسن کے درمیان معاصرانہ چشمک تھی اور اسکا
آخری نتیجہ یہ ہوا کہ احمد بن حسن کو بھی ہندوستان کے قیدخانوں میں ڈلوا دیا گیا۔ محمود کے
انتقال کے بعد مسعود اور احمد دونوں بھائیوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی جس میں مسعود کو فتح
اور محمد کو شکست ہوئی حسنک محمد کا طرفدار تھا اس لئے اس پر قرمطی ہونے کا الزام لگا کر پھانسی دیدی
گئی، خواجہ احمد بن حسن کے دن پھرے اور ہندوستان کے قیدخانہ سے رہائی ملی مسعود نے
تمام بڑے بڑے عہدیداروں کا تقرر کیا لیکن وزیر اعظم کی جگہ ہنوز خالی تھی سب کی نظریں
احمد بن حسن میمندی پر پڑ رہی تھیں۔ مسعود نے ابوسہل ہمدانی کے ذریعہ پیام بھیجا لیکن احمد بن حسن
بوڑھا ہو گیا تھا اور گوشہ عافیت اختیار کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے ابوسہل پر ٹال دیا کہ اس
کام کے لئے تم مجھ سے زیادہ انسب ہو آخر مجبور ہو کر سلطان مسعود نے خود اس سے درخواست
کی اسے تخلیہ میں بلا کر دیر تک گفتگو کی اور کہا

"خواجہ آپ کیوں نہیں اس فرض کو اپنے ذمہ لیتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ آپ
میرے لیے بمنزلہ باپ کے ہیں میرے سر پر اس وقت بہت سے اہم کام ہیں اور یہ
مناسب نہیں کہ ایسے موقع پر آپ اپنی قابلیت سے مجھے محروم رکھیں۔

احمد بن حسن نے ضعیفی کا عذر پیش کیا لیکن مسعود کا اصرار برابر جاری رہا اس نے وعدہ کیا کہ بجز سیر و شکار اور شراب و کباب کے سلطنت کے تمام معاملات اسی پر چھوڑ دے گا بالآخر خواجہ احمد بن حسن نے چند شرائط کے ساتھ اسے منظور کر لیا۔ تفویض منصب کی رسم بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ادا کی گئی اور نہایت اہتمام سے خلعت اور قلمدان وزارت تفویض کیا گیا۔

خواجہ نے نہایت تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام دئے اور تھوڑے عرصہ میں تمام سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا۔ باوجودیکہ امراء اور اہل دربار میں باہمی نزاع اور مخاصمت بھی جاری رہی لیکن محض خواجہ احمد بن حسن کے اثر سے مملکت کے نظم و نسق پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑا اس کے مشورے سے تمام بڑے بڑے خود سر جنرل معزول کر دیے گئے جس کی وجہ سے سلطنت میں کسی بغاوت اور شورش نے جڑ نہیں پکڑی

بیہقی

پورا نام ابوالفضل بن الحسن البیہقی۔ پیدائش ۳۸۶ھ (۹۹۵ء) وفات ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) اپنے وقت کا مشہور عالم و فاضل اور تاریخ کا ماہر تھا۔ اس کی کتاب کا نام "تاریخ بیہقی" یا "تاریخ آل سبکتگین" ہے تمام جلدیں مجلدات بیہقی کے نام سے موسوم ہیں۔ ابتدائی حصہ یعنی ناصرالدین سبکتگین کے متعلق "تاریخ ناصری" کے نام سے مسعود کے متعلق حصہ "تاریخ مسعودی" اور محمود کے متعلق "تاج الفتوح" کے نام سے بھی علیحدہ علیحدہ طور پر موسوم کیا جاتا ہے" روضۃ الصفاء کے مقدمہ میں ہے کہ یہ کتاب کل ۳۰ جلدوں میں ہے۔ مصنف کا ذکر حیدر رازی۔ ضیاالدین برنی ابوالفضل اور جہانگیر نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا ہے باوجود اس قدر مشہور ہونے کے

...جلدوں کا بھی پتہ نہیں بچی کچی جلدیں بھی اب ہندوستان میں نایاب ہیں صرف تین نسخہ یہاں تھے جو ایک انگریز مستشرق سٹرارسے نے حاصل کئے اور تین اور نسخوں کی مدد سے جو یورپ کے کتب خانوں میں تھے۔ ایک ایڈیشن شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں ۷، ۸، ۹ مکمل اور ۱۰، ۶ کے کچھ اجزا شامل ہیں۔

بیہقی کی تاریخی فضیلت اس کے ان الفاظ سے عیاں ہو سکتی ہے۔

آدمی، آدمی کے دل سے پہچانا جا سکتا ہے دل قوی یا ضعیف ہوتا ہے جو کچھ کہ وہ سنتا ہے یا دیکھتا ہے اور جب تک کہ وہ برا یا بھلا نہیں سنتا یا دیکھتا اس وقت تک وہ اس دنیا کی رنج و خوشی سے بے خبر رہتا ہے لہذا معلوم ہونا چاہئے کہ آنکھ اور کان (انسان کے) دل کے پاسبان اور مخبر ہیں وہ جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں۔ اس کی خبر وہ دل سے کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھا کر عقل کو پہنچا دے جو نیک و بد کی تمیز کر سکتی ہے اور پہچان سکتی ہے کہ کونسی چیز مفید ہے اور کونسی مضر۔ یہ غرض ہوتی ہے جس کے لئے انسان مخفی باتوں اور ان چیزوں کا جن کے متعلق اس نے کبھی کچھ سنا ہے اور نہ دیکھا ہے اور ان باتوں کا جو زمانہائے ماضی میں واقع ہوئی ہیں علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ابوالخیر الحسن

ابوالخیر الحسن بن سوار بن بابا بن بہرام (وبقول ابن ابی اصیبعہ بہنام) المعروف بابن الخمار ۳۳۱ھ میں بغداد میں پیدا ہوا۔ یحیٰی بن عدی مشہور منطقی سے فلسفہ پڑھا۔ بعدازاں خوارزم میں مامون کے دربار میں پہنچا جہاں خوارزم شاہیہ کے کنف حمایت میں انکے انقراض حکومت تک بسر کرتا رہا ۴۰۷ھ (۱۰۱۶ء) میں خوارزم کی تباہی کے بعد وہ محمود کے ساتھ چلا گیا محمود اس کی کمال تعظیم و تکریم کرتا تھا یہاں تک مشہور ہے کہ اس کے سامنے زمیں بوس ہوتا تھا۔ ابوالخیر نہایت منکسر

مزاج تھا لیکن سلاطین وامراسے تزک واحتشام سے ملتا تھا تین سو غلام رکاب میں رہتے تھے اہل علم اور زہاد کی خدمت میں پیادہ جاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس پیادہ روی کو جابرون اور فاسقون کی عیادت کا کفارہ قرار دیتا ہوں۔ ایک مرتبہ محمود کے دربار سے واپس آتے ہوئے گھوڑے سے گر کر ضربات کے صدمہ سے ایسا بیمار رہا کہ جانبر نہ ہو سکا۔

ابو الخیر اخیر زمانے میں عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا وہ سریانی سے عربی میں کتب حکمت کا ترجمہ کرتا تھا اور اپنے زمانے کے مشہور حکما میں شمار ہوتا تھا[۱]

اس مضمون کے لکھتے وقت مندرجہ ذیل کتابیں پیش نظر تھیں۔

۱۔ تذکرۃ الشعرا مطبوعہ یورپ

۲۔ چہار مقالہ "

۳۔ لباب الالباب "

۴۔ شعر العجم حصہ اول و چہارم

۵۔ مقالات شبلی

۶۔ البیرونی

۷۔ مقدمہ زاخو کتاب الہند

۸۔ ایلیٹ

۹۔ آثار الکرام

۱۰۔ محمود غزنوی کی بزم ادب

۱۱۔ تنقید شعر العجم از محمود شیرانی

مضمون مولانا اسلم عظیم آبادی (رسالہ جامعہ)

---

[۱] البیرونی صفحہ ۱۰۵

طولسطائے اور میکائیلو فیچ کی خط و کتابت

یہ طولسطائے اور نواب اعظم نکولائی میکائیلو ویچ کی یہ خط و کتابت جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھی اس صدی کی ابتداء سے متعلق ہے۔ روسی زبان سے ہر۔ی لیون نے جرمن میں ترجمہ کیا ہے جو سہ ماہی رسالہ "سیاست و تاریخ" میں شائع ہوا ہے۔ خاکسار اسے اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سب سے پہلے جرمن مترجم کا ایک نوٹ ہے اس کے بعد ایک خود نواب اعظم کا اور پھر وہ خطوط ہیں جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے۔ جرمن مترجم کا جو مقدمہ ہے اس کے ترجمے میں میں نے ذرا اجمال سے کام لیا ہے صرف ضروری حصوں کا ترجمہ "جامعہ" کے ناظرین کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ مگر نواب اعظم کے مقدمے اور خطوط کا پورا پورا ترجمہ کیا گیا ہے۔

محمود

دیباچہ مترجم

اس خط و کتابت کے متعلق بعض تشریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں نواب اعظم نکولائی میکائیلو ویچ، زار روس نکولا اول کا نواسا تھا۔ اور زار سکندر سوم کا چچا زاد بھائی عام سیاسی کاموں میں اس نے کبھی کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ اس فوجی خدمت کے بعد جو شاہی خاندان کے ہر رکن پر فرض ہوتی تھی اس نے اپنی زندگی روسی تاریخ کے لئے وقف کر دی اس نے روس کی تاریخ جدید یعنی سکندر اول کی حکومت پر جس سے اسے خاص ذوق تھا کئی معرکۃ الآرا تصانیف کی ہیں اس کی بعض تصانیف کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ روسی تاریخی مجلس کا صدر تھا ۱۹۱۹ء کی ابتدا پر شاہی خاندان کے بعض دوسرے ارکین کے ساتھ اسے بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا حالانکہ سیاسیات میں اس نے کبھی کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

نواب اعظم کے بعض پرانے کاغذات میں جو ابھی حال میں دستیاب ہوئے ہیں طولسطائے کے خطوط اور انکے جوابات بھی ہیں۔ نواب اعظم اور طولسطائے کی پہلی ملاقات ۱۹۱۰ء میں کریمیا میں ہوئی۔ طولسطائے کی عمر اس وقت ۸۲ سال کی تھی۔ نواب اعظم کو طولسطائے کے متعلق سرکاری حلقوں میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ بالکل غلط اور بے بنیاد تھیں۔ ان کی پہلی گفتگو کا موضوع فرقہ "دوخوبور" تھا (اس لفظ کا ترجمہ اُردو میں معقولئے اور انگریزی میں Rationalist کیا جا سکتا ہے) اس فرقے کے متعلق انیسویں صدی کے آخر میں بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ روس میں اس فرقے کی ابتدا سترہویں صدی ہی میں ہو چکی تھی۔ یہ لوگ تمام مذہبی اصولوں کی بنیاد عقل پر رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں کلیسا کے ناقابل تبدیل اصولوں اور ہر طرح کی پابندیوں یہانتک کہ سیاسی اور فوجی فرائض اور لگان کی ادائیگی میں بھی عذر تھا۔ اس فرقے اور حکومت کے تعلقات میں ۱۸۲۰ء ہی سے کشیدگی شروع ہوگئی۔ اور اس جماعت کے اراکین کو خاص طور پر "خطرناک" سمجھا جانے لگا۔ ۱۸۴۰ء میں ان سے بعض کو جلا وطن بھی کیا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں اختلافات نے اور بھی شدید صورت اختیار کرلی اور طولسطائے اور اس کے ساتھیوں کے مشورے کے مطابق اس جماعت کے ۷۰۰۰ اشخاص کینیڈا چلے گئے۔ طولسطائے کو ان لوگوں سے دلی ہمدردی تھی۔ ان لوگوں کے اصول کچھ ایسے واقع ہوئے تھے کہ کینیڈا میں بھی وہاں کی حکومت انکے لئے بعض قوانین بنانے پر مجبور ہوئی۔ اس کے بعد ان میں سے کچھ تو وہاں رہنے پر راضی ہوگئے اور کچھ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے برطانی کولمبیا چلے گئے۔ ان معقولین کی ہجرت کے مسئلہ پر طولسطائے اور میکائیلووچ میں بہت گفتگو ہوئی ہے۔

طولسطائے نے نواب اعظم کے نام جو خط لکھا ہے اس میں ایک دوسرے نہایت اہم مراسلے کا ذکر ہے جو طولسطائے نے زار نکولائی دوم کے نام لکھا تھا۔ اور جو نواب اعظم نے زار تک پہنچایا تھا۔

... ہنری جارج کے مسلک کا پیرو تھا۔ اس کی کتاب "اجتماعی مسائل" کے
... ترجمہ پر طولسطائے نے ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ہنری جارج کے خیال میں تمام مصائب
زمین کی تقسیم پر۔ زمین پر ہر شخص کو وہی حق حاصل ہے جس طرح ہوا اور سورج کی روشنی
پر۔ زمین پر جو لگان ہوگا وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ ریاست کی ملک ہوگا اور سب کے
کام آسکے گا۔ ریاست کو اس کے بعد کسی اور قسم کی آمدنی کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی
... کی ضروریات کے لئے یہی رقم کافی ہوگی۔ ہنری جارج نے اس طریق کو Single
Tax System یا "وحدانی طریقہ مالگذاری" کہا جاتا ہے۔

طولسطائے ہنری جارج کا ہم خیال تھا۔ اس نے زار کے نام جو خط لکھا تھا اس میں اس
سے اسی طریق پر کاربند ہونے کی درخواست کی تھی۔ اس خط میں اس نے حکومت وقت کی
اچھی طرح خبر لی ہے اور زار کو جسے خط میں وہ "برادر عزیز" کے لقب سے یاد کرتا ہے اس
بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ قوم کو آزادی رائے اور آزادی تقریر عطا کرے۔
خط میں طولسطائے یوں رقمطراز ہے:۔

"اگر روسی قوم کو اس بات کی آزادی ہو کہ وہ اپنے دل کی بات زبان پر لاسکے تو
میرے خیال میں وہ اس وقت یہی کہے گی۔ سب سے پہلے تو مزدور پیشہ لوگوں کا مطالبہ ہوگا کہ
تمام غیر مساوی قوانین ختم ہو جانے چاہئیں جنہوں نے ان کی حیثیت "اچھوت" کی سی بنادی ہے
اور جن کی وجہ سے انہیں وہ تمام حقوق حاصل نہیں جو اور شہریوں کو حاصل ہیں۔ انہیں اس
بات کی آزادی ہو کہ وہ جہاں چاہیں آباد ہو سکیں، جو چاہیں پڑھیں اور اپنی روحانی ضروریات
کے مطابق جس عقیدہ کی چاہیں پیروی کریں مگر جو سب سے بڑی بات ہے وہ یہ ہے کہ تمام
یعنی تمام دس کروڑ نفوس بیک زبان یہ کہیں گے کہ زمینداری کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ زمین پر سے
شخصی قبضے کے اٹھنے کا سوال ایسا ہے جو میری رائے میں تمام روسی قوم کے پیش نظر ہے۔
زندگی کے ہر دور میں انسان کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ زندگی کو ایک قدم آگے اعلیٰ معیار

کی طرف لے جائے۔ آج سے پچاس سال پہلے یہ قدم روس سے غلامی کا ملیا میٹ کرنا تھا آج یہ قدم یہی ہے کہ مزدور پیشہ لوگ اس جماعت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو بلا وجہ انکے سر پر سوار ہے روس میں جہاں آبادی کا بیشتر حصہ کھیتی سے پیٹ پالتا ہے یہ ممکن نہیں کہ محض کارخانوں اور فیکٹریوں کو قومیانے (nationalise) سے یہ مشکلات دور ہو جائیں روسیوں کے لئے تو ناگزیر ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ زمین مخلوق خدا کی ملکیت ہے یہی ہے وہ آرزو جو آج روسیوں کے دل میں جگہ کیے ہوئے ہے اور تمام قوم حکومت سے اس بات کی متوقع ہے کہ وہ اسے واقعہ کی صورت دے گی۔ پھر رعایا کو روز روز دبانے کے لیے نئے ہتھیاروں کی ضرورت باقی نہ رہے گی حکومت کا بھی وہی مقصد ہو گا جو قوم کا ہے۔ اور وہ مقصد بس یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلائی جائے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ آج یہ "ارضی جائداد" اسی قدر بے انصافی پر مبنی ہے جتنی آج سے پچاس سال پہلے "جسمانی جائداد" تھی۔ اور میں خیال کرتا ہوں اس کے دور ہو جانے سے روسی قوم اپنی آزادی، خوشحالی اور اطمینان کے اعتبار سے بہت آگے بڑھ جائے گی۔ میں یہ بھی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر حکومت نے اس قسم کا قدم اٹھایا تو روز کے ان تمام انقلابی اور اجتماعی جھگڑوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو آج مزدور پیشہ جماعت کو بھڑکا رہے ہیں اور جو قوم اور حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہیں۔"

یہ ہے وہ خط جو طولسطائے نے زار کے نام لکھا اور نواب اعظم کو بھیجا جنہوں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے زار تک پہنچایا۔ اس موضوع پر خود نواب اعظم نے دو خطوط طولسطائے کو لکھے ہیں جن میں انہوں نے طولسطائے سے اپنا اختلاف رائے ظاہر کیا ہے۔ مگر انکا بھی یہ خیال تھا کہ سرکاری عمال اور محکموں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خطوط پہلے روسی انقلاب (۱۹۰۵ء) سے بھی پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ خطوں پر جو تاریخیں ہیں وہ پرانی روسی جنتری کے حساب سے ہیں جسے یورپی کیلنڈر سے ۱۳ دن پیچھے سمجھنا چاہیے۔

طولسطائے اور نواب اعظم کے خطوط سے پہلے اسی موضوع پر نواب اعظم نے ایک نوٹ لکھا جو درج ذیل ہے ۔

مقدمہ خط وکتابت

مجھے عرصہ سے لیو طولسطائے سے نیاز حاصل کرنے کا شوق تھا۔ خزاں ۱۹۰۱ء میں بمقام کریمیا مجھے اسکا بہت اچھا موقع ہاتھ آیا۔ میں وہاں دو ہفتے کے لیے اپنے بھائی سکندر سے ملنے گیا ہوا تھا۔ طولسطائے بیگم پانین[1] کے مکان میں جو پاس ہی تھا مقیم تھے میں ۲۲ر اکتوبر کو کریمیا پہنچا۔ میں نے سنا تھا کہ طولسطائے اکثر پیدل اور گھوڑے پر سیر کیا کرتے ہیں چنانچہ ان سے ملاقات کے خیال سے میں بے نتیجہ روزانہ ادھر اُدھر گھوما کیا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چل سکتا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ان کے نام ایک پرچہ لکھ کر خود دریافت کروں کہ کیا میں مل سکتا ہوں۔ اسکا جواب میں نے ان سے صاف صاف اور بے تکلفانہ مانگا۔ ادھر زبان پر بات آئی اور اس نے واقعہ کی صورت اختیار کی۔ میں نے ۲۶ر کی صبح کو خط بھیجا اور میرے پاس فوراً جواب آیا کہ میں اسی دن ایک بجے ان سے مل سکتا ہوں۔ میں پہنچا تو بیگم طولسطائے نے میرا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور کہا کہ ان کے شوہر ابھی اوپر کی منزل سے نیچے آتے ہیں۔ دو منٹ میں طولسطائے تشریف لے آئے مجھے نہایت محبت سے سلام کیا اور مجھ سے اس بات کی معافی چاہی کہ انہوں نے میرے پرچے کا جواب تحریری نہیں بلکہ ٹیلیفون کے ذریعے دیا۔ لیکن اس کا سبب یہ بتایا کہ وجع مفاصل کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں درد تھا بیگم صاحبہ چلی گئیں۔ ہم دونوں پاس پاس بیٹھے اور گفتگو شروع ہوئی۔ ان کی جسمانی حالت کے متعلق پہلی نظر میں تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت معمر اور ناتواں ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد یہ خیال تبدیل کرنا پڑا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ خوب تندرست اور

---

[1] انقلاب سے پہلے بہت رئیس عورت تھی اور اپنی فیاضی اور نیک دلی کے لیے مشہور تھی ۔

[illegible] انکا لباس سادہ تھا۔ ایک خاکی رنگ کا کرتہ اور پیٹی ۔ اسی رنگ کا چوڑے پائیچے کا پاجامہ سادے جوتے جن کا اوپر کا حصہ پائیچوں کو ڈھک لیتا تھا اگر کوئی کہے کہ طولسطائے کا لباس میلا کچیلا اور جسم صاف نہیں رہتا تو اسکا اعتبار نہ کرنا چاہئے ۔ برخلاف اس کے وہ نہایت صاف ستھرے ان کے ہاتھ پاکیزہ اور ناخون بالکل ٹھیک ہیں ۔ البتہ ان کی زبردست سفید ریش میں کسی قدر ذرا سا بے ترتیبی پائی جاتی ہے ۔ مگر اس میں بھی کنگھی کی ہوئی ہوتی ہے جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے وہ ان کی نیلے رنگ کی آنکھیں ہیں انکی نگاہ دل کے پار ہوجاتی ہے آنکھیں کسی قدر ڈھیلی ہوئی ہیں اور گال خوب ابھرے ہوئے ہیں ۔ اس وجہ سے اور بھی اثر ہوتا ہے ۔ آنکھوں سے خوش اخلاقی اور کسی قدر رنج مگر اس کے ساتھ ہی فہم و عقل پختگی تیز اور اصابت رائے کا اظہار ہوتا ہے ۔ نہ تو ان کی آنکھوں میں کج نگہی اور نہ انکے طرز عمل میں کسی قسم کی خرابی ہے ، تمام چیزیں نہایت متناسب اور موزوں ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ دوران گفتگو میں ان کی نگاہ مخاطب پر جمی رہتی ہے خصوصاً ایسے موقع پر جب انہیں کسی بات سے خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہو اور اسے وہ تشریح کے ساتھ بیان کر رہے ہوں ان کی نگاہ مخاطب کی آنکھوں پر جم جاتی ہے ۔ مجھے تو ان کی شخصیت بہت ہی بھلی معلوم ہوئی ۔

ہماری گفتگو تین مسائل پر ہوئی :-

۱۔ زار سکندر اول اور فیودر کسیچ[1] ۔

۲۔ کوہ قاف کے دو خوبور

۳۔ میرا اپنا بھی مسئلہ

---

[1] فیودر کسیچ ۔ پیدائش ۱۸۶۰ء [illegible] سکندر اول کی موت کے بعد لوگوں میں یہ خیال عام تھا کہ بوڑھا دراصل سکندر اول ہے اور سکندر اول کا انتقال ہوا ہی نہیں ۔ ان کی جگہ کسی اور کو دفن کر دیا گیا ہے ۔ بعض مورخین نے بھی اس شبہ کا اظہار کیا ہے خود نواب اعظم نے اس موضوع پر مفصل کتاب لکھی ہے ۔

یہ آخری سوال ان کے لئے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہوا۔ انہوں نے بہت داد
[illegible] بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا کہ " یہ سوال بہت نادر اور یہ واقعہ نادر تر"
[illegible] اس اجمال کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا۔

[illegible] موضوع کے سلسلے میں طفلس کے سابق گورنر نواب شیر واکلدزے کے رتبے اور خود طولسطائے نے اس میں جو حصہ لیا اس پر ان میں اور مجھ میں اختلاف تھا یہاں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ طولسطائے اپنی رائے میں پکے تھے اور مجھ پر اعتراضات کر رہے تھے مگر پھر بھی انکی [illegible] نہ ہوئی اور اس طرح وہ مجھے ہمیشہ موقع دیتے رہے کہ میں اپنی رائے کا اظہار کروں گورنر کے متعلق طولسطائے مجھے اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ ویسے وہ نہایت نیک آدمی ہیں مگر حاکم اچھے نہیں۔ دو خوبوروں کے طفلس میں آباد ہوجانے کے بعد وہ حالات کو سدھارنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایک طرف تو ریاست کے تمام کل پرزوں کا ڈھیلا ہوجانا اور دوسری طرف خود طولسطائے کی تعلیمات جن کی وجہ سے اس جماعت کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایسی مشکلات تھیں جنہوں نے نواب کے کام کو بہت دشوار بنا دیا۔

مگر طولسطائے مجھے یہی یقین دلا رہے تھے کہ اس جماعت کو روسی سرحد میں رکھنے کے لئے خود ان سے جو کچھ بن پڑا انہوں نے کیا۔ مگر جب انہوں نے حکومت کی بے پروائی کا اچھی طرح اندازہ کر لیا تو ان کی بھلائی کی خاطر انہیں غیر ملک میں جانے کا مشورہ دیا۔ طولسطائے کی رائے میں اب دو خوبور کناڈا میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر میری معلومات اس کے برعکس ہیں، ہاں جب میں نے کہا کہ دو خوبوروں کے نواب شیر واکلدزے سے اب بھی ایسے تعلقات ہیں اور وہ انہیں کنیڈا سے خطوط لکھتے ہیں تو طولسطائے بہت پریشان ہوئے۔ میں نے خاص طور پر طولسطائے کے دو شاگردوں چلکو اور برجکو کا ذکر کیا جو اکثر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور جن کا اس جماعت پر ہمیشہ اچھا اثر نہیں ہوتا۔ اس پر طولسطائے نے دبی زبان سے

یہ تسلیم کیا کہ ان کے شاگرد انہیں ہمیشہ اچھی طرح نہیں سمجھتے ہیں مگر بہرحال وہ حکام اور عمال سے تو بہتر ہی ہیں۔

سکندر اول پر ہماری گفتگو نے بہت طول کھینچا۔ طولسطائے نے کہا کہ ان کا اپنا ارادہ تھا کہ اس روایت پر جو سکندر اول کی موت اور ہیرنیودر کسیچ کے بھیس میں سائبیریا میں زندگی بسر کرنے کے متعلق مشہور رہے کچھ لکھیں۔ اگرچہ ابھی تک اس روایت کی نہ صرف تصدیق نہیں ہوسکی ہے بلکہ اکثر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ بہرحال طولسطائے کو سکندر اول کی زندگی سے بہت دلچسپی تھی، در واقعی اس میں بہت کچھ جدت، الجھاؤ اور دورنگی پائی جاتی ہے طولسطائے کے خیال کے مطابق اگر سکندر نے اپنی زندگی تنہائی ہی میں بسر کرنے کی ٹھان لی تو واقعی اس نے پورا پورا جرمانہ ادا کر دیا۔

اسی سلسلے میں ذاتی مزاج کی بحث چھڑ گئی جس کے متعلق مجھے خاموشی اختیار کرنی چاہئے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے متعلق گفتگو ہوئی جنہیں ہم دونوں جانتے ہیں مثلاً بیگم بیلیپے اور الوماشو والوا اور بیگم الیزا بتھا انو ناچرتکوزا۔ یہ دونوں لارڈ رڈ اسٹوک[1] اور پچکو[2] کی تعلیمات کی پیرو ہیں۔ ان تعلیمات کے بارے میں طولسطائے نے کہا کہ چاہے ان کی نیت اچھی ہو مگر ان کی تعلیمات بنیادی طور پر غلط اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ بیٹھے بیٹھے جب ایک گھنٹہ ہوگیا تو میں نے رخصت چاہی پہلی ملاقات میں میں انکا زیادہ وقت نہ لینا چاہتا تھا۔ انھوں نے مجھے دروازے تک پہنچایا اور کہا کہ انہیں مجھ سے مل کر بہت خوشی حاصل ہوئی۔

دوسری مرتبہ شام کے کھانے سے قبل میں طولسطائے سے ملنے گیا۔ انھوں نے

---

[1] انگریز نواب۔ ایک طرح کے مذہبی و اخلاقی استباع کا مروج۔ اٹھارہویں صدی میں روس کے اعلیٰ طبقوں میں اس کے بہت سے پیرو تھے۔

[2] لارڈ رڈ اسٹوک کی موت کے بعد اس کے خیالات کی اس شخص نے روس میں ترویج و اشاعت کی۔

ہے اور خلوت خانہ میں بلایا۔ اور میرا ان الفاظ سے استقبال کیا :۔
"آپ کو دیکھ کر مجھے حد درجہ مسرت حاصل ہوئی مجھے آپ کا انتظار تھا میرا ضمیر مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کچھ کر رہے ہیں اس پر آپنے اچھی طرح غور بھی کر لیا ہے اس لیے کہ آپ مجھ سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ میں بذات خود طاعون ہوں مجھے کلسا سے باہر کیا گیا ہے لوگ مجھ سے خوف زدہ ہیں اور آپ پھر بھی میرے پاس آتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ میں طاعون ہوں مجھے ایک طرح کی وبا خیال کیا جاتا ہے۔ آپ کو میری وجہ سے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا لوگ آپ کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھیں گے کہ آپ ایسے شخص سے ملتے ہیں جو سیاسی اعتبار سے بہت مشکوک ہے۔"

اس غیر متوقع تمہید کا جواب میں نے یہ دیا کہ "میری عمر اس وقت ۳۳ سال کی ہو چکی ہے۔ شادی میری ہوئی نہیں۔ لوگ مجھ سے خوب واقف ہیں مجھے نتائج کا ذرہ برابر خوف نہیں۔ اور پھر جہاں تک حکومت کا تعلق ہے مجھے اس کے متعلق آپ کی نسبت ذرا زیادہ حسن ظن ہے۔"

پھر وہی دو خوبوردن اور شیبر واشدنسے کا قصہ شروع ہوا مگر طولسطائے میری رائے بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ان کو اپنے مختلف النوع شاگردوں پیروؤں کی بات ہمیشہ بلا چون و چرا تسلیم کر لینا چاہیے ان کی وجہ سے طولسطائے کی حیثیت نازک ہو جاتی ہے اکثر تو یہ بات سمجھتے ہی نہیں اور اکثر ان کا عمل طولسطائے کی مرضی کے سراسر خلاف ہوتا ہے طولسطائے اپنے شاگردوں میں سے چرتکو[1] اور برجکو کو نہایت ہوشیار اور عقلمند تصور کرتے ہیں۔

ان میں سے پہلے سے میں بھی واقف ہوں۔ گو وہ صاف دل، ایمان دار اور مخلص بھی مگر میری رائے میں وہ غیر معمولی طور پر کم سخن ہیں۔ اس کے بعد ہم نے تبت کی مشہور

---

[1] طولسطائے کا مشہور شاگرد اور اس کی تصانیف کا ناشر۔

شخصیت میکا اشا خوویچ[1] اور مسئلہ ضمیر پر اس کی بوسرکتہ الآراء تفسیر ہوئی ہے اس پر گفتگو شروع کی۔ اگرچہ طولسطائے کی رائے میں وقت آگیا ہے کہ روس کو آزادی ضمیر حاصل ہو جائے مگر میکا اشا خوویچ کے متعلق ان کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ وہ اسے شہرت کا بندہ اور کم ظرف انسان تصور کرتے ہیں مجھے یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی اس لئے کہ میری بھی اس کے متعلق یہی رائے تھی کہ وہ محض ہردلعزیزی حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہتا ہے ورنہ اسے خود اپنی بات پر یقین نہیں!

پھر روس کی موجودہ صورت حال مثلاً انتشار حکومت، طریق کار کا فقدان، وزراء کی ضد اور ناعاقبت اندیشی۔ سپ یگنس[2] کی ناقابلیت، ویُس[3] کی گستاخی، عام لا مذہبیت وغیرہ پر بات چیت ہوتی رہی۔ طولسطائے نے لا مذہبیت پر بہت تفصیل سے گفتگو کی اور اسی کو تمام موجودہ مصیبتوں کی اصل وجہ قرار دیا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی تصانیف کے اکثر قارئین یہ سمجھتے ہیں کہ آپ روح کے دوام کے قائل ہیں" تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "کیا واقعی ان میں سے بعض کی یہ رائے ہے اور میرے خیالات کی وہ اس طرح تعبیر کرتے ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے تو سوائے افسوس کے میرے لئے اور کیا چارہ کار ہے۔ مجھے خود اس بات کا احساس ہے کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں مجھے اب پہلے کی طرح الفاظ نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری لے دے کر ایک ہی تمنا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح بھی ممکن ہو میں بنی نوع انسان کی مدد کروں۔ آج کل

---

[1] مجلس قانون ساز کا رکن۔ رئیس خیالات میں لبرل "آزادی ضمیر" پر تقریر کرنے کے بعد تمام روس میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۲۰ء میں بحالت ہجرت انتقال ہوا۔

[2] ۱۹۰۱ء میں وزیر داخلہ مقرر ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں کسی اجتماعی نے کام تمام کر دیا۔

[3] مشہور سیاسی مدبر مالی

میں ایک کتاب "ایمان" کی تصنیف میں منہمک ہوں۔ میری آرزو ہے کہ اسے میں اپنی موت سے پہلے تکمیل کو پہنچا دوں۔ یہ میری بڑی خوش قسمتی ہوگی اگر میں موت سے پہلے اسے اختتام تک پہنچا سکا۔ تقریباً دو تہائی حصہ ختم ہو چکا ہے۔ ایک تہائی باقی ہے مگر اس میں کامیابی مشکل نظر آتی ہے۔ طبیعت موزوں ہی نہیں ہوتی اکثر بیمار رہتا ہوں اور اسی وجہ سے یہ کام پڑا ہوا ہے۔"

طولسطائے کی گفتگو میں موت کا اکثر ذکر آیا گیا۔ یہ سوال اس وقت انہیں بہت پریشان کر رہا ہے۔ گو وہ صاف صاف نہیں کہتے مگر پھر بھی انہیں اپنی زندگی کے متعلق جو شبہ پیدا ہو گیا ہے اسکا اظہار ان کے الفاظ سے ہو جاتا ہے۔

اس دفعہ میری ملاقات ٹھیک دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اور ہمیں دونوں میں گفتگو ہوا کی۔ طولسطائے کی گفتگو کا وہ حصہ خاص طور پر دلچسپ تھا جو سکندر اول کی سوانح اور اس کے عہد کی عام زندگی سے متعلق تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ناول "جنگ و صلح" کا بھی ذکر کیا۔ اس تمام بات چیت کا مجھ پر جو خاص اثر ہوا وہ یہ تھا کہ مجھے یقین آ گیا کہ وہ بالکل بے تکلفانہ بول رہے ہیں اور انہیں میرے سامنے کسی طرح سنے کا خیال نہیں۔ انہوں نے نہایت بے باکی سے تمام مسائل پر گفتگو کی اور میں ان کی ملاقات سے حد درجہ متاثر ہوا۔

جس روز میں وہاں سے رخصت ہونے والا تھا تو صبح کے پہر میں آخری مرتبہ اس قابل تعظیم بزرگ سے ملاقات کی غرض سے گیا۔ ملاقات کا سلسلہ پھر گھنٹہ بھر رہا اس مرتبہ طولسطائے نے جنگ کریمیا (۱۸۵۳-۵۶ء) کا تفصیل سے ذکر کیا جس میں وہ خود نوجوان کی حیثیت سے شریک تھے۔ اور جس میں سے محاصرہ سیباسٹوپل کا انہوں نے اپنی بعض مشہور تصانیف میں بھی ذکر کیا ہے۔ یہ یادگار انکے حافظے میں اس طرح محفوظ ہے کہ واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آ جاتی ہے اور اس کے سننے میں طبیعت کو عجیب حظ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے موجودہ زار نکولائی دوم کا ذکر کیا۔ طولسطائے کو ان سے بہت ہمدردی ہے اور وہ ان کی بڑی خوشی سے مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ انہیں شہنشاہ نہایت بھلے مانس۔

خلیق طبیعت اور مدد کرنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ساری مصیبت انکے ارد گرد کے لوگ ہیں۔ انہوں نے مرحوم زار سکندر سوم کا بھی اچھے الفاظ میں ذکر کیا اور کہا کہ "اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ ذلیل پادری مجھے کلیسا سے نکال باہر نہ کر پاتے"۔ پھر انہوں نے مجھ سے میرے والد کی خیریت دریافت کی جن سے ان کی ملاقات ۱۸۵۴ء میں جنگ کریمیا میں فوجی افسر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ طولسطائے نے انکے مزاج کی بابت دریافت کیا اور یہ سب اتنے پیارے اور بھلے انداز میں کہ میں تو یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ طولسطائے کو "مزاجی" کہنا ظلم ہے۔ ایک بات اور کہہ کر میں مقدمہ ختم کرتا ہوں اور وہ یہ کہ طولسطائے مصنف کی حیثیت سے ایک ہیں اور انسان کی حیثیت سے دوسرے۔ اور میں بہت ہی خوش قسمت ہوں کہ انہیں بچشم خود دیکھ سکا۔

... ...

۵ اپریل کو طولسطائے نے نواب اعظم کے نام مندرجہ ذیل خط لکھا ہے:

مہربانم نکولائی میکائیلووچ۔ مجھے آپ کا تار ملا۔ میں فوراً ہی جواب دینا چاہتا تھا مگر مجھے صاحب فرش ہونا پڑا۔ دو مہینے تک بستر سے اٹھنے اور قلم ہاتھ میں لینے سے قاصر رہا۔ فوراً میں یوں لکھنا چاہتا تھا کہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا خاص طور پر اس وجہ سے کہ آپ نے میری درخواست پوری کی باوجود اس کے کہ اس سے آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اور جو خط آپ نے پہنچایا ہے اور جسے آپ نے غالباً میری درخواست کے بموجب پڑھا بھی ہوگا وہ آپ کے خیالات کے صریح مخالف اور طبیعت کو ناگوار رہا ہوگا۔ اگر اس میں میں غلطی پر ہوں تو مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ میرے شکوک کو معاف فرمائیں، بہرحال آج جبکہ پہلی مرتبہ طبیعت سنبھلی ہے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چرتکوف کے ذریعہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرا خط خندہ پیشانی کے ساتھ وصول کیا گیا (یہ بہت خوب) اور یہ وعدہ کیا گیا کہ اسے کسی کو نہ دکھایا

۱؎ یعنی نواب اعظم میکائیل نکولائیوچ، زار سکندر کے بھائی جو عرصہ تک کوہ قاف کے حاکم رہے۔

جائے گا مگر میں نے تو اس قسم کی کوئی درخواست نہ کی تھی۔ اب آپ سے ملنے ضروری خیال [illegible] ان کے وجوہ بھی ہوں گے اور مجھے اس میں کوئی خاص عذر نہیں۔

میں اپنے بعض ان خیالات کی تشریح کرنا چاہتا ہوں جو میں نے آپ کے سامنے پیش کئے تھے اور جو میں خط میں اچھی طرح نہ کر پایا تھا۔ اور یہ اس امید پر کہ اگر آپ میرے ہم خیال نہ بھی ہو جائیں تو کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ سکیں اور میری تجاویز کو ایک غیر ملکی شخص کے تخیل کی بلند پروازی نہیں۔ (اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سرکاری حلقوں میں مجھے یوں ہی سمجھا جاتا ہے) بلکہ سنجیدہ اور طویل فکر و خیال کا نتیجہ سمجھیں۔ میرا ایمان ہے کہ یہی ایک ذریعہ ہے جو اس مطلق العنانی کو مکمل تباہی و بربادی سے بچا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ حکومت ترقی کی ان تمام خواہشات کو جن کے حصول کی کوشش میں لوگ لگے ہوئے ہیں اپنا بنائے اور اپنی قوت سے رعایا کے مقاصد کی تکمیل کرے۔ میرے خیال میں روسی قوم کے سامنے اس قسم کا جو مطمح نظر اب تک رہا ہے اور آج بھی یہی ہے کہ زمین کو شخصی ملکیت سے نجات دلائی چاہئے اس مضمون پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی اور لکھا جائے گا مگر بنیادی طور پر اس سوال سے امریکی مصنف ہنری جارج نے اپنی بڑی کتاب "ترقی اور افلاس" اور چھوٹے سے رسالے "اجتماعی مسائل" میں بحث کی ہے یہ سوال میرے خیال کے بموجب اسی قدر اہم اور حل کا محتاج ہے جتنا اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں غلامی کا مسئلہ تھا مگر وقت یہ ہے کہ آج اس کا حل تو درکنار اس کا ذکر بھی بدیں وجہ ممنوع ہے کہ یورپ اور امریکہ کے امراء اور امراء ہی نہیں تمام جائداد رکھنے والے جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ہے اس بات کے کوشاں ہیں کہ یہ مسئلہ یہیں کا یہیں ختم کر دیا جائے اور اس پر سرکاری حلقوں میں گفت و شنید بھی نہ ہو۔ اس مسئلہ کا حل صرف روس میں مطلق العنانی کے وجود کی وجہ سے ممکن ہے اور روس میں اسے خاص اہمیت بھی حاصل ہے اس وجہ سے کہ روسی قوم کا بڑا حصہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے اور اس کے لئے زمین کی کمی اور غیر مساوی تقسیم نے بڑی دشواریاں پیدا کر دی ہیں۔ ہنری جارج کا بتایا ہوا طریقہ جسے "وحدانی طریقہ مالگذاری"

کہا جاتا ہے اور جس کا غالبا آپ کو علم ہوگا نہایت آسان اور قابل عمل ہو۔ اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ تمام زمین پر اس کی پیداوار کے مطابق لگان مقرر کر دیا جائے جو زمین جوتنے والے کاشتکار کو خود ادا کر دیں۔ یہی ریاست کی آمدنی ہو اور وہ تمام دوسری محصولوں کی جگہ لے لے میں اسکا بآسانی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ سرکاری فرمان کی رو سے ایک مرکزی بورڈ اس غرض سے بنایا جائے جو زمین پر سے شخصی ملکیت اٹھالے۔ اور حکومت کی ایک کمیٹی بنا دی جائے جو زمین پر لگان لگائے اور دوسرے امور کی انجام دہی کرے جو روسی شہنشاہ صرف روسیوں کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے یہ خدمت انجام دے گا وہ کتنا بڑا کام کرے گا اور وہ کتنی خوبی کے ساتھ۔ روز مرہ کے اجتماعیوں کے جھگڑے اور انقلابیوں کی چالبازیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو اپنی جگہ پر کس قدر محفوظ محسوس کرے گا۔ قوم کے بہترین افراد اسے مدد دیں گے اور اسی طرح عام رعایا جو اپنی سب سے اہم اور دلی خواہشات کو اس کے ذریعے پورا ہوتے ہوئے دیکھے گی۔ اور وہ خواہش یہی ہے کہ ہر شخص اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے لئے زمین سے اپنی خوراک حاصل کرے جو خدا نے کسی ایک کو نہیں بلکہ بلا تفریق ہر ایک کو عطا کی ہے یہ ہی میرا ایمان۔ مگر جیسا میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں یہ بہت ممکن ہو کہ میں غلطی پر ہوں اور کوئی اور مطمح نظر ہو جسے حاصل کرنے کی دھن میں انسان لگا ہوا ہے اور جو حکومت کا بھی مطمح نظر ہونا چاہئے یہ تو ممکن ہے مگر ایک چیز بہر حال ناممکن ہوا اور وہ یہ کہ ایسی حکومت ہرگز زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی جو موجودہ طریقہ پر چل رہی ہے، جو اپنی زندگی میں لوگوں سے بے تعلق ہو چکی ہو اور جو اپنے آپ کو رعایا کی خدمت کے لئے پیش کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ رعایا کی اس مقصد کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس کا حصول واقعی اسے خوشحالی دے سکتا ہے۔

کل سپ یاگنس[1] کے قتل کی اطلاع ملی۔ یہ واقعہ بہت تکلیف دہ ہے۔ خاص طور پر نفرت

---

[1] ۱۹۰۲ء وزیر داخلہ ۱۹۰۲ء میں کسی انقلابی نے قتل کر دیا۔

غصہ اور انتقام کے ان جذبات کی وجہ سے جنہوں نے اسکا ہونا لازمی بنا دیا - یہ بات بہر حال ایک
ہونے والی تھی - اور اگر حکومت نے اپنے رویہ میں پوری پوری تبدیلی نہ کی تو در اصل یہ اور بھی
والی تباہی کا پتہ دیتی ہے - کامل نظم و نسق صرف معقول سمجھوتے اور محبت پر قائم ہو سکتا ہے
بلکہ اور انتقام پر کسی چیز کی بھی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی -

معاف فرمائیے کہ میں نے آپ کو اتنا بڑا خط پڑھنے کی تکلیف دی، مگر اس سے میرا مقصد صرف اس قدر تھا کہ آپ میرے مطلب کو سمجھ سکیں پھر تو کمزوری کی وجہ سے جس کا اندازہ آپ سے کر سکتے ہیں کہ میں لیٹے لیٹے لکھ رہا ہوں اور خاص طور پر سپ یکنس کے ظالمانہ قتل واقعہ کی وجہ سے میں غیر معمولی بے قراری محسوس کر رہا ہوں یہ واقعہ جانبین میں دشمنی اور سختی کے جذبات کو اور بھی بھڑکائے گا حالانکہ اس کو دور کرنا کس قدر آسان تھا

اچھا اب رخصت - میں تہ دل سے آپ کی جسمانی تندرستی اور روحانی مسرت و اطمینان کی دعا کرتا ہوں -

آپکا مخلص

لیو طولسطائے

ان خطوں کے جواب میں نواب اعظم نے طفلس سے دو خط لکھے جہاں ان دنوں انکا قیام تھا - پہلا خط ۱۵ نومبر کا لکھا ہوا ہے :-

صدیقی لیو نکولائیوچ - آپ کے خط نے جو مجھے کل ملا مجھے حد درجہ خوشی بخشی - ایک تو اس وجہ سے کہ مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ اب اتنے تندرست ہیں کہ خط لکھ سکیں اور دوسرے اس وجہ سے کہ مجھے آپ کے جس خط کا انتظار تھا وہ عین ایسٹر کے موقع پر ملا - آپ کی صحت کے متعلق اب تک جو اطلاعات شائع ہوئیں انکا میں بڑی توجہ سے مطالعہ کرتا رہا ہوں لو خیال تھا - میں خود اب اپنی خاموشی کو توڑ دوں اور ڈھائی مہینے کے بعد کہ اس زمانہ میں سفر بھی کیا اور آرام بھی - آپ کو پھر اپنی بکواس سے تکلیف دوں -

اب آپ اپنے خط کا جواب سنئے۔ ۲۲ جنوری کو جب میں پیٹرس برگ پہنچا تو دوسرے ہی دن آپ کا خط ملا۔ ظاہر ہے کہ اسے میں نے پڑھا۔ اس کی ایک نقل کی اور خیال کیا کہ میں اسے بلا پس و پیش اس تک پہنچا سکتا ہوں جس کے نام وہ لکھا گیا تھا[1]

جب میں نے قیصر سے پوچھا کہ کیا میں خط آپ تک پہنچا سکتا ہوں تو انہوں نے جواب دیا "یقیناً"۔ چنانچہ تین دن کے بعد جب ایک خاندانی دعوت ہوئی تو اس کے اختتام پر میں نے خود انہیں آپ کا خط دے دیا۔ اسی کے ساتھ میں نے اپنی طرف سے یہ بھی کہا کہ "نیکولائے دوم کی عزت کے خیال سے میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں جسے اگر شرف قبول بخشا گیا تو مجھے دلی مسرت ہوگی اور وہ درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے وزرا میں سے کسی کو بھی یہ خط پڑھنے کے لئے نہ دیں۔ یہ میری اپنی درخواست ہے"۔ قیصر نے یہ وعدہ کیا کہ وہ خط کسی کو نہ دکھائیں گے اور فرمایا کہ وہ اسکا بہت دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔ اس کے بعد مجھے کوئی اور موقع نہ مل سکا کہ میں اس خط پر ان سے گفتگو کر سکتا اور خود اس موضوع پر ان سے گفتگو چھیڑنا میں نے مناسب خیال نہ کیا۔

میں اس بات سے ان کی نوازش کا اندازہ لگا سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے خط پہنچانے کی اجازت دی اور پھر اسے بڑی مہربانی کے ساتھ راز میں رکھنے کا وعدہ کیا۔ ہمارا قیصر واقعی نہایت نیک دل اور دوسروں کی مشکل میں کام آنے والا انسان ہے۔ ساری مصیبت تو وہ لوگ ہیں جو اس کے رازدار ہیں۔ میں نے جب قیصر سے درخواست کی کہ وہ خط کسی اور کو نہ دکھائیں تو یہ محض آپ کی عزت کے خیال سے تھا۔ اور اس خواہش کی بنا پر کہ ہزار قسم کی افواہوں اور وزرا کی تشریحات کا سد باب ہو سکے جن کا ہمیشہ یہ مقصد رہتا ہے کہ وہ قیصر کے سامنے آپ کی نہایت بھیانک تصویر پیش کریں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

---

[1] یعنی زار نکولائی دوم کے نام

...وہ حکومت اور مادر وطن کو اس انتشار کی حالت سے نکالنے کے لئے آپ اپنے ... کے خط میں جو نسخہ تجویز کر گئے ہیں اس کے متعلق اگر آپ برا نہ مانیں تو میں عرض کروں ... آپ کا تخیل بہت زیادہ بلند ہے۔ اور اس کے محض تخیل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ آپ روس ... سمجھتے ہیں جس کا یورپ اور یہاں تک کہ امریکہ میں بھی کوئی شخص خیال تک ... میں نہیں لاتا۔

... ہر کسان اپنی چھوٹی سی ملکیت کا خود ہی ذمہ دار ہو اور اسکا لگان ادا کرے۔ مگر جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کا منشا تو یہ ہے کہ تمام جائداد مع اپنی تمام آمدنی کے ریاست یعنی شاہی خزانہ کی ملک ہو جائے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مالکوں کی پوری جماعت یعنی ہر قسم اور رتبے کے مالک اس شرط کے ساتھ کہ آمدنی کا ایک حصہ انکے لیے مخصوص ہوگا اس پر رضی مند ہو گئے تو آپ کو خود کسانوں کی نہایت خوفناک مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اتنے عظیم الشان مقصد کی تکمیل کے لئے ایک غیر معمولی زار کا وجود لابدی شے ہے۔ مثلاً پیٹر اعظم پھر اس کے ساتھ ایسے ہی دوسرے مدد کرنے والے ہوں نہ کہ وہ جو آج نکولاؤ دوم کے احکام کی تکمیل کرتے ہیں۔ آج وہ محکمے جن کے قیام کو سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں، مجلس قانون ساز، مجلس مدبرین اور وزارت، ان کی از سر نو اصلاح اور ان میں نئی روح پھونکنے کے لیے یہ اشد ضروری امر ہے۔

میں اس موضوع کو اسپر ختم کرتا ہوں کہ آپ کے خیالات جس قدر بلند اور ہمدردانہ ہیں انہیں عملی جامہ پہنانا اسی قدر دشوار ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ "کل جگ" اصلاح کا محتاج ہے۔ مگر اصلاح قابل ہونا چاہئے نہ کہ عجلت پسندانہ۔ اب سب سے اہم سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اصلاح کا کام شروع کہاں سے کیا جائے کتنے مسائل ہیں تعلیم تربیت، مدرسین، اساتذہ، مزدور، نقصان پہنچانے والے افسر، جماعت حکام، عام مصیبتیں، دولت پیدا کرنے کا سول ... برداشت فوجیت، ضابطہ کا فقدان۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہی مسائل کیا کم ہیں کہ آپ کاشتکاری

کی اصلاح کا مسئلہ بھی چھیڑنا ممکن خیال کرتے ہیں۔ انسان جماعت کا ساتھ دے کر ہی تو لڑائی لڑ سکتا ہے مگر آپ کو اس کی کوئی ہیں کہ آپ اس معاملہ میں تنہا ہیں۔ اس لئے کہ جب آپ کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا سوال آئے گا تو وہ لوگ بھی جو آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔
میرے خیال میں تو ہماری سوسائٹی اس قدر قعر مذلت میں جا چکی ہے کہ اس کی اصلاح صرف حکومت کی مستحکم اور مسلسل کوشش اور اس کی پوری پوری رضامندی ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ میری رائے میں شہنشاہیت اب بھی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کو ۱۳ کروڑ انسانوں کے سامنے کم کرے اور وزرا کی ذمہ داری بڑھا دے۔ خرابی کی جڑ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بہت پرانی ہو گئی ہیں۔ انیسویں صدی میں زندگی اور اس کی ضروریات کہیں آگے نکل گئیں مگر ہمارے سرکاری محکمے وہیں کے وہیں رہے اس کی اگر اصلاح ہوئی اور اسے پھر زندہ کیا گیا تو پھر اسکا بھی امکان ہوگا کہ اس پیچیدہ مسئلہ پر جو آپ نے چھیڑا ہے غور کیا جائے اور بلند تخیل خوبی کے ساتھ عملی جامہ پہن سکے۔

آپ کو مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سپاگنس کے قتل کی وجہ سے جوش اور مجمعے کے ایسے جذبات پیدا ہوں جو نہ ہونے چاہئے تھے۔ اب مجھے تو یہ دیکھنے کا شوق ہے کہ پلیوے[1] معاملہ کو کیونکر طے کرتا ہے۔ مجھے تو فن لینڈ اور کوہ قاف میں اچھی علامات نظر آ رہی ہیں۔ خدا کرے میں اپنے اس خیال میں غلطی پر نہ ہوں۔ اب وانوسکی[2] کے استعفے پر کیا رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ کیا اپنی ہردلعزیزی کی خاطر اور خود اپنی مرضی سے اپنے قیصر کو ایسے وقت میں خیرباد کہنا

---

[1] ورک پلیوے جو سپیاگنس کی جگہ وزیر داخلہ مقرر ہوا تھا اور ۱۵ر جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک انقلابی کے ہاتھ مارا گیا۔
[2] وانوسکی (۱۸۲۲ء تا ۱۹۰۴ء) ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۸ء تک وزیر جنگ تھا، اس زمانہ میں اس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ ۱۹۰۱ء میں جب وزیر تعلیم کے قتل کا واقعہ ہوا تو اسے وزیر تعلیم مقرر کیا گیا۔ ایک سال تک نوجوانوں کی انقلابی تحریکوں سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا رہا اور ۱۹۰۲ء میں اپنی جگہ سے مستعفی ہو گیا۔

اور اس کے لئے اور وسائل پیدا کرنا مناسب تھا؟

مگر میں نے اپنے خط کو بہت طول دیا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں آپ اسے پڑھتے پڑھتے تھک نہ جائیں۔ میں اس طویل تحریر کے لئے معافی کا خواستگار ہوں اگر آپ کے پاس وقت ہو ... پڑتال کا ذرہ برابر خوف نہیں اور مجھے آپ سے گفتگو کرنے میں بہت لطف ... آپ کی ۵ نومبر کی سطروں کا تہ دل سے شکریہ جنہوں نے مجھے اطمینان اور یقین دلایا ہے ... میں میرے لئے جگہ ہے۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد دوبارہ تندرست و توانا ہو جائیں۔ آپ اپنی صحت کا بہت خیال رکھئے۔ اور بغیر سوچے سمجھے زیادہ تفریح کے لئے باہر نہ جائیے نہ پیدل اور نہ گھوڑے پر۔ براہ کرم اپنی بیگم صاحبہ کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پہنچا دیجئے۔ ... آپ سے پوری قوت کے ساتھ مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا نہایت ہی مخلص

نکولا ویکا میلووچ

نواب صاحب کا دوسرا خط یہ ہے:۔

عزیزی نکولائی میچ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ملیریا کے حملہ کی وجہ سے دوبارہ کمزوری محسوس کر رہے ہیں مگر امید ہے کہ موسم گرما کے ساتھ ساتھ آپ کی قوت بھی عود کر آئے گی۔ آپ نے براہ کرم مجھے جو خط لکھا ہے اس میں اس قدر اہم، بنیادی اور دلچسپ سوالات سے بحث کی گئی ہے کہ میں نے اسے کئی بار پڑھا، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں آپ سے بہت سی باتوں میں متفق نہیں ہو سکتا۔ اس کی سب سے پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ مجھے ہنری جارج کی کتاب کے متعلق پوری معلومات نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اس کے مطالعہ سے قاصر رہا اور میرے ذہن میں اس کتاب کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ مجھ پر اتنی نوازش کیجئے کہ مجھے اس کتاب کا روسی یا فرانسیسی ترجمہ بھیج دیجئے۔ اس لئے کہ اگر میں انگریزی میں پڑھوں تو جلد پڑھنے میں بہت سے الفاظ کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اختلاف کی دوسری وجہ غالباً زراعتی معاملات سے میری

ناواقفیت ہی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر میرے تمام دلائل کچھ زیادہ وقیع نہیں ہو سکتے - اور خصوصاً آپ کے سامنے کہ آپ نے اتنی کثرت کے ساتھ اور بغیر دم لئے ہوئے ان مسائل کا مطالعہ کیا ہے - تجربہ اور علم اشیا آپ کی پشت پر ہیں اور میری طرف صرف مباحثہ کی قابلیت -

مگر مجھے روزانہ کے مسائل سے دلچسپی ہو بھی تو میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ میں اس کی طرف صرف اس وقت توجہ کرتا ہوں جب مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد کیجائے لیکن آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے ان معاملات سے کتنا واسطہ ہے اور پیٹرس برگ کے سرکاری حلقوں سے میں اپنے آپ کو کس قدر دور رکھتا ہوں - لہذا مخلوق کے معاملات میں کسی طرح کا فائدہ یا نقصان پہنچانے کا سوال تو جاتا رہا - البتہ میں بیٹھے بیٹھے کاغذ پر نظریے بنا سکتا ہوں اور آپ کا مشکور ہوں کہ آپ مجھ سے خط و کتابت پر آمادہ ہو گئے - واقعہ یہ ہے کہ جب سے آپ نے گذشتہ خزاں کے موقع پر مجھ سے چند گھنٹوں کے لئے ملاقات کی ہے اور آپ کا دل میری طرف سے مطمئن ہو گیا ہے - اس وقت سے آپ میرے حال پر جو عنایت فرماتے ہیں اسے میرا دل اچھی طرح محسوس کرتا ہے لیکن اس قدر پیچیدہ مسائل پر خط و کتابت، آمنے سامنے گفتگو کے ذریعہ تبادلۂ خیالات کی نسبت بدرجہا دشوار ہے - اور افسوس اس بات کا ہے کہ نہ معلوم اسکا موقع مل سکے گا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور جی بھر کے گفتگو کروں - مجھے یقین ہے کہ اس صورت میں آپ کے پیش کردہ مسائل کے متعلق مجھے جو غلط فہمیاں یا شبہات ہیں وہ فوراً رفع ہو جائیں گے - مگر کاغذ پر یہ ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے -

میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ آپ کے خط کی بعض باتوں کا جواب نہ دوں :-

۱ - اگر آپ مطلق العنان حکومت کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ وہ اس قسم کی زراعتی اصلاحات کر سکے جن کا خاکہ ہنری جارج نے اپنی کتاب میں کھینچا ہے تو پھر گویا آپ اس کی موجودہ ساخت کو بھی اس قابل سمجھتے ہیں مگر آپ تو خود ہی فرماتے ہیں کہ موجودہ اہل کار اس قابل نہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بدتر ہے - اس سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ صاف ہے -

...ہی یہ کہ ان کی جگہ اوروں کو مقرر کرنا چاہئے۔ مگر کیسے؟ کیا شاہ نکولا دوئم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ حکومت کا تمام عملہ یک لخت بدل سکے؟ آپ پرانے حکموں کو پرانے زمانہ کی یادگار تو سمجھتے ہیں مگر اس کے ساتھ "پرانی قمیص پر نئے پیوند لگانا" آپ مناسب نہیں خیال کرتے۔ پھر میری سمجھ میں کوئی دوسرا اصل نہیں آتا کہ نئے عناصر کیونکر ان اجسام میں رکھے جا سکتے ہیں جو اپنی زندگی ختم کر چکے ہیں۔

فرض کیجئے ہمیں ایسے اشخاص مل ہی گئے کہ جو کام کر سکیں اور روس سے اچھی طرح واقف ہوں (یہ دوسری شرط میں اپنی طرف سے لگاتا ہوں) آپ کے خیال میں تو ایسے لوگوں سے "روس بھرا پڑا ہے" مگر میں اسے آسانی یقین نہیں کر سکتا۔ میری رائے میں یہ بہت مشتبہ امر ہے۔ مگر پھر بھی فرض کیجئے کہ آپ کو ایسے اشخاص مل گئے تو کیا آپ کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ ان تمام کے تمام دس یا بیس عہدہ داروں کے ذہن میں بھی ذرا سی اصلاح اور اس کے فوائد کا خیال گھر کرلے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر نکولائی دوم کے ذہن میں آپ کی تجاویز کے فوائد آگئے اور اس نے انہیں پورا بھی کرنا چاہا تو سب سے پہلے راہ میں جو رکاوٹ آتی ہے وہ عہدہ داروں کا انتخاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ پھر وہی "گھڑیال، ... اور چھینگے" کی کہانی اپنے آپ کو دہرائے گی۔

۳- اسی خیال سے میں نے آپ کو لکھا ہے کہ اس قسم کی بلند پایہ اصلاح کے لئے (اگر اسے متفقانہ سمجھا جائے) تو پیٹر اعظم جیسی شخصیت کی ضرورت ہے یعنی ایسا شہنشاہ جو قوی ہو، آزاد ہو، اپنی تجاویز پر آخری دم تک اڑا رہنے والا ہو اور پھر لوگوں کے انتخاب کا ملکہ رکھتا ہو۔ محض نیکی اور خوش خلقی کے ذریعہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس میں سے عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس پر میرا پورا پورا یقین ہے اس لئے کہ شہنشاہ کی یہ خوبیاں دراصل اس کی مطلق العنانی کے قیام کی بنیاد ہیں۔

۴- حقیقت یہ ہے کہ انسان کی موجودہ حالت کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے اور یہ نہیں کہ

زار نکولاؤ دوم سے تا ممکنات کا مطالبہ کیا جائے۔ ضرورتی یہ امر ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔ اور یہی ہر اس روسی کا اولین فرض ہے جو اپنے وطن اور اپنے بادشاہ کو عزیز رکھتا ہے۔ ہاں ابھی پھر اعلیٰ محکموں کی نئی اصلاحات کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا۔ یہ کام وزرا کے ذمہ کردینا چاہئے۔ مگر آپ پوچھیں گے کہ وہ کس کے سامنے ذمہ دار رہوں؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ رائے عامہ کے سامنے کوئی وجہ نہیں کہ سرکاری اطلاعات میں مجلس قانون ساز کے اجلاس اور اس کے محکموں کی ٹھیک ٹھیک کارروائی شائع نہ کی جائے۔ جب ہر وزیر کو اس کا علم ہوگا کہ جو لفظ بھی اس کی زبان پر آئے گا۔ اس کا رعایا کو علم ہو جائے گا۔ تو پھر لکھنے سے پہلے ذرا اچھی طرح غور کر لینا ہوگا اس صورت میں کام کی مقدار زیادہ ہو جائے گی اور فضول گوئی کم۔ اور اسی سے ایک طرح کی اخلاقی جوابدہی کی ابتدا ہوسکے گی۔ ایک طرف وزار کے سامنے اور دوسری طرف پبلک کے سامنے۔

موجودہ محکموں کی تعداد اور یہ تمام لکھا پڑھی جو حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے کیوں نہ کم کر دی جائے؟ اور ایسے حکام جو بے لگام چھوڑ دئے گئے ہیں اور جن کی حیثیت اس کیڑے کی سی ہے جو درخت کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہ حکام جنہیں جب بھی موقع ملتا ہے حکومت کے نام پر بٹہ لگاتے ہیں ان کو کیوں نہ اچھی طرح قابو میں رکھا جائے؟ بہت کچھ جو اب تک زار کی آنکھ سے پوشیدہ ہے پھر وہ اس کے سامنے آئے گا اور اس کی آنکھیں کھلیں گی۔ نتیجتاً اس کے لئے یہ آسان ہوگا کہ وہ معتبر اور اپنی مرضی کے مطابق حکام کا انتخاب کرے۔

اس طرح تمام اعلیٰ محکموں کی از سر نو ترتیب کے ساتھ نئے لوگ بھی خود بخود سامنے آئیں گے اور شاید آپ کی تجاویز واقع کی صورت اختیار کر سکیں گی۔ گذشتہ صدی میں بھی آخر لوگ تھے ہی جو اس بات کے کوشاں تھے کہ زندگی میں نئی روح پھونکیں کیا آپ کی طرح اسپرانسکی[1]

---

[1] اسپرانسکی (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۹ء) مشہور روسی سیاست داں روس میں بہت سی اصلاحات کا

[illegible] س ۔ موردو نیو[1] نواب کا مکران[2] ، ن ۔ ا ۔ ملیوتن[3] اور خود قیصر سکندر دوم کی شخصیتوں [illegible] زار سکندر سوم نے اپنے خاص روسی انداز میں تمام چیزوں کو دبی [illegible] دینے کی کیسی کوشش کی؟ اندرونی سیاست میں ہمیشہ ریاست کی بھلائی ان کے پیش [illegible] سیاست میں ان کے ۱۳ سالہ عہد میں روس نے وہ حیثیت حاصل کی [illegible] سے پہلے اسے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری روسی زندگی میں مطلق العنان بادشاہ کو کتنا اہم درجہ حاصل ہے مگر میں پھر دہرا دوں کہ محض نیکی اور [illegible] کام نہیں چل سکتا ۔

میں نے پھر اپنے شبہات اور بعض فروعات کے بیان میں طول کو بہت دخل دیا اور پھر بھی مجھے خوف ہے کہ میں آپ کو ذرہ برابر بھی مطمئن نہیں کر سکا ہوں ۔ مگر میں دوبارہ عرض کر دوں کہ میں ہمیشہ وہی ایمانداری کے ساتھ لکھ دیتا ہوں جو کچھ میرے دماغ میں آتا ہے ۔ بہر حال اس بات پر ہم دونوں متفق ہیں کہ موجودہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم رہنے والی نہیں ۔ اور اگر یہ طوائف الملوکی ہی چلتا رہا تو تباہی و بربادی یقینی ہے ۔ اب اس مرض کے علاج کے متعلق مجھ میں اور آپ میں اختلاف ہے ۔ میرے لئے یہی بات اطمینان بخش ہے کہ میں آپ سے صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں اور آپ اسے صبر کے ساتھ سنتے رہیں ۔

حواشی

[1] نواب ن ۔ س ۔ موردو یو ([illegible] تا [illegible]) اعتدال پسند روسی سیاست داں ۔

[2] نواب ا ۔ ف کا کرن ([illegible] تا [illegible]) اطالی النسل ۔ ۲۲ سال کی عمر میں روس گیا اور وہاں سرکاری ملازمت اختیار کی [illegible] تک وزیر مالیات رہا ۔

[3] ن ۔ ا ۔ ملیوتن ([illegible] تا [illegible]) سکندر دوم کے عہد کا مشہور مدبر ۔

آخر میں پھر آپ سے درخواست ہے کہ آپ بہت احتیاط سے کام لیں۔ اور جب طبیعت بالکل صاف نہ ہو جائے کسی قسم کی مشقت نہ کریں مجھے امید ہے کہ کریمیا کی آب وہوا اور موسم گرما کا آپ کی صحت پر اچھا اثر ہوگا۔ میں آپ سے نہایت گرمجوشی سے مصافحہ کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص ترین نیازمند

نکولائیو میکا ئیلوویچ

غزل

(از حضرت احسان)

نہاں ہے جسکی ہر اک موج میں پیام سُرُش — وہ ہم شکستہ دلوں کا ہے نغمۂ خاموش
نگاہ شوق لطافت سے ہو اگر معمور — تو رقص گاہ تجلی ہے ورد کا آغوش
نظر سے بچ نہ سکا کوئی نکتہ فطرت — جنون عشق میں اللہ رے یہ عالم ہوش
ابھی نصیب کہاں ذوق بیخودی دل کو — اک اضطراب ہے پھر بھی یہ اضطراب خموش
نکل گئے ہیں بہت دور تیرے دیوانے — غضب ہوا جو کہیں انکو آگیا پھر ہوش

بنیادی اصلاح

(ایفیم زوزُلیا جدید روس کا مشہور افسانہ نگار ہے ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ایک مفلسی میں گزرا۔ لڑکپن کا زمانہ اوڈیسا میں ایک مدرسہ میں کاٹا اور اپنے وطن میں آن بسا۔ بچپن ہی سے اس کی تڑپ بہت تیز اور رجحان بہت شوخ تھی۔ انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا اور کئی مرتبہ قید خانہ میں رہنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اس نے ۲۰ سال کی عمر میں افسانے لکھنا شروع کر دیئے تھے لیکن پھر کچھ عرصہ کے لئے اس شغل کو ترک کر دیا۔ اس کی طنزیہ تحریریں تیز تلوار کا کام کرتی ہیں۔ بولشویکوں نے اسے اپنا لیا ہے۔ لیکن یہاں پر بھی وار کر ہی دیتا ہے ذیل کا افسانہ معلوم روس کے انسانوں کی ہجو ہے یا ان کے مصلحین کی!)

اشتہار

شہر بھی روز جیسے ہیں گلیاں بھی۔ سر پر وہی نیلا آسمان سڑک کے پتھر بھی پرانے میلے لباس میں ہیں۔ مگر کچھ آدمی ہیں، بدحواس و پریشان، جو دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار چسپاں کر رہے ہیں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور لیئی کی بالٹی میں جو سیڑھی کے ڈنڈے میں لٹکی ہے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔

اشتہار کی عبارت نہایت سادہ ہے، بے رحم اور بے پناہ۔ ملاحظہ ہو:-

ہر شخص کے لئے

بلا استثنا

عدالت العالیہ نے ایک خاص تحقیقاتی کمیشن کا تقرر فرمایا ہے جو شہر کے باشندوں کا امتحان کریگا۔ نیز محلہ محلہ تحقیق کرکے فیصلہ کریگا کہ شہریوں

میں کس کس کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہئے جو باشندے مدّ زائد میں درج کئے جائیں گے اور جن کا وجود غیر ضروری قرار پائے گا انھیں برخاستی کا حکم ملے گا اور انھیں ۲۴ گھنٹے کے اندر دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ حکم برخاستی کے خلاف ۲۴ گھنٹے کے اندر مرافعہ دائر ہو سکتا ہے۔ مرافعہ تحریری ہونا چاہئے۔ یہ درخواست اُنھیں عدالت العالیہ کی مرکزی کوٹھی کے سامنے پیش کر دیجائیگی تین گھنٹے کے اندر فیصلہ صادر ہو جائے گا غیر ضروری انسان جو قوت ارادہ کے ضعف یا زندگی سے محبت کے باعث زندگی ترک کرنے پر بخوشی آمادہ نہ ہونگے اُن کے متعلق عدالت العالیہ مناسب کارروائی کرے گی اور اُن کے دوستوں، پڑوسیوں، یا خاص مسلح ٹولیوں کے ذریعہ تعمیل حکم کرائے گی۔ ۔ ۔

نوٹ:۔ ۱۔ باشندگان شہر پر واجب ہے کہ کمال اطاعت کے ساتھ عدالت عالیہ کے اراکین کے احکام کو مانیں۔ ان کے سوالات کے جواب صحیح صحیح دیں۔ ہر غیر ضروری شخص کے خصائص کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ بھی شائع کی جائے گی۔

۲۔ اس حکم پر بلا رورعایت عمل ہوگا۔ انسانی فضلہ جو زندگی کو عدل و مسرت کی بنیادوں پر تعمیر نہیں ہونے دیتا اُسے بے رحمی کے ساتھ صاف کرنا ہے یہ اعلان بلا امتیاز سب کے لئے ہے۔ مرد عورت، غریب امیر کوئی مستثنیٰ نہیں۔

۳۔ حق زندگی کی تحقیقات کے دوران میں شہر چھوڑ کر جانا سخت ممنوع ہے۔"

"ارے بھائی، تم نے پڑھا؟"

"تم نے پڑھا بھی؟"

"کیوں جی، پڑھا، یہ پڑھا؟"

"تم نے پڑھا؟"

"پڑھا، پڑھا؟"

شہر میں ہر جگہ آدمیوں کا جمگٹھا۔ راستے بھیڑ سے بند۔ کسی کے پاؤں جواب دے گئے، اشتہار پڑھتے پڑھتے وہیں دیوار کا سہارا لے لیا۔ کوئی زار و قطار رو رہا ہے۔ کوئی غش کھا کر گر پڑا۔ شام تک بے تعداد لوگوں کو ضعف کے دورے پڑ گئے۔ شہر میں کہرام مچا ہے۔ بس یہی "تم نے پڑھا، تم نے سنا؟"

"ارے کیسا غضب ہے۔ کسی نے ایسا اندھیر نہ سنا نہ دیکھا۔"

"کیوں بھائی ہمیں نے تو عدالت عالیہ کو منتخب کیا تھا، ہمیں نے تو انہیں سارے اختیارات دئے تھے۔"

"ہاں، یہ تو سچ ہے۔"

"اس مصیبت کے ہمیں ذمہ دار ہیں، ہمیں ہی ہیں۔"

"ہاں، یہ تو سچ ہے۔ قصور تو اپنا ہی ہے۔ ہم نے تو بہتر زندگی کی خواہش کی تھی۔ مگر یہ کسے خبر تھی کہ اس کی تدبیر ہوگی۔ عدالت نے جو سہل اور سچ طریقہ نکالا وہ کسی کے خیال میں بھی نہ تھا۔"

"نام تو دیکھو، کمبختوں کے نام، جو اس کمیٹی میں ہیں۔ اللہ اللہ کیا لوگ ہیں؟"

"کون، کون۔ تمہیں کیا خبر؟ کیا نام بھی نکل گئے ہیں؟"

"ایک جان پہچان والے سے سنا ہے۔ کمیٹی کا صدر آک ہے۔"

"سچ؟ خدا کا شکر ہے۔ یہ بھی خوش قسمتی جانو۔"

"ہاں ہاں۔ وہی صدر ہے۔"

"یہ بڑا ہی اچھا ہے۔ واللہ کیا آدمی ہے!"

"ٹھیک۔ پھر زیادہ فکر نہیں۔ وہ تو واقعی فضلہ ہی کو صاف کرے گا۔ وہ ناانصافی نہیں کرنے گا۔"

"بھائی کیا کہتے ہو۔ مجھے چھوڑ دینگے؟ میں تو اچھا خاصہ آدمی ہوں۔ خبر ہے؟ ایک دفعہ ایک جہاز ڈوبا تو بیس آدمیوں نے ایک کشتی میں اپنی جان بچائی۔ مگر کشتی اتنے آدمیوں کا بوجھ نہ سہار سکی اور سب کے سب ڈوبنے ہی کو تھے۔ پندرہ کشتی میں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کی جان بچانے کے لیے پانچ کو سمندر میں کودنا ضرور تھا۔ میں ان پانچ میں پہلا تھا۔ میں سب سے آگے کودا۔ دیکھتے کیا ہو، یقین نہیں آتا؟ اب بڈھا ہو گیا! کمزور ہو گیا۔ کیوں تم نے کیا واقعی یہ بات پہلے نہیں سنی تھی؟ اس وقت تو سارے اخبار کے اخبار اس سے بھرے پڑے تھے۔ میرے چار ساتھی تو مر گئے۔ میں اتفاق سے بچ گیا۔ کیوں کیا سمجھتے ہو؟ مجھے چھوڑ دینگے؟"

"اور مجھے؟ اور مجھے؟ میں نے اپنا سارا مال دولت غریبوں کو دے ڈالا۔ بہت دن ہوئے۔ میرے پاس ثبوت کے کاغذ موجود ہیں۔"

"بھائی کیا خبر۔ یہ سب اُس پر منحصر ہے کہ عدالت کے پیش نظر کیا چیز ہے؟"

"اجی حضرت۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اپنے پڑوسی کو تھوڑا سا فائدہ پہنچا دینے سے آدمی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ملتا۔ یوں تو پھر ہر بیوقوف اُتّا اور دائی کو زندہ رہنے کا حق ملنا چاہئے۔ یہ تو پُرانے دقیانوسی خیالات ہیں۔ زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ آپ ہیں کہاں؟"

"اچھا تو پھر آدمی کی اصلی قدر و قیمت کاہے سے ہے؟"

"ہاں، واقعی بتائیے، کاہے سے ہے؟"

"میں کیا جانوں، کاہے سے؟"

...خوب رہی۔ جب نہیں جانتے تو پھر خواہ مخواہ ہر بات میں اپنی ناک ...گھسیڑتے ہو؟"

...معاف کیجیے گا۔ میں جو سمجھتا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔"

"ذرا دیکھو تو، دیکھو تو! سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔ گڑبڑ تو ...ہے..."

"...یا اللہ، یا اللہ ۔ اوہو، اوہ...... جان بچاؤ، جان۔"

بھاگڑ

سڑکوں اور گلیوں میں بھاگڑ پڑی تھی۔ آدمیوں کے غول کے غول ادھر سے ادھر دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ لال لال منہ والے نوجوان، چہروں پر ہوائیاں۔ دفتروں اور دوکانوں کے بیچارے غریب منشی اور محرر۔ سستے کھڑکھڑاتے جوڑے پہنے ہوئے دولہا۔ گوّیے، بھکیّے۔ بانکے۔ قصہ گو۔ تاش کھیلنے والے۔ ہر شام کو سینما میں جانے والے۔ بھاڑے کے ٹٹو، بدکار، بدمعاش، ٹھگ، سفید پیشانی اور گھونگردار بالوں والے۔ لچّے، شہدے، لفنگے، لٹھ باز۔ ٹھٹھے لگانے والے، جھگڑا مچانے والے، شوقین چھیلے، مشتاق، سائیکلوں پر چڑھنے والے، ہٹے کٹے مشٹنڈے جنھیں بیکاری کی وجہ سے سوائے شکلکلی کے کوئی کام نہیں، باتیں بنانے والے، فریبی، لمبے لمبے بال والے سکار رکھے پاکھنڈی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آہ سرد بھرنے والے، غمگین اداس آنکھوں والے جیسے غم کے پردہ میں بس کچھ ہیں۔ نوجوان ناتجربہ کار گنوار، بھرے بھرے چہرے، لال لال ہونٹ والے، چکنی چپڑی باتیں کرنے والے، سچی بات بدگو، ہلکے دل ہوتے ناکام لوگ، اللہ جانے کیا کیا خرافاتی۔

موٹی موٹی، ٹھوس ٹھوس گرکھانے والی سست عورتیں بھی دوڑ رہی تھیں۔

اور تپلی دبلی لڑاکو جھگڑالو عورتیں بھی چنچل چلبلی، کان کھاؤ مغز چاٹ، عقلمندوں کی بیویاں اور بیوقوفوں کی، بے وفا، ناتونی، حاسد، لالچی، خوف کے مارے سب کے چہرے بگڑے ہوئے۔ مگری مدیخ النیں؛ یک پارسا مگر بدکار عورتیں، جو بیکاری میں اور کچھ نہیں تو اپنے بال ہی رنگا کرتی ہیں، بے وارث دبے یار، بے سہارے اور بے مددگار عورتیں، بے شرم بے لاج عورتیں، فقیریاں، بھک منگیاں، مارے ڈر کے سب خراب حال، شائستگی پاس لحاظ سب بالائے طاق۔

کمر جھکے بوڑھے بھی دوڑ رہے تھے، اور موٹے ہٹے کٹے بھی۔ ٹھنگنے بھی لمبے بھی۔ خوبصورت بھی بدصورت بھی۔ طوائف خانوں کے مالک، مال گروی رکھنے والے، لوہار، بڑھئی، بنیئے بقال، جیل خانوں کے منتظم، سربراہ کار، سلیقہ شعار، بڑے بڑے خدمتگار، اچھے کھاتے پیتے گرہست، لوگوں کو دھوکہ دے دیکر موٹے ہونے والے، معزز ٹھگ، مقدس ڈاکو۔

سب کے سب دوڑ رہے ہیں۔ ایک پر ایک چڑھا جاتا ہے۔ بدن پر، ہاتھوں میں، سر پر، کپڑے گدڑے لدے ہیں۔ منہ سے لعاب نکل رہی ہے۔ خاموش اور افسردہ گھروں سے ان کے پیچھے چلانے، روئے پیٹنے کی صدائے بازگشت اٹھ رہی ہے۔ بتے رہے ہیں کہ اپنا سارا مال اسباب لئے جا رہے ہیں۔ کسی کی انگلیاں اپنے تکیہ ہی میں گڑی ہیں۔ کوئی اپنا صندوق گھسیٹ رہا ہے۔ کوئی زر و جواہر لئے جا رہا ہے۔ کوئی اپنے بچوں کو کھینچ رہا ہے۔ ایک گھر سے چلاتا پیٹتا نکلا، پھر لوٹا، سر پیٹنے لگا، اور پھر سڑک پر دوڑا۔

مگر سب کو لوٹا دیا جاتا تھا۔ سب کو۔ انھیں کے سے دوسرے انسان ان پر بے دریغ گولی چلا رہے تھے؛ ان کا راستہ روک رہے تھے، ڈنڈوں سے خوب پیٹ رہے تھے؛ گھونسے بھی مل رہے تھے، پتھر بھی، کوئی تو گتھ جاتا تھا اور دانتوں

[illegible]ی آ جاتی تھی۔ ایسا شور، ایسا ہنگامہ، الاماں۔ آخر کو شہریوں کو لوٹنا پڑا۔ پھر گھروں کی طرف بھاگے اور میدان میں اپنے زخمیوں اور مردوں کو چھوڑ آئے۔

[illegible] ہوتے شہر میں پھر کچھ سکون سا ہو گیا۔ روتے کانپتے لوگ گھروں کو [illegible]ے اور اپنے بستروں پر پڑ پڑ کر سو گئے۔ سر سب کے ایسے گرم تھے جیسے آگ جل رہی ہو، مگر ان میں تھوڑی دیر کے لئے امید کی جھلک پیدا ہو جاتی تھی۔

سیدھی سادی کارروائی

"تمہارا نام؟"

"بسو"

"عمر؟"

"تیس برس"

"پیشہ؟"

"سگریٹ بناتا ہوں"

"سچ بولو، جی!"

"حضور سچ عرض کرتا ہوں۔ میں نے ایمانداری سے ۱۲ برس یہی کام کیا ہے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کی ہے۔"

"بال بچے کہاں ہیں؟"

"یہ حاضر ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔ یہ میرا لڑکا ہے۔"

"ڈاکٹر، بسو کے بال بچوں کا امتحان کرو۔"

"جی، کر چکا۔"

"پھر کیا کہتے ہو؟"

"شہری لسو کے بدن میں خون کی کمی ہے - عام حالت اوسط - اس کی بیوی کو پیٹ کے درد اور گٹھیا کی شکایت ہے - لڑکا تندرست ہے"

"اچھا، ڈاکٹر، تم جا سکتے ہو - شہری لسو، تمہاری دلچسپیاں کیا ہیں؟ تمہیں کیا چیزیں پسند ہیں؟"

"مجھے سب آدمی پسند ہیں - زندگی پسند ہے"

"زیادہ واضح بات کرو - ٹھیک ٹھیک، صراحت سے!"

"مجھے پسند .... ہاں، کیا پسند ہے؟ .... مجھے اپنے لڑکے سے محبت ہے ... وہ بڑی اچھی بانسری بجاتا ہے ... مجھے کھانا پسند ہے - یہ نہیں کہ میں کوئی پیٹو ہوں ...... مجھے عورتیں پسند ہیں .. عورتوں اور لڑکیوں کو سڑک پر چلتے دیکھنا اچھا لگتا ہے . جب تھک کر شام کو گھر آتا ہوں تو آرام کرنا مجھے بھاتا ہے - .. مجھے سگریٹ بنانا پسند ہے ... مجھے زندگی پسند ہے"

"بس بس سنبھلو - روں روں مت کرو .... کیوں نفسی صاحب، آپ کیا کہتے ہیں؟"

"مفصول بکتا ہے - کچرا ہے کچرا - نہایت معمولی ہستی - لغو مخلوق - طبیعت کچھ بلغمی کچھ دموی جیتی کم درجہ - آخری - ترقی کی امید - مفقود - مجہولیت ۵۰ فی صدی - مسز لسو اس سے بھی پست - لڑکا بھی معمولی ہے مگر شاید .... کیوں جی، تمہارے لڑکے کی کیا عمر ہے - روں روں کیوں کرتے ہو!"

"تیرہ برس"

"گھبراؤ مت - فی الحال تمہارا لڑکا زندہ رکھا جائیگا - رہے تم سو .... خیر یہ میرا کام نہیں آپ صاحبان فیصلہ صادر فرمائیں"

"عدالت عالیہ کی کمیٹی کی طرف سے جو حیات انسانی کو کچرے اور فضلات سے پاک کرنے کے لئے قائم کی گئی ہیں تم کو حکم دیتا ہوں، شہری لسو، اور تمہاری بیوی کہ تم دونوں

...ندگی سے رخصت ہو لو۔ بس چپ رہو۔ چلاؤ مت۔ داروغۂ صفائی، تم ...ت کو چپ کرو۔ سنتری کو بلاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بلا خارجی مدد کے تعمیل حکم نہیں ...

فضول اور فالتو لوگوں کی خصوصیات

بھورا کمرہ

عدالت العالیہ کی غلام گردش میں ایک طرف کو ایک بھوری کوٹھری تھی ایک کوٹھری جیسی بتیری کوٹھریاں ہوتی ہیں، چھوٹی جس میں دم گھٹے۔ لمبائی چوڑائی کوئی ڈھائی ڈھائی گز ہوگی، چھت بھی کچھ زیادہ اونچی نہ تھی لیکن اسی چھوٹی سی کوٹھری میں کئی ہزار انسانوں کی قبر تھی۔ ایک الماری تھی جس پر موٹا موٹا لکھا تھا۔ "غیرضروری آدمیوں کی فہرست"۔ اس فہرست کے کئی حصے تھے، منجملہ اُن کے ایک حصہ "بلا امتیاز اثر پذیر لوگوں" کے لئے؛ ایک چھٹ بھیئے طرفداروں کے لئے؛ ایک مجہولوں کے لئے؛ ایک توازن بگڑ جانے والے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کی خصوصیت نہایت مختصر لکھی گئی تھی اور بالکل بے تعلقی کے ساتھ۔ بعض بعض کے متعلق بیشک ایک آدھ سخت بات درج تھی۔ لیکن ایسی عبارتوں پر بلا استثناء کسی نے سرخ پنسل سے نشان کر دیے تھے اور حاشیہ پر لکھ دیا تھا کہ غیرضروری لوگوں کو بھی خواہ مخواہ بُرا کہنا مناسب نہیں۔ غیرضروری لوگوں کی مسلوں کے چند نمونے یہ ہیں:۔

غیرضروری نمبر ۱۴۷۳۱

صحت: اوسط۔ اپنے جان پہچان کے لوگوں سے ملتے جاتا ہے لیکن اُس کی صحبت سے نہ کسی کو فائدہ ہوتا ہے۔ دلچسپی۔ ہر بات میں ہر ایک کو صلاح و مشورہ ضرور

دیتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں ایک لڑکی کو بھگا لایا تھا، پھر اُسے چھوڑ دیا۔ شادی کے سامان آرائش کی خریداری اُس کے نزدیک زندگی کا سب سے اہم مقصد ہے۔ دماغ کند اور دُھندلا ہے کام کی بالکل صلاحیت نہیں۔ جب پوچھا گیا کہ زندگی میں سب سے دلچسپ تجربہ کیا ہوا تو جواب دیا کہ پیرس کے ایک قہوہ خانہ میں جانا۔ نہایت معمولی مذہبیت کی مخلوق سب سے بچی نہ کا فرد۔ دل کمزور۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر۔

غیر ضروری نمبر ۱۴۶۲۲۳

ایک چھوٹی سی دوکان میں نوکر ہے۔ درجہ متوسط۔ کام سے ذرا دلچسپی نہیں۔ ہر کام میں بس وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس میں سب سے کم دشواری ہو۔ جسمانی طور پر: اچھا۔ دماغی اعتبار سے اسی عام مرض کا شکار ہے: یعنی زندگی کا خوف، آزادی کا ڈر۔ جب چھٹیوں میں آزاد ہوتا ہے تو شراب سے اپنے حواس مختل کر لیتا ہے۔ انقلاب کے زمانہ میں ذرا جلت پھرت دکھائی تھی۔ ایک لال تسمہ بھی لگا لیا تھا اور جتنے آلو اور حقیا علہ کہیں ملتا سب جمع کر رہا تھا۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کھانے پینے کی چیزیں کم نہ پڑ جائیں اس پر فخر کرتا تھا کہ غریبوں کی اولاد ہے۔ خود انقلاب میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مارے ڈر کے۔ کھٹی بالائی اسے پسند ہے بچوں کو مارتا ہے۔ زندگی کی رفتار سست ہے۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر۔

غیر ضروری نمبر ۱۵۲۰۱

آٹھ زبانیں جانتا ہے مگر لگتا ہے کہ سب سے جی اُکتا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں ذہانت جتلاتا ہے۔ بہت پر خود غلط ہے۔ زبانیں جاننے پر بڑا گھمنڈ ہے چاہتا ہے کہ لوگ اس کی عزت کریں۔ گپ بہت لگاتا ہے۔ زندہ چیزوں کی طرف سے بہت اعتناء ہے جیسے بیل کو ہو۔ فقیروں سے بہت ڈرتا ہے۔ مکھیاں اور پتنگے مارنے کا بڑا شوق ہے۔ شاذ ہی اسے دلی خوشی حاصل ہوتی ہو۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر۔

غیر ضروری مادہ نمبر ۴۳۵۶

خواہ مخواہ نوکروں کو برا بھلا کہتی رہتی ہے۔ جبکہ دودھ پر سے بالائی اور شوربہ پر سے تار اُتار لیتی
[illegible] پر چھپے پڑے گزار دیتی ہے۔ اس کی سب سے عزیز آرزو یہ ہے کہ اس کے پاس
ایک چمکدار زرد آستینوں کا لباس ہو۔ بارہ برس تک ایک نہایت قابل موحد اس پر عاشق رہا۔ اور
[illegible] عاشق کے شغل تک کا علم نہ ہوا۔ یہی سمجھا کی کہ کوئی بجلی کا کام کرنے والا ہے۔ اس غریب
کو چھوڑ کر اس نے ایک چمڑے کے تاجر سے شادی کرلی۔ اولاد نہیں ہے۔ اکثر بلاوجہ تلون مزاجی
کا اظہار کرتی ہے۔ راتیں سوتے سوتے اُٹھکر چار راو، تو بس سوتی ہے۔ بالکل غیر ضروری ہستی۔
۲۴ گھنٹے کے اندر۔

ماہرین فن کی ایک فوج آک کے ساتھ عدالت العالیہ کی کمیٹی میں کام پر لگی ہوتی تھی۔ اس میں ڈاکٹر بھی تھے، ماہران نفسیات بھی، بڑے بڑے مبصر اور مشہور مصنف بھی۔ یہ سب بہت غیر معمولی رفتار سے کام کرتے تھے۔ بعض بعض موقعوں پر یہ ماہر گھنٹہ بھر میں سیکڑوں آدمیوں کو دوسری دنیا کی راہ بتلا دیتے تھے اور غیر ضروری انسانوں کی شکلیں تھیں کہ بھوری کوٹھری میں بھری جا رہی تھیں۔ ان کا عدالت میں بیان کی روانی کا مقابلہ اگر ممکن ہے تو مصنفین کے راسخ سقن کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

صبح سے رات تک کام جاری رہتا تھا۔ گھروں پر جانے والے کمیشن آتے تھے اور جاتے تھے۔ احکام عدالت کو نافذ کرنے والوں کی ٹولیاں آتی تھیں جاتی تھیں۔ اور میزوں کے پیچھے درجنوں آدمی بیٹھے ہوئے نہایت تیزی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھے جاتے تھے۔

آک ان سب کو اپنی چھوٹی چھوٹی تیز اور ناقابل فہم آنکھوں سے دیکھتا تھا اور کچھ سوچا کرتا تھا اسی فکر میں اس کا بدن روز بروز جھکتا جاتا تھا اور اس کے بڑے، جھلے، اور تضدی سر جس سفیدی کے آثار زیادہ نمایاں ہوتے جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ اس کے اور اس کے ملازموں کے درمیان ایک دیوار سی پیدا ہو گئی۔ جو اسکی خود شناسی، اسکی فکر، اور اس کے احکام کو نافذ کرنے والوں کی کور چشمی اور ان کے باتھو کی بے تعلقی کے درمیان حائل ہو گئی۔

آگ کے شبہات

ایک دن کمیٹی کے اراکین اپنے کمرہ میں اپنی رائیں سنانے کے لئے جمع ہوئے آگ اپنی روز والی جگہ پر نہ تھا۔ بہت ڈھونڈھا کہیں پتہ نہ لگا۔ انہوں نے ادھر اُدھر آدمی دوڑائے ٹیلیفون کئے مگر بے سود۔ کوئی دو گھنٹے بعد اتفاق سے دیکھا تو یہ بھوری کوٹھری میں بیٹھے ہیں۔ یہ کوٹھری میں غیر ضروری آدمیوں کی مسلوں پر بیٹھا تھا۔ آنکھوں میں شدید تفکر کے آثار تھے جو خود آگ تک کے لئے بھی غیر معمولی سی چیز تھی۔

سب نے پوچھا "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"دیکھتے ہو نہ کہ سوچ رہا ہوں" آگ نے تھکی ہوئی آواز سے جواب دیا۔

"مگر یہاں اس کوٹھری میں کیوں؟"

"یہی سب سے مناسب جگہ ہے۔ میں آدمیوں کی بابت کچھ سوچ رہا ہوں اور اگر انسانوں کے متعلق کارآمد فکر ممکن ہے تو وہ انکی تباہی کے مکناموں کے قرب ہی میں ممکن ہے انسان کی تباہی کے دستاویزوں کے پاس بیٹھکر اُس کی عجیب و غریب زندگی کے متعلق کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔"

کسی نے ایک سوکھا ٹھٹھا لگایا۔

"ہنستے ہو؟" آگ نے ہاتھ میں ایک مسل لیکر کہا "سنو مت، میں سمجھتا ہوں کہ عدالت العالیہ کے خیال میں ایک تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ مرنے والوں کی مسلوں کو دیکھکر مجھے ترقی کے کئے نئے راستے سوجھے ہیں۔ تم سب نے تیزی اور صفائی سے مختلف ہستیوں کو

غیرضروری طور پر سوچا سمجھا گیا ہے۔ تم میں سے نااہل سے نااہل چند جملوں میں یقین کے ساتھ یہ حکم لگا دیتا ہے۔ اور میں ہوں کہ یہاں بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ آیا تمہارا یہ طریق درست

آک پھر سوچتے سوچتے کچھ بہک سا گیا، ایک ٹھنڈی سانس لی، اور آہستہ سے کہا۔
"کرنا کیا چاہیئے؟ اصل بات کیا ہے؟ اگر زندوں کی زندگیوں کو دیکھو تو نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں سے تین چوتھائی کو ختم کر دینا چاہیئے۔ مگر جب ان بڑھیاں کو دیکھو جو مر گئے ہیں تو کچھ شبہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ ان سے محبت کیجاتی اور ان پر رحم کیا جاتا؟ میں سمجھتا ہوں کہ بس یہی مسئلہ انسانیت کی، اور تاریخ انسانیت کی ابتدا گلی ہے۔"

آک پر ایک غم آمیز خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے مرے ہوؤں کی مسلوں کو پھر الٹ پلٹ کرنا شروع کیا اور ان کے متعلق وہ اختصار پر غور کرتا رہا۔ عدالت کے اراکین چلے گئے۔ کسی نے آک کے خیال کی تردید نہ کی۔ اول تو اس لئے کہ آک کی تردید بیکار تھی، دوسرے اس لئے کہ کسی میں اس کی ہمت ہی نہ تھی۔ مگر سب نے یہ محسوس کر لیا کہ کوئی نئی تجویز پک رہی ہے اور سب اس سے غیر مطمئن ہیں۔ موجودہ صورت کی انہیں عادت پڑ چکی تھی اور یہ تجویز تھی بھی نہایت واضح اور قطعی۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نئی صورت اختیار کیجانے والی ہے۔ مگر کیا؟ یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس عجیب و غریب آدمی کا دماغ کیا نئی چیز نکالے گا، یہ جس کو اس شہر پر ایسا حیرت خیز تسلط حاصل تھا۔

آک غائب ہو گیا یہ اس کی عادت تھی، جب کوئی خاص فکر ہوتی تو غائب ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے ہر جگہ ڈھونڈا پر نہ پایا۔ کسی نے خبر دی کہ آک شہر کے باہر بیٹھا رو رہا ہے۔ کسی اور نے خبر دی کہ آک اپنے باغ میں چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا تھا اور مٹی منہ میں لے لیکر چابتا تھا۔

عدالت العالیہ کا کام دھیما پڑ گیا آک کے غائب ہونے سے کام میں وہ انہماک کہاں

نہ سکتا تھا۔ شہریوں نے اپنے دروازوں میں لوہے کی سلاخیں چڑھا لی تھیں اور عدالت کے
[آد]میوں کو گھر میں گھسنے ہی نہ دیتے تھے۔ بعض محلوں میں تو عدالت کے سوال پر کہ تمہیں زندہ
[ر]ہنے کا حق ہے یا نہیں لوگ ٹھٹھے لگاتے تھے۔ اور ایک جگہ تو یہ تک ہوا کہ لوگوں نے
عدالت کے اراکین کو پکڑ کر اُن کے حق زندگی کی تحقیقات کر ڈالی اور ان کی مسلیں تیار کر دیں
جو کسی طرح سیوری کوٹھری والی مسلوں سے کم نہ تھیں۔

شہر میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عبرضروری "شہری جن پر ابھی عدالت کے حکم
کی تعمیل نہ ہو سکی تھی بے مطمئن اور دلیر بنگئے تھے کہ خوب مزے سے سڑکوں پر اکڑتے پھرتے تھے
ہر طرح کی دل لگی کرتے اور عجب یہ کہ شادیاں تک کر رہے تھے۔ لوگ راستوں میں ایک
دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ "شکر ہے، شکر، ختم ہوئی مصیبت، ختم ہوئی۔" "حق زندگی
کا امتحان خدا خدا کرکے ختم ہوا۔" "کیوں، میاں، سچ کہو، کیا واقعی زندگی زیادہ مزہ کی نہیں
ہو گئی۔ انسانی کچرا پہلے سے کم ہے۔ اب آدمی ذرا اطمینان سے سانس تو لے سکتا ہے!"

"ارے، ارے، تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیا سچ تم سمجھتے ہو کہ جن بیچاروں کو ختم
کیا گیا ہے انہیں زندگی کا حق نہ تھا۔ اجی کیا کہتے ہو، میں کتنے ہی ایسے آدمیوں کو جانتا
ہوں جنہیں ایک منٹ زندہ رہنے کا حق نہیں اور وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اور ذرا
سوچو تو کتنے اچھے بھلے آدمی ختم کر دیے گئے۔ اُفوہ۔ کاش تمہیں خبر ہوتی۔"

"یہ کیا بات ہے، غلطیاں تو لازمی ہیں۔ یہ تو کہو، کچھ آگ کی بھی خبر ہے۔"

"کچھ پتہ نہیں۔"

"سنا ہے کہ شہر کے باہر ایک درخت پر بیٹھا رو رہا ہے۔"

"نہیں جی۔ چاروں ہاتھ پاؤں پر جانوروں کی طرح چل رہا ہے اور مٹی
چبا رہا ہے۔"

"رونے دو جی" "ہاں، ہاں، مٹی چبانے دو۔"

ساری یہ خوشی قبل از وقت ہے ۔ سچ کہتا ہوں قبل از وقت ہے ۔ آگ آج شام کو آنے والا ہے اور عدالت کا کام پھر شروع ہو جائے گا "

مجھے معلوم ہے ابھی سب باکچرا باقی ہے پوری پوری صفائی لازمی ہے ۔ پوری

تم ہو ، بھائی "
دیکھو لوگو ، دیکھو ۔ ۔ ۔ نئے اشتہارات لگ رہے ہیں "
دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ کسی خوش خبری ، کسی خوش قسمی ہے "
" پڑھو ، پڑھو "
" ذرا پڑھو تو "
" پڑھنا ذرا پڑھنا "

نئے اشتہار

آدمی چاروں طرف دوڑ رہے تھے ۔ سانس پھولے ہوئے تھے ۔ ہاتھوں میں لیئی کی بالٹیاں تھیں ، اور گلابی رنگ کے اشتہارات کے کٹے ۔ اس کٹے سے اشتہار نکالکر خوشی خوشی مکانوں پر چسپاں کئے جا رہے تھے ۔ ان کا مضمون بھی صاف واضح ، سادہ اور قطعی تھا ۔

سب کے لئے

بلا استثنا

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی سب شہریوں کو حق زندگی مل جائیگا ۔ زندہ رہو ، بڑھو ، پھلو پھولو ۔ عدالت العالیہ اپنا سخت فرض انجام دے چکی ۔ آئندہ سے اس کا نام عدالت ترحمات عالیہ ہوگا ۔ تم سب اچھے لوگ ہو اور تمہارا حق زندگی مسلّم ۔ عدالت ترحمات عالیہ

تین تین اراکین کے خاص کمیشن مقرر کرے گی جو روزانہ شہریوں کے گھروں پر جاکر انہیں مبارکباد دینگے اور اس پر اُن کے خیالات جمع کر کے "خوشی کی ملوں" میں شامل کریں گے۔

اس کمیشن کے اراکین کو شہریوں سے اُن کے طرز زندگی کی بابت مفصل سوالات کا اختیار ہوگا۔ اور شہری اگر چاہیں تو تفصیل سے جواب دے سکتے ہیں بلکہ یہی بہتر ہوگا۔ شہریوں کے مسرت خیز جواب مرتب کر کے ایک گلابی دفتر میں آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دئے جائینگے۔

سارا شہر باغ باغ تھا۔ سارے دروازے، دریچے، کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گھروں سے گانے بجانے، ہنسنے کھلکھلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ موٹی موٹی تھیں لڑکیاں بیٹھی پیپا تو بجاتی تھیں۔ صبح سے شام تک گراموفون چلتے ہی رہتے تھے۔ بانسریاں، ستار، سارنگیاں سب بج رہی تھیں۔ شام کو لوگ کوٹ اُتار کر پیر پھیلا کر اپنے چھجوں پر بیٹھتے تھے۔ سڑکوں میں چہل پہل دیکھنے کی تھی۔ مٹھائی کی دوکانوں اور قہوہ خانوں میں مرد عورتوں کی بھیڑ تھی۔ کوئی مٹھائیاں اُڑا رہا تھا، کوئی ٹھنڈا شربت پی رہا تھا۔ بساطیوں کے یہاں جہاں آئینہ بکتے تھے ایک ہجوم تھا۔ مرد عورت سب کے سب آئینہ خرید کر اپنا اپنا منہ دیکھ رہے تھے۔ مصوروں کے یہاں تصویروں کے بے تعداد آرڈر آرہے تھے۔ ہر شخص اپنی تصویر پر چوکھٹہ چڑھوا کر دیوار پر لگا رہا تھا۔ ایک جگہ تو قتل ہی ہوگیا۔ جس کا اخباروں میں بڑا چرچا رہا۔ بات یوں تھی کہ ایک نوجوان نے کسی مکان میں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ اور مالک مکان سے مطالبہ کیا کہ دیوار پر اُس کے ماں باپ کی تصویریں لٹکی ہیں وہ اُتار دے۔ مالک اور اُس کی بیوی اس پر بہت ناراض ہوئے۔ آخر کو بات بڑھی اور ان دونوں نے ملکر نوجوان کو مار ڈالا اور پانچویں منزل سے اُس کی لاش سڑک پر پھینکدی۔

احساس نفس اور خود پرستی کے جذبے بڑی ترقی پر تھے۔ جھگڑے ٹنٹے روز کا قصہ بن گئے تھے۔ ایسی باتیں ہر وقت سننے میں آتی تھیں۔ ٹھیک ٹھیک۔ ظاہر ہے کوئی غلطی ہوگئی

ہم زندہ ہو۔ عدالت عالیہ نے اپنا کام بے پروائی سے کیا" "جی ہاں، بہت بے پروائی سے کیا، ابھی تو آپ جیسے جیتے پھر رہے ہیں۔" مگر روزانہ زندگی میں ان جھگڑوں کا کوئی زیادہ خیال [illegible]۔ انہوں نے بہتر کمانا شروع کر دیا تھا۔ طرح طرح کے مربے بنتے تھے۔ گرم کپڑے کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ صحت کی بڑی قدر کرنے لگے تھے۔ عدالت ترجمات عالیہ [illegible] روزانہ گھروں پر جاتے اور لوگوں سے دریافت حال کرتے تھے۔ اکثر کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم بڑے مزے میں ہیں۔ اور بہت سے اس کا ثبوت دینے پر بھی اصرار کرتے تھے۔ بعض کچھ شکایت بھی کرتے تھے کہ عدالت العالیہ نے اپنا کام قبل از وقت ختم کر دیا۔ کل شام میں ٹرام میں آ رہا تھا۔ اور غضب ہے خدا کا ایک جگہ بھی تو خالی نہ تھی مجھے اور میری بیوی کو پورا راستہ بھر کھڑا رہنا پڑا۔ ابھی بہت سے غیر ضروری آدمی زندہ ہیں۔ قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ شیطان اُن کی خبر لے۔ کب افسوس ہے کہ جب موقع تھا تو انہیں ختم نہیں کیا گیا۔ بعض کو اور شکایتیں تھیں۔ مثلاً "ذرا دیکھو تو، کسی نے مجھے زندگی کی مبارکباد نہ دی، نہ بدھ کو، نہ جمعرات کو میں انتظار ہی کرتا رہا۔ عجیب لوگ ہیں۔ کیوں جی۔ کیا اب میں خود ان کے پاس جاؤں کہ مجھے مبارکباد دو؟"

خاتمہ

آک کے دفتر میں حسب معمول کام جاری تھا لوگ بیٹھے تھے اور لکھ رہے تھے۔ گلابی دفتر خوشی کی مسلوں سے بھر گیا تھا۔ ان میں نہایت تفصیل کے ساتھ لوگوں کی سالگرہ، شادیوں، سفر، دعوتوں، اور عشق و محبت کی رودادیں درج تھیں۔ بعض مسلیں تو ناول و افسانہ معلوم ہوتی تھیں۔ باشندوں نے درخواست دی کہ عدالت ترجمات عالیہ ان مسلوں کو کتابوں کی صورت میں شائع کر دے۔ جب شائع ہوئیں تو لوگوں نے خوب پڑھیں۔ ادھر آک پر خاموشی طاری تھی۔ بس روز بروز کمر جھک رہی تھی، سر سفید ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی یہ گلابی دفتر میں جاتا اور

گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا جس طرح پہلے بھوری کوٹھری میں بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن ایک چیخ مار کر گلابی دفتر سے نکلا "ان کو ختم کرنا ضروری ہے۔ ان کو قتل کرنا۔ ان کو مار ڈالنا چاہئے" مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے نوکر اپنی سفید سفید انگلیوں سے اب اُسی تیزی کے ساتھ زندوں کا حال کاغذ پر لکھ رہے ہیں جیسے پہلے مُردوں کا لکھتے تھے تو اُس نے عجیب طرح سے اپنا ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر بھاگ کر غائب ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے ہی غائب ہو گیا۔

آک کے غائب ہونے کی بابت سیکڑوں افسانے بن گئے اور طرح طرح کی افواہیں مشہور ہوئیں مگر آک کا پتہ پھر نہ چلا۔

اور وہ کثیر التعداد انسان جنہیں آک پہلے ختم کرنا چاہتا تھا، جن پر بعد کو اسے رحم آگیا تھا اور تھوڑے دن بعد اس نے جنہیں قتل کرنے کی پریشانی تھی، وہ انسان جنہیں بہت سے اچھے لوگ بھی تھے اور بہت کچھ غیر ضروری کچرا بھی وہ انسان آج تک زندہ چلے جاتے ہیں۔ جیسے کبھی آک تھا ہی نہیں، جیسے کبھی ان کے حق زندگی کا سوال ہی کسی نے نہ اٹھایا تھا۔

غزل

(از حسرت جگر)

…ام ہوا اس دل کے پیمانے میں ہے
وہ ترے شیشہ میں ہے ساقی نہ پیمانے میں ہے

پھر چھپا لیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب الٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے

ایک ایسا راز ہی دل کے نہاں خانے میں ہے
لطف جس کا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

ایک کیف ناتمام درد کی لذت ہی کیا
درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں ہے

… کرشمے تجھ کو زاہد تیری دنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہے کشش کہ پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا بہکر بہک جانے میں ہے

تجھ کو ہے جذب طلب حسن ازل ہی کی قسم
دیر کتنی دل پہ اک تصویر اتر آنے میں ہے

حسن کی ہر ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذر جانے میں ہے

منتشر کر دے اسے بھی حسن بے پایاں کیا تھا
زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے

اٹھ گیا کافر جگر تھا کیا کوئی پھر حق پرست
حشر ہے کعبہ میں برپا شور بتخانے میں ہے

غزل فارسی

(از حضرت اصغر)

زفیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا
زخونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا

پے روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
بہ اوجِ عرشِ اعلیٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا

زموجِ خونِ دل صد بار من رنگیں قبا گشتم
بخاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا

ز "لا" تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ و انجم را
زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

بلے از جلوۂ حسنت جہاں یکسر نمی ماند
بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا

جہانے را تپش بخشم، جہانے را بوجد آرم
دریں خاکسترے حسن شرارے کردہ ام پیدا

من مسلم چہ مسلم؟ آنکہ او را یار میگوید
پس از عمرے ہمی زنار دارے کردہ ام پیدا

جہانِ مضطرب را یہ سکونِ دائمی نیدانی
چہ ساں در بیقراری ہا قرارے کردہ ام پیدا

مگر اے پیرو طرزِ جنونِ من نیدانی
بیں محمل نشینے صد غبارے کردہ ام پیدا

من از رنگِ وجودِ خویش اصغر نقشہا چینم
برائے جانِ بیخود مست یارے کردہ ام پیدا

شذرات

[illegible] ۱۹۲۲ء بھی ختم ہوگیا۔ سال کے ختم پر عموماً ادارے اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں، ان مفید کاموں کو گنواتے ہیں جو انکے ہاتھوں گذشتہ بارہ مہینے میں انجام پائے، دبی زبان سے اپنی خامیوں کا ذکر بھی کردیتے ہیں شاید اس لئے کہ اس سے ان کی خدمات ذرا اور چمک [illegible] آیندہ سال کے متعلق وعدے کرتے اور اپنے ارادوں کا اعلان کرتے [illegible] والے اپنی خدمات کیا گنوائیں؟ اگر ان سے کوئی خدمت بن پڑی تو اللہ کا احسان [illegible] خدمات کا سچا اجر اسی کے یہاں سے ملتا ہے۔ اگر ہم میں خامیاں ہیں (اور اس [illegible] میں ان خامیوں کا خود جامعہ والوں سے زیادہ کسے احساس ہوگا؟) تو ہم انہیں سب کے سامنے بیان کرکے اپنے دل کے بوجھ کو کیوں ہلکا کریں، خدا کرے اگلے سال ہماری زندگیاں پچھلے [illegible] سے بہتر، ہماری خدمت زیادہ پرخلوص، ہماری فکر زیادہ حق پسند، ہماری نظر زیادہ پاک ہو۔ آئندہ کے لئے وعدے ہم کیا کریں اور کیسے کریں؟ اپنی خامیوں کے بھروسہ پر؟ اپنی قوم کی بے اعتنائی کے زعم پر؟ تنگ نظر خیرخواہوں اور تنگ دل مخالفوں کے اعتماد پر؟ نہیں، نہ ہم اپنی خدمات کی اہمیت جتانا چاہتے ہیں، نہ اپنی غلط اندیشیوں اور خامکاریوں کا اعلان کرکے اپنی ذمہ داری کو کم کرنا چاہتے ہیں، نہ ہم بڑے بڑے وعدے کرکے اپنے ہمدردوں کے لئے اس وقت خوشی لیکن بعد کو مایوسی کا سامان مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہماری خدمات کی قدر کرنا چاہے یا بے قدری وہ خود انہیں معلوم کرے۔ جس کا دل ہماری خامیوں پر دکھتا ہو اور وہ انکی اصلاح میں ہماری مدد کرنا چاہے اسے ہماری کھلی ہوئی برائیاں تو معلوم ہی ہوسکتی ہیں، وہ جو اسے معلوم نہیں وہ بھی اس پر دیانت وایمانداری سے ظاہر کردی جائیں گی؟ اور جس کا جی ہماری برائیوں اور ان کی تشہیر سے خوش ہوتا ہو اسے

اسے اپنی خوشی کے وسائل اپنی ہی محنت سے تلاش کرنے چاہئیں۔ ہم سال کے ختم پر جب اپنا اور اپنے کام کا محاسبہ کرتے ہیں تو ہماری گردن اس کے دربار میں جھک جاتی ہے جسکی منشا کی تلاش اور جس کی رضا کی طلب ہمارے وجود کی غایت ہے اسی کے سامنے اپنی کوتاہیوں کا اقرار صراط مستقیم کے ملنے کا وسیلہ ہے اور اسی کے منشا کی تکمیل اصلی خدمت۔ آئندہ کے وعدے اور ارادے بھی اس کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کے سامنے ہماری روحیں ایک جامع سوال کے جواب میں نہ جانے کب کی "بلا" کہہ چکی ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ جامعہ کو اس کا کام بنائیں۔ وہی اس کی توفیق عطا فرمائے آمین

حسبنا اللہ، ونعم الوکیل

اس سال ہندوستان کی سیاسی زندگی کا سب سے اہم واقعہ کانگریس کا وہ رزولیوشن ہے جس میں ملک کی سیاسی جدوجہد کے مقصود، سوراج کی وضاحت کردی گئی ہے اور اسکے معنی کامل خود مختاری مقرر کیے گئے ہیں۔ ملک کے اخباروں اور ہماری سیاسی انجمنوں اور فرقوں کے مباحثوں میں اس کی وجہ سے مکمل آزادی اور ڈومینین، جیسی حیثیت کے فرق اور ان کے اعتباری محاسن ومعائب کا سوال بہت اہم بن گیا ہے۔ حالانکہ اس کی کچھ زیادہ ضرورت نظر نہیں آتی۔ دنیا کی ہر قوم کا حق ہے کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی روایات اور اپنے مخصوص حالات کے اعتبار سے ترقی دے۔ متمدن دنیا ہر قوم کے اس حق کو نظری حیثیت سے تسلیم بھی کرچکی ہے۔ سب مانتے ہیں کہ تمدن انسانی کا گلدستہ اپنے کمال حسن کو اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب اسکا ہر پھول اپنی تاریخ اور روایات کی سرزمین سے کسب فیض کرکے پوری شادابی حاصل کرے اور اپنے اندر اپنے مخصوص رنگ و بو کے اعتبار سے کمال پیدا کرے۔

ہندوستان میں آزادی کی جو تحریک آج تقریباً پچاس سال سے جاری ہے کیا اس کے

سامنے ابتک یہ ابتدائی حقیقت نہ تھی؟ پھر وہ کیوں ابتک "ڈومینین" جیسے مرتبہ سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرتا تھا؟ ہوسکتا ہو کہ کمزوری کے باعث، ممکن ہو اپنی بزدلی کی وجہ سے۔ یا ضرورت زمانہ اور مصلحت وقت کا لحاظ کرکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں بھی اس ظاہری اعتدال مطالبات میں شامل تھیں لیکن ہندوستانی آزادی کے مجاہدوں میں جب کے سب تو کمزور و بزدل، صرف مصلحت اندیش اور ابن الوقت نہ تھے۔ تو آج بطا۔ ان میں کسی مخصوص عزم و [illegible] ہو رہو گیا ہو۔ بات یہ ہو کہ ہر محکوم قوم جب وہ اپنی محکومیت کے معنی کو جان جاتی ہو تو آزادی ہی کی طالب ہوتی ہے اور آزادی "کامل" ہی ہوتی ہے۔ اسکے ٹکڑے کرنا اور ہر [illegible] کی تعیین کرنا ممکن نہیں۔ اسلئے ہندوستان نے بھی جس دن سے اپنی محکومیت کی ذلت کو محسوس کیا اس وقت سے آزادی کا مطالبہ شروع کیا اور ہمیشہ اسکا مطلب کامل آزادی تھا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ و روایات کی حقیقی روح یہ ہو کہ، بنیادی زندگی میں اختلافات کو ختم کرکے ہم آہنگی پیدا کرے۔ کُل کی بھلائی کے آگے جزو کا خیال نہ کرے ہندوستان کی سیاست میں اسکی اس تمدنی روح اور مسلمانوں کے اس عقیدہ نے کہ قوم، نسل، ملک کا [illegible] حیات انسانی کے ارتقاء صحیح کا دشمن ہے ہمیشہ اس کے مفکرین کو تنگ نظری اور یورپ جیسی انسانیت دشمن قوم پرستی سے بچایا ہے۔ اس لئے اس کے ان مجاہدین راہ حریت نے بھی جو کلمہ حق زبان سے نکالکر قید و بند کی صعوبتوں کے برداشت کرنے کے لئے آمادہ تھے کبھی آزادی کے یہ معنی نہیں سمجھے کہ ساری دنیا سے الگ، سب ملکوں سے بے تعلق ہندوستان اپنی سیاسی زندگی کا ڈھیر کھڑا کرے۔ انہوں نے اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہی کہ دنیا میں الگ الگ قوموں کے دن ختم ہوگئے اور معیشت و صنعت کے انقلابات عظیم نے اتحاد اقوام کو حیات عالم کے لئے لازمی بنا دیا ہو۔ اور وہ اس حقیقت کو کس طرح بھولتے؟ ان میں خود وہ لوگ شامل تھے جو اتحاد دول اسلامی کے لئے کوشاں تھے۔ وہ شامل تھے جو اتحاد ایشیا کے خواب کی تعبیر اپنی جدوجہد سے کرنا چاہتے تھے اور ہاں

وہ بھی تھے جو آزاد قوموں کے اس اتحاد کو جس نے صرف مصر اور ہندوستان کے ساتھ انصاف
نہ کرکے اپنے نیک نام کو بٹہ لگایا ہے۔ یعنی سلطنت برطانوی کو سیاست عالم میں ایک مفید جمعیتہ
اقوام سمجھتے تھے اور جن کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان اور مصر کے ساتھ بھی یہ جمعیتہ وہی رویہ اختیار
کرے جو اس نے اپنی نوآبادیوں کے ساتھ کیا ہے تو یہ جمعیتہ دنیا کے لئے سیاسی رحمت ثابت
ہو سکتی ہے اسلئے کہ حقیقی طور پر آزاد قوموں اور ملکوں کا ایسا اتحاد جو اشتراک مقاصد کی وجہ
سے اس درجہ مستحکم ہو دنیا کی تاریخ نے آجتک نہیں دیکھا لیکن اسکے افادہ اور اس کے
استحکام کی شرط اصلی یہی ہے کہ اسکا ہر رکن پورا پورا آزاد ہو کہ جب چاہے اس جمعیتہ کو چھوڑ دے
اور جبتک رہے اشتراک مقاصد کی وجہ سے ساری ذمہ داریوں میں برابر کا شریک ہو
سلطنت برطانوی میں مصر اور ہندوستان کے علاوہ اور کونسا حصہ ہے جسے برطانیہ
آج بہ جبر اپنے ساتھ رکھ سکتا ہو؟ کنیڈا آج چاہے تو بلا اسکے خون کا ایک قطرہ گرے ریاستہائے
متحدہ امریکہ کا جزو بنجائے۔ اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا
دونوں کی طرف سے اس قسم کے اتحاد کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ لیکن کیا کوئی برطانوی مدبر
خواب میں بھی یہ خیال کرسکتا ہے کہ اس اتحاد کو بہ جبر روکا جائے۔ نہیں، برطانیہ کنیڈا کو صرف
باہمی اشتراک مقاصد اور اس کے مفاد ملی کا یقین دلا کر ساتھ رکھ سکتی ہے۔

غرض ہندوستان کی آزادی خواہ جماعت نے اگر ایک ڈومنین جیسے مرتبہ کو اپنی
سیاسی جد و جہد کا مقصد قرار دیا تھا تو کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے قومی
روایات اور تاریخ عالم کے رجحان کو پیش نظر رکھ کر ایسا کیا تھا۔ اسلئے کیا تعجب ہے کہ جب لارڈ
ارون کے مشہور اعلان سے یہ توقع قائم ہوئی کہ انگلستان اس کے لئے آمادہ ہے کہ
ہندوستان کو بھی اس جمعیتہ اقوام میں جس کا نام سلطنت برطانوی ہے برابر کے شریک کی
حیثیت سے شامل کرے تو وہ اس کی طرف بھوکوں کی طرح دوڑ پڑے مگر جب بعد کو معلوم

ہوا کہ ہندوستان کے لیے ڈومینین والا مرتبہ کچھ اور ہی ہے ، اور وزیر ہند نے بتلا دیا کہ ہندوستان کو تو بڑی حد تک یہ مرتبہ حاصل ہی ہو چکا ہے تو لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ اس لئے کہ جو ہمیں حاصل ہے اسکا حال تو ہم سے بہتر اور کون جانتا ہے اور یہی وجہ ہوئی کہ کانگریس نے لفظ سوراج کے معنی کامل آزادی ، متعین کر دیئے

کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کسی حالت میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی منفی پابندی کا محل اس کی کامل آزادی کا تصور نہیں کر سکتا۔ کامل طور پر آزاد ہندوستان ممکن ہو کہ آج بھی سلطنت برطانیہ کا رکن بننے پر آمادہ ہو جائے بشرطیکہ وہ ویسا ہی رکن ہو جیسے کنیڈا ہے جیسے جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا ہیں۔ اگر انگلستان اسکے لئے تیار ہے تو ہندوستان کی طرف سے غالباً کبھی صلح کا دروازہ بند نہ ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں تو ڈومینین مرتبہ کا ذکر دھوکا ہے اور جانکر سیاست میں کون دھوکا کھاتا ہے

ہم جانتے ہیں کہ ہم نے کامل آزادی کے متعلق جو لکھا ہے کانگریس کے ذمہ دار لوگوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری سیاست ملکی میں ایک ایسے گروہ کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ جو تحریک سیاسی کو ایک خاص قسم کے جماعتی انقلاب کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ اس جماعتی انقلاب کے مقاصد اگرچہ ابھی متعین نہیں ہیں لیکن ہوا کا رخ بتلاتا ہے کہ اس آندھی کے جھونکے روس کی طرف سے آ رہے ہیں ہمارے نزدیک مفکرین سیاسی کا فرض ہے کہ روس کے معاملات کا غور سے مطالعہ کریں اسلئے کہ ہمارے خیال میں انقلاب روس تاریخ انسان کی سب سے عبرتناک ٹریجڈی ہے۔ اسکے بعض مفید نتائج سے انکار ممکن نہیں لیکن اسکی بنیادی غلطی سے انکار بھی اسی قدر مشکل ہے زندگی کی گوناگونی کو کسی ایک کٹے چھٹے منطقی اصول کے تحت لانے کی سعی ناکام ، ملکیت شخصی کو مٹانے کے لئے اٹھنا اور نہایت وسیع پیمانے پر ملکیت اراضی کے حق قائم کرا دینا ، آزادی کے لئے انقلاب کرنا اور کروڑوں انسانوں کی آزادی ضمیر تک چھین لینا فرقوں کے امتیاز کو مٹانیکا دعوے کرنا اور آج دس سال گذر جانے تک ان نوجوانوں کو مدرسوں تک

[redacted] میں نہ داخل ہونے دنیا جن کا تصور صرف یہ ہے کہ وہ کسی سابقہ سرمایہ دار کی اولاد ہیں، یہ اور اس جیسی بیشمار باتیں ہمیں کسی ایسی کوشش کی نقل کے خلاف متنبہ کرنیکے لئے کافی ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم سیاسی تنہا ان حقیقتوں کی طرف سے غفلت برتیں اور جب بھونچال آئے تو لسکے ساتھ وہ بھی آنکھ میں

ہمیں انگلستان اور دنیا سے اپنا معاملہ طے کرنیکے لئے پہلے اس اندرونی مسئلہ کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ دنیا میں جنگ سیاست میں عموماً یہ ہوتا رہا ہے کہ سیاست خارجہ کے مسائل نے سیاست داخلی کی حدود کو متعین کیا ہے پہلے یہ ہوتا تھا کہ جہاں وزارت خارجہ سے ہدایت نامہ نکلا کہ اس وقت بس فلاں قصہ بند ہو جانا چاہیے ورنہ خارجی سیاست پر اثر پڑیگا اور وہ قصہ بند ہو جاتا تھا۔ آج ساری دنیا میں یہ صورت بدل گئی ہے۔ اسوقت داخلی ملکی سیاست نے خارجی سیاست کو پس لپشت ڈالدیا ہے۔ آج دنیا میں ہر جگہ داخلی سیاست کی گتھیاں سلجھانا مدبر کا پہلا فرض بنگیا ہے۔ میکڈانلڈ کو اپنی داخلی دشواریاں ہیں، تاردو کو اپنی، اسٹریلیا اپنے دستور اساسی کی ترمیم میں مصروف ہے تو اسٹالین بھی روسی کسانوں کی مخالفت سے کم گھبرایا ہوا نہیں اسپین کی سیاست کا اہم ترین مسئلہ اگر اس وقت جنرل ریویرا کے اختیارات کا تعین ہے تو امریکہ بھی خارجی معاملات سے زیادہ اپنے مالی اور معاشی مسائل کے حل میں مصروف ہے ہندوستان کی خارجی سیاست کی کامیابی بھی اس کے اندرونی مسائل سیاسی ومعاشی کے حل پر منحصر ہے۔ اب وہ وقت بظاہر گذرا ہوا معلوم ہوتا ہے جب ایک قومی فتح کی امید پر غریب اپنے حقوق کے مطالبہ کو ملتوی کردیں، یا اقلیتیں تحفظ حقوق کے خیال کو دماغ سے نکالدیں ہندوستان کو آزاد کرانے والوں کے لیے یہ صورت حال گویا انکی دشواریوں میں بہت تکلیف دہ اضافہ ہے لیکن ہر بڑا کام مشکل ہوتا ہے کیا ہندوستانیوں کے تدبر سے یہ توقع کرنا کہ سیاست ملکی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے وہ داخلی مسائل کے تصفیہ کیطرف پہلے توجہ کرینگے اور انکو معقولیت کے ساتھ طے کرلیں گے کوئی ناممکن توقع ہے؟ ہم تو ایسا نہیں سمجھتے لیکن اس سوال کا صحیح جواب بڑی حد تک ہماری اگلے سال کی سیاسی زندگی سے ملیگا۔
